

محفل و تحاليس



کتاب

مجلد اول
مجلد دوم
مجلد سوم
مجلد چہارم
مجلد پنجم

عقہ

چودہ ستارے محفل و مجالس

علامہ السید فیضان حیدر جوادی طائراہ

عصمہ پبلیکیشنز

بی۔ او باکس نمبر۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

(۷۸۶ / ۱۱۰)

مولائے کائنات

ابوالائمہ حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام

کی مناجاتوں میں سے ایک مناجات

إِلٰهِیْ کُفِّ بِنِیْ عِزِّ اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَاَوْکُفِ
بِنِیْ فَخْرًا اَنْ تُکُوْنَ لِیْ رَبًّا اَنْتَ کَمَا اُحِبُّ
فَاَجْعَلْنِیْ کَمَا تُحِبُّ

میرے اللہ میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں
اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔ تو دلیسا ہی
ہے جیسا میں چاہتا ہوں، پس تو مجھ کو دلیسا بنالے جیسا تو چاہتا ہے۔

اشتراک:



IDAARA-E-TARVEEJ-E-SOAZKHWANI

ادارۃ ترویج سوز خوانی

Post Box No. 10979, Karachi-74700



○ مجلہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں ○

نام کتاب :	مجلہ و مجالین
مؤلف :	علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
ناشر :	عصمہ پبلیکیشنز کراچی
تعداد اشاعت :	۵۰۰ سو
تاریخ اشاعت :	جولائی ۲۰۰۲ء
طباعت :	پرنٹنگ محل ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
سپرڈیلکشن :	پبلایشنز
ہڈ سٹ :	۱۵۰ روپیہ
مستحق قانون :	پروفیسر سید سبط جعفر زیدی ایڈوکیٹ
	جناب سٹیئر رضوی ایڈوکیٹ (ہائی کورٹ)
	سید امتیاز عباس
سرورق ڈائیل ڈسٹنگ :	

اشاعت اسٹ

افتخار بک ڈپو۔ اسلام پورہ کرشن نگر۔ لاہور
مکتبہ الرضا۔ ۸ بیسٹ میاں مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
رحمت اللہ بک ایجنسی کھارادر۔ کراچی
حسن علی بک ڈپو۔ کھارادر۔ کراچی
محفوظ بک ایجنسی۔ مارٹن روڈ۔ کراچی
عباس بک ایجنسی۔ رستم نگر۔ کھٹو
خراسان بک سینٹر بریڈ روڈ۔ کراچی
احمد بک ڈپو۔ رضویہ سوسائٹی کراچی
نیدی بک اسٹال۔ خراسان کراچی
سید محمد تقی نقی کاظمی جی ۵/۲۔ اسلام آباد
سوڈے بکس لائبریری اینڈ اسٹیشنرز۔ سکرو۔ بلتستان
وہاب بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ مین اردو بازار۔ کراچی۔
آل بکس بک ڈپو مسجد باب العیسیٰ۔ نارسہ ناظم آباد۔ کراچی۔

S. Jawad Halder Rizvi
Principal

JAMIA IMAMIA ANWARUL ULOOM
39, Mirza Ghalib Road, Allahabad - 211 003 • Ph.

Residence : D-19, Kareli Colony, Allahabad - 211 018 • Ph.

سید جوان حیدر رضوی

مدرسہ جامعہ امامیہ انوار العلوم
۳۹، مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔

اجازت نامہ

جناب محترم سید ایوب نقوی صاحب

مدیر عصمہ پبلیکیشنز کراچی پاکستان

سلام علیکم

میریدیکہ بفضلہ تعالیٰ ہجرت ہوئے

واللہ اعلم سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ سے انکی تصنیفات و تالیفات کو شائع کرنے
کیلئے امر فرمایا ہے کہ اس تصنیف کو شائع کرنے میں انکی حیات میں گنگوہی جی اس گنگوہی کے پس منظر میں آپ کو اجازت
دی جاتی ہے کہ دوسرے طاب ثراہ کی تصنیفات و تالیفات کو پاکستان میں شائع کر سکتے ہیں یہ اجازت آپ کے
ادارہ عصمہ پبلیکیشنز کیلئے مخصوص و محدود ہے۔

جناب ایوب نقوی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص انفرادی طور پر یا کوئی ادارہ آپ کی اجازت
کے بغیر دوسرے سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ کی تصنیفات و تالیفات کو شائع نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی صاحب
ادارہ اسکی تصنیف و تالیفات کو شائع کرنا ہے تو ہمیشہ مسکولی ہوگا اور جناب ایوب نقوی صاحب کو قانونی چارہ جوئی کرنے کا مکمل
حق حاصل ہوگا۔

والسلام علی من اتبع الهدی
سید جوان حیدر رضوی
ابن علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
۲۲ دسمبر ۲۰۰۲ء



قصہ مشہور ہے کہ کسی زمانے میں انگریزوں کی ایک جماعت نے اس بات کا سروے کیا کہ دنیا کی کس قوم میں کس قدر ذوق مطالعہ پایا جاتا ہے اور آخر میں جب اپنی رپورٹ مرتب کی تو ہندوستان کے بارے میں یہ تبصرہ کیا کہ ”یہاں کی قوم میں ذوق مطالعہ بہت ہے لیکن کتاب الگ کر — خرید کر نہیں۔“

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ برصغیر میں کیا جا رہا ہے کہ کھانا کھانا ہو تو سب الگ الگ کھائیں گے۔ سامان خریدنا ہو تو سب کا سامان الگ الگ ہونا چاہیے۔ مکان بنانا ہو تو سارے خاندان کا مکان الگ الگ ہو — لیکن کتاب خریدنا تو محلہ بھر یا خاندان بھر میں ایک آدمی خریدے یہی کافی ہے۔ باقی لوگ اس سے ماریتے کر پڑھ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم میں مطالعہ کا ذوق اس منزل پر ہوا اس میں نشر و اشاعت کا کام کس قدر مشکل ہوگا اور تبلیغ کی کاڑی کس طرح آگے بڑھ سکے گی۔ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ہندوستان نہ غریب ہے نہ فقیر — یہاں کے مومنین یہ مفلس ہیں نہ فاقد کش۔ دنیا کے ہر کام پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہے۔ شادی بیاہ کی مہل ریسوں سے مکانات کی آرائش تک ہزاروں روپیہ برباد ہو رہا ہے۔ لیکن جب مذہبی کتاب خریدنے کا وقت آتا ہے تو ہر شخص کو غربت، ناداری، افلاس اور ملکی پریشانیوں سب ہی یاد آنے لگتی ہیں اور ایک کتاب کا خریدنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا

ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا نہیں خریدنا ہے کوہ ہمالیہ کو سر پر اٹھانا ہے جب کہ ایسی کوئی کیفیت دنیاوی لٹریچر کی خریداری میں نہیں پیدا ہوتی۔ درحقیقت اسی قومی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہر کام قیمت ادا کر کے انجام دینا ہے اور دین و مذہب کو مفت حاصل کرنا ہے۔

ایسے حالات میں ذہنی افلاس اور مذہبی جہالت کا دور دورہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ یہ تو محض خوش فہمی ہے کہ ہر آدمی اپنی جگہ پر اپنے کو ”اعلم درواں“ تصور کرتا ہے اور جو بات نہیں جانتا اس کے نہ جانتا ہی کو کمال دین و دیانت تصور کرتا ہے — در مذہب کا صحیح احساس ہوتا اور مذہب کو تنظیم حیات کا ذریعہ سمجھا جاتا تو یہ صورت حال ہرگز نہ ہوتی۔

کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عراق و ایران اور بالخصوص ایران میں کتاب بازار میں نہیں آتی اور پیش فروش (ایڈوانس بینک) کے طور پر ہزاروں نسخے بک جاتے ہیں۔ اور تقریباً ہی کیفیت پاکستان میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان میں پانچ سو نسخے نکلنے کے لئے پانچ سو طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں اور برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور ہر شخص کے پاس ایک ہی ”مذہر معقول“ ہوتا ہے کہ دیگر ممالک میں پیسہ ہے اور ہندوستان میں غربت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ملک میں غربت ہے تو کیا آتشبازی کے پیسے باہر سے آتے ہیں۔ شادیوں کی رسومات پر ہزاروں کا سرمایہ عراق و ایران والے صرف کرتے ہیں۔ ولادت سے وفات تک درجنوں تقریبات ایجاد کر کے دعوت احباب کا سامان بیرونی ملک دلانے کرتے ہیں۔ ریڈیو ٹیپ ریکارڈ، فرنیچر، سامان آرائش، عرب و عجم والے خرید کر رکھ جاتے ہیں؛ — اور اگر ایسا نہیں ہے — تو پھر یہ سب سامان کہاں سے آجاتا ہے؟

بات صرف یہ ہے کہ انسان جس کام کو ضروری سمجھتا ہے اس کے لئے وقت

بھی نکالتا ہے اور سرمایہ بھی فراہم کرتا ہے اور جس کام کو "نافل" تصور کرتا ہے اس کے لئے کسی ایسا نہ تصور بھی نہیں کرتا۔

خدا جزائے خیر دے ان صاحبانِ فکر کو جنہیں آج بھی مذہبی سرپرستی کی اہمیت کا اندازہ ہے اور اس کا بوجھ بھی رقم خرچ کرتے ہیں اور اس طرح کام بھی انجام پاتا ہے اور مرحومین کے ایصالِ ثواب کا بھی بہترین راستہ نکل آتا ہے۔

زبِ کرم جملہ حضرات کو اس قسم کی توفیق کرامت فرمائے اور ایسا ایصالِ ثواب کرنے والوں کے مرحومین کو جنت الفردوس میں جوارِ معصومین عنایت فرمائے۔
ناظرین کرام ایسے مرحومین کے لئے ایک سورہ فاتحہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کریں تو درجی کتب کی اشاعت میں شرکت کا ثواب بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

والسلام علی من اتبع الهدی

السید ذیشان حیدر جوادی
۱۵ جمادی الاول ۱۴۰۵ھ

فہرستِ محفل

چودہ ستارے

صفحہ

۱۱	پہلی محفل	داستانِ عظمت سرکارِ دو عالم
۲۲	دوسری محفل	داستانِ عظمت صدیقہ طاہرہ
۵۶	تیسری محفل	داستانِ عظمت مولائے کائنات حضرت علیؑ
۷۲	چوتھی محفل	داستانِ عزیمت امامِ حسنِ مجتبیٰؑ
۹۵	پانچویں محفل	داستانِ عظمت سرکارِ سید الشہداء امام حسینؑ
۱۱۳	چھٹی محفل	داستانِ عظمت امامِ زین العابدینؑ
۱۳۲	ساتویں محفل	داستانِ عظمت امام محمد باقر علیہ السلام
۱۵۵	آٹھویں محفل	داستانِ عظمت امام جعفر صادق علیہ السلام
۱۷۳	نویں محفل	داستانِ عظمت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
۱۹۲	دسویں محفل	داستانِ عظمت امام رضا علیہ السلام
۲۱۶	گیارہویں محفل	داستانِ عظمت امام محمد تقی علیہ السلام
۲۳۹	بارہویں محفل	داستانِ عظمت امام علی نقی علیہ السلام
۲۵۹	تیرہویں محفل	داستانِ عظمت امام حسن عسکری علیہ السلام
۲۷۹	چودھویں محفل	داستانِ عظمت حضرت حجۃ بن الحسن

محفل اللہ تعالیٰ فرما جائے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسم مبارک :	احمد، محمد،
لقب :	مصطفیٰ، بشیر، نذیر، وغیرہ،
کنیت :	ابوالقاسم،
والد ماجد :	جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم،
والدہ ماجدہ :	جناب آمنہ بنت وہب بن عبدمناف،
ولادت :	۱۲ ربیع الاول ۱۲۰۰ عام الفیل جمعہ شعب الی طاب،
بادشاہ وقت :	نوشیرواں عادل،
ازواج :	تیرہ (جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ،
اولاد :	جناب یزید، قاسم، یحییٰ، طاہر، ابراہیم،
شہادت :	۲۸ صفر ۱۱۰۰ بروز دوشنبہ مدینہ منورہ،
عمر شریف :	۶۳ سال،

فہرست مجالس

چودہ ستارے

۳۰۰	پہلی مجلس	داستان عزیمت سرکارِ دو عالم
۳۲۱	دوسری مجلس	داستان عزیمت صدیقہ طاہرہ
۳۲۲	تیسری مجلس	داستان عزیمت مولائے کائنات حضرت علیؑ
۳۶۸	چوتھی مجلس	داستان عزیمت امام حسن مجتبیٰؑ
۳۸۹	پانچویں مجلس	داستان عزیمت سرکارِ شہداء امام حسینؑ
۴۱۰	چھٹی مجلس	داستان عزیمت امام زین العابدینؑ
۴۳۱	ساتویں مجلس	داستان عزیمت امام محمد باقر علیہ السلام
۴۵۲	آٹھویں مجلس	داستان عزیمت امام جعفر صادق علیہ السلام
۴۷۵	نویں مجلس	داستان عزیمت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
۴۹۷	دسویں مجلس	داستان عزیمت امام رضا علیہ السلام
۵۲۰	گیارہویں مجلس	داستان عزیمت امام محمد تقی علیہ السلام
۵۴۳	بارہویں مجلس	داستان عزیمت امام علی نقی علیہ السلام
۵۶۴	تیرہویں مجلس	داستان عزیمت امام حسن عسکری علیہ السلام
۶۷۹	چودھویں مجلس	داستان عزیمت حضرت حجتہ بن الحسن

عمل اللہ تعالیٰ توجہ الشرف

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْمَوْلَانَا أَبِ الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ الْمَقْتُولِينَ
وَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى أَعْدَائِهِمْ أَجْمَعِينَ آمَنَّا بِكَ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَمْدُ فِي كِتَابِهِ الْكُبْرَى
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْأَمْرَ الْأَكْبَرُ وَإِنَّا لَنَافِعُكَ وَالْأَوَّلُ
الکائنات عالم انسانیت کو اپنے کرم اور اپنی حکمت کاملہ سے آگاہ کرتے
ہوئے ارشاد فرما رہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا
اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ تمنا کرکے فرض نہیں ہے اور تم پر
کبھی قسم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اعلان و حقیقت دو قسم کے نظریات کی تردید ہے
جو خالق کائنات سے ربط رکھنے والوں نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھے ہیں اور جن کی
بنیاد گمراہی کا ایک ماحول عالم وجود میں آ گیا ہے۔

خالق کائنات کے مسئلہ پر غور کرنے والے دو طرح کے ہیں۔

بعض افراد وہ ہیں جنہوں نے خالق کائنات کو اپنے مسائل حیات سے بالکل
اجنبی اور بیگانہ بنا دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اسے ہمارے معاملات میں
داخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا کام خلق کرنا تھا، اس نے کر دیا۔ اب ہمارے
خیر و شر کیا ہیں اور ہمارے فائدہ و نقصان کے مسائل کیا ہیں ان سے اس کا
کوئی تعلق نہیں ہے، انہیں ہم خود بہتر جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں صاحب
شعور و ادراک بنایا ہے۔ ہم صاحب عقل و فہم ہیں، ہمارے پاس فکر و نظر
کی قوتیں ہیں، ہمارے پاس قلب و دماغ کا سرمایہ ہے۔ ہمیں کئی کئی ہدایت

کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں کوئی خالق و دوکان نہیں ہے، کسی ضابطہ زندگی کی ضرورت ہے
ہم بے نیاز ہیں اور بے نیاز رہیں گے۔

ان بے چاروں کو اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ اگر اس یا شعور ہستی نے یہ
شعور نہ دے دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس خالق عقل نے یہ جو ہر عقل نہ مرحمت فرمادیا ہوتا
تو کیا ہوتا۔ یہ جو کچھ ہے سب اس کے کرم کا نتیجہ ہے اور جو سرمایہ ہے سب
اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ یہ انتہائی بد نصیبی ہے کہ انسان نے عقل و شعور کا مصرف
بفادت کو قرار دیا ہے، مگر اس کے ذہن میں شعور و ادراک کا کل فائدہ یہ ہے
کہ پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا جائے اور اس کی ہستی کو غیر ضروری ہے بعض
اور بے فائدہ قرار دے دیا جائے۔ اسے کچھ بھی عظمت خالق کا اندازہ ہو نا
تو اس کے خیالات یہ نہ ہوتے اور اس کا طریقہ فکر و نظر ایسا نہ ہوتا،
اسے کم از کم یہ شعور تو ہوتا کہ جس نے پیدا کر کے نعمت زندگی دی ہے جس
عدم کو وجود کا لباس پہنایا ہے، وہ ہمارے حال پر بہرہ ان ہے اور ہمارے
مسائل کو ہم سے زیادہ جانتے والا ہے۔ لیکن نفس پرست انسان نے
خدا ہدایت کو خدا بنا کر ذاتی خدا کے وجود سے انکار کر دیا اور اس کو سرمایہ
فکر و نظر سمجھنے لگا۔

یہ بات مرث و نیائے کفر و الہاد تک محدود ہوتی تو کسی حد تک مسبر
آجاتا اور یہ کہنے کا موقع ہوتا کہ جن افراد نے ہستی معبود ہی کو نہیں پہچانا
ان سے اس سے زیادہ کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن قیامت یہ ہے
کہ تاریخ کے ایک کور پر بھی خیال مسلمانوں کے ذہن میں بھی پیدا ہوگی تھا
اور یہی انداز فکر امتی قرآن نے بھی پیدا کر لیا تھا۔ آپ یہ توبہ نہ کریں

کہ اسلام میں ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور وعدہ لا شرک الاکملہ پڑھنے والی اُمت اس افتازہ فکر کو کیوں کلا بنا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایک لمحہ کے لئے جاتِ مریٰ اعظم کے بعد کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ سبباً خود بخود حل ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مسائل میں اپنے کو خود مختار اور زیادہ عادل و عاقل نہ سمجھ لیا ہوتا اور رب العالمین کو حیات و کائنات کے مسائل سے بیگانہ نہ کر دیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خدا اور رسول کے مقرر کئے ہوئے نامذہب کے ہوتے ہوئے کوئی نیا انتخاب عمل میں آتا اور کسی نے ذرہ دار اہل کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہ انتخاب خود بتا رہا ہے کہ اُمت کو خدا پر اعتماد نہیں ہے اور وہ اپنے وجود کو خدا اور رسول سے زیادہ اپنے مسائل کا ذمہ دار سمجھتی ہے اور یہ ایک ایسا نقطہ ابتلا تھا جس سے اُمت کے دو حصے ہو گئے۔ خدا اور رسول پر اعتماد کرنے والوں نے اس کے نامذہب کو اختیار کیا اور اپنے نفس کے پرستاروں نے اس نامذہب کو آگے بڑھایا جیسے انھوں نے خود منتخب کیا تھا۔ یاد دہانہ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اُمت اسلامیہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک حصہ اپنے نفس کا پرستار ہو گیا اور ایک نفس اللہ کا پرستار ہو گیا۔

ایکے افراد ہر دہ میں پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے رب العالمین کو اپنے مسائل سے بظن کر دیا ہے اور اپنے مسائل کے خود ذمہ دار بنے رہے ہیں اور ایسے افراد بھی ہوتے رہے ہیں جنھوں نے کمال ایمان و عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے جملہ ذمہ داریاں اسی کے سر رکھ دی ہیں اور بظاہر ان کا خیال ہے کہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اسی کا فرض ہے کہ ہمیں ماہِ راست پر لگائے اور یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ ہمیں جنت تک پہنچائے۔ ہمارے پاس نہ کوئی اختیار ہے نہ ہماری کوئی ذمہ داری۔

یہ وہ گمراہ کن عقیدہ ہے جس کے پرستار بڑے غلو سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب نبیہ حکم خدا کے بتہ بھی نہیں مل سکتا تو بندہ کیسے بخش کر سکتا ہے۔ بندہ کے جملہ افعال کی ذمہ داری پروردگار پر ہے۔ ان افراد نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ عظم خدا کے نبیہ بتہ نہیں مل سکتا اس میں حکم کا کوئی دخل نہیں ہے اور حکم اور ہے اور حکم اور علم کا قیاس حکم پر نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ تپوں کے سلسلے میں تو لفظ حکم کا استعمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس شعور و ادراک اور قدرت و اختیار نہیں ہے لیکن انسان کے بارے میں اس لفظ کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحب شعور و ادراک ہے اور اس کے پاس جو ہر عقل و فہم ہے۔ وہ تپوں کو ہر میں اُڑانے والا ہے خود تپہ نہیں ہے۔ وہ تپوں کو توڑ دلا ہے اور واضح لفظوں میں ہوا کا رخ بدلنے والا ہے، ہوا کے رخ پر اُڑنے والا نہیں ہر صدمات۔

مقصود کلام یہ ہے کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پیدا ہوتے رہے ہیں اور مالک کائنات نے اس آیت میں دونوں کے نظریات کی نزدیک ہے جو افراد اسے اپنے مسائل جات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہدایت اور رہنمائی کی ذمہ داری اسی کی ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار اسی کے ہاتھوں میں ہے اور جو لوگ اسے تمام تر ذمہ دار بنا دینا چاہتے ہیں اور اپنے کو ہر منزل پر سبکدوش کر لینا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس پر صفت ہدایت کی ذمہ داری ہر آنکھی پیکر و منزل تک پہنچانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس نے جان لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ ہم نے صحیح راستہ کی ہدایت کر دی، اب جا بے انسان شکر یہ ادا کرے یا کافر و منکر ہو جائے۔ تو اب کہنا پڑے گا کہ اسلام کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ خدا کو اپنے

مسائل سے الگ بھی نہ رکھا جائے اور اسے تمام ترفند وار بھی نہ دیا جائے اور یہی وہ دربانِ راستہ ہے جسے اہل بیت اہلِ اہل نے اختیار فرمایا ہے اور جسے جبر و اختیار کی بحث میں باوجود اعتدال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا جن لوگوں کے عقائد میں عدالت داخل نہیں ہے وہ کبھی منزل سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کبھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور جن کے عقائد میں عدالت ایک بنیادی نقطہ ہے وہ درمیانی راستہ ہی پر رہتے ہیں، نہ کبھی آگے بڑھتے ہیں نہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور ہم نے تو یہ منظر میدانِ غدیر میں صاف صاف دیکھا ہے کہ نقطہ اعتدال کو سمجھانے والے بیٹے نے آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کیا کہ سب اکٹھا ہو جائیں تو علی کی ولایت کا اعلان کیا جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اسلام کا نقطہ اعتدال یہی ہے اور اس سے آگے بڑھ جانے والا بھی ظالم ہے اور اس سے پیچھے رہ جانے والا بھی صراطِ مستقیم سے منحرف ہے۔ لایزال عہدی انصافین! یاد رکھو ہمارا عہدہ خالین کو نہیں مل سکتا۔ مسلمات،

یاد رکھئے! شریعت کی ہدایت کی ذمہ داری پروردگار پر ہے اور علم انسانیت کو راہ دکھانے کا فرض اس نے اپنے ذمہ لیا ہے اور اسی فریضہ کی ادائیگی تھی جس نے تخلیق کائنات میں اس ترتیب کو پیش نظر رکھا کہ راہِ راست پر چلنے والے بعد میں پیدا ہوں اور راہِ ہٹا پہلے پیدا ہو جائے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ راستہ تو چھینے والے موجود تھے اور راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ منزل تک جانے والے موجود تھے اور منزل تک لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ حکمت الہی اور کرمِ بزرگوار کا تقاضہ تھا کہ اس نے عدم کے ستارے کو راہِ ہٹا سے توڑا۔ راہِ ہٹا سے نہیں کائنات کا وجود اول راہبر کو بنایا راہبر کو نہیں۔ یاد رکھئے لفظوں میں

یوں کہا جائے کہ اس نے اپنے فالقین کے مزاج کو سمجھا دیا کہ آغاز کائنات میں جب کچھ نہ تھا تو صرت تاہنا تھا۔ اور تاہنا دنیا میں بھی جب ساری دنیا تاہنا ہو جائے گی تو راہِ ہٹا کا وجود رہے گا اب جسے الہی راہِ ہٹا کو پہچانا ہو وہ یہ شخص ہدایت لیکر آگے بڑھے اور یہ دیکھے کہ جہاں فنا کا سلسلہ قائم ہو جائے وہ خدائی سلسلہ نہیں ہے اور جہاں "يَبْتَغِي دَجْنَماً مَّيْتًا ذُوًا لِّجَلَالٍ ذِكْرُكَ" کی شان سے راہِ ہٹا و جہاں اللہ بن کر باقی ہے وہاں الہی نشاندگی ہے اور اسی کو خدا کی نیابت و بالانشینی کا حق ہے۔ مسلمات،

الکلب کائنات نے اپنے اس فریضہ ہدایت کو ہر دور میں ادا کیا اور ہر مڑ پر ایک نیا ایک راہِ ہٹا کا انتظام کیا۔ تاریخ کے مختصر سے وقفہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی آمد اس بات کی دلیل ہے کہ الکلب کائنات نے کوئی دور کوئی زمانہ کوئی علاقہ کوئی خطہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں اپنی طرف سے راہِ ہٹا کا انتظام نہ کیا ہو اور جس میں اپنی ہدایت نہ قرار دی ہو جیہ بد نصیبی جیسے صفتِ امتِ پیغمبر کے حصہ میں آئی ہے کہ ہر قوم و ملت پر رحم کرنے والے خدا کو اس کے حالِ زار پر رحم نہ آیا اور اس نے اس قوم کو حضور کے بعد لا وارث چھوڑ دیا۔ العیان باللہ،

عزیزانِ محترم! کرم الہی پر کتنا بڑا اتہام ہے یہ سوچنا کہ خدا نے امتِ پیغمبر کو لا وارث چھوڑ دیا ہے اور اسے ذلت سے کوئی محبت ہے نہ مذہب سے کوئی تعلق۔ وہ نہ اسلام کی بقا چاہتا ہے نہ قرآن کی زندگی بخشت ہے اب بھی مسلمان اپنے خیالات کی اصلاح کر لیں اور سرکاریہ و عالم کی ولادت با سعادت کے مبارک موقع پر یہ عہدہ کریں کہ آپ کسی ایسے عقیدہ و خیال کو اختیار نہ کریں گے جو بدعتِ مذہب کے منافی اور نظامِ اسلام کو دہم پر دہم کر دینے والا ہو۔

یاد رکھئے! الہی ہدایتوں کا یہ سلسلہ جنابِ آدم سے چلتے چلتے جنابِ ابراہیم تک

پہنچا۔ انھیں مالک کائنات نے رسول بھی بنایا نبی بھی بنادیا بھی بنایا امام بھی۔ خدات
کا شرف بھی بخشا اور بے شک نبی کا انداز بھی۔ انھیں مہمہ کعب بھی بنایا اور مبارکات
بھی اور رب سے بڑا شرف یہ عنایت فرمایا کہ انھیں ایک پورے سلسلہ ہدایت
کا مرکز و معدن بنا دیا اور دونوں بیٹوں کو نبوت و رسالت کے عہدوں سے
سرفراز فرما کر ان کے اعزاز کو لا جواب بنا دیا۔

دنیا جانتی ہے کہ جناب ابراہیم کے دو فرزند تھے۔ ایک جناب اسمعیل اور
ایک جناب اسمعیل۔ جناب اسمعیل کی اولاد میں حضور سرور کائنات میں اور جناب
اسمعیل کی نسل میں سارے انبیاء بنی اسرائیل۔ جناب اسمعیل نے راہ خدا میں
قربانی دی اور جناب اسماعیل نے امت کی ناسمجگی کی لیکن ایک مسئلہ اس وقت
پیدا ہو گیا جب مشربانی اسمعیل بے اثر دکھائی دینے لگی اور بنی اسرائیل
میں انبیاء کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا انگشت بدلتا ہے جس نے راہ خدا
میں زندگی قربان کی، جس نے ایک خواب کی بنیاد پر گھر پر جھری کا چلن گمارا
کر لیا، جو نو جوانی کے عالم منزل ذوق میں لپٹ گیا اور آخری سانس تک جاوہ
تسلیم و رفا سے نہیں ہٹا۔ جس کی قربانی کو خدا نے سن کر کیا مگر خود اس کے
پلے نجات میں جنبش نہیں آئی۔ اس کی نسل میں جو بھی آتا ہے وہ بغیر نبی
آتا ہے جو بھی پیدا ہوتا ہے وہ غیر رسول ہوتا ہے۔ نہ کوئی کتاب آتی
ہے نہ کوئی نصرت۔ نہ کوئی نبی آتا ہے نہ کوئی رسول۔ تو کیا یہ قربانی
اسمعیل بالکل بے قیمت ہے، کیا اس کی بارگاہ میں ایسا دیوانہ کا کوئی مرتب
نہیں ہے، کیا اس نے قربانی اسماعیل کو رد کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو
ہم بھی اسے بے قیمت سمجھیں اور اپنے ذہن سے قربانی کی عظمت کو نکال دیا

اسا گرایا نہیں ہے تو کیا وجہ کہ جسے شرف قربانی نہیں ملا اس کی پوری نسل کو نبی بنا
دیا اور جس نے ایسا قربانی کا مظاہرہ کیا اس کی نسل میں کوئی نبی رسول نہیں آتا ہے
یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ ایک مرتبہ آواز قدرت آئی۔ میرے بندے! پریشان نہ ہو میرے
کرم میں کوئی کمی نہیں ہے، میرے خزانہ قدرت میں کوئی نقص نہیں ہے۔ میں
کمالات کا قدر دانا ہوں، میں ایسا قربانی کی عظمتوں کو پہچانتا ہوں میں مصلحت
کا انتظار کر رہا ہوں۔ وقت آنے پر میں اپنے کرم کا مظاہرہ کروں گا۔ میرا منشاء
اس سلسلہ میں پہلی ہی منزل پر تجھے انتظار کا عادی بنا دیا جائے تاکہ آخری
پر انتظام میں کوئی زحمت نہ ہو۔

جن لوگوں نے کل نسل اسمعیل کے پہلے راہنما کا انتظار کیا تھا وہ آج
آخری کا بھی کمر ہے ہیں اور جو کل انتظار کے مخالف تھے وہ آج بھی انتظار
کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ کل جیسے جیسے نسل اسمعیل کے
انبیاء گزرتے جا رہے تھے انتظار شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ اب زمانہ قریب
آگیا ہے۔ اب آئینہ آکا آ رہا ہے اور جب تک اس سلسلہ کے آخری پیغمبر جناب عیسیٰ
تھے اس لئے سب سے زیادہ اس آخری وارث اسمعیل پیغمبر کا انتظار انھیں کو
رہا ہوگا اور وہ ہر لمحہ اس بات کے منتظر رہے ہوں گے کہ کب خدا اس وارث
اسمعیل کو بھیجے اور میرے بعد آئینہ والا سلسلہ اوصیاء تمام ہر اور دنیا پھر
کبھی نبی سے روشناس ہو۔ اور شاید جناب عیسیٰ کی یہی ادا قدرت کو
پسند آگئی کہ اس نے آواز دی کہ اے عیسیٰ تم نے پہلی منزل پر انتظار شدید
کا شرف حاصل کیا ہے تو آخری منزل پر بھی یہ شرف تمہیں کو عنایت کروں گا۔ آج
بھی آسمان پر عیسیٰ انتظار کر رہے ہیں اور انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب نسل اسمعیل کا

آفریلا ہما بڑہ غیب سے ظہور کریگا اور آسمان سے جناب علیؑ پر اس کے پیچھے ناز
جماعت آدا کریں گے صلوات

عزیزانِ محترم! یہ غلط نہیں نہ ہم کہ جناب اسماعیل کے بعد اعران کی نسل میں
انبیاء و مرسلین نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ ان میں کوئی صاحبِ کردار
اور صاحبِ ایمان نہیں تھا یا کسی کی عظمت و جلالت میں کوئی نقص تھا۔ ہرگز نہیں!
یہ سب اللہ والے تھے سب کا ایمان تو حید پروردگار پر تھا۔ سب اپنے جدِ حق پر ایمان
کی ملت پر قائم تھے۔ فقط عہدوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا اور وہ اپنے وقت
کا انتظار کر رہا تھا اور شاید ہی مصلحت رہی ہو کہ جیسے جیسا عہدہ دینا ہوگا اسکے
لئے ویسا ہی زمانہ اختیار کیا جائے گا۔ اور قدرت یہ بتانا چاہتی ہو کہ جس سلسلہ کو
ختم کر دینا ہے اس کی نسل کو منصب پہلے دیا جائے گا اور جس کی نسل کے انتظار کو باقی
رکھنا ہے اس کا سلسلہ منصب بعد میں قائم کیا جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ
نسلِ اسماعیل کی منصبی حرمت ختم ہو گئی اور نسلِ اسماعیل کی شرافت آج تک قائم ہے۔ آپ
یہ نہ خیال فرمائیں کہ نسلِ اسماعیل میں بھی تو جناب علیؑ زندہ موجود ہیں اور ادھر بھی ایک
نیا قائم و دائم ہے۔ اس لئے کہ جناب علیؑ کے وجود میں تو کوئی خیرہ نہیں ہے۔ وہ
مسلکاتِ اسلام و قرآن میں ہے لیکن ان کی حیثیت نبوت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ
ایک نامتو پروردگار کی حیثیت سے نہیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے نبی و رسول نہیں ہیں
ان کی کتاب نسخ ہو چکی ہے ان کی شریعت ختم ہو چکی ہے ان کا دور تمام ہو چکا ہے
اور ان سب کی زندہ دلیل یہ ہے کہ اب جب وہ آئیں گے تو کسی صاحبِ شریعت کو نماز
پڑھانے کے لئے نہیں آئیں گے اور جب صاحبِ شریعت۔ "دارِ شریعت" کے پیچھے
نماز پڑھنے کے لئے سمجھ لیجئے گا کہ ایک کی شریعت ختم ہو چکی ہے اور ایک کی شریعت باقی

ہے۔ ایک کے عہد کی میعاد ختم ہو چکی ہے اور ایک کا منصب ناقیام قیامت قائم ہے۔
صلوات

عزیزانِ گرامی! دامنِ وقت میں گنجائش نہیں ہے اور دامنِ تاریخ میں بھی
اتنی دست نہیں ہے کہ نسلِ اسماعیل کے ایک ایک فرد کی جلالت پر روشنی ڈالی جاسکے۔
البتہ یہ بات آسانی کہی جاسکتی ہے کہ نسلِ اسماعیل میں نبیوں کے سلسلہ کے خاتمہ پر اور
جناب علیؑ کے آسمان پر چلے جانے کے بعد سے اوت کی قیادت کا فرق زیادہ قدر نسلِ اسماعیل
ہی میں رہا ہے اور یہی وہ افراد تھے جو جزیرۃ العرب میں قوم و ملت کی رہنمائی کا فرض
انجام دے رہے تھے تقریباً پانچ سو سال تک اور کیا جناب علیؑ۔ کون کون تھا اور
فریقہ ہدایت کس کس کے سپرد تھا اس کا تفصیلی تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے لیکن اجمالاً یہ کہا
جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ بہر حال قائم تھا اور زمینِ حجت خدا سے خالی نہیں تھی۔ اب وہ کون
تھا جو اس فرض کو انجام دے رہا تھا اس کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ اس دور میں
جب اور کیا جناب علیؑ کے تذکرے اور ان کے تلمیذی کارنامے پروردگار میں تھے نسلِ اسماعیل کے
کا با منظر تاریخ پر نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوا تھا کہ قدرت اپنی نمائندگی اور امت
کی قیادت و رہبری کا کام انہیں نمایاں افراد کے سپرد کر چکی ہے جس کا کہن و خمیتوں کے بارے
میں مزاحمت بھی لگتا ہے۔ اس وقت اس مجموعہ پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ
نسلِ اسماعیل کے کار با منظر تاریخ سے ہٹا نہیں جاسکتے اور غور و تامل پر جھٹکا جھگڑا ہے۔
وہ جناب فی بن کلاب بن مرہ نے عرب کو قیادت کا سلیقہ سکھایا اور مختلف خداؤں میں ہی ہوئی تو
کہ انہما ہی غور دیا۔ دنیا کو جیسے کا انداز سکھایا اور ذلت کے گڑھے میں پڑی ہوئی قوم کو
متر کا احساس بخشا۔ اسی نسلِ اسماعیل میں تھے جناب علیؑ کے نمایاں کارنامے تاریخ میں
محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ وہ تاریخی کے دور میں نہایت

تھے اور جاہلیت کی فضا میں علم و عمل کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔

خاتم نبیؐ کے بعد ان کے فرزند جناب عبدالمنان کا کردار ہے جن کے فائز ہیں جو عالم تھا کہ انھیں قمری طما کہا جاتا تھا اور باطنی وجاہت و شرافت کے اعتبار سے شہر اویہ اشہر انظم کیا کرتے تھے کہ جس مسافر کو کوئی میسران نہ ملتا ہمد وہ عبدمنان کے گھر چلا جائے بغیر سے امیر ہر جا بیگا اور نادار سے دولت مند بیکر واپس آئے گا جناب عبدالمنان نے اپنے باپ کی نیا بت میں عرب کی سرور سی بنگالی اور خانہ کعبہ کی نو لیسٹ کا کام انجام دیا۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جتنی زندگی اور منظم حکومت کا شور رسکے بیٹے حضور سرور کائنات کے جدِ اعلیٰ جناب نبیؐ نے دیا ہے اور اس شہور کو کمال بخشگی کا شرف جناب عبدالمنان نے بخشا ہے۔

جناب عبدالمنان کے بعد ان کے فرزند جناب ہاشم کا دور آتا ہے جن کے کردار کی بلندی کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کا نام ہاشم تھا انھیں ہر گیکھا تھا، ہاشم کے معنی چوڑے کرنے اور بڑے کرنے والے کے ہیں۔ آپ کے اس لقب کا راز یہ تھا کہ جب عرب میں قحط پڑا تو آپ سفر تجارت پر گئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ ملک میں قحط پڑا ہوا ہے فوراً واپس آ گئے اور سارا آوارہ لوگوں کی شکن میں تبدیل کر کے اسے چوڑے کر کے عرب کی لذیذ ترین غذا خیار کی اور ساری قوم کو کھلایا تاکہ خلفت خدا سے یک نہ رہے۔ انسانوں کا کیا ذکر ہوا میں اڑتے ہوئے پرند بھی آپ کے کمر سے محروم نہ تھے اور ان کی غذا کا بھی بندوبست فرما دیا کرتے تھے چھوٹی سہا بدوں کا سنگب بیا رہا جناب ہاشم نے رکھا جب آپ سفر تجارت پر گئے اور قمری روم سے تعلقات قائم ہو گئے تو آپ نے پہلا کانیا، پنجم دیا کو ملک کے تاجروں پر سے سرکاری ٹیکس اٹھانے اور انھیں سفر کی سہولتیں فراہم

کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ جناب ہاشم کے اس احسان کو دنیا عربیت نظر انداز نہیں کر سکتی اور اگر ہاشم انسان کو یہ احساس ہے کہ آپ نے اس معاہدے سے عرب کی تجارت کو منسوخ نہ مخرج ملک پہنچا دیا ہے۔

جناب ہاشم کے فرزند اور جانشین جناب عبدالمطلب تھے جو حضور سرور کائنات کے جدِ بزرگوار تھے اور جن کی عظمت اس وقت تک یادگار رہے گی جب تک دینِ قرآن میں سورۃ فیل محفوظ ہے اور صفحہ بارہ پنج برابر یہ کا داتو ثبت ہے۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاشمی خاندان کی قیادت میں خانہ کعبہ کی بڑھتی ہوئی شہرت و عظمت نے ابرہہ کو بے چین کر دیا اور اس نے دیکھا کہ عقیدہ توحید مسلسل زنی کر رہا ہے اور دنیا خانہ کعبہ کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ اس کی مزاحمت مرکزیت نہ دیکھی گئی اور اس نے اپنے شہر میں ایک عظیم الشان گرجا بنوا دیا تاکہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے اس کا طواف کریں اور کعبہ کی مرکزیت ختم ہو جائے لیکن جندہی دنوں میں دیکھا کہ اللہ کا بنایا ہوا گھر اور ہے اور بندے کا بنایا ہوا گھر اور اتنا زور و مت کر کے کے بعد بھی دنیا اور توحید نہ ہوئی تو بالآخر یہ طے کیا کہ اس خانہ کعبہ کو گرادیا جائے، اس کی تعمیر کو تباہ ویرا د کر دیا جائے تاکہ لوگ ادھر سے فرحت پا کر ادھر توجہ ہوں اور اس عزم کے ساتھ انھیں کا ایک لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ منزلیں طے کر کے قریب مکہ پہنچا تو کباری کے قریب پہنچ کر اس کے لشکر نے پہلا کام یہ کیا کہ اہل مکہ کے تمام جانور بچہ ڈالے اور جناب عبدالمطلب کے اذیت بھگت کر لئے، تاکہ اہل مکہ مرعوب ہو جائیں اور کسی قسم کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں۔

سوال یہ پوچھا کہ کیا ابرہہ کے اس ارادہ عزم میں خانہ کعبہ کا بہن

بھی کوئی قصہ تھا؟ اس نے بھی کسی کا کچھ بگاڑا تھا کہ اس کے منہم کرنے کا ارادہ کر لیا
 گیا وہ دنیائے اسلام جناب دیگی کہ نہیں! یعنی کتب کی تاریخ اس بات کو واضح کر رہی ہے
 کہ باطل بے قصہ بھی اہل حق کو تباہ کر دینا چاہتا ہے اور جب باطل حق کے مقابلہ
 میں اپنی کمزوری اور ذلت کا احساس کرتا ہے تو اس کے پاس ایک ہی حربہ رہ جاتا
 ہے کہ وہ حق کو تباہ و برباد کرے تاکہ باطل کو فروغ حاصل ہو اور لوگ حق کی
 طرف منحرف ہو جائیں۔ لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک فیصلہ ہے کہ حق بہر حال زندہ رہتا
 اور باطل بہر حال فنا ہو جاتا ہے۔ دنیائے اسلام اس واقعہ سے سبق لیتی تہمیت
 اور اہلبیت کے رابطہ کو سمجھ لیتی۔ ابراہم نے بیت کے مقابلہ میں بیت بنایا اور دنیا
 نے اہلبیت کے مقابلہ میں افراد تیار کئے۔ مگر ہر بیت کی عظمت و گھٹ سکی
 تو اسے منہم کرنے کا ارادہ کیا گیا اور اہل بیت کے وقار میں فرق نہ آیا تو انھیں
 قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن خدا کا حکم ہے کہ دونوں کی حیات
 محفوظ رہی اور آج بیت و اہلبیت دونوں کے دشمن صفوہ ہستی سے فنا ہو چکے ہیں
 مگر غلطہ میں بیت محفوظ ہے۔ اور پڑھ غیب میں اہلبیت موجود ہے۔ صلوات ،
 جناب عبدالمطلب کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ابراہم کے دربار میں گئے
 اس نے نہایت ہی احترام سے بیٹھا اور یہ سبیل ہے کہ جناب عبدالمطلب کی جلالت سے
 دشمن بھی سرعوب تھے۔ پوچھا کہ عبدالمطلب آپ نے کیوں زحمت کی؟ آپ نے فرمایا کہ تیرے
 لشکر والوں نے میرے اونٹ پکڑ لئے ہیں۔ میں انھیں واپس لینے آیا ہوں۔ ابراہم
 کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کہنے لگا۔ عبدالمطلب، میں نہیں بڑا بلند نفس اور ادا اللہ
 والا سمجھتا تھا۔ تم خانہ کعبہ کے متولی اور حرم خدا کے محافظ تھے مگر بڑے افسوس کی
 بات ہے کہ تمہیں اپنے اونٹ یا درہ گئے اور اپنے خدا کا گھر یا درہ آیا کر اے

بارے میں مجھ سے سفارش اور التماس کرتے۔ جناب عبدالمطلب نے فوراً بدل
 ارشاد فرمایا۔ ابراہم! ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، ان کی فکر مجھے ہے۔ اور
 اس گھر کا مالک کوئی اور ہے جو اسے بہر حال بچائے گا تو اب میری
 کیا ضرورت ہے؟

ابوہریرہ سکون و اطمینان، ایمان و عقیدہ کے استیعام کی تمنا کر رہا تھا
 کہ اگر آج خدا نخواستہ کسی بیت اللہ پر حملہ ہو جائے اور مسلمان یہ کہہ کے الگ
 ہو جائیں کہ جس کا گھر ہے وہ خود بچائے گا تو سب انھیں اسلام سے خارج
 کر دیں گے اور ان پر بے حد ناکامی لگائیں گے کہ خانہ خدا کا تحفظ واجب ہے
 اور یہ کوئی فرد ہی نہیں ہے کہ اس کے گرانے والے پر عذاب خدا ہی نازل
 ہو جائے جب کہ خود اسی خانہ کعبہ پر درپردہ میں حملہ ہوا لیکن نہ کوئی آسانی
 نہ شکر آیا اور نہ کوئی عذاب نازل ہوا۔ تو پھر جناب عبدالمطلب کو یہ کہہ کر الگ
 ہو جانے کا کیا حق تھا اور ان کی یہ علیحدگی کس طرح قابلِ تعریف ہو گئی۔ اس
 منزل پر ایک لمحہ سچھڑ کر سوچنا پڑے گا اور ایمان کی عزت و برتری کا اندازہ لگنا
 پڑے گا کہ اگر آج مسلمانوں کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے اور اس کے کہنے کا کوئی اثر
 نہیں پڑ سکتا ہے کہ اس کے اعلان پر عذاب الہی نازل ہو جائے تو کل جناب
 عبدالمطلب نے یہ کیوں کہا اور عذاب الہی کیسے نازل ہو گیا۔ اور عذاب بھی کیوں
 کہ ابابیل کا لشکر آیا اور مکہ کی پھینک کر ہاتھوں کو سواروں کے
 تباہ و برباد کر دیا۔ اتنے مختصر سپاہی اور اتنے گراؤ میں جانور۔ لیکن جب
 اُدھر والا حملہ آور ہوتا ہے تو اُدھر والوں کے قیامت کام نہیں آتے
 اور سب فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

یاد رکھئے! ابابیل اور اصحاب قبل کے ساتھ کو نگاہ میں رکھنے والے مسلمان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ سپر یا دیگر دوسری طاقتوں سے مرعوب ہو جائے۔ خواہ وہی طاقت کو جھوٹی طاقت کے ذریعہ ہمارا فنا کرنا ہے۔ شرط یہ ہے کہ جھوٹی طاقت کا رشتہ خدا سے ہوا خدا سے نہ ہو صلوات،

جناب عبدالطلب کے طرز عمل کو دیکھنے کے بعد دہم میں باتیں کہی جاسکتی ہیں کہ یا تو عبدالطلب کی شکاہ اتنی دور رس تھی کہ وہ آنے والے عذاب کو دیکھ کر اس کی خبر دے رہے تھے اور اپنے علم غیب کا اعلان کر رہے تھے یا ان کے بیان میں اتنا زور تھا کہ جب کہیا تو عذاب الہی نازل ہو گیا۔ دونوں ہی صورتوں میں بانا پڑ کر نسل انجیل میں نبوت کے نہ ہونے کے باوجود ایسے بلند کردار افراد موجود تھے، جن کی باتوں پر کسانوں میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ اور جن کے الفاظ سے عذاب الہی کھینچ کر آجاتا تھا۔ صلوات،

جناب عبدالطلب کے بیان کے فرزند جناب البطال اور جناب عبداللہ کا کردار سائے آج ہے۔ جناب عبداللہ کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جناب عبدالطلب نے یہ تذکرہ کی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے دس بڑے عنایت کئے تو میں ایک بیٹا اس کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ یہ جذبہ خود آواز دے رہا ہے کہ نسل اسمعیل میں جذبہ قربانی موروثی طور پر چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں پیا ہوا۔ حسن اتفاق کہ معبود نے دعا کو قبول کر لیا۔ اور جب مذکورہ کر کے کا وقت آیا تو قرعہ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ چاند سے فرزند کی قربانی کا مسئلہ بہت سخت تھا۔ لیکن عبدالطلب تیار ہو گئے اور شاعر نے جذبات وفاق طرین خوب ماثور کے حالات کے ذیل اس طرح اشارہ کیا کہ

حق کچلے حصار دغا گھیرتے ہیں ہم بیٹے کے سبھی گلے پھجوری پھرتے ہیں ہم
لوگوں نے جناب عبدالطلب سے اصرار کیا کہ اے وارث انجیل کیا یہ نہیں
کو آپ مذہب دیدہ سمجھتے اور چاند سے فرزند کو بچا لیجئے۔ جناب عبدالطلب تیار ہو گئے اور
طے پایا کہ دس ادھوں کو مذہب قرار دیکر قرعہ ڈالا جائے۔ قرعہ ڈالا گیا۔ جناب عبداللہ
کے نام نکلا۔ دوسری مرتبہ ادھ ڈھا کر بیٹن کر دیئے گئے۔ لیکن قرعہ انھیں کے نام
نکلا۔ پھر تیسرے گئے گئے۔ لیکن انھیں کا نام نکلا۔ اور اس طرح دس دس کر کے ستر تک
نوبت پہنچی۔ اور آخری مرتبہ قرعہ ادھوں پر رکھ کر آیا جس سے جناب عبداللہ کی جان
بچ گئی۔ سوا دس راہ خدایں قربان ہو گئے اور اسلئے اپنے دور شریعت میں
اسی مقدار کو جان کا فدیہ قرار دیا۔ اکل ابراہیم نے دیندہ روح بجا سنا تو قربانی فرض
ہو گئی اور آج عبدالطلب نے سوا دس ذبح کئے تو وہی نفس کا بدلہ بن گیا۔ یہ
بے عظمت کردار کہ جو مرتبہ غلت کے بعد ابراہیم کو ملا تھا وہی مرتبہ آج عبدالطلب
کو حاصل ہوا ہے۔ صلوات،

یہی نفس عبداللہ کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو جائے کہ نگاہ قدرت
میں ان کا مرتبہ کتنا عظیم اور بلند تھا۔ لیکن ان تمام باتوں اور اتنی عظیم اور بلند شخصیتوں
کے باوجود سماج کا عالم دیگر گول تھا۔ عالم عربیت ایک گہری جہالت میں ڈوبا ہوا تھا
عقیدہ اخلاق، اجتماع، اقتصاد، سماج، فرد، تہذیب، تمدن کوئی ایسا مرحلہ نہیں تھا
جہاں انھیں انسان کہا جاسکتا ہو۔ پورا سماج سدا با افتقار بنا ہوا تھا
پتھر و گار ایک جگہ پر پتھر پتھر ہوتی رہے گی اور کب تک قبل کی رفاقت برباد ہوتی
رہے گی۔ معبود! کب تک یہ شراب نوشی اور عیاشی کا رواج رہے گا۔ کب تک لوگ غلام ادنیٰ
ہوتے رہیں گے۔ کب تک سود کے ذریعہ غریبوں کا خون چوسا جائے گا۔ کب تک جو کئے نام پر

حرام خوری ہوگی۔ کبتک بیٹیاں زندہ دفن ہوں گی۔ کبتک ان بیٹے کھیلے ترکہ میراث نہی دیگا
 کبتک بھائی بھائی کا خون بہاتا رہے گا۔ کبتک سربراہ قافلے لٹے رہیں گے۔ کبتک انسانیت
 کا خون ہزار ہیکا کبتک تہذیب بھمان اور تمدن بے روح بنادے گا۔ کبتک یادِ غرت
 کا نلام ہزار ہیکا کبتک شرافت سربراہانِ عرباں ہوتی رہے گی۔ کبتک عزت بچتی رہے گی
 اور کبتک انبیاء کی ریاضت سکھنے کے عالم میں پڑی رہے گی۔ کیا یہ سماج قابلِ حسم
 نہیں ہے۔ کیا یہ ہواشرہ کسی مہربانی کا حقدار نہیں ہے۔ کیا قرآنی اُتیل کوئی
 منصب نہیں چاہتی۔ کیا سلسلہ ہدایت دارشاد کو قیامت تک نہیں چلنا ہے۔؟
 خدائے قدرت اُن مہکے بندے ذرا انتظار کر۔ میں نے رحم و کرم کو رکھ
 رکھ کر مسلسل بارش سے پانی کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور لوگ بارشِ رحمت
 کو بھی زحمت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن جب تھوڑی پانی میں جاتا ہے اور چند روز
 تک بارش نہیں ہوتی تو ہوا کے حبس اور دغا کی گھٹن ہی کو دیکھ کر بارش کی دعا میں
 ہونے لگتی ہیں اور پھر ایک ایک قطرہ آب کو دُر آبدار کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ میرے
 عیسیٰ کے بعد نہت کو اسی لئے روک لیا تھا کہ انسانوں کو نبی کی قدر و قیمت
 کا اندازہ ہو جائے اور انھیں یہ سلوک ہو جائے کہ بظاہر انبیاء نہیں رہتے ہیں تو
 سماج کا کیا عالم ہوتا ہے اور جب یہ احساس بیدار ہو گیا اور ساری کائنات
 فریادِ طلب ہو گئی ہے تو دیکھ! وہ مکہ سے ایک گھٹا اٹھ رہی ہے۔ وہ خانہ
 عبدالمطلب سے ابرگوبر بار اُسٹ رہا ہے۔ وہ ارضِ الاول کی صبح کو خاتمیت کا
 ابرگوبر بار بارشِ رحمت کر رہا ہے۔ وہ دنیا جل تھل ہو رہی ہے۔ وہ کھیتیاں ہری
 بھری ہو رہی ہیں۔ وہ سبز و لہلہا رہا ہے۔ وہ ریاضت انبیاء کا کام آ رہی ہے۔ وہ
 قرآنی اُتیل گل کھلا رہی ہے۔ وہ سلسلہ ابراہیم پر مبارک آ رہی ہے۔ وہ بارخِ رست

کا آخری پھول کھل رہا ہے۔ اور غارِ مذہبِ عالم کو دائمی گنوار بناد رہا ہے۔ صلوات
 ، ارضِ الاول کی صبح کیا مساوات نشان صبح تھی جب گنوارِ خلیلی میں ہوا
 آ رہی تھی اور آواز کی گود میں عرب کا جاند چمک رہا تھا۔ قصرِ کسری کے چوڑے کنگرے
 گرتے ہوئے آواز دے رہے تھے کہ چوڑا اندازِ حق کا حامل آ رہا ہے۔ بحرِ سادہ
 خشک ہو کر پکڑ رہا تھا کہ اس کی سموات کے سامنے دریا میں مجالِ روانی نہیں ہے
 آتشِ کدہ فارس گل ہو کر آواز دے رہا تھا کہ ایک وارثِ خلیل آ رہا ہے۔ کائنات
 میں انقلاب برپا تھا۔ روحِ تہذیب و تمدن رقص کر رہی تھی۔ اسلام سر فرخو ہو رہا تھا
 کفر کی لہری میں ایک مصلیٰ مچی تھی اور عالم بالا میں جنِ مسرت نایا جا رہا تھا۔

آنے والا اول غلغلات ہونے کے باوجود اتنی دیر میں آ رہا ہے اور
 اسے اول کے بجائے آخر بنایا جا رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے لیکن اس کا واضح
 سا جواب یہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیت کو آنا ہوتا ہے ویسا ہی انتظام کیا جاتا ہے
 مومن حکام کی آمد کا انتظام چند لمحہ قبل شروع ہو جاتا ہے اور بڑی شخصیت کی آمد
 کا اہتمام چند روزہ اور چند ماہ قبل سے ہوتا ہے۔ مالکِ کائنات اپنے آسمانی
 حبیب صاحبِ معراج کو بھیجنے والا تھا۔ اس نے پہلے تمہید میں انبیاء کو بھیجا تاکہ
 زمین ہموار کریں۔ اس کے بعد ادعیاء کا سلسلہ قائم کیا کہ قوم قبولِ احکام کیلئے
 تیار ہو جائے۔ اس کے بعد مخصوص برگزیدہ بندوں کو مقرر کیا کہ وہ اپنے کردار
 سے قبولِ ہدایت کیلئے ذہن تیار کریں۔ اور اس طرح جب پورے ماحول تیار ہو گیا
 تو اپنے محبوب کو عرشِ اعظم سے فرضِ مکہ پر اتارا اور اس شان سے اتارا کہ
 گویا آدمِ صفت لیکر آ رہے ہیں۔ لوحِ نہدیمیت آ رہے ہیں۔ ابراہیمِ فلت
 مدوش آ رہے ہیں۔ مومن حکم بدست آ رہے ہیں۔ عیسیٰ مرمہ جلانے ہوئے

اور ایک مخلوق مخلوق کا رشتہ۔ اس کے احکام انھیں دگر رشتوں کے جامع اور اس کے
دین کی دست و ہمہ گیری انھیں دونوں رشتوں سے وابستہ ہے۔ اس کا مقصد
پہلے رشتہ سے یہ ہے کہ دُور میں کا ایک ایک بسنے والا بارگاہیہ نیاز میں تسلیم جھکا راوی رہے و
انسانیت و عبادت و عبادت و عبادت اور دوسری منزل میں اس کا مقصد قیام اس کے اور وہ یہ جانتا کہ بند
آپس میں اس طرح زندگی گزاریں کہ اس امان قائم ہے اور کبھی طرح کا فساد و اختلاف نہ پائے
باقی اسلام انھیں دونوں مقاصد کی تکمیل کیلئے آرا ہے۔ قدر نے جابا کہ اسے ایک
ایسے ماحول میں بھیجا کہ ہر دیکھنے والا دونوں مقاصد کا اعجاز کرے۔ اس ایک ماحول
عبداللہ کا مہلب اختیار کیا اور دوسری طرف جناب آمنہ کا بطن اظہر مہلب عبداللہ اور اسے
رہا ہے کہ اگر انوالا عبیدت کا علیہ بر بیکر رہا ہے اور آمنہ کے بطن اخلاص کا خاصہ کہ انوالا
اس عالم کا قدر دار بیکر رہا ہے۔ اب اگر صحیح زندگی گزارنا ہے تو اس کی عبیدت کا مہلب بھی لیا
اور امن و امان کا بھی عبیدت جو پڑوے تو خدا سے مایوس ہو جائے گا اور امن و امان
کا لحاظ نہ کرے تو سماج میں زندہ نہ ہو سکے گا۔ زندہ رہنا ہے تو عبداللہ کے لال
کا کلمہ پڑھنا اور سکون و اطمینان سے زندگی گزارنا ہے تو آمنہ کی گود کے پالنے کی اخلاص
محبت میں پناہ لینا۔ مسلمات،

مرل غلام اس دنیا میں آئے اور یہ اعلان کرتے ہوئے آئے کہ جب نہ امن و
نہ خدا سے بھر جاتا ہے۔ جب انسانی قدریں پا مال ہونے لگتی ہیں۔ جب لامذہبیت اور
الہاد کا دور دورہ ہو جاتا ہے جب ظلم و جور و غلام سے حکما تک عالم ہو جاتے ہیں تو رب کریم
اپنی رحمت کا ملہ ایک محمد کو بھیجتا ہے اور اس کے ذریعہ کا ثواب ظلم کو منقلب کر دیتا ہے اور یہ
اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے دو ظلم میں پہلے محمد کو بھیجا تھا اس طرح آخری دو ظلم و جور میں آخری
محمد کو پڑوے غیب سے باہر لائے گا۔ مسلمات۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

اسم مبارک	:	فاطمہ
لقب	:	زہرا، بتول، صدیقہ وغیرہ
کنیت	:	ام المومنین، ام ایہا
والد ماجد	:	حضرت محمد مصطفیٰ
والدہ ماجدہ	:	جناب خدیجہ
ولادت	:	۲۰ جمادی الثانیہ ۶ شہرہ بیث، مکہ معظمہ
اولاد	:	امام حسن، امام حسین، جناب زینب، جناب اکرم، جناب عثمان
شہادت	:	۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۱ شہرہ یا ۳ جمادی الثانیہ ۱۱
عمر مبارک	:	۱۸ سال
قبر مطہر	:	بین قبر و قبر رسول، یا حجت البقیع

مدیرہ منورد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الاولين
والاخرين خاتم النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد
آلہ الطيبين الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين
اما بعد فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم بسم الله الرحمن الرحيم
اِنَّ عَلِيًّا لَّلهُدَىٰ ذِيْ النُّوْرِ لَّا اُخْرٰى ذَا لَٰكُنَّ

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"
آیت کریمہ کا اندازہ بتا رہا ہے کہ مالک کائنات نے ہر دور میں
ہدایت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور کبھی بندوں کو یہ اختیار
نہیں دیا کہ وہ اپنے ہادی اور راہنما کا انتخاب خود کریں۔ ایک لاکھ چوبیس
ہزار نبیاء گذر گئے لیکن کسی ایک ہی کا تقرر قوم کے ہاتھوں میں نہیں رکھا گیا۔
اور نبی تو بڑی چیز ہے وحی نبی بھی قوم کی طرف سے مقرر نہیں ہوا۔ اور قوم کا
کیا ذکر ہے خود نبی کو بھی یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اپنا وحی خود مقرر کر لے۔
جناب موسیٰ کا واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب حکم خدا سے
فرعون کی ہدایت درپیش تھی کہ اے نبی تو عرض کرتے ہیں۔ پروردگار میں
ایکلا ہوں۔ میسر ہی زبان بھی اتنی فصیح نہیں ہے جتنی فصیح زبان اس راہ میں
درکار ہے۔ میسرے حالات تجھے معلوم ہیں۔ معبود! میسر ہی مضبوطی
کے لئے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے۔ انھیں میرے کار تبلیغ میں شریک
کر دے تاکہ ہم ایک کے بجائے دو ہو کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اور شاہد فرعون
پر اثر انداز ہو سکیں۔

موسیٰ کی دعا بارگاہِ احدیت میں قبول ہوئی۔ ہارون وزیر بنے کارِ تبلیغ میں شریک ہوئے فرعون کے دربار تک گئے۔ پیغامِ الہی پہنچایا۔ فرعون نے انکار کیا۔ ان سارے واقعات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بحث صرف اتنی ہے کہ جب جناب موسیٰ نے نام تک معین کر دیا تھا تو دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی ہارون کو اپنے ساتھ لے گئے تھوتے اور اگر دعا ہی کرنا تھی اور خدا ہی سے وزیر مانگنا تھا تو ہارون کا نام نہ لیا ہوتا۔ اس کی مصلحت ہوتی تو ہارون ہی کو مقرر کر دیتا ورنہ کسی اور کو ساتھ کر دیتا۔ یہ عجیب انداز دعا ہے کہ نام و نسب تک معین کر دیا۔ اور پھر دعا بھی کر رہے ہیں۔ جناب موسیٰ جواب دیں گے میں رہتی دنیا تک کے لئے ایک بغیر مقرر کئے دے رہا ہوں کہ مجھے الہیت کا علم ہے اور ایسا علم ہے کہ خدا نے بھی اس سے انکار نہیں کیا لیکن اس کے باوجود میں نے دعا ہی کی ہے مقرر نہیں کیا۔ اب تم ہوشیار رہنا کہ وہی وزیر کا مقرر صفِ خدا کے ہاتھ میں رہے۔ امت کے ہاتھ میں نہیں اور اتنا تو سوچنا کہ جو کام نبی نہ کر سکے اسے امت کیا کرے گی۔ — صلوات

یہ تبلیغ کے آغاز کی منزل ہے اور جناب موسیٰ اس قدر خاموش ہیں کہ ہارون کے بغیر قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں کہوں گا جناب موسیٰ! حکمِ خدا ہے تو آگے بڑھئے۔ جب ہم کامیاب نہ ہو گی۔ اور مخالفوں کا طوفان اٹھے گا تو کسی کو ساتھ لے لے لے گا۔ ابھی تو پہلی ہی منزل ہے۔ ابھی سے کیا پریشانی ہے۔ کچھ دن تو کام کیجئے ورنہ دنیا کیا کہے گا کہ بغیر وہی وزیر کے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اس طرح آپ کامیاب ہو گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ موسیٰ کا کوئی کمال نہیں تھا۔ وہ تو ہارون تھے جنہوں نے مقصد کو کامیاب نہ کر دیا ورنہ ان کی زبان میں نہ فصاحت تھی اور نہ ان کی تبلیغ میں دم۔

جناب موسیٰ! آواز دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ برداشت ہے۔ جس کا جو دل چاہے کہہ لے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ دنیا یہ سمجھے کہ موسیٰ بیباک بغیر وہی وزیر کی مدد کے بغیر راہِ تبلیغ میں قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ اب جسے ہوش ہو گا وہ خود سمجھے گا کہ وزارت کا کام تبلیغ کے خاتمہ پر نہیں ہوتا۔ تبلیغ کے آغاز میں ہوتا ہے اور امت محمدیہ کو تو اتنا اور بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بغیر آخر نے خود اپنے کو بھی موسیٰ ہی سے تشبیہ دی ہے۔ گویا بغیر معلن کرنا چاہتے ہیں کہ نہ کل موسیٰ نے وزیر کے بغیر کارِ تبلیغ شروع کیا تھا اور نہ آج میں اپنے ہارون کے بغیر تبلیغ کا کام شروع کروں گا۔ اور یاد رکھو غدیر خم تھا وہ بے بیباک بغیر کے لئے نہیں۔ پیغمبر نے تو دعوتِ ذوالعشرہ ہی میں موسیٰ کی تاریخِ دہرا دی تھی کہ جب تک مددگار نہ مل جائے گا۔ کارِ تبلیغ شروع نہ کروں گا۔ اور قدرت کا بھی اشارہ تھا کہ میرے پیغمبر! تم ۴۹ سال خاموش بیٹھے رہو یہ گوارا ہے۔ لیکن بغیر ناصر مددگار کے کام شروع نہ کرو یہ گوارا نہیں ہے۔ اب یہ جا کر قدرت سے پوچھا جائے کہ پروردگار کیا قوم میں کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو پیغمبر کا مددگار اور دین کا دوزار بن سکتا۔ آخر کچھ پیغمبر کے ہمسایہ بھی تو رہے ہوں گے۔ انھیں کے اعتماد پر اعلان کر دیا ہوتا۔ آواز آئے گی۔ مجھے سن دو سال درکار نہیں ہے، علم و کمال درکار ہے۔ جب تک وہ نہ آئے گا جو پیغمبر کے علم کا دروازہ اور کمال کا وارث ہو گا۔ رسالت کا اعلان نہ ہو گا۔ رسالت و توحید کا اعلان رک سکتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ امت کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ جو اسلام اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھے گا اس کا توحید و رسالت سے کیا رشتہ ہو گا، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ قدرت ۴۹ سال تک پیغمبر کو مدد کے رہی کہ جب تک "علی ولی اللہ" کا اہتمام نہ ہو جائے گا۔ لا الہ الا اللہ

اور محمد رسول اللہؐ کا اعلان بھی نہ ہوگا۔ اب یہ امت کو اختیار ہے کہ خدائی دین پر قائم رہے یا اس سے الگ ہو جائے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی قدرت کا ایک انتظام تھا کہ جس طرح آغاز میں رسالت رکی رہی کہ جب تک ولایت کا اعلان نہ ہوگا رسالت کا اعلان بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح انجام میں قیامت بھی رکی ہوئی ہے کہ جب تک پرچم اسلام پر "علیٰ ولی اللہ" نقش نہ ہو جائے گا۔ قیامت نہ آئے گی۔ علیؑ کمال اسی دن کے لئے پر وہ غیب میں قائم ہے کہ وقت آجائے تو پرچم اسلام پر "علیٰ ولی اللہ" کا نقش ابھار دیا جائے۔ صلوات

پروردگار عالم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے۔ اور ہدایت کے لئے دو اہم شرطیں قرار دی ہیں۔ ایک علم اور ایک کردار۔ علم نہ ہوگا تو دین کی تبلیغ نہ ہوگی۔ اور کردار نہ ہوگا تو دین اصلی حالت میں محفوظ نہ رہ سکے گا۔ جو ذمہ دار ہوگا وہی دین کو تبدیل کر دے گا۔ دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ اور اس علم و کردار کا اثر تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ۴۰ سال کی خاموش زندگی میں دشمنوں سے صداقت و امانت کا اقرار لے لیا تھا۔ علم و کمال کی وہ منزل تھی جو عرب کے ذہن سے بالاتر تھی لیکن کردار و اعمال کو کسی حد تک وہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے مسلسل اپنے اعمال و کردار کا مظاہرہ کیا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ دین خدا کا راہبر کتنا بلند کردار اور عظیم المرتبت ہوتا ہے کتنا صادق القول تھا وہ پیغمبرؐ جسے اس عرب نے سچا مان لیا۔ جو خدائی کے سلسلے میں بھی سچے نہ تھے۔ جن کی زبان ۳۶۰ بتوں کو خدا کہتے تھے گھس گئی تھی جو زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سچائی کی قدر و قیمت نہ پہچانتے تھے۔ انہوں نے بھی مرسل اعظمؐ کو سچا مان لیا اور ایسا سچا مان لیا کہ نبیؐ انھیں ہر مردہ حیات اور ہر منسلک فکر و نظر پر جھوٹا کہتے رہے اور وہ ہر منسلک پر سچا کہتے رہے۔ حدیث ہے کہ پیغمبرؐ کو

مجنون کہا۔ ساحر کہا۔ شاعر کہا۔ کاہن کہا لیکن جھوٹا نہ کہا۔ اس لئے کہ انھیں بھی معلوم تھا کہ ان پر ہر الزام لگایا جاسکتا ہے۔ جھوٹ کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اور پیغمبر اسلامؐ بھی مطمئن تھے کہ ہر الزام وقت کے ساتھ دھل جائے گا لیکن اگر جھوٹ کا الزام لگ گیا تو اس کی صفائی دینا پڑے گی۔ یہ تو وقت فیصلہ کرے گا کہ دونوں میں مجنون کون تھا دین کا دعوت دینے والا مجنون تھا یا دعوت پر پیغمبر مارنے والے مجنون تھے۔ یہ زمانہ فیصلہ کرے گا کہ کھانا کھلانے والا جادوگر تھا یا کھانے والے جادوگر تھے۔ یہ آنے والی نسل فیصلہ کرے گی کہ آیات قرآنؐ سننے والا شاعر تھا یا سات قصیدوں پر فخر کرنے والی قوم شاعر تھی۔ یہ دیئے انصاف ملے کر نیکی کہ پروردگار کے اشارہ پر غیب کی خبریں دینے والا کاہن تھا یا آثار قدیمہ دیکھ کر مسائل کا فیصلہ کرنے والے کاہن تھے۔ لیکن یہ مسئلہ بڑا نازک تھا کہ اگر کسی نے ایک واقعہ میں بھی غلط بیانی کا الزام لگا دیا تو نہ واقعہ پلٹ کر آئے گا نہ جھوٹ اور سچ کا فیصلہ ہو سکے گا۔ ایمان لانے والے صادق کہتے رہیں گے۔ دشمن کا ذب ثابت کرتے رہیں گے۔ کتنا حسین کردار تھا پیغمبر اسلامؐ کا کہ سب کچھ ہو گیا کوئی جھوٹا نہ کہہ سکا اور آپؐ نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ یاد رکھو۔ جو خدائی نشانہ ہوتا ہے اس پر ہر الزام لگایا جاسکتا ہے لیکن اسے جھوٹا کہنے کی ہمت نہیں ہو سکتی دنیا والو! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ واقعی سچا وہ نہیں ہے جسے چاہنے والے صادق یا صدیق کہیں واقعی سچا وہ ہے جسے جان کے دشمن اور خون کے پیاسا کہیں۔ اور یہی حقیقت دور نبیؐ جاس میں پھر دہرائی گئی کہ کل دادا کو خون پیاسے کفار نے صادق دامن کہا تھا۔ اور پوتے کو جان کے دشمن مسلمان جعفر صادقؑ

کہہ رہے ہیں اور قدرت آواز دے رہی ہے میرا نمندہ ہر دور میں صادق ہوتا ہے اور ہر کام میں سچا ہوتا ہے۔ اس کا قول سچا۔ اس کا وعدہ سچا۔ اس کا عمل سچا۔ اس کا کردار سچا۔ اس کا دین سچا۔ اس کا ایمان سچا۔ اس کا خدا سچا۔ اس کا قرآن سچا اور وہ خود اتنا سچا کہ جاہلیت میں صادق کہا جائے تو وہی ذہن میں آئے۔ اور اسلام میں صادق کہا جائے تو وہی ذہن میں آئے۔ صلوات

صداقت کی تاریخ بڑی حسین تاریخ ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ نبوت میں صداقت کی سند ملی تو آخری نبی کو ملی اور تاریخ امامت میں صداقت کی سند ملی تو درمیانی امام کو ملی۔ شاید قدرت کی مصلحت یہ رہی ہو کہ آخری نبی کی صداقت کا اقرار لے لیا جائے تاکہ جب وہ گذشتہ نبوتوں کے بارے میں بیان دے تو وہ بھی صحیح ہو اور جب آئندہ وراثت کے بارے میں بیان دے تو وہ بھی صحیح ہو۔ اب وہ مسلمان کیا مسلمان ہو گا کہ نبی صادق گذشتہ کے بارے میں بیان کرے تو قبول کر لے اور آئندہ کے بارے میں کچھ کہے تو اسے ہریان کہہ دے۔ ایسے مسلمان سے تباہیت کے کفار ہی بہتر تھے۔ صلوات

امامت میں درمیانی امام کی صداقت کا اقرار لیا تاکہ آغاز بھی مستند ہو جائے اور انجام کا مستند ہو جائے۔ یا یوں کہا جائے کہ جب بنی امیہ بنی عباس کو جھوٹا کہہ رہے تھے اور بنی عباس بنی امیہ کو جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اور تاریخ حکومت میں کوئی کھنکھاتی نہ تھی تیار نہیں تھا۔ اس وقت تاریخ الہیت اتنی پاکیزہ نہ کر دار تھی کہ اس نے اور مرے بھی صداقت کی سند در ادھر بھی صداقت کا اقرار لے لیا۔ صلوات

اور خدا جانے، از بیع الاول کی تاریخ بھی کتنی حسین اور خوش قسمت تاریخ تھی کہ ہر صداقت اسی کے ہتھ میں آئی۔ نبی صادق آیا تو اسی تاریخ میں اور امام صادق آیا تو اسی تاریخ میں گویا یہ تاریخ صداقت کو اس آگئی۔ اور سترہ مہینے میں سلسلہ عام الفیل کی تاریخ دہرا دی گئی۔ کل آئندہ کی گود میں نبی صادق آیا تھا اور آج ام فروہ کی آغوش میں امام صادق آیا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ کل عبد اللہ کا لال محمد صادق تھا اور آج محمد باقر کا فرزند صادق محمد ہے۔ صلوات

جناب ام فروہ وہ صاحب علم و کردار خاتون تھیں کہ جب رجب کے موقع پر کسی شخص نے آپ کو ٹوکا کہ آپ بائیں ہاتھ سے حجر اسود کو کیوں بوسہ دے رہی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اپنا علم اپنے پاس محفوظ رکھ۔ مجھے تیرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اے کسی اور کے علم کی کیا ضرورت ہو گی جس کے لال نے اتنا علم دین رائج کیا ہو اور اتنے احکام شریعت پھیلائے ہوں کہ دین محمدی کو مذہب جعفری کا نام مل گیا ہو۔ صلوات

اس کے گھر میں صبح و شام علم کا جرجرا۔ اس کے آئین میں ہر آن شریعت کا تذکرہ۔ اور اس کی زیور میں پر بڑے بڑے امام سرسبز۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ آج جتنے بڑے بڑے امام کہے جاتے ہیں سب اسی زیور میں کے فیقر تھے اور اسی امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ کا اعلان تھا کہ اگر دو سال امام جعفر صادقؑ کی شاگردی نہ کرنا تو ہلاک ہو گیا ہوتا۔ "ارباب کرم! یہ انداز بیان بھی عجیب ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہلا ہوتا۔ اور مجھے تو یہی اعلان دیکھ سکا کہ اندازہ ہوتا ہے کہ یو تا اپنے دادا کا کیسا وارث ہے کہ کل دادا نہ ہوتا تو امت ہلاک ہو جاتی اور

آج پوتا نہ ہوتا تو امت ہلاک ہو جاتی — دادا نے جسے ہلاکت سے بچایا
اسے خلافت مل گئی اور پوتے نے جسے ہلاکت بچایا اسے امامت مل گئی۔ اور
یہ دنیا بھل انصاف ہے کہ بچانے والے کو نہ کل خلافت ملی نہ آج حکومت دی
گئی — لیکن آل محمد مطمئن رہے کہ ہم اس خلافت و حکومت کے لئے
کیا دوڑیں جو ہمارے غلاموں اور شاگردوں کو مل جایا کرتی ہے۔ اور میں تو یہ
سمجھتا ہوں کہ آل محمد کے خسر کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کے در کے فقیر کبھی
بادشاہ بن گئے کبھی امام — کوئی ایسا بھی امیر تو ہو جو اپنے فیروں کو ایسا
غنی بنا دے اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا دولت مند ہو گا تو وہ امیر
نہ ہو گا۔ بلکہ جناب امیر ہو گا۔

صلوات

یہ جناب ام فروہ حضرت قاسم کی بیٹی اور محمد بن ابی بکر کی پوتی تھیں
جن کے بارے میں امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا کہ محمد میرا فرزند ہے اگرچہ دوسرے
کے صلب سے ہے۔ اتنی عظمت و جلالت کے نصیب ہو گی کہ امام حسنؑ اور امام
حسینؑ جیسے فرزندوں کا باپ اسے اپنا فرزند قرار دے اور شاید اس فرزند
میں بھی یہی مصلحت رہی ہو کہ کل جب خاندان نبوت میں محمد کی پوتی بیاہ کر
آئے اور میرے ایک لال کی ماہ بنے تو دنیا یہ نہ سوچے کہ میرے گھرانے میں
کسی اور گھرانے کی وراثت آگئی ہے۔ بلکہ خاندان رسالت میں امامت ہی
کی وراثت رہے۔ حکومت کی وراثت نہ آنے پائے اور ہمیں سے یہ کہنے
کو جی چاہتا ہے کہ آج جو نا فہم طعنے دیتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی رگوں
میں کسی صدیق کا خون ہے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ امام صادقؑ تو وہ
مرکز صداقت ہیں جن کی رگوں میں باپ کی طرف سے بھی صداقت ہی کا
خون ہے کہ باپ صادق۔ دادا صادق۔ پردادا صادق۔ جد امجد صادق۔

مورث اعلیٰ صادق اور ماں کی طرف سے بھی ایسی صداقت کہ ماں صادقہ
نانا صادق۔ پرنانا صادق اور ایسا صادق کہ علیؑ جیسے صادق نے اسے اپنا
فرزند بنالیا کہ اس کی نسل میں میری صداقت کا خون چلے۔ کسی اور کا خون
شامل نہ ہونے پائے۔

صلوات

اور کیا کہنا جناب اسرار کا کہ انھوں نے پہلی منزل پر خون
حکومت کی تاثیر بدل کر اتنا طیب و طاہر بنا دیا کہ مولائے کائناتؑ نے
محمدؐ کو اپنا بیٹا بنالیا۔ اور محمدؐ کی نسل کو اپنی نسل قرار دے دیا۔
جناب پیامِ اعظمی نے اپنے ہی موقع کے لئے ماں کی خدمتوں کا تذکرہ
کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اپنے اولاد کی تقدیر بدل دیتی ہے

باپ کے خون کی تاثیر بدل دیتی ہے۔

صداقت صادق آل محمدؐ پر تفصیلی بحث پھر کسی موقع پر کی جائے گی اس
وقت ہدایت کے پہلے جزو پر بحث کرنا مقصود ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دین رسولؐ
کا یہ ذمہ دار علم و کمال کی کس منزل تھا۔

کس کی مجال ہے جو اس شخصیت کے علم و کمال پر روشنی ڈال سکے جس
کے علم کی روشنی ساری کائنات میں پھیل گئی ہو۔ اور جس کے مدد سے فکر و
نظر میں چار ہزار شاگردوں نے سبق حاصل کیا۔ مسجد کوفہ میں نورِ سولہ دریں
تھے جن میں صرف آپ کی حدیثیں بیان ہوتی تھیں اور آپ کے علوم کا چرچا ہوتا
تھا۔ ہر طرف آپ کی صداقت کا شہرہ۔ ہر طرف آپ کے علم کا تذکرہ۔ اس دور
کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دینائے علم میں بالکل
سناٹا تھا اور صادق آل محمدؐ کے علاوہ کسی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مختلف

مذہب کے پیرو: لاندہب۔ دہریے۔ بے دین۔ دشمن دوست سب آپ کی جو کھٹ پر جہیں سائی کرتے تھے۔ اور آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ اس مقام پر چند مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کا چرچا آج بھی ہے اور جن کا سہارا لے کر نا فہم ازاد امت اسلامیہ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے دور میں ایک شخص جس کا نام جعد بن درہم تھا اس نے مٹی پانی جیسے مواد کو جمع کر کے کچھ کیرے بنائے اور مسلمانوں کو یہ بھانا شروع کر دیا کہ میں ان جانوروں کا خالق ہوں۔ لہذا مجھے بھی خدا مان لو۔ بالکل وہی انداز جو آج کی دنیا میں پایا جاتا ہے کہ جس نے کوئی شے ایجاد کر لی وہی اپنی خدائی کا قائل ہو گیا۔ اور یہی تمنا پیدا ہو گئی کہ دنیا خدائے برحق کو چھوڑ کر اسی کو خدا مان لے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خالق حقیقی نے ان اشیاء میں یہ صلاحیت رکھی ہوئی تو آپ کی تخلیق کہاں سے آتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دھوکہ دینے والے کو حقیقت سے کیا قلعن ہے۔ دعویٰ شروع ہو گیا اور لوگ جھکنے لگے۔ ہر طرف ہنگامہ ہے کہ ایک نیا خدا پیدا ہو گیا ہے اور اس کی خدائی کا جواب نہیں دے سکتے۔ اتنا زمانہ گزر رہا ہے کہ بعد بھی مسلمانوں کا عقیدہ اس منزل پر ہے کہ نا اہل کو خدا ماننے کے لئے تیار ہیں تو جو مسلمان ایسے ایسے افراد کو خدا مان سکتے ہیں۔ وہ اگر حاکم و بادشاہ مان لیں تو کیا حرج ہے۔ صلوات

امام جعفر صادق علیہ السلام تک یہ خبر پہنچی کہ دین اسلام خطرہ میں ہے اور ابن درہم اپنے کچھ خدا منوانے پر تلا ہو رہا ہے تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ان جانوروں کا خالق ہے؟ اس نے کہا: بیشک۔

فرمایا: اچھا تو یہ بتا دے کہ ان کی تعداد؟

اس نے کہا: یہ تو نہیں معلوم۔

فرمایا: اچھا یہ بتا دے کہ ان میں نہ کتنے ہیں اور مادہ کتنے؟ عرض کی یہ بھی نہیں معلوم۔

فرمایا: اچھا جو مشرق کی طرف جا رہے ہیں انہیں مغرب کی طرف موڑ دے اور جو مغرب کی طرف جا رہے ہیں انہیں مشرق کی طرف موڑ دے۔ اس نے کہا: یہ کس کے اختیار میں ہے۔

آپ نے فرمایا پھر تو کس بات کا خالق ہے نہ علم تیرے پاس ہے نہ قدرت تیرے پاس ہے نہ اختیار تیرے ہاتھ میں ہے۔ پس خدائی ہی خدائی ہے۔ (مناقب)

ارباب کرم! آپ نے دیکھا امت اسلامیہ کس منزل پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں خدائی کے لئے بھی علم و اختیار کی ضرورت نہیں تھی۔ اور مسلمان خدا ماننے کے لئے تیار تھے۔ اب جو امت علم و قدرت کے بغیر خدا ماننے کے لئے تیار ہو جائے وہ کیا رہنما نہیں مان سکتی۔ صلوات

صادق آل محمدؑ نے فرمایا: اچھا اب بندگان کا اختیار دیکھ۔ میں اشارہ کرتا ہوں تو الگ ہو جائیں گے مادہ الگ ہو جائیں گے۔ مشرق والے مغرب میں آجائیں گے اور مغرب والے مشرق میں آجائیں گے۔

میں عرض کر دوں گا۔ مولا! آپ کے لئے یہ کون سا بڑا کام ہے جس کا بعد مغرب کے آفتاب کو مشرق کی طرف موڑ سکتا ہے وہ کیا چند مخلوقات کا رخ نہیں موڑ سکتا۔ صلوات

دنیا نے امت کا زور کہاں دیکھا۔ امت دنیا کی حکومت کی طلب نہیں ہے۔ یہ چند روزہ تماشا ہے اور بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ امت

اس اختیار کی مالک ہے جس کا سلسلہ زمین سے آسمان تک ہے اور جس کی دست شمس و قمر بحر و بر اور جنت و کوثر تک ہے۔ صلوات
دنیا انصاف کرے اگر صادق آل محمد سامعہ نہ آجاتے تو امت
کا کیا حال ہوتا اور اسلام کس ٹھکانے لگتا۔ اور اگر کچھ سمجھ میں آجائے
تو یہ سوچے کہ پروردگار نے ہدایت کا نظام اپنے ہاتھ میں کیوں رکھا ہے
اور یہ اختیار امت کو کیوں نہیں دیا۔ امت جاہل و عاجز کو راہنہ بنا سکتی ہے
لیکن علام الغیوب اسی کو راہنہ بنائے گا۔ جسے غیب تک کا علم عنایت کرے گا
اور قادر مطلق اسی کو ہادی مقرر کرے گا جسے کائنات کا اختیار دیدے گا۔

— صلوات

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی انداز سے ملتا جلتا ہے کہ ایک شخص ابو شاکر
دلیصانی حضرت کی خدمت میں آکر کہنے لگا کہ میں خدا کو خالق نہیں مانتا آپ
ثابت کیجئے۔ آپ نے فرمایا تمہارا بھی ثابت کرتا ہوں۔ ایک ایسے قلعہ کے بارے
میں سوچ جس میں ایک طرف سونا چھہ رہا ہو۔ ایک طرف پاندی بہہ رہی ہو۔ نہ
سونا پاندی پر غالب آئے نہ پاندی سونے کو نقصان پہنچائے۔ قلعہ کے
دروازے ہر طرف سے بلند ہوں ہوا تک کا گزر نہ ہو اور ایک دن دروازہ
کھلے تو اس میں سے تازہ مخلوقات برآمد ہونے لگے۔ یہ اتان مخلوقات کو
کس نے پیدا کیا ہے۔ اور ان کے لئے یہ سارا انتظام کس نے کیا ہے؟ اس نے
کہا ایسا قلعہ ہے کہاں جس کی آپ مثال دے رہے ہیں؟ آپ نے ایک بچہ کے
ہاتھ سے مرغی کا ایک انڈا لے کر پیش کر دیا۔ دیکھ اس کے اندر سونے جیسی زر کی
سہ پاندی جیسی سفید سی ہے۔ دروازے بند ہیں۔ چند دنوں کے بعد زندہ جانور
برآمد ہونگے۔ اب اگر کوئی خدا نہیں ہے تو اس بند قلعہ میں مخلوق کون پیدا کرتا ہے۔

مشکل کو خالی کر رہا ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ علی کو چھوڑنے کے بعد ابراہیم کا واسطہ
بھی نہیں رہا جاتا ہے اور خاندہ خدا کا قرب بھی بے کار ہو جاتا ہے، اور کیوں نہ ہو اہلبیت
کو چھوڑ کر بیت سے جگر ہی ہاتھ آئے گا طوان نہ لے گا، طوان کنائے تو اہلبیت کو کہیں
پہچانا پڑے گا، اور ان پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ صلوات،

دلدار کے شکاف نہ ہونے پر پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ کر واضح کر دیا کہ فرار
کرتی اگر کسی فرار کی ماں ہوتی لیکن مجھے پہچان لو! میں حیدر کرار کی ماں ہوں اور مجھے یہ
دلدار کیا مرعوب کرے گی، میرا رشتہ شجاعت کا خامن اور ہمت و استقلال کا ذرہ دار
ہے، میں ایک اسد کی بیٹی ہوں اور ایک شیر ذوالجلال کی ماں، میرے میدان سے
ہٹنے کا کیا سوال ہے۔ صلوات،

آئیں تو اس بے نیازی سے آئیں کہ نہ ہمدردوں کا خیال ہے نہ عورتوں کا
انتظار، نہ آپ و داد کی فکر ہے نہ انتظامات و دلاوت کی کشمکش، اور زبان حال سے
آواز دے رہی ہیں کہ یہ سب نکریں ہوتیں اگر میں خود سے آتی، لیکن جب کسی
کے بلانے پر آئی ہوں تو اب انتظام اسی کے ذمہ ہے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے
مجھے اس کے کوم پر اعتماد ہے کہ وہ کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا اور اگر کسی دنیا
والے کی آمد ہوتی تو میری عورتوں کو طلب کرتی لیکن جب ادھر والے کی آمد کا مسئلہ
ہے تو خدمت کے لئے بھی ادھر ہی کی عورتیں آئیں گی۔ چنانچہ روایت گواہ ہے کہ
حوا آئیں، سارہ آئیں، مریم آئیں، حورائے جنت آئیں اور فاطمہ بنت اسد کے
مشکلات میں کام آئیں اور قدرت نے اعلان کر دیا کہ اب فرق مراتب پہچان لو!
جو مریم و فاطمہ دلاوت خدمت کے لئے آئیں ان کا مرتبہ بنت اسد کا مرتبہ
نہیں ہو سکتا، اور ان کا لال فاطمہ کے لال کا ہم جگہ نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے

کرا سے دنیائے بھی محسوس کیا اور اللہ نے بھی ثابت کر دیا۔ دنیائے یوں محسوس کیا کہ مومن کے لال کو لال کا بیٹا کہا اور بنت اسد کے لال کو خدا مانا۔ اور خدا نے یوں محسوس کر لیا کہ امامت کی آخری منزل پر مریم کے لال کو مامر بنادیا اور بنت اسد کے آخری فرزند کو امام بنادیا۔ صلوات،

اور شاید قدرت کے اسی منصوبہ کی کار فرمائی تھی کہ دنیا پر نشان ہو کر خانہ کعبہ کے قریب آئی لیکن جناب ابوطالب نہیں آئے۔ ابوطالب آواز سے رہے تھے کہ فاطمہ خود سے گئی ہرنیں تو میں تلاش میں نکلتا اور علیؑ میرے ساتھ ہوتے تو انتظامات کی ذمہ داری میرے اوپر ہوتی لیکن جب خدا نے بتایا ہے اور آئے والا بھی اسی کا نامندہ ہے تو ذمہ داری کا بار بھی اسی کے سر ہے۔ طالب وجعفر عقیل کا انتظام میں نے کیا ہے اور علیؑ کا انتظام پروردگار کے ذمہ ہے اور شاید ہی دیر ہے کہ جب حالات کی پریشانی کی بنا پر ابوطالب کے فرزندوں کی کفالت کا موقع آیا اور یہ طے پایا کہ ایک ایک بچہ کو لے کر پال لیا جائے، اور ابوطالب کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے تو علیؑ بن ابی طالب کو بیخبر سے ہی لائے کہ دنیا بچپان لے کر جن کی تربیت دنیا والوں کے ذمہ تھی انہیں دنیا والے نے گئے اور جس کی پرورش مالک کائنات کے ذمہ تھی اس کی ذمہ داری رسول اسلام نے لے لی ہے۔ نعرۂ صلوات،

عزیز ابن محسن ہم اب علیؑ آئندہ بیخبر سے دوبارہ ماں کی گود میں آئے ماں نے دستور عرب کے مطابق حفاظت کی غرض سے بچہ کو کپڑے میں لپیٹنا چاہا بچہ نے کپڑے کو پارہ پارہ کر دیا، دوسرے کپڑے میں لپیٹا، اس کا بھی ہی حشر ہوا سات بارچہ استعمال کئے اور بچہ نے سب کو پارہ پارہ کر دیا، اور ایک مرتبہ

آواز سن۔ "یا اما خلیفۃ بنی ہاشم" ہا دیگراں مجھے جھوٹے دیکھے، مجھے تسلیم کرنے دیجئے۔ میں کہوں گا علیؑ مسیح پروردگار کو پارچے سے کیا تعلق، ماں حافت کو یہی سمجھ کر نے دیجئے آپؑ تسلیم فرمنا چاہتے ہیں پڑھئے۔ تسلیم کرو اس مشرے سے کیا تعلق ہے؟ امام کی معلومت، امام ہی جانتا ہے، لیکن واقعہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علیؑ منسلب صبیح میں ہاتھ کا بانڈھا پسند نہیں کرتے، جہی تو بار بار کہہ رہے ہیں مادہ گراں سے ہاتھ کنول دیجئے میں صبیح پروردگار کرنا چاہتا ہوں، بیچانا آپ نے جو حکمت دینا آخر تک نہ کچھ سکی امامت نے اسے بچپن ہی میں گھما دیا اور بتادیا کہ صبیح پروردگار میں کون سا انداز محبوب کر دگا ہے۔ صلوات،

آخر کار مادہ گراں نے بچہ کو گہوارہ میں لٹا دیا اور کسی کام سے چلی گئیں دھڑاک اٹھا آیا اد گہوارہ کی طرف بڑھتا، چاہتا تھا کہ نہ لودہ حرم پر حملہ کرے تو ایک مرتبہ بچہ نے گہوارے سے دونوں ہاتھ نکالے اور اندر سے کمر دھڑکے کر کے خاک پر ڈال دیا۔ صلوات،

دنیا انکشت بدندان تھی کہ یہ کم سنی اور پرہیزگار، یہ گہوارہ اور میر بہا دہی، لیکن علیؑ نے دامن مہربانی کو جس کی طاقت دنیا کی دین ہوتی ہے وہ عشق و مہارت کے بعد شجاعت کا مظاہرہ کرنا ہے اور جس کی طاقت خدا داد ہوتی ہے وہ ایسے ہی کرات کا اظہار کرتا ہے۔

اللہ رے کمال علیؑ۔ آغوش رحمت میں آئے تو آسانی صحیفوں کی تلافی کر دی، گہوارہ میں آئے تو اندر سے دھڑکھڑے کر دیئے اور قرآن مجید نے آواز دی کہ ہم نے طاقت کو اس لئے سرور و لشکر بنادیا تھا کہ ان کے پاس علم کی طاقت بھی تھی اور ہم کی قوت بھی، ہم مال و دولت اور جاہ و چشمہ نہیں

دیکھا کرتے۔ ہماری نمائندگی کے لئے علم و جسم کی دست درکار ہوتی ہے، علی نے آواز دی۔ دنیا والو! اگر میری نمائندگی کی شان پہچاننا ہے تو مجھے جہانی اور غیبتی میں نہ دیکھو، میرے کم رشتی کا عالم دیکھو۔ خانہ کعب سے نکل کر آغوش نبی میں آیا تو علیہ السلام کا اعلان کیا، اور گہوارہ میں قدم رکھا تو حادثہ جسم کا اظہار کر دیا۔ اب میرے علاوہ اس کائنات میں کون نمائندہ پروردگار ہو سکتا ہے؟ منسلوات۔

واقعہ تمام ہو گیا، لیکن علی کے اظہار شجاعت سے عالم عربیت میں ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا، جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے کہ اس اذہبے کا خاصہ یہ تھا کہ اسے سیار الولد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور عرب میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو لوگ اسے اذہبے کے قریب لاکر ڈال دیا کرتے تھے، اگر اس کے نسب میں کوئی عیب ہوتا تو اذہبے سے ناکار دیتا تھا اور اس طرح زندگی سے شجاعت و شرافت کا فیصلہ ہو جاتا تھا علی نے اذہبے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تو لوگ گھبرا کر یہ سبب استقام کے پاس آئے، حضور اب کیا ہو گا؟ اس بچہ نے قیامت ہی ڈھادی، اب ہمارے بچوں کا کیا حشر ہو گا اور ہم شجاعت کا فیصلہ کیسے کریں گے؟

مرسل اعظم نے فرمایا: تمہیں تو اس واقعہ پر غور ہونا چاہیے کہ اگر ہی سانپ میاں بنارہ جاتا تو اس کے مرنے کے بعد پھر کوئی میاں نہ رہ جاتا۔ یہ قدرت کا کرم تھا کہ اس نے غائی میاں کو مٹا کر ایک ایدھا اور دائمی میاں دے دیا، یاد رکھو آج سے نسب کا میاں یہ علی کی محبت ہے، اس کی محبت کو دیکھتے جانا اور شجاعت و شرافت کا فیصلہ کرتے رہنا۔ منسلوات۔

بات آخری منزل تک لا رہا ہوں، اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، علامہ عبداللہ امرتسری نے اپنی کتاب آرجح المصالح میں علی کے ناموں میں حیدر کی بھی وجہ بیان کی ہے کہ علی نے اذہبے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ وجہ صحیح ہو یا نہ ہو، اتنا ضرور ہے کہ اس نام کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ضرور وابستہ تھا کہ لوگ اس نام سے لرزتے تھے، اچانچہ جب خیبر کے میدان میں آپ نے مرحب سے کہا کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے تو اس نے گھبرا کر دایہ کا ارادہ کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ اب سر کی خیر نہیں، لیکن خدا ہٹا کرے ابلیس ملعون کا کہ یہ اپنوں کا بھی نہیں ہوتا، کہنے لگا کہ مرحب کہاں دایہس جا رہا ہے لوگ تیرے بارے میں کیا سمجھیں گے، تیری شجاعت کس قدر رسوا ہوگی۔ اس نے کہا کہ میری ماں نے وصیت کی ہے کہ حیدر نامی پہلوان سے نہ لڑنا ورنہ زندگی کی خیر نہیں، ابلیس نے کہا، مرحب! کیا ایک نام کے بہت سے انسان نہیں ہوتے؟ یہ کیا ضرور ہے کہ یہ وہی حیدر ہوں جن کے بارے میں تیری ماں نے وصیت کی ہے؟۔ شامت کا مارا ہلک کر آیا اور جہانجام ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے! لیکن عزیزان گرامی! یہ معلوم ہو گیا کہ شیطان کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ ایک نام کے بہت سے کہہ کر فضائل پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے، شاید ہی وجہ ہے نو قرآن حکیم نے مقام فضیلت میں اہلبیت کے کردار کا ذکر کیا ہے، نام نہیں لیا، کہ یہ ابلیس کے پیرواں بھی ہی نسخہ استعمال کر رہے تھے۔ پیغمبر اسلام نے بھی اسی فطرت کا اندازہ کر کے میدان غدیر میں علی کو مولا نہیں بنایا، بلکہ منبر مایا "یہ علی مولا ہے" تاکہ ایک نام کے بہت سے نہ ہو جائیں۔ منسلوات، فضائل کو اس منزل پر لانے کے بعد ایک نظر ان عزرائیل پر بھی

ڈالنا ضروری ہے جن سے فضائل اہلیت کسی صورت سے برداشت نہیں ہونے اور
ہر منزل فضیلت پر کوئی زکوٰۃ کوئی نقص نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ
جب عام فضائل میں یہ روش ہے جہاں مقابلہ کرنے کی بھی گنجائش ہے اور دوبارہ
حاصل کرنے کی بھی گنجائش ہے تو اس فضیلت کا کیا عالم ہوگا جس میں مقابلہ کا کوئی
سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ کوئی انسان دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے، نہ علیٰ کی اس
فضیلت سے مقابلہ ہو سکتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان آدمیوں کا بھی
قائل نہیں ہے کہ اس امید میں زندگی گزار لیتا کہ شاید اگلے جنم میں خاندان کعبہ
میں پیدا ہو جائے، چنانچہ چاروں طرف سے مایوس ہونے کے لب آخری راستہ
یہ نکال کر مولا کی اس فضیلت ہی سے انکار کر دیا جائے، فضیلت سے انکار کے
دور راستے نکالے گئے، ایک راستہ یہ ہے کہ خاندان خدا میں پیدا ہونا کوئی علیٰ
کا کمال نہیں ہے۔ یہ تو انسان کا بغیر اختیار عمل ہے، جس میں اس کا کوئی بس
نہیں ہے، انسان نہ پیدائش پر اختیار رکھتا ہے، نہ موت پر کب کہاں
موت آجائے کس کے بس کی بات ہے اور کہاں پیدا ہو جائے کس کے اختیار
کی بات ہے، یہ ماکہ کائنات کے اختیار کی بات ہے اور اتفاق وقت کہ
فاطمہ بنت اسد اس موقع پر خاندان کعبہ ہی تک آگئیں اور وہیں علیٰ
کی ولادت ہوگئی، ورنہ اس میں علیٰ کا کیا دخل ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اولاً تو
ناجی ذاتیات اس اتفاق کے مرضی مخالف ہیں، ان میں الہی منصوبہ کے آثار
پائے جاتے ہیں، اور قدرت کا انتظام صاف نظر آتا ہے لیکن اگر یہ مان لیا
جائے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ علیٰ خاندان کعبہ میں پیدا ہو گئے تو کیا یہ بھی
اتفاق تھا کہ فاطمہ بنت اسد خاندان کعبہ ہی تک آئیں، یہ بھی اتفاق تھا

کہ دیوار کعبہ میں دربن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ پیچھے بیٹنے کے بجائے آگے
بڑھ جاتیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ دیوار دوبارہ جڑ جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ
تین دن تک ہزار کوششوں کے باوجود قفل نہ کھل سکے، یہ بھی اتفاق تھا کہ
تین دن کے بعد دوبارہ دیوار میں دربن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ مریم و حوا
اور آسیہ و سارہ جیسی خواتین خدمت کے لئے جلی آئیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ
پیغمبر اسلام استقبال کے لئے پہنچ جائیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ بچہ آغوش
پیغمبر میں آکر آنکھیں کھول دے اور اگر یہ سب اتفاق تھا تو یہ اتفاق بھی ہزار
اختیارات سے بہتر ہے اور کیا کہنا اس بندے کی فضیلت کا جس کے سلسلے
کے اتفاقات بھی فضائل بن جائیں اور جب اتفاقات نے فضائل کے دریا
بہا دیئے ہیں تو جب اختیارات کا سلسلہ شروع ہوگا تو بات کس منزل تک
پہنچے گی؟ اور مجھے تو کہنا پڑے گا کہ علیٰ کی منزل اتنی بلند ہے کہ
اتفاق سامنے آئے تو غار کعبہ زچہ خانہ بن جائے اور اختیار سامنے آئے تو
ایک ضربت شعلین کی عبادت پر بھاری ہو جائے یصلوات،

عزیزانِ محترم! یہ انکار فضیلت کا پہلا رخ تھا، دوسرا رخ اس سے
دوبارہ دلچسپ ہے، بکہا یہ جاتا ہے کہ خاندان کعبہ میں بتوں کا ادھ تھا اور بت پرستوں
کا دستور تھا کہ جب کوئی مشکل پڑتی تھی تو خاندان کعبہ تک اپنے بتوں سے دعا مانگتے
آیا کرتے تھے، مافالہ جناب فاطمہ بنت اسد بھی دستور عرب کے مطابق
انہیں بتوں سے دعا کرنے کے لئے آئی تھیں کہ اچانک دیوار کعبہ میں در پیدا
ہو گیا اور وہ اندر چلی گئیں اور علیٰ بن ابی طالب کی ولادت ہوگئی۔ میں کہوں گا
کہ بے شک فاطمہ بنت اسد بتوں ہی سے دعا مانگنے لگی تھیں اور

انہوں نے جب کہا تھا کہ پروردگار میں تجھ پر ایمان لائی تیری کتابوں پر ایمان لائی تیرے رسولوں پر ایمان لائی تو ان کی ٹراد پروردگار سے بت ہی تھی، انہیں نے کتابیں نازل کی ہیں اور انہیں بتوں نے انبیاء کو نبی اور رسول بنایا ہے اور انہیں بتوں نے دیوار کو در بنا دیا ہے، اور انہیں بتوں نے دعاء قبول کر کے ایک بت شکن کو پیدا کر دیا جو لیکن عزیز و اتنا اور بقاد و کہ جب یہ سب کام بت کرتے ہیں تو تمہارا خدا کیا کرتا ہے؟ اور اس کا کیا معرف ہے؟ اس کے اختیارات کیا ہیں؟ اور اس کے اپنے اعمال و افعال کیا ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتوں کی نسلی ممت ہے جو اس قسم کے تصورات پر آمادہ کر رہی ہے درندہ کوئی مسلمان یہ سرفرح بھی نہیں سکتا کہ جناب فاطمہ بنت اسد بتوں سے دعاء کریں گی اور یہ سارے کرامات و کمالات بتوں سے ظہور میں آئیں گے، سچ ہے بت پرستوں کو بت ہی نظر آتے ہیں، بت شکن نہیں مصلوات،

لیکن اس مقام پر آنے کے بعد مجھے ایک فقرہ اور کہنا پڑے گا کہ اس اعتراض کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوئی اور یہ خیال مسلمانوں کے ذہن میں آیا کہاں سے کہ جناب فاطمہ بنت اسد بتوں سے دعاء کرنے کے لئے آئی تھیں، بات صرف یہ ہے کہ اگر آج خانہ کعبہ میں بت نہ ہوتے تو اس اعتراض کی گنجائش بھی نہ ہوتی، یہ انہیں بتوں کے وجود کا کرشمہ ہے کہ دعائے فاطمہ بنت اسد مشکوک بنا دی گئی، اور اس پر بتوں سے دعاء کرنے کا الزام لگا دیا گیا۔ تو اب آپ کو ہم! اتنا اور سوچئے کہ اگر کہیں یہ بت آج تک رہ جاتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہمارا ہر سجدہ مشکوک ہوتا، چار ہی ہر نماز مشکوک ہو جاتی ہمارا ہر ذبیحہ مشکوک ہو جاتا، ہمارا ہر عمل مشکوک ہو جاتا، حدیث ہے کہ ہمارا دوزخ

تک مشکوک رہ جاتا، اور دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ مسلمانوں کو اللہ سے کوئی محبت نہیں ہے یہ بتوں کا کرشمہ ہے کہ یہ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں، مسجد سے بھی کر رہے ہیں، اطاعتیں بھی کر رہے ہیں، عبادتیں بھی کر رہے ہیں، ان کا ہر عمل انہیں بتوں کے لئے ہے، خانہ خدا تو فقط ایک بہانہ ہے جس کی طرف خواہ مخواہ رخ مڑ جاتا ہے۔ بتا پئے دنیا کے اسلام میں اس الزام کا کوئی جواب تھا اور کس مسلمان میں اتنی محبت تھی کہ اپنے عمل کے اخلاص کو ثابت کر سکتا اور دنیا کو بتا سکتا کہ ہمارا عمل اللہ کے لئے ہے اس کا بتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب یہ اثبات ممکن نہیں تھا تو ماننا پڑے گا کہ اس انسان نے پورے دنیا انسانیت و عبودیت پر احسان کیا ہے، جس نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا ہے اور مسجدوں کو اللہ کے لئے بنا دیا ہے۔ پہچانا آپ نے علی کی عظمت کیا ہے۔ عدد شہد و سبب خیر گرد خدا خواہ۔ دشمن نے اپنی جانب میں بت اسد پر الزام کیا تھا لیکن ہی الزام فضا کی بنیاد بن گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ علی نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا ہوتا تو مسلمانوں کی کل عبادت اور بندگی مشکوک ہو جاتی، اور علی کا پوری دنیا نے عبادت و بندگی پر احسان ہے کہ انہوں نے سب دلوں کو خلوص بخشا عبادتوں کو اخلاص عنایت کیا اور بتوں کی طغیان جاتے ہوئے ذہنوں کو خدا کی طرف موڑ دیا، اور یہ بھی ایک بت شکنی ہے جو علی نے ولادت کے وقت اسلام دی ہے، علی منہ تبھروں کے بتوں کے بت شکن نہیں ہیں، بلکہ علی اس بت شکن کا نام ہے جس نے جھر کے بت توڑے، غرور کے بت توڑے، جھوک و خمیات کے بت توڑے اور کعبہ دل کو جملہ بتوں سے پاک کر کے عرش الاعظم بنا دیا، علی نہ ہوتے تو خانہ کعبہ بیت اللہ نہ کہا جاتا، اور علی نہ ہوتے تو قلب مومن عرش الرحمن نہ بنایا جاتا۔

عزیزانِ گرامی! بات آگئی ہے تو خانہ کلام میں ایک اور فقرہ کہہ کے آپ کی نیت کو تمام کردوں کہ دنیا علی کی اس فنیات سے کیا مقابلہ کرے گی، انبیاء اس منزل پر نہیں آئے
آچو یاد ہو گا کہ جب جنابِ مہم کے بیاں جنابِ عیسیٰ کی ولادت کا وقت آیا تھا تو بیت المقدس
میں رہنے والی مہم سے کہا گیا تھا کہ مریم باہر چلی جاؤ، یہ عبادت خانہ ہے نہ چہ خانہ نہیں ہو
اور جب علی کی ولادت کا وقت آیا تو اپنے گھر میں رہنے والی بنتِ اسد کو دیوار میں دہنا
کے بلایا، حالانکہ بیت المقدس کی جغیت عارضی تھی، وہ چند دنوں کے لئے قبلہ بنا آیا
تھا، اور خانہ کعبہ کی حیثیت دائمی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبلہ ہے حیرت کی بات
ہے کہ بیت المقدس جیسے گھر میں کلمۃ اللہ روح اللہ بلکہ بقولِ نزاری (ابن اللہ) پیدا
ہونے دیا جائے اور خانہ کعبہ میں فرزندِ ابوبکر، پیدا ہو جائے،

عزیزانِ محترم! یہ علی نہیں پیدا ہو رہے ہیں، یہ قدرتِ واضح کو بھی ہے
کہ پہچان جو شرفِ ابن اللہ، کلمۃ اللہ عیسیٰ کو نہیں ملا، وہ شرفِ فرزندِ ابوطالب کو
ہی رہا ہے، اب فیصلہ کر دو کہ ابوطالب کا فرہیں یا مومن، اور فیصلہ کرنے سے پہلے
سرتج لینا کہ اگر میری حکمت اور عدالت پر اعتراض کیا تو تمہارا بھی ایمان نہ رہ
جائے گا، عزیزو! ابوطالب اس مردِ مومن کا نام ہے جو ایمان کی پیاد دیواری
میں رہتا، ادھر عبدالمطلب، ادھر علی، ادھر فاطمہ بنتِ اسد، ادھر رسول
اکرم، عبدالمطلب کی وصیت گواہ ہے کہ ابوطالب صادقِ ایمان ہیں، فاطمہ
بنتِ اسد کی زوجیت گواہ ہے کہ ابوطالب مومن ہیں، رسول اکرم کی تربیت
گواہ ہے کہ ابوطالب حافظِ اسلام و ایمان ہیں اور علی کی ولادت گواہ ہے
کہ ابوطالب صادقِ ایمان نہیں بلکہ کل ایمان کے باپ ہیں، نعرہ صلوات،
علی کی تاریخ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ علی کی ولادت

بھی اللہ کے گھر میں ہوئی اور دنیا سے جانے ہوئے علی کی شہادت کا سلسلہ بھی
اللہ کے گھر سے شروع ہوا،
زندگی کا آغاز بھی خانہ خدا سے اور انجام بھی خانہ خدا پر۔ اور کبھی ہوئی
بات ہے کہ انسان کی سوانح عمری میں ولادت و وفات کو بڑی اہمیت حاصل
ہوتی ہے، قدرت نے علی کے آغاز و انجام کو مسجد سے مربوط کر کے واضح کر دیا کہ
علی والادہی ہو گا جس کا ربط کعبہ و مسجد سے ہو، جو طوان کعبہ سے فزا کرے
اور مسجد میں نماز پڑھنے سے کناہ کشی کرے اس کا علی سے کوئی تعلق نہیں
ہے، علی آئے تو عظمتِ کعبہ کا اعلان کرتے ہوئے آئے اور گئے تو عظمتِ مسجد
کا اعلان کرتے ہوئے صلوات،



مولائے کائنات حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

اسم مبارک	:	علیؑ، حیدرؑ، ایلیاؑ
لقب	:	مرتضیٰؑ، امیر المومنین وغیرہ
کنیت	:	ابوالحسنؑ، ابوالاعلیٰؑ
والد ماجد	:	عمران (کنیت ابوطالب)
والدہ ماجدہ	:	فاطمہ بنت اسدؑ
ولادت	:	۱۳ ربیع الثانی، عام الفیل، خانہ کعبہ، بروز جمعہ
ازواج	:	جناب سیدہؑ، ام البنین وغیرہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب عباسؑ، جناب محمد حنفیہؑ وغیرہ
شہادت	:	۲۱ رمضان المبارک یکشنبہ
عمر مبارک	:	۶۳ سال
قبر مطہر	:	نخف اشرف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء
والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین
الطاهرین ولعنة اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد
قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انا علینا للعبدی وان لنا للآخرة والاخرة
ایضا وجواب اقدس الہی ہوتا ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔
یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مالک کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام
روزِ اول سے اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور تاریخ انسانیت میں کوئی دور ایسا
نہیں گزر سکتا جس نے کوئی آدمی اور راہ ہمارے نہ مقرر کیا ہو، اور ہدایت انسانیت
کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ آغازِ تخلیق میں بشر سے پہلے ابوالبشر کو راہنما بنا کے پیدا
فرمایا خدا اس بات کا دلیل ہے کہ قدرت اس بات کو گنوارہ نہیں کر سکتی کہ دنیا میں
گمراہوں کا وجود رہے اور راہنما کا وجود نہ رہے، ہدایت حاصل کرنے والے رہیں
اور ہدایت دینے والا نہ رہے، اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب تک کائنات میں
کوئی ایک ہدایت لینے والا رہے گا، ہدایت دینے والا ضرور رہے گا چاہے پردہ
غیب ہی میں کیوں نہ رہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اس نے آغاز کائنات
میں یہ ہدایت نہ کیا تو انجام میں کیسے برداشت کرے گا بلکہ میں تو یہ بھی کہہ
سکتا ہوں کہ تخلیق کائنات میں آدم کا سب سے پہلا راہنما بن کر پیدا

ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ماہنا، راہو سے پہلے ہوتا ہے تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس طرح کل کوئی راہرو نہیں تھا لیکن ماہنا تھا اس طرح کل کوئی راہرو نہ رہ جائے گا لیکن ماہنا بہر حال قائم رہے گا۔ مسلمات،

تخلیق آدمؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ماہنا کی خلقت میں ایک خصوصی اہتمام بھی برتا جاتا ہے جیسا کہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ قدرت نے خلقت آدمؑ کیلئے خصوصییت کے ساتھ نئی فراہم کرائی اور پھر تلوں سے خمیر کیا گیا۔ اور جیسے پیکر آدرت چار کر کے اس میں اپنی روح پھونکی اور کپڑے لٹا کر سے سجود کرایا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ماہنا کی تخلیق میں ایک خصوصی اہتمام برتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کل جب قدرت نے تخلیق آدمؑ میں اتنا اہتمام برتا تھا تو پھر تخلیق نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ میں یہ اہتمام کیوں نہیں برتا گیا۔ اور اگر برتا گیا تو اس کا تذکرہ داسن قرآن میں کیوں نہیں ہے۔؟

میرا خیال ہے کہ قدرت نے ہر نامندہ کی خلقت میں کوئی نہ کوئی اہتمام ضرور برتا ہے، جیسا کہ تاریخ کے بعض واقعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے لیکن تفصیلی تذکرہ منہ خلقت آدمؑ میں اسی لئے کیا گیا ہے کہ انسان پہلی ہی منزل پر اس نعمت کو پہچان لے، اس کے بعد تو خود ہی اندازہ کر لے گا کہ جب پہلے ماہنا میں یہ خمیر مولیٰ اہتمام کیا گیا ہے تو دوسرے راہروں میں یہ اہتمام کیوں نہ رکھا جائے گا اور یہی اندازہ میں نے ہر منزل پر دیکھا ہے۔ نبوت کے آغاز میں پہلے نبی کو ماہنام سے پیدا کر دیا تاکہ نبوت کی انفرادیت کا اندازہ ہر خانے اور امت کی منزل میں پہلے امام کو بڑے اہتمام سے خلق کر دیا جائے

امت کی جلالت کا اندازہ ہو جائے۔ مسلمات،

نبی سب نبی ہیں اور امام سب امام ہیں، لیکن تاریخ نگار ہے کہ نبوت کی منزل میں آدمؑ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرایا گیا اور نہ امت کی منزل میں علیؑ کے علاوہ کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ وہ تاریخ نبوت میں آدمؑ کا امتیاز تھا اور یہ تاریخ امت میں علیؑ کا امتیاز ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح آدمؑ خلیفۃ الناس نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے اس طرح علیؑ خلیفۃ المسلمین نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے علیؑ کا درجہ عین کرنا ہے تو آدمؑ سے سلسلہ شروع کر دو علیؑ کے سلسلہ میں کوئی دوسرا بشر نہیں آ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات نے خدا جل جلالہ فرما دیا تھا کہ میں جو چہ تھا خلیفہ ہوں اور جب چاہنے والوں نے حیرت سے پوچھا مولانا! یہ کیا فرما رہے ہیں، ہم تو آپ کو خلیفہ بلا فصل اور پہلا امام مانتے ہیں تو منہ مایا، بے شک میں جو چہ تھا خلیفہ ہوں۔ عرض کی، مولانا! جو اس وضاحت فرمائیں، آپ کا مقصد کیا ہے؟ فرمایا: اللہ نے قرآن حکیم میں: **خَلْفَتُوں کا تذکرہ کیا ہے، سب سے پہلے اس نے آدمؑ کو خلیفہ بنایا، اس کے بعد داؤدؑ کی خلافت کا اعلان کیا، اس کے بعد ہارونؑ کو خلیفہ بنایا اور آخر میں مجھے خلیفہ قرار دیا، تو میں ان تینوں خلفاء الہی کا جو چہ تھا خلیفہ ہوں۔ مسلمات،**

مولائے کائنات نے اس تفصیل سے دو باتوں کو واضح کر دیا، اول تو یہ کہ میرا سلسلہ الہی خلفاء سے ہے، مسلمانوں کے خلفاء سے نہیں، مجھے ان سے نہ ملانا اور میری منزل کا تعین کرنے کے لئے ان کا سہارہ نہ لینا، یہ ظالم ہیں، میں معصوم یہ جاہل ہیں میں عالم، یہ گھنگارہ ہیں میں پاکیزہ کردار، یہ بت پرست ہیں میں بت شکن، یہ دشمن ہیں گھروں کے پیدا ہیں اور میں خانہ نادکبریا۔

یہ آغاز میں ظلمت تھے اور انہام میں مادیت اور میں آغاز میں نور کامل تھا اور انہام میں نور مستقیم، ان کی خلقت مادہ سے ہے، میری خلقت نور سے ہے، ان کی خلقت جہالت کے ساتھ ہوئی ہے میری تخلیق تلاوت قرآن کے ساتھ، ان کی خلقت مشرک عورتوں کے، جہنم میں ہوئی ہے میری خلقت حمد و ثناء جنت کے حضور میں۔ انھیں دنیا نے اپنا نائنہ بنا دیا ہے مجھے اللہ نے اپنا جانشین بنایا ہے، انھیں امت کی امداد نے صاحب اقتدار بنایا ہے مجھے الہی کرم نے جنت و جہنم کا مختار بنایا ہے، انھیں دنیا کے خزانوں نے غنی بنایا ہے مجھے الہی دولت نے امیر بنایا ہے، انھیں بندوں کے مفادات نے القاب و خطابات عطا کئے ہیں میری شان میں عرش الہی سے آیتیں اتری ہیں اور مختصر یہ ہے کہ انھوں نے تاج شاہی کو زینت سر بنایا ہے اور میں نے تاج حکومت کو ٹٹو کر دلوں میں رکھا ہے۔ صلوات،

دوسری طرف مولا نے کائنات نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قرآن مجید میں جس خلافت کا ذکر ہے وہ انبیاء کی خلافت ہے اہل دنیا کی خلافت نہیں ہے۔ اس نے یا تو آدم و داؤد و ابراہیم کی خلافت کا ذکر کیا ہے یا آیت ولایت میں میری حکومت کا تذکرہ کیا ہے۔ انبیاء و مرسلین کی جانشینی کا تذکرہ کیا ہے یا مسدات غدیر میں میری عظمت کا اعلان کیا ہے۔ پہلے خلیفہ سے دین کا آغاز کیا ہے یا آخری خلیفہ پر دین کی تکمیل کی سند دی ہے اس کے علاوہ اس کے دامن میں کسی خلافت کی گنجائش نہیں ہے، میری مخلوق کی بحث میں نہیں جانا چاہتا، میں اگر یہ تسلیم بھی کر لوں کہ مسلمان دنیا کے فضائل و مناقب میں بھی آیتیں نازل ہوئی ہیں اور قرآن حکیم نے انھیں بھی اپنا مودع قرار دیا ہے تو بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی خلافت حکومت کا کوئی تذکرہ کیا ہے، اور تذکرہ کیا، بھلا اللہ چاہنے والوں نے آج تک

دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس خلافت و امامت و حکومت و ولایت کا ذکر قرآن میں ہے وہ علی کا حصہ ہے اور جس کا تذکرہ تاریخ میں ہے وہ سلاطین دینا اور شاہان وقت کا حصہ ہے، اب امت کو اختیار ہے چاہے خلافت قرآن پر ایمان لائے یا خلافت تاریخ پر اور جب اس کا فیصلہ ہو جائے گائب میں دیکھوں گا کہ حسنا کتاب اللہ کے دعویٰ میں کتنا اثر ہے اور مجھے یہ کہنے کا حق ہو گا کہ حسنا کتاب اللہ کا دعویٰ ہم کرنے کو زیب بھی دیتا، یہ تاریخ کے پرستاروں کو حسنا کا دعویٰ کرنے کا حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔ لیکن ہم نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے کہ خود قرآن ہی نے اپنے مفسرین کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور مرسل اعظم بھی تنہا قرآن کو جھوٹ کر نہیں گئے بلکہ آپ نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میں دو گواہ قدر چیزیں جھوٹے جاتا ہوں، ایک قرآن اور ایک میری عترت اور میرے اہل بیت،

اب تو یہ واضح ہو گیا کہ تنہا قرآن پر ایمان لانے والا نہ خدا کا وفادار ہے نہ نبیؐ کا، اس کا ایمان نہ توحید پر ہے نہ رسالت پر، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ" کے نعروں کی کوئی قیمت نہیں ہے، جب تک "عَلَيْهِ وَعَلَى الْاَلْبَنَاءِ" پر ایمان نہ ہو گا، نہ لاله اللہ تمام آئے گا نہ محمد رسول اللہ صلوات،

عزیزان محترم! مجھے آج اسی سلسلہ خلافت الہیہ کی جو چٹھی اور سلسلہ امامت کبریٰ کی پہلی کڑی کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ قدرت نے اس کی ولادت میں کیا اہتمام برتا ہے۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب مولا نے کائنات کی ولادت کا وقت

قریب آیا تو جناب فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ کے قریب آئیں اور اپنے شکم اندس کو دیوار کعبہ سے لمس کر کے دعا کی، اے پروردگار! میں تجھ پر ایمان لائی، تیری کتابوں پر ایمان لائی، تیرے رسولوں پر ایمان لائی، مسعود! اس بیت کا واسطہ، اس کے سمارا براہیم کا واسطہ اور اے میرے پروردگار اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے، میری مشکل کو آسان کر دے۔ راوی کہتا ہے کہ ابھی دعاء تمام نہ ہوئی تھی کہ دیوار خانہ کعبہ ختم ہوئی اور نیا در پیدا ہوا، جناب فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ کے اندر گئیں اور مولائے کائنات کی ولادت ہوئی، تین روز خانہ کعبہ میں مقیم رہیں، دیوار اپنی اصلی حالت پر پلٹ گئی، لوگوں کو واقعہ کی خبر ہوئی تو چاروں طرف سے لوگ لوٹ پڑے۔ یہ کیا قیامت ہوئی، یہ دیکھ کر یوں کو ختم ہوئی، یہ دوبارہ کس طرح جڑ گئی، یہ فاطمہ بنت اسد دیں کیوں نہیں، اور کس طرح اندر چلی گئیں، اور چلی گئیں تو اب باہر کیوں نہیں آئیں؟

دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی، دوبارہ بلائے گئے، قفل توڑنے کی سعی ہوئی لیکن قفل کو نہیں ٹوٹا تھا، دروازہ کو نہیں کھل سکتا تھا، نہ کھلا، تین دن کے بعد از خود دیوار میں در پیدا ہوا، اور فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ سے باہر آئیں، پیغمبر اسلام استقبال کے لئے بڑھے، بچہ کوچی کی آغوش سے اپنی آغوش میں لیا، بچہ کی آنکھیں بند تھیں، جیسے ہی بچی کی آغوش میں آیا، آنکھیں کھول دیں، اور جلال رسالت پر نظر ڈالی، پیغمبر نے فرط مسرت سے اعلان کیا یا علی! تو نے اپنی نظر کے لئے مجھے مخصوص کیا اور میں نے اپنے علم کے لئے تجھے مخصوص کیا۔ صلوات،

عزیزانِ موعود! واقعہ کی تفصیلات آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں، غور کیجئے تو ہر لفظ ایک فضیلت اور ہر لفظ ایک کرامت ہے، ہر منزل ایک شرف ہے، اور ہر منزل ایک جلالت۔

زیادہ تفصیل کا محل نہیں ہے، صرف چند لفظوں کی طرف آجئے ذہنوں کو متوجہ کر دینا چاہتا ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب بنت اسد کو ولادت کی تکلیف کا سامنا ہوا تو گھر سے باہر کیوں نکلیں، ایسے موقع پر خواتین اپنے گھر میں رہا کرتی ہیں اور دوسری عورتیں دعاء کے لئے مسجد اور عبادت گاہوں کی طرف جایا کرتی ہیں لیکن یہاں فاطمہ بنت اسد نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، اور خانہ کعبہ تک چلی آئیں، اور پھر آئیں بھی تو ایسی پریشان نہیں کہ گھبرا کر اپنا مدعا بیان کر دیتیں، بلکہ پہلے اپنے ایمان کا اعلان کیا، پھر اپنے مولود کی حالت کا واسطہ دیا اور آخر میں دعا کی، دعاء سے بعد بھی دیوار کعبہ ختم ہوئی تو پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ گئیں۔۔۔ آج اگر خدا خواستہ اسی عمارت کی کوئی دیوار ٹوٹنے لگے تو آپ حضرات بھی یہاں نظر نہ آئیں گے، چہ جائیکہ ایک خاتونِ اہلِ دہ بھی ایسے سخت وقت میں جب کہ عورتیں سایہ سے بھی ڈرا کرتی ہیں اور پرچھائوں سے بھی دہشت زدہ ہو جاتی ہیں جناب فاطمہ بنت اسد پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ جاتی ہیں اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہو جاتی ہیں، اس کے بعد یہ خیال بھی نہیں ہے کہ وہاں کوئی مددگار ملے گا، کہاں سے عورتیں آئیں گی، کون اس موقع پر ساتھ دے گا، کہاں سے آب و دانہ کا انتظام ہوگا، کہاں سے آنے والے فرزند کے ضروریات فراہم ہوں گے، اور اس کے بعد قیامت یہ ہے کہ منظر کو دیکھ کر سارے شہر میں کھرام برپا ہے، تمام افرادِ مسکرت خانہ کعبہ کے قریب آگئے ہیں اور تین دن گزرنے پر بھی جناب

الباطل نہیں آئے، جنہیں آنا چاہئے تھا، اور جن کی یہ ذمہ داری تھی، آج اگر اے مرتع پر کوئی خاتون گھر سے باہر چلی جائے تو سب سے زیادہ فکر شہر ہو کر ہوگی، اور پھر اے ماحول میں جبکہ گھر کا دروازہ بند ہو اور کمک تک پہنچنا ناممکن نہ ہو، کیا الباطل کھانپنے آنے والے لال کی فکر نہیں ہے، کیا فاطمہ بنت اسد کی زحمات کا خیال نہیں ہے، کیا انہیں مکہ کے ہنگامہ کی خبر نہیں ہے، کیا ان سے لوگوں نے اس عجیب و غریب حادثہ کو نہیں بیان کیا۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوا، تو پھر سوال یہ ہے کہ الباطل کیوں نہیں آئے؟ اور قیامت یہ ہے کہ تین دن کے بعد بھی پیغمبر اسلامؐ نے الباطل نہیں آئے۔

عزیزانِ گرامی! واقعہ کے خصوصیات صاف اعلان کر رہے ہیں کہ یہ ولادت کسی عام بچہ کی ولادت نہیں ہے، اس میں قدرت نے ایک خصوصی اہتمام برتا ہے، اور اس کا اندازہ دنیا کے دوسرے افراد کی ولادت سے بالکل جدا سمجھا رہے ہیں، چھٹی تو دیوار میں در بنا کے بلایا گیا ہے، اور بچہ بھی کیسا بچہ کہ تین دن گزر گئے آنکھ ہی نہیں کھولتا، ماں فطری اعتبار سے پریشان ہے، خواتین اس کی وجہ سے کہ بچہ آنکھ نہیں کھولتا اور بچہ ہے کہ آنکھ بند کئے ہوئے ہے اور تین دن کے بعد جیسے ہی آغوشِ پیغمبرؐ میں آنا ہے خدا آ نکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ کس نے بتایا کہ کس کی آغوش سے کس کی آغوش میں آ گیا، یہ کسے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ سے باہر آ چکا ہے، یہ کیسے اندازہ ہوا کہ ماں کی آغوش نہیں ہے، رسالت کی آغوش ہے، اور یہ کس نے سمجھایا کہ خانہ کعبہ کے اندر آنکھ نہیں کھولنا چاہئے آغوشِ پیغمبرؐ میں آ کر آنکھ کھولنا چاہئے، کیا بچہ کو ماں سے زیادہ کسی سے انس ہے اور اگر ایسا ہے تو ماں بچہ کی شکایت

کیوں نہیں کرتی اور یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا جھوٹا بھیا (معاذ اللہ) ایک نقص لے کر آیا ہے کہ اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور پھر نبوت کو کیا ہو گیا ہے کہ جب بر بنائے فطرت بچہ آنکھ کھولتا ہے اور جو چہرہ ساتے ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے تو نبوت کو یہ اداس قدر پسند آ جاتی ہے کہ اتنی ہی سی بات پر سارے علم کا فیصلہ کر دیتا ہے اور نظر سے علم کا سودا ہو جاتا ہے۔

اربابِ کرم! شعراء کے یہاں نظر سے سیراب ہونا تو دیکھا تھا لیکن نظر سے کمالات کا منتقل ہونا نہیں دیکھا تھا، یہ آج دیکھ رہا ہوں کہ آئندہ لے بچہ نے ایک نظر میں سارے کمالات کا سودا کر لیا، یہ بچہ بھی عجیب بچہ ہے کہ بچپن میں چہرہ رسالت پر ایک شکاہ ٹٹاتا ہے تو علم رسالت کا سودا کر لیتا ہے اور جوانی میں بستر رسالت پر ایک غنیمت سمجھتا ہے تو مرضی بردار کا سودا کر لیتا ہے۔ صلوات،

تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ کے خصوصیات نگاہ میں آ گئے ہیں اب اس کے سوا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ خدا اور رسولؐ کا ایک جانا پہچانا منصوبہ تھا، جس کی راز دار جناب فاطمہ بنت اسد بھی تھیں اور جناب الباطل بھی، اور ہرگزوں پر اضطراب طاری نہ ہونا بھی اسی بنیاد پر تھا کہ سب کو رازِ الہی کی خبر تھی اور سب کو معلوم تھا کہ آج قدرت کا یہی اہتمام ہے اور واقعات کما حقہ انداز میں پیش آنا ہے اور اگر الگ الگ تفصیلات دریافت کرنا چاہتے ہیں تو مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جناب فاطمہ بنت اسد گھر سے نکل کر خانہ کعبہ تک اس لئے آئیں کہ آج کا مولود میرا نمائندہ نہیں ہے، پردہ دگلا کر نمائندہ ہے، دعاء سے پہلے ایمان کا اعلان اس لئے کیا کہ ناظمِ امت میرے

ایمان کا اعلان کر لے اور کل بحث ایمان میں آپ کی طرف ماں کا ایمان بھی جھگڑا ہے میں نہ پڑ جائے، اور جب میرا ایمان ثابت ہو جائے گا تو دنیا کے عقل و ہوش کو سوچنا پڑے گا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے مسلمان عورت کسی کافر مرد کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی اور اس طرح ہر قسم کے ایمان کا بھی مسلمان ہو جائے گا۔ صلوات

دعاء میں انبیاء اور کتب کا حوالہ دے کر اپنے ایمان کی دست اور اپنے صلوات کی بندی کا اعلان کیا اور معارف مرم کا حوالہ دے کر واضح کر دیا کہ خاندان کعبہ کے گرد بھی وسیلہ کے بغیر دعا قبول نہیں ہوتی، اب وہ لوگ خاندان خدائے کیا لے جائیں گے جو وسیلہ کے قائل نہیں ہیں اور خدا تک بلا وسیلہ پہنچنا چاہتے ہیں۔

مجھے تو کم ناپڑتا ہے کہ براہ راست جانے والے براہ راست ہی جائیں گے، اب کہاں جائیں گے اس کا فیصلہ روز قیامت ہوگا، اور اگر آج چاہتے ہیں تو اس حدیث کو پڑھ لیجئے جس میں مسلمان نے اپنے خدا کو بھی جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ اور یہ اعلان کر دیا ہے کہ جہنم کا بیٹ نہیں سہرے گا۔ و ما ذالک خدا بھی اپنا ایک پیر جہنم میں ڈال دے گا۔

عزیز و اختلافت کما پنا وسیلہ بناؤ تاکہ جنت تک جانے کا راستہ ملے، ورنہ براہ راست وہیں جانا پڑے گا جہاں پہلے سے ما ذالک اپنے خدا کو بھیج دیا ہے۔

معارف مرم کا واسطہ دینے کے بعد اپنے مولود و فرزند کا واسطہ دیا تاکہ دنیا و پیمان لے کر میرا لال دنیا میں آنے کے بعد ہی مشکلف نہیں ہے، عالم الہامی

قلعہ کی مثال دیکھ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ ایسا خناس قلعوں ہی میں پیدا ہوتا ہے اور ایسے عقیدے راحت و آسائش ہی میں جنم لیتے ہیں۔ صاحبان اقتدار سمجھ لیں کہ خدا کا اقتدار بند قلعوں کے اندر بھی چلتا ہے۔ اس نے انسان کو متوجہ کر دیا ہے کہ تم کہیں بھی رہو موت تمہیں تلاش کرے گی۔ چاہے بند قلعوں ہی میں کیوں نہ رہو۔ صاحبان قصر و محل سمجھ لیں کہ دنیا کی گرفت سے آزاد ہو سکتے ہیں لیکن خدائی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ صلوات

ابوالعوجا و نامی شخص کا نام سنا ہوگا۔ یہ ایک دہریہ مزاج اور بد زبان انسان تھا۔ مذہب پر اعتدال رکھنا اس کا شعار تھا اور شکوایہ انداز سے کرنا تھا کہ کوئی اسے منہ لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور اس طرح اس کی اور بن آئی تھی کہ ہر ایک سے یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کسی میں مجھ سے بحث کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ نام کا بھی ابوالعوجا تھا اور مزاج کا بھی ٹیڑھا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ نے چند سوالات کرنا ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو۔ اس نے پوچھا کہ آخر یہ حاجی لوگ کب تک مکہ کی زمین کو روزِ ندا کریں گے۔ کب تک ایک پتھر کی پوجا کرتے رہیں گے۔ کب تک ایک مکان کے گرد جانوروں کی طرح چکر لگاتے رہیں گے۔ کیا آپ کو یہ اعمال جاہلانہ نہیں معلوم ہوتے اور کیا اسلام کے پاس دوسرا مکان اور دوسرا کام نہیں ہے کہ مسلمان دوسرا کام کریں اور یہ جہالت کا کام چھوڑ دیں۔

آپ نہایت سکون سے اعتدال من سننے رہے اور جب اعتراض تھا

ہو گیا تو فرمایا: بھائی کہ ایک زمین کا نام نہیں ہے۔ اسے خدا نے اپنا سکہ قرار دیا ہے۔ خانہ کعبہ ایک گھر نہیں ہے اسے خدا نے اپنا گھر بنایا ہے۔ مسلمان کسی زمین یا گھر کی عبادت نہیں کرتے اس خدا کی عبادت کرتے ہیں جس نے اس زمین اور مکان کو عزت دی ہے۔ یاد رکھو یہ گھر خلقت دنیا سے دو ہزار سال پہلے سے پیدا ہو چکا ہے۔ اسے اللہ نے بخشش کا وسیلہ اور رحمت کا ذریعہ بنایا ہے ہم مسلمان گھر کا احترام نہیں کرتے اس نسبت کا احترام کرتے ہیں جو اس گھر کو پروردگار سے حاصل ہے۔

ابو العوجا نے سوال کو اور آگے بڑھا دیا۔ ہم اس خدا ہی کو نہیں مانتے جس کی طرف گھر کی نسبت دی گئی ہے۔ اور گھر تو کم از کم سامنے موجود ہے۔ اس خدا کا تو پتہ بھی نہیں ہے کہ کہاں ہے۔ آپ نے ایک غائب ہستی کا پتہ دے دیا اور ہم غائب پر ایمان نہیں رکھتے۔

آپ نے فرمایا تو نے عقل سے کام نہیں لیا۔ وہ نگاہ سے غائب ہے۔ عقل سے غائب نہیں ہے۔ عقل کی نگاہ میں ہر جگہ موجود ہے۔ ہر آن موجود ہے۔ رگ گردن سے زیادہ قریب ہے۔ ہر ایک کی سُننا ہے۔ ہر ایک کے عمل کو دیکھنا ہے۔ ہر ایک کے راز دل کو جانتا ہے۔ اس کے وجود کا وہی انکار کر سکتا ہے جو اپنی عقل سے انکار کر دے۔ عاقل اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ خدا کا عقیدہ عقل سے پیدا ہوتا ہے نظر سے نہیں۔

ابو العوجا نے کہا یہ سب تو صبح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے ہر جگہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ وہ زمین پر ہے تو آسمان پر کیسے ہے اور آسمان پر ہے تو زمین پر کس طرح ہے۔ ایک شے مختلف مقامات پر کس طرح رہ سکتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تو نے خدا کا صحیح تصور ہی نہیں کیا۔ خدا وہ نہیں

ہے جو کسی مکان میں محدود ہو جائے۔ یہ تو مخلوق کا تصور ہے۔ خالق کا مطلب یہی ہے کہ کسی مکان کا پابند نہ ہو اور ہر جگہ رہے۔

ابو العوجا نے کہا ٹھیک ہے خالق کسی جگہ کا پابند نہیں ہے۔ لیکن اس کا خالق ہونا ہی کیسے ثابت ہوا؟ خالق مان لیا جائے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ اصل بحث تو یہی ہے کہ اس کے خالق ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ آپ نے فرمایا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی چیز ہے۔ یہی بتا دے کہ تجھے کس نے پیدا کیا ہے۔؟

اس نے فوراً جواب دیا۔ مجھے کس نے نہیں پیدا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو کوئی چیز بغیر بنانے والے کے بھی بن سکتی ہے۔ وہ کون کا شے ہے جو بغیر بنانے والے کے وجود میں آگئی ہو؟ یہ سننا تھا کہ ابو العوجا جگر اٹکیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔ خیر اس موضوع کو چھوڑیے۔ ابھی اعتراضات بہت ہیں۔ ایک مسئلہ یہی ہے کہ یہ شہر و نشر یہ حساب و کتاب یہ قیامت و آفت کیا بلا ہے۔ جب انسان مرکز مٹی کا ڈھیر ہو گیا اور خاک میں مل گیا تو شہر و نشر کا کیا مطلب ہے؟ یہ باتیں تو بالکل عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ اتنا سوچنے کے مرنے کے بعد حساب و کتاب نہ نکلا تو نہ میرا کوئی نقصان ہے نہ تیرا۔ میں نے مذہبی زندگی گزاری۔ تو نے لامذہب زندگی گزاری۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہی نہیں ہے کہ تجھے خوشی ہو اور تجھے افسوس ہو یا تجھے افسوس ہو اور تجھے خوشی ہو لیکن اگر مرنے کے بعد شہر و نشر اور حساب و کتاب نکل آیا تو میں فائدہ میں رہوں گا۔ اور تیرا نقصان ہو جائیگا۔ ابو العوجا جگر اٹکیا اور کہنے لگا قرآن میں قیامت کے بارے میں ہے کہ

جب اہل جہنم کی ایک کھال بدل جائے گی تو ہم دوسری کھال بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ سوال یہ ہے کہ گناہ تو ایک کھال نے کیا ہے۔ یہ دوسری کھال نے کیا بجگاؤا ہے کہ اسے بھی جہنم میں جلا یا جائے گا۔

حضرت نے فرمایا تو فلسفہ عذاب ہی نہیں سمجھا۔ دوسری کھال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کہیں اور سے لاکر پٹنا دی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھال دوبارہ درست کر کے پھر جسم پر چڑھا دی جائے گی۔ جس طرح ایک اینٹ کو توڑ کر دوبارہ اینٹ بنالی جاتی ہے اور ایک مادہ کو بجگا کر دوبارہ نئی شکل دیدی جاتی ہے۔

ابو العوجا نے بات بدل دی۔ ابھی تو حوت ہی کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا جہنم کا کیا ذکر ہے۔ یہ پروردگار کا نظام موت کیا ہے۔ کوئی کسی مرض میں مرتا ہے کوئی کسی مرض میں مرتا ہے۔ کوئی بغیر مرض میں مرتا ہے۔ ہر طرف ایک نیا ہنگامہ ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ موت کے لئے ایک مرض معین ہو جاتا اور لوگ اسی مرض میں مرا کرتے۔ کم سے کم ایک نظام مقرر ہوتا اور اس قدر انفرقہ تفریق تو نہ ہوتی۔

آپ نے فرمایا بیٹیک لیکن تو نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح لوگ اس مرض کے آتے تک کس طرح موت کی طرف سے مطمئن رہتے۔ اور انہیں موت کا خیال بھی نہ آتا۔ پروردگار عالم ہی نہیں چاہتا تھا۔ کہ لوگ موت سے غافل ہو جائیں اور بندگی چھوڑ دیں۔ اس لئے موت کے اسباب اسی لئے الگ الگ رکھ دیئے ہیں کہ انسان کو ہر آن موت کا خیال رہے۔ اور کسی وقت موت سے غافل نہ ہونے پائے۔

عزیزان محترم! یہ ابو العوجا کے مختلف سوالات تھے جو اس نے مختلف مواقع پر امام جعفر صادق سے کئے ہیں، سوالات کی نوعیت دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ اس دور میں ذہن کس قدر گڑبگڑ گئے تھے۔ اور ارباب حکومت کی جہالت و بے بسی نے انسانوں

کو کس قدر تیز و تند بنا دیا تھا کہ جس کا جو چاہے اعتراض کر دے کوئی جواب دینے والا نہیں تھا۔ آج اگر خدا کی طرف کا معین کیا ہوا انسان نہ نہ ہوتا تو مذہب کا کیا حشر ہوتا اور اسلام کس ٹھکانے لگتا۔ اس کا اندازہ انہیں حالات سے کیا جاسکتا ہے اور میں تو گناہ کش کروں گا کہ ایک نظر روح سوالات پر ڈالے تو اندازہ ہوگا کہ ذہن پیچھے کہاں سے ہیں اور گمراہی کا راستہ کہاں سے نکلتا ہے ابو العوجا کے ابتدائی سوالات ہی بتاتے ہیں کہ مذہب پر اعتراض کے دھڑکنے ہیں۔ یا انسان غیب کا انکار کر دے یا نسبت کی اہمیت سے غافل ہو جائے۔ اگر ذہن میں غیب کا عقیدہ ہے اور نگاہ میں نسبت کی اہمیت ہے تو بے کعبہ پر اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ حجر اسود پر۔ نہ عبادات پر بحث ہو سکتی ہے نہ حشر و نشر پر۔ نہ جہنم پر حملہ کیا جاسکتا ہے نہ موت پر۔ یہ صرف غیب اور نسبت سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ اتنے اعتراضات پیدا ہو گئے اور صبح و شام پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ ائمہ معصومین کا بھی کردار تھا کہ انھوں نے اپنے چاہنے والوں کو ان دونوں چیزوں سے غافل نہیں ہونے دیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آج ان کے غلاموں کا عقیدہ غیبت برہمی ہے اور نسبت پر بھی۔ غیبت کے استحکام کے لئے ایک امام غائب پر ایمان رکھے ہوئے ہیں۔ اور نسبت کے استحکام کے لئے پورے سلسلہ عزاکو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جہاں ہر خے کا احترام نسبت ہی سے پیدا ہوا ہے اور پورا نظام نسبت برقرار رہے۔ یہ غیبت و نسبت سے دوسری کا نتیجہ ہے کہ قوم میں ابو العوجا جیسے لوگ پیدا ہو گئے اور یہاں انھیں دونوں عقیدوں کی برکت ہے کہ اپنی قوم میں کوئی ابو العوجا نہیں پیدا ہوا۔ آپ نے غور کیا میں نے کیا عرض کیا۔ ایسے بد عقیدہ لوگ اسی جماعت میں پیدا ہوتے ہیں جہاں غیبت اور نسبت کا عقیدہ نہیں ہوتا۔

اور جہاں غیبت کی برکت اور نسبت کی عظمت ہوتی ہے وہاں گمراہی کا وبال

ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صلوات

اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ پر اعتراض کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کے شیخہ اعمال کم کرتے ہیں اور آپ کے دشمنوں کے اعمال دوستوں کے اعمال سے زیادہ ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ شیطان ان کے عقائد کی طرف سے مایوس ہو گیا ہے اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ عقیدہ میں نہیں بہک سکتے۔ تو وہ انھیں اعمال میں بہکا رہا ہے اور دوسروں کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہے کہ عقیدہ میں بہک چکے ہیں تو سوچتا ہے کہ اب عمل میں کیا رکھا ہے۔ لگا رہنے دو۔ میرا نقصان بھی کیا ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی عمل سے فرصت مل گئی تو ممکن ہے کہ عقیدہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ صبح و شام اعمال میں لگے رہیں اور عقیدہ کی طرف آنے کا موقع ہی نہ پائیں۔

ارباب کرم! دیکھا آپ نے۔ امام نے کیا فرمایا؟ فرماتے ہیں کہ شیطان دو جماعتوں کو دو طریقوں سے گمراہ کیا ہے۔ کسی کو عمل سے گمراہ کیا ہے اور کسی کو عقیدہ سے۔ عقیدہ کی گمراہی بدتر ضرور ہے لیکن عمل کی گمراہی بھی گمراہی ہی ہے اس لئے اب دشمنانِ اہلبیتؑ کو بھی سوچنا پڑے گا اور دوستانِ اہلبیتؑ کو بھی سوچنا پڑے گا کہ شیطان کا جادو دونوں پر چل سکتا ہے اور اس کے اغوار سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ایک کو عمل میں لے لیا ہے اور دوسرے کو عقیدہ میں۔ اب واقعی بندہ خدا وہ ہے جو نہ عمل میں بہکنے پائے نہ عقیدہ میں۔ اور یہی شان تھی ان اصحابِ معصومین کہ جو عمل میں بھی قابل رشک تھے اور عقیدہ بھی قابل نقید۔ اور کیوں نہ ہوتا ایسے مرکز سے وابستہ تھے جہاں

گمراہی کا تصور بھی نہیں تھا اور ایسی ذات پر اعتماد کئے ہوئے تھے جو ادھر کی نمائندہ نہ تھی بلکہ ادھر کی نمائندہ تھی۔

اور کردار کا یہ عالم تھا کہ سجدہ میں چلے جائیں تو زمین سر بلند ہو جائے دسترخوان پر میٹھ جائیں تو نعمتیں نازل کریں۔ باغ میں مزدوری کریں اسلام کو عزت مل جائے۔ غریبوں کو کھانا تقسیم کریں تو زندگی بھر کسی کو غربت کا احساس نہ ہو۔ صبر کریں تو صبر سرفراز ہو جائے۔ شکر کریں تو شکر محکمہ ادا کرے۔ جب ہو جائیں تو مصمت ناطق کہے جائیں۔ اور بول پڑیں تو امام صادقؑ کہے جائیں۔ صلوات

ایک شخص نے امام کے دسترخوان پر لذیذ کھانے دیکھ کر اعتراض کیا کہ آپ کو قیامت کے حساب و کتاب کا خیال نہیں ہے۔ جتنا اچھا کھانا کھایا جائے گا اتنا ہی سخت حساب دینا پڑے گا۔ آپ نے فرمایا یہ تو نے کہاں سے نکال لیا ہے۔ اس نے کہا قرآن مجید میں لکھا ہے۔ "لَنَسْتَأْتِيَنَّكَ يَوْمَ الْقِيَامِ مِنَ الْغَيْمِ" تم سے قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائیگا فرمایا افسوس کہ تو نے پروردگار کو اپنا ہی جیسا بھیل سمجھ لیا ہے کہ وہ دسترخوان پر کھانا کھلا کر پھر حساب لے گا۔

کاش تو نے کرم الہی کی معرفت حاصل کی ہوتی تو تجھے معلوم ہوتا کہ کریم کھلا کر کھانے کا حساب نہیں لیتا۔ اس نے کہا پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ نعمت ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے جس کا قیامت کے دن حساب کیا جائے گا۔ اور اس حساب سے کوئی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ جب تک ہماری ولایت دیرِ عالم میں نہیں آئی تھی ہر نعمت نامکمل اور ناتمام تھی اور جب ہماری معرفت درمیان میں آگئی تو نعمتوں کی تکمیل ہو گئی۔ اور قدرت نے اعلان کر دیا کہ "الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاعْتَمَدْتُ عَلَيْكُمْ مِنْمَنْ مَنَنْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا" قیامت کے دن کھانے کا حساب نہیں دینا ہوگا مذہب کے اعلان کا حساب دینا ہوگا۔ اور جب اعلان کے بغیر

صلوات
اور اس کے بعد ہر نعمت نامکمل اور ناتمام تھی اور جب ہماری معرفت درمیان میں آگئی تو نعمتوں کی تکمیل ہو گئی۔ اور قدرت نے اعلان کر دیا کہ "الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاعْتَمَدْتُ عَلَيْكُمْ مِنْمَنْ مَنَنْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا" قیامت کے دن کھانے کا حساب نہیں دینا ہوگا مذہب کے اعلان کا حساب دینا ہوگا۔ اور جب اعلان کے بغیر

جناب امام حسن علیہ السلام

اسم مبارک :	حسنؑ
لقب :	مجتبیٰ، زکی، وغیرہ
کنیت :	ابو محمدؑ
والد ماجد :	حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ
والدہ ماجدہ :	جناب فاطمہ زہراؑ
ولادت :	۱۵ رمضان المبارک ۳؎ مدینہ منورہ
ازواج :	کنیزوں سمیت ۶۲
اولاد :	جناب قاسم، حسن، منشا، عبداللہ وغیرہ ۱۵۷۲ تک
شہادت :	۲۸ صفر ۵۰؎ مدینہ منورہ
عمر شریف :	۴۷ سال
قبر مطہر :	جنت البقیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء
والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد
والہ الطیبین الطاہرین ولدتہ اللہ علی اعدائہم اجمعین
اما بعد فقد نال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَرَاتٍ لَّنَا لَلْاٰخِرَةُ وَالْاٰوَلٰى

ارشاد جناب احدیت پر تبارے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے
اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔
تاریخ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب مالک کائنات نے
ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو اور عالم بشریت کی رہنمائی کے لئے کوئی نہ کوئی ہادی اور راہنما
نہ مین کیا ہو۔ تاریخ خود گواہ ہے کہ اس نے ضرورت و حالات کے مطابق ایک ایک دور
میں متعدد ہادی اور راہنما بھی مین کئے ہیں اور کوئی قریہ، کوئی شہر کوئی بستی ایسی
نہیں بھڑھی جہاں اپنا ہادی اور راہنما بھیجا ہو تفصیلات میں یا نہ ملیں قرآن مجید
خود گواہ ہے کہ ایک ایک وقت میں متعدد راہنما رہے ہیں اور اپنے اپنے علاقے
میں ہدایت کا فرض انجام دینے رہے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک
ہی علاقہ میں متعدد راہنما بھیجے گئے، اگر قوم ایک کی آواز کہہ رہا میں اڑا دینا چاہے
تو وہ ملتا جلتا کرنے کے لئے موجود ہے۔ جناب موسیٰ اور جناب ہارون کا واقعہ کہ
نہیں معلوم کہ پروردگار عالم نے فرعون کی ہدایت کے لئے دونوں کو ایک ساتھ بھیجا،
اور موسیٰ نے خود بھی یہ مطالبہ کیا کہ پروردگار میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا کر

بری پشت مضبوط کرے، حیرت کی بات ہے کہ موسیٰ بنی ہیں اور ہارون ان کے دھی،
بنی اپنے وجود کو ہدایت کی منزل میں ناکافی سمجھا ہے اور ایک وزیر کی ضرورت
محسوس کر رہا ہے اور پیغمبر اسلام کے زمانہ میں وہ انقلاب آیا کہ نبی کے اٹھنے ہی
کتاب کافی ہو گئی اور نبی کے وزیر کی ضرورت نہ رہی۔

کاش کوئی ہرنا جو موسیٰ سے کہتا۔ بنی خدا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں ایک
نبی کے لئے باعث توہین ہے کہ وہ منزل تبلیغ میں کسی دھی یا وزیر کی ضرورت
محسوس کرے، آپ تشریف لے جائیں، اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ بنی کہ خدا پر بھروسہ
کرنا چاہیے۔ دھی و وزیر کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جناب موسیٰ آواز دیں گے کہ
انبیاء کی مصلحتوں کو تو نہیں سمجھ سکتا، اسے ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس وقت کس چیز کی
ضرورت ہے۔ یہ تیرے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔

میں عرض کر دل لگا کر نبوت پر بھی ایسا وقت آ سکتا ہے، جب بنی
دھی کے بغیر اپنے وجود کو ناکافی سمجھے اور دھی کے وجود کو اپنے وجود کی تکمیل
قرار دے۔

یقیناً ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہوتا تو دعوت ذوالغفرہ میں مددگار کی
جستجو نہ ہوتی اور نبی اکرم اپنے اعتماد پر اعلان اسلام کر دیتے، فرق صرف یہ ہے کہ
موسیٰ کو اپنے ہارون کی ضرورت تھی اور پیغمبر اسلام کو اپنے ہارون کی ضرورت
ہے اور اس وجہ سے تو پیغمبر نے کہہ دیا تھا یا علی میری اور تمہاری ہی نسبت
ہے جو موسیٰ اور ہارون کی تھی فرق بس یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا ہارون
کو مرتبہ نبوت بھی ملا تھا اور تم نبی نہ ہو گے، باقی جملہ ہارونی صفات و کمالات تمہارے
اندر بطریق ادنیٰ پائے جاتے ہیں۔ آپ اسے شخص اور کمزوری نہ سمجھیں، ہارون کو

نبوت ضروری لیکن موسیٰ کی زندگی ہی میں دنیا سے اٹھ گئے اور پسندے ہارون موسیٰ
کو اٹھانے کا ایک دن بھی نہ آیا اور علیؑ پیغمبر اسلام کے بعد بھی زندہ رہے اور
دعائیت و وزارت کے رشتہ سے پورا کار و بار نبوت سنبھالے رہے، جب ہی تو
پیغمبر نے غدیر کے میدان میں اعلان کیا تھا کہ جس کا میں موسیٰ ہوں اس کا یہ علیؑ
موسیٰ ہے جملہات۔

موسیٰ اور ہارون کے رشتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بحث کی طرف
اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ پروردگار عالم نے اس رشتہ کو اس قدر مضبوط بنا یا کہ
برائے نام بھی فرق نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ اس موقع کو یاد کریں جب کسے کسے
وسط میں جناب ام الفضل نے یہ خواب دیکھا کہ رسول اکرم کے جسم کا ایک ٹکڑا
دن اقدس سے جدا ہو کر میری گود میں آ گیا ہے اور گھبرا کر پیغمبر کی خدمت میں
حاضر ہوئی۔ حضور! اس خواب کی تعبیر کیا ہے، مجھے تو بے حد وحشت عروس
ہمہری ہے۔ آپ نے فرمایا، ام الفضل گھبراؤ نہیں، یہ وحشت کی منزل نہیں ہے،
مرست کی منزل ہے، عنقریب میری بیٹی فاطمہ کے یہاں ایک فرزند متولد ہونے والا
ہے جو میرا پارہ جسم دیگر ہو گا اور تمہاری آغوش میں رہے گا۔ ام الفضل مرست
سے عبور انھیں اور وقت کا انتظار کرنے لگیں۔ یہ میرا مقدر کہ رسول کا پارہ
جسم دیگر میری آغوش میں رہے۔ زہراؑ کا لال مسیری گود میں پرورش
پائے۔

خدا کے فضل سے وہ وقت بھی آیا جب ۱۵ ماہ بارک کی صبح کو حدیقہ قطیف
فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے یہاں حسن مجتبیٰ کی ولادت ہوئی۔ اور ام الفضل کو
اپنے خواب کی تعبیر ملی۔ مرست کا عالم نہ پرچھنے، اُدھر زہراؑ خوش اُدھر

ام الفضل خوش، ادھر سار خوش، ادھر سرد بکائناں خوش، ادھر غمناں خوش، ادھر اند خوش، زمین سے آسمان تک خوشی کا عالم ہے۔ ملائکہ مبارکباد دینے کیلئے آ رہے ہیں جو میں دھند میں جھوم رہی ہیں، جنت سبحانی جا رہی ہے، کوثر کا پانی فرط مسرت سے موجیں مار رہا ہے، زہرا کو لاڈلا ملا، علی کو دھی ملا، نبی کو وارث ملا، قرآن کو مفسر ملا، اسلام کو محافظ ملا، حرم خدا کو پاس بان ملا، دین الہی کو جگہ بان ملا، ام الفضل کو تعبیر ملی، جنت کو سردار ملا، جبریل کو مہمدم ملا، عرش الہی کو گوشوارہ ملا، زمین کو زینت ملی، مدینہ کو رونق ملی، بیت رسالت کو جلال ملی، امت کو مصلح ملا، اہل محبت کو مصداق اجر رسالت ملا، صلوات،

اسماء بچہ کو زرد کپڑے میں لپیٹ کر بنیر اقدس کی خدمت میں لائیں حضور فرزند مبارک ہو! سرکار نے ایک نظر غور سے دیکھا اور تیروں پر تل ڈال کر بولے: اسماء یہ زرد کپڑے میں لپیٹ لیا، میں نے منع کیا تھا کہ بچہ کو زرد کپڑے میں نہ لپیٹا جائے اسماء دور گر گئیں اور سفید کپڑے میں بچہ کو لپیٹ کر سرکار دو عالم کی آغوش میں دیریا گیا جسم کو جان مل گئی، دل کو قرآن مل گیا، پھول کو خوشبو مل گئی، گلستان کو باغبان مل گیا، طور کو جلوہ مل گیا، اور نور کو نور مل گیا، صلوات،

میں نہیں جانتا کہ حضور نے رنگین کپڑے کی مخالفت کیوں کی اور بچہ کو سفید کپڑے میں لپیٹنا کیوں ضروری سمجھا، نبوت کی مصلحت نبوت ہی جانتی ہے، اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاید حضور کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہر کوئی بچوں پر دنیا کا کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا، یہ اللہ کے رنگ میں رنگ کو آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں رنگین کپڑوں کی ضرورت بھی ہوگی تو یہاں کے رنگ کام نہ آئیں گے بلکہ آسمان سے جبریل آئیں گے، کوثر سے پانی آئے گا، جنت سے رنگ آئے گا اور

عہد کے دن بچوں کے کپڑے رنگے جائیں گے۔

عزیزان محترم! اب آپ نے محسوس کیا کہ جن کے لباس پر دنیا کا رنگ چڑھ سکے ان کے کردار پر دنیا کا رنگ کیا چڑھ سکتا ہے؟، صلوات،

کتنے نامان ہیں وہ انسان جو کردار حسن پر خواہش پرستی کا الزام لگا کر طلاق و نکاح کی داستانیں سناتے ہیں اور دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ کل محمد بھی ماذا اللہ سماج کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، قدرت نے مختلف مواقع پر واضح کر دیا کہ دنیا کے رنگ سے متاثر نہ ہونا تمہارا کام ہے اور ہمارے رنگ میں کردار کو رنگ لینا آل محمد کی شان ہے، صلوات،

بچہ رسول کی آغوش میں ہے، علی نگاہ کے سامنے ہیں، ایک مرتبہ رسول نے مڑ کر دیکھا، اعلیٰ اس بچہ کا کیا نام رکھا ہے؟، عرض کی، حضور یہ کام آپ کا ہے مجھے کیا تعلق، کیا میں آپ پر بیعت کر سکتا ہوں؟

رسول اعظم نے مسرور ہو کر فرمایا:

بے شک باعلیٰ اتم محمد بر تقدیم نہیں کر سکتے اور میں خدا پر تقدیم نہیں کر سکتا، اس بچہ کا نام دی میں کرے گا۔ گفتگو ہمیں ہی تھی کہ جبریل ابن نازل ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد حدیث ہے کہ آپ میں اور علیؑ میں دی نسبت ہے جو موسیٰ اور ہارونؑ میں ہے، آپ علیؑ کے فرزند کا نام باہن کے فرزند کے نام پر رکھیں، پیغمبر اسلام نے فرمایا: ہارون کے فرزند کا نام کیا ہے؟، عرض کی، خیر، فرمایا: لیکن یہ تو عربی زبان کا نام نہیں ہے عربی کی اس کا ترجمہ ہے حسن۔

رسول اعظم نے بچہ کا نام حسن رکھ دیا اور دنیا پر منزلت ہارونی کے

ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارے نام بھی آسمان سے نازل ہوتے ہیں تو ہمارے کلمات کا کیا ذکر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جب ہم برائے نا اچھے دنیا کے فتنات نہیں ہیں تو منصب و کمالات میں کسی کے کیا محتاج ہوں گے۔ مصلوات۔

نام لے ہو گیا، بظاہر خبر کا ترجمہ حسن طے ہوا، لیکن باپ کرم! یہ سب عجیب اتفاق ہے کہ ترجمہ اہل سے زیادہ نکلا، خبر تو بارون کے فرزند کا نام رہ چکا تھا لیکن حسن تاریخ میں کسی کا نام نہیں ہوا تھا اور اسی لئے تاریخ کو اعتراض کرنا پڑا کہ حسن حسین دونوں نام خزانہ قدرت میں محفوظ تھے جنہیں پروردگار عالم نے اپنے نبی کے نواسوں کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔

لفظ حسن کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو کبھی عربوں کے ذہن میں نہ آیا ہو یا اس کا استعمال زبان عرب میں نہ ہوتا۔ ہاں، یہ لفظ استعمال ہوا اور سیکورڈل مرتبہ سماج کی نظروں سے گزرا لیکن نہ جانے کیا مصلحت پروردگار تعالیٰ کو کسی نے اپنے بچہ کا یہ نام نہیں رکھا اور سب اسے بطور صفت ہی استعمال کرتے رہے اور اس سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آل محمد کا کمال اس منزل پر ہے کہ جس لفظ کو دنیا بطور صفت استعمال کرتی ہے وہ ان کی منزل تک آتے آتے نام بن جاتا ہے، صفت حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، انسان پہلے بچہ ہوتا ہے، پھر جوانی میں یہ صفت شباب میں تبدیل ہو جاتی ہے، ضعیفی آتے آتے یہ صفت بھی رخصت ہو جاتی ہے اور اب بوڑھا کہا جاتا ہے لیکن نام وہی نام رہتا ہے جو پیدائش کے وقت رکھا گیا تھا، بلکہ مرنے کے بعد بھی وہی نام رہ جاتا ہے جس بات کی دلیل ہے کہ حسن عمل و کردار حسن کی ذات سے یوں وابستہ

ہے کہ بچے ہیں تو حسن ہیں، جوان ہیں تو حسن، ضعیف ہوں تو حسن، خاموش رہیں تو حسن، بول انہیں تو حسن، جنگ کا ارادہ کریں تو حسن، صلح کریں تو حسن، حد یہ ہے کہ زندہ رہیں تو حسن اور دنیا سے اٹھ جائیں تو حسن، مصلوات،

اس مقام پر ایک دو سرانکتہ یہ ہے کہ لفظ حسن بار بار نگاہوں کے سامنے آیا لیکن یہ انتظام قدرت تھا کہ کوئی مترجم نہ ہو سکا، گویا قدرت نے اضافہ کر دیا کہ ہم نگاہوں سے ادھیل رکھنا چاہیں تو شے سامنے آکر بھی ادھیل ہی رہتی ہے اور ذہن مترجم نہیں ہونے پاتے، اب سمجھے فلسفہ حیات آل محمد ان کی غیبت اور ان کے ظہور کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ غیبت میں بھی ظاہر رہتے ہیں اور ظہور میں بھی غائب رہتے ہیں، ان کی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ محض میں رہتے ہیں اور سوائے صاحبان ایمان کے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ نگاہوں سے ادھیل رہتے ہیں اور صاحبان ایمان دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے ایمان و یقین کی بات ہے کہ ایمان نہیں ہوتا تو پہلا محمد بھی سامنے سے نکل جاتا ہے اور کفار و مشرکین کو خبر نہیں ہوتی اور ایمان و یقین ہوتا ہے تو آخری محمد بھی پردہ غیب میں رہتا اور دنیائے ایمان مسلسل زیارت کرتی رہتی ہے۔ مصلوات،

نام کا ذکر آگیا تو نام کے بارے میں بھی ایک لفظ عرض کرنا چلوں دنیا میں نام کا کوئی اہمیت نہیں ہے، نام کردار سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، آپ کسی کا کوئی نام رکھو و شبکے یہ کوئی فرد ہی نہیں ہے کہ اس کا کردار بھی دیسا ہی ہو، بلکہ لیا اوقات تو اس کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے

نچر جا بل پیدا کرتا ہے اور نام عالم رکھا جاتا ہے، آئیوا عاجز ہوتا ہے اور نام قاذو رکھا جاتا ہے، کمالات کا دور دورہ پیش نہیں ہوتا اور نام فاضل و کامل رکھا جاتا ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ نام فقط ایک علامت ہے اس کا کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر نام کو کردار کے خدات بھی نکل جائے تو کوئی نام رکھنے والے سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ آپ نے ایسا نام کیوں رکھا آپ نے عالم بننا تھا اور یہ جابل رہ گیا، آپ نے فاضل کہا تھا اور یہ بے فضل بلکہ فضول ہو گیا۔ نام رکھنے والا بھی یہی کہے گا کہ میں نے ایک علامت معین کر دی تھی، زندگی اور سیرت و کردار کی ضمانت نہیں لی تھی اور نہ مجھے مستقبل کے بارے میں ضمانت لینے کا حق تھا، اور جب نام کا مسئلہ اتنا آسان اور توہینت کے گھرانے میں اتنا اہتمام کیوں برتا گیا... کو نہرہڑ، علی پر بیعت نہ کریں، نبی خدا پر بیعت نہ کریں اور خدا جبریل امین کے ذریعہ موسیٰ اندہ بارون کی تاریخ دہرا کر ایک نام تجویز کرے، اتنے مولیٰ سے کام کے لئے اتنے بڑے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کون سا کام ہے جو عمل نہیں انجام دے سکتے۔ وہ کون سا کام ہے جو نبی کے بس کا نہیں ہے کہ خدا بھی اس میں شامل ہو جائے تو مسئلہ حل ہو۔

عزیزانہ محترم! میں نہیں جانتا کہ مصلحت کیا ہے؟ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ نام بندے رکھتے ہیں تو مستقبل کی ضمانت نہیں ہوتی، وہ مستقبل کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور مستقبل ان کے اختیار میں نہیں ہوتا اور نام خدا رکھتا ہے تو مستقبل کی ضمانت بھی ہوتا اور کردار کی علامت بھی اور یہاں وجہ ہے کہ نبی کا نام محمد بھی اسی نے رکھا۔ علی کا

نبی بھی اسی نے رکھا، خنزادوں کا نام حسن حسین بھی اسی نے رکھا، زہرا کا نام فاطمہ بھی اسی نے رکھا اور نام رکھ کر فاضل کر دیا جو جسے میں محمد کہہ دوں وہ ہر حال میں قابلِ تعریف ہے۔ جسے میں علی کہہ دوں وہ ہر حال میں بلند ہے۔ جسے میں فاطمہ کہہ دوں وہ محشر تک عذاب الہی سے بچانے والی ہے جسے میں حسن حسین کہہ دوں اس کے کردار میں حسن کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ مصلوات، یہ ضرور ہے کہ مستقبل کے حالات کاظم نوربئی اور امام کو بھی ہوتا ہے تو اس میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ جب اس نے علم دے دیا تو اس کی روشنی میں جو نام چاہیں معین کر دیں۔ لیکن اربابِ کرم! اولاً تو یہ مسئلہ نبی ہی کے نام سے شروع ہوتا ہے اور جب آغاز کار پر دروگاہ سے ہوا ہے تو گویا گھرانے میں ایک سیرت بن گئی کہ اب جو باری اور راہنما آئے گا اس کا نام بھی خدا ہی تجویز کرے گا۔ تاکہ وہ گھرا رہا ہو اور وہی کا نام بھی رہے۔ مصلوات، دوسری بات یہ ہے کہ نبی اور امام کے علم میں تو شک بھی کیا جاسکتا ہے اور یہ خطہ بھی ہے کہ مستقبل میں ایک قوم پیدا ہو جائے جو نبی اور امام کے علم غیب میں شک کرنا شروع کر دے پیغمبر نے جاہا کہ یہ نام میں معین نہ کروں کہ علم غیب میں شک کرنے والے فقط علامات سمجھ لیں بلکہ اسے خدائے معین کرے کہ ہر مسلمان اسے کردار کی ضمانت سمجھے اور خود نہ سمجھے وہ علم خدا کا دشمن ہو کہ اسلام ہی سے خارج ہو جائے۔

ولادت کی مسرت کو سات دن گزرے تھے کہ گھر میں ایک نئی تقریب مسرت ہو گئی اور مرل اعظم نے فرزند کے عقیقہ کا اہتمام کیا، اسام میں عقیقہ فریضہ نہیں ہے لیکن مسرت رسول ضرور ہے اور شاید اسی کی مصلحت ہے کہ انصاف

کی سرت اس کی ذات تک محدود نہ رہ جائے اور اس کی سرت سے غریاء و فقراء اور
مؤمنین کو بھی فائدہ پہنچ جائے۔

عقیدہ کا مطلب سرمٹانے کا نہیں ہے۔ سرمٹانا الگ ایک کام ہے
اور عقیدہ الگ، عقیدہ سے مراد وہ جانور ہے جو بچہ کی طرف سے ذبح کیا جاتا
ہے اور جس کا گوشت غریاء و فقراء اور مؤمنین مخلصین پر تقسیم کیا جاتا ہے عقیدہ
کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ سرمٹانے کے ساتھ ہی ہو، بلکہ یہ بھی ممکن
کہ دونوں تقریبات الگ الگ ہوں۔ اور دونوں کو ایک وقت میں انجام نہ
دیا جائے۔ سرمٹانے میں بالوں کا صدقہ مستحب ہے اور عقیدہ کرنے میں گوشت
کی تقسیم یا اور جس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ اسلام تقریبات کو شخصی یا انفرادی
نہیں بنانا چاہتا، اس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ خوشی اور سرت کو گھروں
تک محدود کر دیا جائے یا پھر اثر ان دور رساء قوم کو شریک کر لیا جائے اس کا
منشاء یہ ہے کہ تمہاری سرت کا انتظام ہم نے کیا ہے تو غریب بندوں کی
خوشی کا انتظام تم کرو۔ شاید ہی معلومت عید الفطر کے موقع پر فطرو کی بھیجے
کہ ہم نے تمہیں سال بھر تک پالا ہے، کھلایا ہے، پلایا ہے۔ اب یہ کیسی نا انصافی ہو
کہ تم اکیلے اکیلے عید منالو اور غریب بندوں کا لحاظ بھی نہ کرو اب کم از کم اتنے
نوسون لو کہ تم ہمارے مقابلہ میں کمزور تھے تو تمہاری پرورش کا انتظام ہم نے
کیا، اب جو بندے تمہارے مقابلہ میں کمزور ہیں ان کی پرورش کا انتظام
تم کرو۔ یہ ہے اسلام کا نظام سرت۔ دنیا کی خوشی کا مطلب یہ ہے کہ
غریبوں کو نظر انداز کر کے سرت کا اہتمام کیا جائے اور اسلام میں سرت کی
تکمیل بن نہیں ہوتی جب تک غریبوں کو شامی نہ کر لیا جائے۔ رساء و اثر

کا سامانے کو زندہ رہنا دنیا کے قوانین کا کام ہے، اور غریبوں، بے کمسوں، یتیموں
مفسرین کی زندگی کا انتظام کر کے زندہ رہنا اسلام کا کام ہے۔ یہاں دولت خدیکہ
میش و عشرت کا ذریعہ نہیں ہے۔ غریاء و فقراء کی پرورش کا ذریعہ ہے یہاں غنی
نہیں بنائے جاتے جناب امیر بنائے جاتے ہیں۔ صلوات۔

بعض کتابوں میں اس مقام پر خنز کا بھی ذکر ملتا ہے جو قطعاً صحیح نہیں
ہے۔ قدرت کا انتظام ہے کہ وہ امام معصوم کو قتل شدہ پیدا کرتی ہے اور شاید
اس کا راز یہ بھی ہے کہ خنز ایک کثافت کے جدا کرنے کا نام ہے اور امام کا وجود
برکثافت سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کو سنت رسول
کہا جاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنت رسول کے معنی ہی کا نام نہیں
ہے، رسول کے فرمان کا بھی نام ہے، مسلمان کو یہ دیکھنے کا حق نہیں ہے کہ رسول
نے ذاتی طور پر کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے اس کے
بارے میں کیا حکم دیا اور کیا فرمان نافذ کیا اور جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا تو اب
نہ کہئے گا کہ رسول نے گریہ کیا، ماتم کیا، تزیہ کیا، بنایا، علم کیا، اٹھایا؟
اس کے لئے مسئلہ عمل رسول کا نہیں ہے، مسئلہ اجازت رسول کا ہے
کہ انھوں نے ان اعمال سے کب روکا؟ اگر روکنا ثابت ہو جائے تو حرام
ورنہ ہی عمل عین سنت و سیرت ہے۔ صلوات۔

بھر جیکہ روایت سے عزاداری کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے اور طرقت کیسے
مٹا ہے کہ نبیب اسلام نے شہادت حسین سے قبل ہی غم حسین منایا ہے اور اسے
باقاعدہ طور پر سیرت و سنت بنا دیا ہے۔ کس قدر نادان اور ظالم ہے وہ مسلمان
جو ایسے عظیم عمل کو بدعت اور حرام قرار دیتے، کاش اس مسلمان کو غیرت ہوتی اور

یہ اتنا سوچنا کہ رسول تو قبل ماقوم ثنائیں اور اسے واقعہ کے بعد بھی جواز نظر نہ آئے مصلوات

مالک کا ثنائے نے نہر کے اس لال کو امت کا ہادی اور رہنا بنا کر بھیجا تھا
اسی انتظام ہدایت کی ایک کڑی بنایا تھا، اس لئے ابتدا میں سے ایسے انتظامات
کئے جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اور ہے امت اور اس کی شان اور ہے دنیا
کی شان اور اس کی عظمت اور ہے دنیا کی عظمت اور اس کا ایک نمونہ یہ بھی
ہے کہ مالک کا ثنائے نے اس کے جسم اندھین کو بھی رسول اکرم کے جسم انہیں سے مشابہ
بنادیا، اور تاریخ کو قرار کرنا پڑا کہ رسول اکرم کے نصف بدن سے حق زیادہ مشابہ
تھے اور نصف بدن سے حسین۔ سر سے سینہ تک حق کی مشابہت تھی اور پائے
اقدم حسین سے زیادہ مشابہ تھے اور شاید اس میں بھی مالک کا ثنائے کی یہ
مصلحت رہی ہو کہ ہاتھ حق کے حصہ میں دے دیا جائے اور پیروں کی مشابہت
حسین کے حصہ میں عطا کر دی، اس لئے کہ ان دونوں فرزندوں سے دو طرح کے
کام لینے ہیں جن کے دست اقدس سے منفع نامہ کھولا ہے اور حسین کو میدان جہاد
میں استقلال اور پانچوس کا مظاہرہ کرنا ہے، اب میں امت کو سمجھا دوں کہ حق کا
ہاتھ میرا تھا ہے اور حسین کے قدم میرے قدم ہیں، خبردار حق کی مصلحت یا حسین
کی جنگ پر اعتراض نہ کرنا اور نہ یہ اعتراض میری سنت و میرت پر ہونے کا گناہ
مجھ پر اعتراض کرنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا مصلوات،

فطرت نے اس قدر اہتمام کیا تو سرکار رسالت کا بھی فریضہ تھا کہ اپنے
عمل سے ثابت کر دے کہ یہ بچہ دنیا کے عام بچوں سے الگ ہے اور اسے اللہ
نے امت کا رہنا بنا کر بھیجا ہے۔ اس کا قیاس دنیا کے عام انسانوں پر نہیں کیا

جاسکتا، اس کے ساتھ میں ایسا بناؤ کر رہا ہوں جس کا دوسرے انسانوں کو اہل
بھی نہیں سمجھا، تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے
آتی ہے اور اکثر واقعات تو دونوں بھائیوں کے درمیان مشترکہ طور پر ملتے ہیں
اور شاید اس کا راز بھی یہی رہا ہو کہ پھر سے سلسلہ امامت میں پہلا اور آخری واقعہ کہ
مالک کا ثنائے نے نہر کو دلال دیئے ہیں اور دونوں کو عہدہ امامت سے سرفراز فرمایا
ورنہ کوئی امام ایسا نہیں ہے جس کی اولاد میں ظالم ہوں اور اس کے گھر میں امامت
یوں قائم ہوئی ہو جس طرح بیت نہر میں آئی ہے اور جب مالک نے دونوں کو امام
بنایا ہے تو اسی کی ذمہ داری ہے کہ فضا میں کوئی اور میں بھی ایسی مشابہت نہ ہو
رکھے کہ انسانوں کو دھوکہ دے رہے ہوں اور لوگ فضیلت کی بحث میں نہ الجھنے پائیں
قدرت کا یہی انتظام تھا کہ جو کچھ حق کو دیا اس میں حسین کو شریک کر دیا اور جو کچھ حسین
کو دیا اس میں حق کو شریک بنادیا۔ حد یہ ہے کہ شہادت کے عوض میں نسل حسین میں
لامت رکھی تو وہاں بھی یہ اہتمام کیا کہ ایک منزل پر دونوں کی نسل کو جمع کر دیا جائے کہ
فرزند حسین کے عقد کا موقع آئے تو دختر حق ہی کا انتخاب کیا جائے کہ نسل امامت آگے
بڑھے تو کسی نہ کسی جہت سے دونوں بھائیوں کا حصہ رہے، یہ ادبیات ہے کہ جس کی
شہادت مخفی تھی اس کا سلسلہ بھی پردہ پوشش ہو کر چلا۔ مصلوات

مرل منظم کا بھی یہی انداز ہے کہ مسجد میں پشت پر جگہ دینے میں تو کبھی اس بیٹے
کو کبھی اس بیٹے کو عید کے دن کا نہ صول پر بیٹھاتے ہیں تو ایک کا نہ صول پر اس فرزند کو
اور دوسرے کا نہ صول پر اس فرزند کو، کتنا نازک موقع ہے، رسالت اپنی زلفوں کو
دو حصوں میں بانٹ کر دونوں بچوں کے حوالے کر رہی ہے اور بچے بچنے کی اداؤں کیساتھ
دو بھائیوں پر بیٹھے ہیں، سوچئے کہ اگر کہیں دونوں بچے نہیں گئے اور ایک نے ادھر

کھینچنا شروع کیا اور دوسرے نے اُدھر تو معزز کی کیا کیفیت ہوگی اور سرکارِ دو عالم کس کی خاطر رکھیں گے کس کی بات مانیں گے،

سرکارِ ایساپ نے کیا غصہ کیا: بچوں کے ہاتھ میں زلفوں کا اختیار دے کر اپنے کو بریشانی میں ڈال دیا، پیپلر سلیم فرمائیں گے، نادان! یہ تیرے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ میری مصلحت کی بات ہے۔

یاد رکھو! اگر میرے ذہن میں ذرا بھی شبہ رہتا کہ دونوں بچوں کے ارادوں اور مشیت میں فرق آجائے گا تو میں ان کو لکھنا چاہتا تھا کہ یہ اختیار تو میں نے دیا ہی اسلئے کہ تو تم جیسے نا اہم انسان سمجھ لیں کہ حسن و حسین کی مرضی میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے چونکہ کی مرضی ہے وہی حسین کی مرضی ہے، اب نہ کہنا کہ ایک نے صلح کی اور ایک نے جنگ کی تو دونوں کی مرضی میں فرق آگیا، ہرگز نہیں حسن کی صلح حسین کی صلح ہے اور حسین کی جنگ حسن کی جنگ ہے صلوات،

عزیزانِ محترم! وہ فطرت کا اہتمام تھا یہ رسالت کا انتظام تھا تو اب ذرا قدرت کی ناز برداری بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بچے کا زمانہ ہے، دونوں شہزادے گھر سے باہر نکلے ہیں، اور حدیقہ بنی بنار کی ٹھنڈی ہوا کھا کر سو گئے ہیں۔ سیدہ عالم پریشان ہیں بریل عظیم تک خبر پہنچ گئی ہے۔ سرکار! بچے کہیں چلے گئے ہیں، دیر ہوئی واپس نہیں آئے۔ سیدہ عالم سمجھتی پریشان ہیں۔ سرکار! بحسب قواعد تلاش میں نکلے، دیکھا کہ بچے حدیقہ بنی بنار میں آرام کر رہے ہیں۔ دونوں بچوں کو اٹھایا، شہزادہ اقبال سے آرام کرنے کی جگہ یہ نہیں ہے چلو راں پریشان ہے۔ بچوں کو اٹھایا اور قلعہ کے گھرالے کے بجائے اصحاب کی محفل میں لگا مسجد میں اصحاب کا مجمع تھا، بچوں کو سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ میں بتاؤں کہ دنیا میں نانا اور نانی کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے، اصحاب نے عرض کی ضرور۔

فرمایا: حسن و حسین کہ ان کے نانا سیدہ لانا نیا ہیں اور ان کی نانی خدیجہ انجیری فرمایا: کیا میں بتاؤں کہ ماں اور باپ کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔؟
اصحاب نے عرض کی: فرمائیں۔

فرمایا: حسن و حسین کہ ان کا باپ مٹی ہے اور ان کا طمہ زہر آ۔ فرمایا: میں بتاؤں کہ چچی اور بھوپھی کے اعتبار سے سب سے افضل کون ہے؟
عرض کی: فرمائیے۔

فرمایا: حسن و حسین کہ ان کا چچا جعفر طیار ہے اور ان کی بھوپھی ام بانو اسی طرح سلسلہ جاری رہا اور سرکار شہزادوں کے فضائل بیان کرتے رہے سمجھ نہیں آتا کہ جب سیدہ پریشان تھیں تو معزز بچوں کو مسجد میں کیوں لے آئے اور سیدہ کے گھر کیوں نہیں لے گئے، اصحاب میں کون بیقرار تھا، یہاں کس کو بریشانی تھی، اور پھر اگر بریشانی تھی بھی تو یہ کون سا موقع تھا فضائل بیان کرنے کا، ماں گھر میں مضطر ہے اور آپ مسجد میں فضائل بیان کر رہے ہیں۔

عجب نہیں سرکار! دو عالم فرمائیں، تم نے مصلحت نہیں پہچانی، میرے بچے اس لئے نہیں گم ہوئے تھے کہ انہیں راستہ نہیں معلوم تھا، یا یہ راستہ بھٹک گئے تھے، میری سیدہ اس لئے نہیں پریشان تھی کہ اسے حفاظت الہی پر اعتماد نہیں تھا اور میں اس لئے نہیں تلاش کرتا تھا کہ مجھے منزل نہیں معلوم تھی اور میں جگہ سر بے خبہ تھا۔ یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچے باغ میں جا کر سو جائیں، سیدہ اپنے اضطراب کا اظہار کرے، میں تلاش میں نکلوں، اصحاب میں مہمان پیدا ہو، دنیا کی نگاہ میں واقف کی اہمیت آجائے، سب لوگ گمشدگی کے بعد بچوں کو دیکھنے کیلئے آئیں اور میں شہزادوں کے فضائل بیان کر دوں، اس لئے کہ عام حالات کے

بیانات ذہن سے نکل جاتے ہیں اور حادثاتی حالات کے بیانات ذہنوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں، یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچوں کے کمالات کا اعلان کرنا تھا تو اس واقعہ کا اہتمام کیا اور آپ کے منہ کا اعلان کرنا ہوا تو قدیر کی دوسری کراہی کیا مصلحت عزرائیل گامی! جب سب نے اپنے اپنے اہتمام و انتظام کا اظہار کر دیا تو اب خود امام حسن کی ذمہ داری ہے کہ دنیا پر واضح کر دیں کہ میری مثال عام بچوں جیسی نہیں ہے اور مجھے قدرت نے خاص مقصد کیلئے مطلق کیا ہے، میرا کام ہدایت لینا نہیں ہے، میرا کام ہدایت دینا ہے، شاید یہی راز تھا کہ جب مسجد میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے آیات قرآنی اور احکام الہی بیان کرتے تھے تو امام حسنؑ گھر میں آکر اس سے سارا واقعہ بیان کر دیا کرتے تھے، آج نانا نے یہ فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان ہوا، آج یہ آیت نازل ہوئی اور جب امیر المومنینؑ بیت الشرف میں تشریف لاتے تو جناب سیدہؑ فرماتی تھیں یا ابالحسن! آج میرے بابا نے یہ موقع فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان کیا، آج یہ آیت نازل ہوئی امیر المومنینؑ بنظاہر حیرت سے پوچھتے: سیدہ! یہ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا، تم تو سب سے نہیں تھیں تمہارے تو اپنے بابا کو بیان کرتے نہیں دیکھا ہے۔

عزرائیل گامی! میرا شہزادہ حسنؑ مجھ سے سارے واقعات بیان کر دینا مولائے کائنات نے فرمایا، سیدہ! میں بھی اپنے لال کی گفتگو سنا جاتا ہوں۔ دیکھیں میرا فرزند کس طرح اپنے نانا کی ترجمانی کرتا ہے۔

سیدہ نے عرض کی بے شک! آپ سماعت فرمائیں۔

امیر المومنینؑ موقع ختم ہوتے ہی فوراً بیت الشرف میں تشریف لائے اور ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ امام حسنؑ گھر میں داخل ہوئے،

اور گرامی نے حسب رعایت فرمائش کی۔ بیٹا آج بابائے کیا بیان کیا۔

حسنؑ نے دہرا شہر دیکھا، لیکن آج زبان میں وہ روانی اور بیان میں وہ سلاست نہیں تھی گھبراہٹ کی۔ مادہ گرامی، آج میرے بیان میں روانی اور بہری زبان میں بہری نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا سر دار مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ امیر المومنینؑ پردہ سے باہر آگئے اور دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا، پیار کیا۔ شاباشیں کہنے لال بہت کے گھرانے کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دیکھا آپ نے! حنفیہ کہ جب جنتی نے بیان کیا وہ سب دہرا دیا، فصاحت وہ کہ وحی الہی کی ترجمانی کی اور دست نظردہ کہ لبس پردہ باپ کو دیکھ لیا کیوں نہ ہو بہر اہم کی نگاہ ہے، اس کا انداز دنیا سے جدا گانہ ہے، یہاں تو یہ عالم ہے کہ امامت پردہ میں چھپ جائے تو اسے دیکھ لیا جاتا ہے اور رسالت زیر کسا آجائے تو اس کی خوشبو عروس کرلی جاتی ہے۔ مصلحت،

بات آخری منزل تک آگئی ہے لیکن خاتمہ کلام میں چند فقرے اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امام حسنؑ معصوم تھے، انھیں پردہ دار عالم نے علم دے کر بھیجا تھا، سیدہ طاہرہ بھی معصوم تھیں، ان کے پاس بھی علم لدنی تھا، یہ معصومہ عالم اس بات کی محتاج تھیں کہ امام حسنؑ بیان کریں تو انھیں مسائل شریعت کا علم ہو، نہ امام حسنؑ اس بات کے محتاج تھے کہ ان سے بیان کریں تاکہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ان کو کس دیں۔ اور خود جناب امیر کا اشتیاق بھی مافائدا اس بنا پر نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے، یا یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حسنؑ کس حد تک صحیح بیان کرتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سیدہ طاہرہؑ فرمائش کرتی تھیں، امام حسنؑ بیان کرتے تھے اور جناب امیر کے دل میں اپنے لال کے بیان کا اشتیاق پیدا ہوا، امامت و عصمت کی مصلحت امام امیرؑ

جانے لیکن اتنا ضرور واضح ہو گیا کہ آفت کی گتہ نگار ڈاں ادا دلا دو کہ ایک درس مل گیا کہ جب بچے کسی عقل و عطف سے بڑھ کر آئیں تو ان کو پوچھنا چاہیے کہ آج کیا بیان ہوا اور بچوں کو بیان کرنا چاہیے اور پھر بزرگوں کو دیکھنا چاہیے کہ بیان کا کیا انداز ہے تاکہ بچوں کی تربیت کا انتظام ہو جائے۔ آل محمد کے بچے محتاج تعلیم و تربیت نہیں تھے لیکن ہمارے بچے بہر حال محتاج ہیں۔

اب انصاف سے بتائیے کہ آج کسی گھر میں اس سیرت پر عمل ہوتا ہے کیا؟ کچھ عورتیں معصوم عالم کی سیرت پر ہیں، کیا آج کے مرد مولائے کائنات کی سیرت پر ہیں کیا آج کے بچے امام حسن کا اتباع کر رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ دین تباہ ہوتا جا رہا ہے، دنیا غالب آتی جا رہی ہے، معلومات ختم ہوتے جا رہے ہیں اور نئیات کا شوق بڑھتا جا رہا ہے، قیامت ہے کہ آج ائمہ بچوں سے گانے تو سنتی ہیں، مجلسیں نہیں سنتیں، آج باپ بچوں کو غزوات کی تعلیم تو دیتے ہیں، دین کی تعلیم نہیں دیتے ایسا مسلم ہر تلبہ کہ ان کا مستقبل انھیں غزوات سے وابستہ ہے اور منکر و منکر قرین کے گانے ہی کے بارے میں سوال کریں گے۔

متر زبان گرامی! دنیا چند رفتہ ہے، اسے ایک دن قتا ہو جانا ہے اور ہم آج بچہ پلٹ کر مسجد کی بارگاہ میں جانا ہے، دنیا کو دھوکہ دینا آسان ہے، سب العالمین کو جوتا دینا بہت مشکل ہے، اگر آج محبت الہیہ باقی ہے اور سیرت الہیہ پر عمل کرنے کا جذبہ ہے، اگر چیخ سرست صرف ہم نہیں ہے اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت ہے تو یہ عہدہ کہ اٹھے کہ سیرت امام حسن سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کو دین و مذہب کی تعلیم دیں گے، معصوم عالم کی سیرت پر عمل کریں گے ادا اپنے بچوں سے مذہبی مسائل پوچھیں گے مولائے کائنات کے نقشہ قدم پر چلیں گے اور بچوں کے مذہبی معلومات کی نگرانی کرتے

پر ہو گئے۔

بات تمام ہو گئی، فضائل کا ایک کلمہ بیان کر کے تقریر کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ بڑی نازک منزل ہے، ہمارے کردار میں اور معصومین کے کردار میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہو گیا ہے، بہرورد واقعہ ہے کہ امام حسن اور امام حسین ایک راستہ سے گزر رہے تھے، ایک مقام پر دیکھا کہ ایک ضعیف العمر انسان بیٹھا دھوکہ رہا ہے اور اتفاق سے اس کا وضو صحیح نہیں ہے۔ دونوں شہزادے ٹھہر گئے اور یہ طے کیا کہ مسئلہ کی اصلاح کے بغیر قدم آگے بڑھانا جائز نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کبھا میں تو کس طرح؟ ہمدی طرح کہیں کتیرا وضو صحیح نہیں ہے تو جا ملے، تو اخلاق آل محمد کے خلاف ہے اور یہ کہیں کہ وضو بہت عمدہ ہے تو یہ حکم الہی کے خلاف ہے۔ یہ پائے آل محمد نے تبلیغ دین حق میں کیا کیا راستے اختیار کئے ہیں، ایک رقبہ قریب آ کے فرمایا، حضور! آپ بزرگ آدمی ہیں، ہم دونوں بھائی دھوکہ دیا چاہتے ہیں، آپ ذرا زحمت کر کے یہ بتا دیجئے کہ دونوں میں کس کا وضو صحیح ہے؟ یہ کہہ کر دونوں نے وضو شروع کیا۔ جیسے ہی دونوں شہزادوں کا وضو تمام ہوا، ضعیف العمر انسان چونک پڑا، بڑھ کر گلے سے لگا لیا شہزادو! اس اخلاق کے قربان، اس تہذیب کے تصدق، تم دونوں کا وضو صحیح ہے، میں نے ہی غلط وضو کیا تھا!

بزرگ خیر اسلام کو بچیلانے والے دیکھیں کہ آل محمد نے دین کی تبلیغ کس انداز سے کی ہے اور دنیا کو راہ راست پر کس طرح لائے ہیں، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ اخلاق دوسرے، نہ بحث و مباحثہ، نہ دھوکا نہ ڈر نہ نا، ایک ایسا حسین انداز کہ جسے تنبیہ کہیں دہ بھی قربان ہو جائے اور جسے سمجھایا جائے وہ بھی گلے لگائے۔ دنیا نے اخلاق بزرگ سنا ہے تو اخلاق حسن کا مشاہدہ بھی کئے اور یہ دیکھ لے کہ صاحب خلق عظیم کا

دارت کیسا ہوتا ہے اور اسلام کس تلوار سے پھیلتا ہے اور میں تو ایک فقرا کیسے نہیں
 بیان تمام نہیں کر سکتا کہ ہمارے کردار میں اور مصروفیت کے کردار میں اتنا فرق
 ہو گیا ہے کہ کل بچے بڑوں کی اصلاح کر دیا کرتے تھے اور آج بڑے بھی بچوں کی
 اصلاح نہیں کر پا رہے ہیں، گویا امت کو از روئے رہی ہے کہ جو سمجھا داتا ممکن ہے
 وہ ہمارا مشغلہ ہے اور یاد رکھو! ہمیں بچہ نہ سمجھا ہم نے کتنے ہی بڑے بوڑھوں کی
 اصلاح کر دی ہے۔ ہماری عظمت امت کے بچے نہ سمجھیں گے، ہماری بلندی امت کے
 بوڑھے ہی سمجھیں گے۔ میں جیغوں نے مانا سے یہ کہہ کر لینا چاہا تھا کہ بچوں کو ہمیں
 دے دیجئے ہم اپنے کاندھوں پر بٹھالیں گے تو مانا نے انکار کر کے واضح کر دیا تھا
 کہ اہل محمد دنیا کو اٹھانے کے لئے آئے ہیں، یہ اہل دنیا کے اٹھانے کے محتاج
 نہیں ہیں۔ صلوات،



جناب امام حسین علیہ السلام

اسم مبارک :	حسینؑ
لقب :	سید الشہداءؑ
کنیت :	ابو عبد اللہؑ
والدہ ماجدہ :	جناب فاطمہؑ
والد ماجد :	حضرت علیؑ
ولادت :	۳ شعبان العظمیٰ ۴ؑ
ازواج :	۱ پانچؑ
اولاد :	۱ چھؑ
شہادت :	۱۰ محرم ۶۰ؑ
عمر شریف :	۵۵ سالؑ
قبر مطہر :	کربلائے معلیٰؑ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء
والمرسلين خاتم النبيين سيدنا و مولانا ابي القاسم
محمد وآله الطيبين الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم
اجمعين۔ اما بعد فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَابْنَ لَنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے، بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور
دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے انسان کی ہدایت کی ذمہ داری
اس کے سر نہیں ڈالی اور اسے بے مہار نہیں بنایا بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی راہنمائی
کا انتظام کیا ہے اور حیات کے ہر شعبہ میں اس کے لئے قواعد و قوانین وضع کر دیئے
ہیں۔ اب یہ انسان کے اختیار کی بات ہے کہ وہ خدائے اہتمام پر اعتماد کرے یا اپنے
لئے الگ سے کوئی نظام ہدایت معین کر لے۔ الہی نظام پر اعتماد کرنا بھی کوئی معمولی
بات نہیں ہے، اس کے لئے بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، نفس کو پامال کرنا
پڑتا ہے، زندگان دنیا کو تباہ کرنا پڑتا ہے، عیش دنیا کو خیر باد کہنا پڑتا ہے اور
سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بظاہر اپنا ہو کے بھی دوسرے کا ہو جانا پڑتا ہے
نہ انسان کا کوئی اسادہ رہ جاتا ہے، نہ اختیار، نہ خواہش رہ جاتی ہے نہ پسند
نہ مرضی رہ جاتی ہے نہ مشیت، اب جو نمائندہ الہی چاہے وہی اپنی پسند ہے۔
اور جس پر اس کی نظر عنایت پڑ جائے وہی اپنا منظور نظر ہے۔

مرکز سید الشہداء نے سرزمین کربلا ہر قدم رکھنے کے بعد اسی تختہ کبریت
اشارہ کیا تھا، لوگ بندگان دنیا ہیں، دین تو فقط زبانوں پر چسپا ہوا ہے
جب تک دنیا سلامت رہتی ہے دین کا نام لیتے ہیں اور جب دنیا خطرہ میں پڑ جاتی
ہے تو دین کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ امام حسین سے بہتر اس حقیقت
کا جانتے والا کون ہو سکتا ہے، آپ کے پاس علم امامت بھی ہے اور تجربہ حیات
بھی۔ آپ نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور انہیں سمجھانا چاہا
ہے جن کی آنکھیں بند ہیں اور جو دنیا سے بکسر غافل ہو گئے ہیں، مقصد
یہ ہے کہ الہی نظام پر ایمان لانے اور نہ لانے میں وہی مشرق ہے جو
کربلا میں حسینیت اور یزیدیت میں تھا، نظام الہی کے ذمہ دار کا نام حسین بن علی
تھا اور نظام دنیا کے پرستار کا نام یزید بن معاویہ اور حقیقت اس لئے
واضح کی گئی تھی کہ دنیا کر ہلاک جنگ کو دو بادشاہوں کی جنگ نہ کہدے اور یہ
خوب سمجھ لے کہ یہ ایمان و عشاق کا موکر ہے، اسلام و کفر کی جنگ ہے عہدیت
اور یہ راہ روی کا موکر ہے، آدمیت اور ابلہیت کی لڑائی ہے۔ محمدیت
اور سفیائیت کی مٹاؤ آرائی ہے، محمدیت کے نمائندہ کا نام حسین اور سفیائیت
کے بقیتہ السلف کا نام ہے یزید۔

مرکز سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے بیان کا حوالہ دینے کا مقصد
یہ ہے کہ آج کے اس معتمد اجتماع میں اسی عظیم شخصیت کا تذکرہ کرنا ہے
اور مختصر لفظوں میں اسی ہستی کے حالات و کردار پر روشنی ڈالنا ہے، امام حسین
کے کردار کے لئے سید الشہداء کا لفظ ہی بہت کافی ہے اور میرا خیال ہے کہ روئے
زمین پر اس سے بڑا کوئی لقب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں

وہ طرح کے القاب و خطابات پائے جاتے ہیں۔ بعض الفاظ نقص، عیب، کمزوری اور
برائی کی علامت ہیں۔ جیسے شیطان، ابلیس، جاہل، فاسق، کافر، بدکار، عیاش
وغیرہ کہ ان الفاظ کے سنتے ہی ذہن برائی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ خیال
آتا ہے کہ ان الفاظ کا مصداق بچھٹا کوئی ہے ایمان اور بدکردار آدمی ہو گا اور
بعض الفاظ سے اچھائی اور خوبی کا تصور قائم ہوتا ہے جیسے مومن، مظلوم، نبی
امام، خلیفہ، رشتہ، منی، اذکار اور اس طرح کے دوسرے بے شمار الفاظ جن کے
سننے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنی قوم اور اپنی ملت کا مستم
اور با عزت آدمی ہے۔ اس کے کردار میں کوئی زکوٰۃ کی حق اور خوبی ضرور ہے
وہ اسے اس مقدس نام سے زیادہ کیا جاتا۔ لیکن ان دونوں قسم کے الفاظ کے
ساتھ ایک خصوصیت ہے کہ بعض الفاظ جماعتی اور قومی اعتبار سے فضیلت و
منقصت رکھتے ہیں اور بعض الفاظ ہر قوم اور ہر جماعت میں عیب کی
حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی یا امام مسلمانوں میں عظمت کی علامت ہے
ہندوؤں میں نہیں۔ اذکار یا رشتہ منی ہندوؤں میں بلندی کی دلیل ہے مسلمانوں
میں نہیں۔ یہی حال ابلیس و شیطان، فرعون و قارون جیسے الفاظ کا ہے کہ یہ
الفاظ ایک طبقہ کے لئے عیب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک طبقہ میں یہی حق
ہیں۔ ابلیس، اللہ والوں کی نگاہ میں عیب ہے اور توحید خالص والوں کیلئے
بہترین حق ہے کہ ایک ایسا بندہ بھی پیدا ہوا ہے جس نے غیر خدا کے سامنے سر
نہیں جھکایا اگرچہ خدا ہی نے حکم دیا تھا۔ فرعون و قارون مومنین کے پرستاروں
کی نگاہ میں عیب ہے۔ بنی اسرائیل کی نگاہ میں خدائی کی علامت تھا غیر منک
دُبا میں اچھائی کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں اور برائی کی علامتیں بھی۔ اور

آج کے دور میں تو پورا ایک ادب علامتوں پر قائم ہے۔ آج کون علامت کی
ہمیت سے انکار کر سکتا ہے۔ قابل ذکریات یہ ہے کہ علامت کی دو قسمیں ہیں
وہ علامتیں جو کسی ایک قوم، طبقہ، جماعت یا گروہ میں عظمت کا درجہ رکھتی
ہیں اور وہ علامتیں جو ہر قوم، ہر ملت، ہر طبقہ اور ہر گروہ میں عظمت کا درجہ
رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لفظ بین الاقوامی علامت کا حامل ہو گا وہ ان تمام
الفاظ سے بالاتر ہو گا جن کی علامت صرف فرد، جماعت یا قوم سے وابستہ ہوگی
اسی لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ انسانیت میں شہید کا لفظ جملہ علامتوں سے
بالاتر ہے، لفظ خدا علامت خیر ہے لیکن مسلمانوں میں، لفظ نبی دانا و خلیفہ
علامت خیر ہے لیکن اللہ والوں میں، لفظ اذکار، رشتہ، رشتہ منی، گروہ علامت
خیر ہے لیکن ایک محدود طبقہ اور جماعت میں لیکن لفظ شہید ایک
ایسی علامت ہے جسے دنیا کی ہر قوم اپنائے ہوئے ہے اسے اپنانے کے
لئے تیار ہے۔ آج دنیا کے حالات کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ
لفظ شہید اس تقدیم ہو گیا ہے کہ سیاسی میدان کے مرنے والے بھی شہید
دوں کپڑے کے سوال پر قتل ہونے والے بھی شہید، ظالموں کے ساتھی
بھی شہید، مظلوموں کے ہمراہی بھی شہید، حملہ آور بھی شہید، مجروح اور
مظلوم بھی شہید، غرض کہ جس کے سینے پر گولی لگی وہ شہید، جس کے گے پر
خبر چلا وہ شہید، جسے سولی پر چڑھایا گیا وہ شہید، جس کی زندگی کا خاتمہ
کیا گیا وہ شہید، شرط صرف یہ ہے کہ کسی مہرم و خطا پر نہ مارا گیا ہو ورنہ
مقتول ہو گا شہید نہ ہو گا۔ گھویا ساری دنیا نے اتفاق کر لیا ہے کہ شہادت
کے لئے نیک کردار ہونا ضروری ہے اور شہید وہی انسان ہو گا جو بلند مقصد پر

قربان ہو جائے، چاہے اس کا مقصد کسی ایک جماعت اور گروہ کی نظر میں بلند ہو، اور جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو مجھے کہنا پڑے گا کہ علامتی میدان میں لفظ شہید ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی عظمت سے دنیا کا کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا، شاید ہی راز رہا ہو کہ پروردگار نے اپنے جملہ نمائندوں کی شہادت مقدس کر دی اور یہ چاہا کہ یہ دنیا سے جانے کے بعد میں منزلِ عظمت پر فائز رہیں بلکہ انہی عظمت ہر قوم و ملت میں مسلم رہے، یہ ادراک ہے کہ ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جنہیں پس پردہ ڈال دیا گیا، اور دنیا کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو سکی، یا شہادت کی اطلاع ہوئی اسباب پرودہ راز میں رہ گئے اور نوعیتِ قتل کے مجہول ہو جانے کی بنا پر شہادت کا صحیح فیصلہ نہ ہو سکا امیر المؤمنین بھی شہید ہوئے اور امام حسن مجتبیٰ بھی حضور اکرمؐ بھی شہید ہوئے اور صدیقِ اکبرؓ بھی، امام زین العابدینؓ بھی شہید ہوئے اور امام محمد باقرؓ بھی، امام صادقؓ بھی شہید ہوئے اور امام کاظمؓ بھی، امام رضاؓ بھی شہید ہوئے اور امام تقیؓ بھی، امام علیؓ بھی شہید ہوئے اور امام عسکریؓ بھی لیکن ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہے اور دنیا انہیں مشکوک بنائے ہوئے ہے۔ ہاں ایک شہادت ایسی ہے جس پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا اور نہ پڑ سکتا تھا، قدرت نے اس کے لئے خاص انتظام کیا تھا، انبیاء و مرسلین کے دور سے اس کا اعلان ہوا تھا، قائم النبیینؑ کی زبان سے تکرار ہوئی تھی جن جنتی کے بیانات سے اظہار ہوا تھا اور پھر علیؑ کی زبان سے تکرار ہوا تھا، مکہ کو ترک کر کے، کوفہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک صحرا کا انتخاب کیا گیا، پہل کو ساتھ لیا، عورتوں کو رفیق سفر بنایا، قافلہ تیار کیا، رفقاء و اصحاب فراہم کئے اور اس کے بعد شہادت کا موقع دیا تا کہ کسی دور میں اس شہادت پر پردہ نہ پڑ سکے اور کوئی حکومت اسے دبانے کے لئے قہر نہ کرے، ہر راہ حق میں قربانی دینے والا شہید ہوا اور امام حسینؑ

سید الشہداء ہو گئے، سب کی عظمتوں پر پردے ڈال دیئے گئے لیکن حسینؑ کی عظمت اقوامِ عالم میں مسلم ہو گئی اور اسی شہادت کا طفیل تھا کہ جبر خدا اور رسولؐ کے پرستار نہیں بنے وہ بھی حسینؑ کے قدموں میں سر جھکائے ہوئے ہیں جو اسلام اور ایمان کو نہیں پہچانتے وہ بھی حسینؑ پر ہنسنے جاتے ہیں اور حسینؑ آواز دے رہے ہیں سیر جانیے والو! میں ایک نانا کا نواسہ اور ایک خدا کا نمائندہ ہوں، تم میرے قدموں تک آ جاؤ میں تمہیں خدا تک پہنچا دوں گا۔ خبردار! میری منزل تک آ کر ٹھہرنا جانا درنہ تمہاری معرفت و معرفت ہو جائے گی، دیکھو میں نے تمہاری ہدایت کا کتنا معقول انتظام کیا ہے کہ جب ساری دنیا میری طرف متوجہ تھی تو میں خاکِ گرام پر سجدہ کر رہا تھا۔ کہ سب میری طرف آئیں اور میں خدا کی طرف نے جاؤں، صلوات۔ یہ ہے عظمتِ حسینؑ، جو منہ حسینؑ کا حصہ ہے اور جس میں کوئی دوسرا شریک اور حصہ دار نہیں ہے اور جسے خدا نے بھی اہمیت دی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ بے حسینؑ میں نے تجھے شہادت کے عوین تین فضیلتیں عنایت کی ہیں، شہادتِ نبویؐ قربت میں رکھی ہے، قبولیت و عبادتِ ربیہ رد منہ پر رکھی ہے اور امامت کو تیری نسل میں قائم کر دیا ہے۔

اب کون پوچھے کہ حسینؑ کی عظمت و منزلت کیا ہے، خدا شفا، قبولیت اور امامت دے رہا ہے، رسولؐ سجدہ میں پشت پر سمجھائے ہوئے ہیں، عید میں کاندھے پر اٹھا رہے ہیں، گھر میں زبان چسار ہے ہیں، محفل میں پیادہ کر رہے ہیں، محراب میں سجدہ کو طول دے رہے ہیں، منبر و فضاں کا اعلان کر رہے ہیں، ازدواج کے گھر شہادت کی داستان سنار ہے ہیں، اصحاب کی محفل میں معرفت کا مہلق دے رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا بھی عظمتِ حسینؑ کے اعلان پر

آئادہ ہے اور رسول اکرم بھی اور کیوں نہ ہوتا دونوں کو معلوم ہے کہ میرے نام کی بقا
حسین سے ہے خدا کو معلوم ہے کہ لا الہ الا اللہ حسین کے دم سے باقی رہے گا، نبی کو معلوم
ہے کہ محمد رسول اللہ کا کلمہ حسین ہی زندہ رکھے گا۔

مراد خدا و دست در دست یزیدہ حقا کہ بنائے لا الہ الا اللہ حسین

اہ شبان سچے کی تیری تاریخ تھی جب یہ زہرا کا چاند افتخار امت پر نمودار
ہوا، اور امام الفضل کو اپنے خواب کی تعبیر ملی، ولادت میں بھی قدرت نے ایک خاص
اہتمام رکھا کہ زہرا کے اس فرزند کو شکم مادر میں صرف چھ ماہ رکھا اور اس کے بعد ایک
طویل حیات منابت کی بجو دنیا جانشی ہے کو بچہ ضحیم مادر میں کم از کم گواہ کی موت گزارا
ہے اور چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہونے والا بچہ زندہ نہیں رہتا لیکن تاریخ کا بیان
کو یا امتیاز قدرت نے صرف جناب تکلی اور امام حسین کو عنایت کیا تھا کہ چھ ماہ کی مدت میں
خلق کیا اور زندہ بھی رکھا اور شاید اسی لئے امام حسین اکثر جناب تکلی کا تذکرہ کرتے
تھے اور دونوں کے واقعات میں ایک حد تک مشابہت و مناسبت بھی پائی جاتی
تھی، بعض حضرات نے اس ذیل میں جناب علیؑ کا نام بھی لیا ہے لیکن مجھے اس سے
بحث نہیں ہے، مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے امام حسین کو ولادت ہی کو
ایک امتیاز دیا ہے، باپ مر لائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب، مال قانون قیادت صدیق
طاہر و فاطمہ زہراؑ، انا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نانی خدیجہ زہراؑ
بھائی امام حسنؑ عتی، دادی حضرت فاطمہ بنت اسد، ہر طرف کمال، ہر رخ پر تفصیلت،
ہر جہت سے عظمت اور ہر اعتبار سے بلندی، ایک بھائی کے امام ہونے ہوئے
امامت ملی اور سکا نبیاد و مسلمین کی وراثت میں شہادت ملی، سلام ہو تجھ پر اے
آدم کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے نوٹے کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے ابراہیمؑ

کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے موسیٰؑ اور علیؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے محمد مصطفیٰؐ
کے وارث۔

منزل ولادت میں مدت کے مختصر رکھنے میں شاید یہ خارہ رہا ہو کہ میرے
حسین میں نے عام بچوں سے ہٹ کر تیری ولادت کو مختصر رکھ کر بھی تجھے طویل حیات
دی ہے، اب تیری ذمہ داری ہے کہ اگر میرے دین پر وقت بڑ جائے تو مختصر مدت میں قرآن
دیجو میرے دین کو دائمی حیات دینا، حسین نے بھی طے کر لیا کہ پروردگار تو نے مجھے
چھ ماہ کی مدت میں حیات دی ہے تو میں بھی اپنے چھ ماہ کے بچہ کو قربان کر کے تیرے
دین کو بقلے دوام دے دوں گا۔

ولادت کی خبر یہ کہ محل اعظم بیت الشرف زہراؑ میں تشریف لائے، کداز دی میرے
بچے کو لائی جناب صغیر خواہر جناب حمزہؑ نے عرض کی حضور ابھی بچہ کو غسل نہیں دیا گیا آگے
طیب و دھواں بالوں تولاؤں، فرمایا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا میرے بچے کو بھی طہارت
کی ضرورت ہے، جلدی لائیے، جسے اللہ نے طیب و دھواں بنایا ہے اسے غسل و طہارت
کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دیکھا اپنے اقدار نے اپنے نائندہ کو کیا طیب و دھواں بنا کر بھیجا ہے کہ غسل
مولود کی بھی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ غسل مولود ایک امر مستحب ہے واجب نہیں ہے
ہمارا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی کوئی ذمہ داری انسان پر ہے،
اور اس کے برخلاف غسل میت واجب ہے، موت کے بعد انسان پر ایک ایسی کیفیت
طاری ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے غسل دینا واجب ہو جاتا ہے، نبی اور امام کے یہاں یہ
کیفیت بھی نہیں پیدا ہوتی لیکن قانون کو جاری رکھنے کے لئے ان کے یہاں بھی غسل
ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ غسل بر بنائے نجاست نہیں ہے یہ اہتمام کیا جاتا

بغیر معصوم کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا، تاکہ دنیا پہچان لے کر اگر موت سر
نہااست پیدا ہو گئی ہو تو قبر کس دناکس کو غسل دینے کا اختیار ہوتا لیکن یہاں
موت نے اتنا طیب و طاہر بنا دیا ہے کہ نہ مگر مگر غیر معصوم کو ہاتھ لگانے کا اختیار
تھا کرنے کے بعد اب وہ اختیار بھی نہیں رہ گیا۔

اب پہچانا آپ نے کہ امام کی منزل کیا ہوتی ہے۔ اور اس کی جات و مدت کا
قدرت نے کیا اہتمام کیا ہے لیکن مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے یہاں بھی امام حسینؑ
کو ایک خصوصیت عنایت کی کہ ہر معصوم کے یہاں کسی نہ کسی بنیاد پر غسل میت برقرار رکھا امام
حسینؑ کو خضارت کا درجہ دے کر اس غسل سے بھی الگ کر دیا آغاز میں غسل و ولادت سے بھی
الگ رکھا اور انجام میں غسل میت سے بھی الگ کر دیا اب دیکھئے کہ حسینؑ کی طہارت کیسی ہے؟
اور اس طہارت کا مزاج کیسا ہے؟ یہاں کسی غسل کی گنجائش نہیں ہے، اس کا آغاز بھی
طیب و طاہر ہے اور اس کا انجام بھی طیب و طاہر

مجھے وضو غسل کی بحث میں نہیں جانا ہے ورنہ اس کے بارے میں بھی عرض
کرتا۔ اور ان تمام خبیثات کی طرف اشارہ کرتا جو اکثر ذہنوں میں پائے جاتے ہیں اس وقت
تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میری بحث ان غسلوں سے ہے جن کا قلعن انسان کے ذاتی
وجود سے ہے اور میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آل محمد ذاتی طور پر طیب و طاہر بنا کر
بھیجے گئے ہیں۔ نہ ان کے آغاز وجود میں کسی نجاست کا تصور ہے نہ انجام وجود میں
مجھے عارضی مسائل سے بحث کرنا نہیں ہے ورنہ ان پر بھی روشنی ڈالتا۔ اس وقت
صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آیت تطہیر کے دائرہ کی دست پر بحث کرنے والے نئی کایہ
فراں کسین صغیر جلدی لاؤ، میرا کچھ ظاہر ہے، اسے طہارت کی ضرورت نہیں ہے
دنیا پاک کرے اور پاک رکھے کی بحث میں پڑی ہوئی ہے اور پیغمبر واضح کر رہے ہیں

کہ میرے طبیعت پیدا ہی طیب و طاہر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں پاک کرنے اور نہ
کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انفرادیت کا تذکرہ ہے تو چند خصوصیات کی طرف اشارہ کر دیا جائے، امام
حسینؑ کی زندگی میں اکثر ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جن میں امام حسنؑ برابر کے شریک
ہیں۔ جناب ام الفضل کا خواب، عید کے دن دوش رسولؐ پر سوار ہونا، مسجد میں پشت
پیشہ برپا کرنا، مبالغہ کے میدان میں جانا، آیت تطہیر میں شامل رہنا، سورہ دہر کے
نزول کی منزل میں بہار ہو کر نذر کرنا، امت کے فیصلہ میں حصہ لینا، ہرنی کے بچے کا
آجانا، فک کا گواہ بن کر جانا، جنت کا سرواہ ہونا، لیکن اس کے باوجود ان واقعات
کو انفرادیت ہی میں شمار کیا جائے گا، اس لئے کہ انفرادیت کا تعلق امت کے دوسرے
افراد سے برتلبے طبیعت تو آپس میں سب ایک دوسرے کی مثال ہیں، یہاں یہ مہو
ہی غلط ہے کہ کس میں کون سا کمال ہے اور کس میں کون سا کمال نہیں ہے، منزل
انہار میں فرق ہو سکتا ہے لیکن منزل کمال میں کسی فرق کی گنجائش نہیں ہے پھر
سبھی میں بعض ایسے خصوصیات کی طرف اشارہ کر دوں گا جو پردہ دگار عالم نے خصوصیت
کے ساتھ امام حسینؑ ہی کو عنایت کئے ہیں ان سے دوسرے اکثر کی عظمت پر اثر نہیں
پڑتا لیکن امام حسینؑ کی عظمت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔

مسجد میں مثل عظم ہیں ممبر بر تشریف فرما ہیں، مسائل شریعت کا بیان
ہو رہا ہے، آیات قرآنی کی تلمذ ہو رہی ہے، احکام الہی پہنچائے جا رہے ہیں، کہ
ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے دیکھا جو شاہزادہ چلا آ رہا ہے۔ پیردامن میں الجھا، بچہ
زمین پر گرا، پیغمبرؐ نے خطبہ قیل کیا، ممبر سے اترے اور بچے کو ممبر پر لٹا کر
نئے سرے سے بیان شروع کیا۔ مسلمانو! اسے پہچانو، یہ میرا حسینؑ ہے، اس کی

محرمت حاصل کر دے، اس کے فضائل پہناؤ اور دقت پڑ جائے تو اس کی مدد بھی کرنا۔

کہاں سرکارِ دعوالم کا خطبہ، حلال و حرام شریعت کا بیان، احکام الہی کی تبیین اور کہاں بچہ کا گناہ، بھلا اس گرنے کی اہمیت کیا ہے، بچے گرتے ہی رہتے ہیں، اصحاب کا مجمع تھا، حضورؐ کسی کو خارہ کر دیتے وہ بچہ کو بڑھ کر اٹھا لیتا خطبہ کو قطع کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہ منبر سے اترنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر اتر بھی آئے تھے لہذا بچہ کو اٹھا بھی لیا تھا تو منبر پر لے جانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر لے بھی گئے تھے تو سارا بیان چھوڑ کر فضائل بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ عجب نازک منزل ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہہ دوں کہ سادۃً پیغمبرؐ نے غلط کیا ہے اور بچہ کی محبت میں بہک گئے ہیں تو اسلام جاتا ہے اور یہ کہہ دوں کہ حسینؑ کے پیر پھیل گئے اور گر گئے تو ایمان جاتا ہے، بھلا معصوم کے قدم میں نذرش کہاں ہو سکتی ہے، یہ کہہ دوں کہ پیغمبرؐ بیمار رہے ہوں گے اور مرض میں بہک کر حسینؑ کے فضائل بیان کرنے لگے تو مذہب ہاتھ سے جاتا ہے، کیا کہوں، کچھ کہنے کی جرات نہیں ہے، کیا یہ کہہ دوں کہ یہ سب صحیح تھا حسینؑ کا آنا بھی صحیح تھا، صحن مسجد میں گرنا بھی صحیح تھا، رسولؐ کا خطبہ کو قطع کرنا بھی صحیح تھا، منبر سے اترنا بھی صحیح تھا، بچہ کو اٹھانا بھی صحیح تھا اور دوبارہ منبر پر جا کر فضائل بیان کرنا بھی صحیح تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان تمام امور کی ضرورت کیا تھی؟ یہ فضائل آلِ محمدؐ کی منزل ہے، اس کو سمجھنے کے لئے بڑا کلیجہ درکار ہے، یہ منزل ہر ایک سے بس کی بات نہیں ہے، واقعہ میں جو کچھ ہو رہا تھا سب عین منیت الہی اور برائی پروردگار تھا، خدا چاہتا تھا کہ حسینؑ مسجد میں آکر گریں، رسولؐ منبر سے اتر کر اٹھیں اور پھر منبر پر باکر بیان بدل کر حسینؑ کا تعارف کرائیں تاکہ دنیا پہچان لے کر میرے

حسینؑ کی منزل کیا ہے؟ بیان پیغمبرؐ حدیث ہے اور میرا حسینؑ قرآن ہے، جب قرآن حدیث کے سامنے آجا بیگا تو حدیث کو دیکرنا پڑے گا اور قرآن کو مقدم کرنا پڑیگا رسولؐ اسلام نے منبر سے اتر کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اب کوئی منبر پر بیٹھنے والا اس قرآنِ ناطق کے سامنے حدیث کا نام نہ لے، یہ تو فقط انقلابِ امت تھا، کو چند ہی دنوں کے بعد قرآنِ ناطق کے مقابلہ میں حدیثیں پیش ہونے لگیں۔

اربابِ کرم! ذرا غور کریں، صاحبِ حدیث اپنی حدیث کو رد کر کہ حسینؑ کی بات کو آگے بڑھانا ہے اور امتی حسینؑ کے سارے گھرانے کی بات کاٹ کر حدیث کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور حدیث بھی دُھ جس کا کوئی وارث نہیں ہے، صاحبِ حدیث کی حدیث تو کچھ ہٹ جائے اور لا وارث حدیث آگے بڑھ جائے یہ ہے امتِ اسلامیہ کا اسلام اور یہ ہے حسینؑ کا کتاب اللہ کا نتیجہ۔

رسولؐ نے خطبہ قطع کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے موضوع بدل نہیں، خود راہِ یہ نہ کہنا کہ حلال و حرام شریعت کو چھوڑ کر حسینؑ کے فضائل شروع کر دیتے اور اپنے فرضِ تبیین سے ہٹ گئے، نہیں، نہیں، یہ حسینؑ کے کلمات بھی میری تبیین کا ایک جزو ہیں اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب تک جتنے احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا زندہ رکھنے والا حسینؑ ہی ہے، میرا اسلام تمہارے دم سے نہیں، حسینؑ کے دم سے زندہ رہے گا، میں نے حسینؑ کا تعارف اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ لوگ میری شریعت کو لا وارث نہ سمجھیں یا اپنے ہی کو وارث نہ سمجھ لیں، میں نے خطبہ کو توڑ کر واضح کر دیا ہے کہ محمدیت کا وارث حسینؑ ہے کوئی دوسرا نہیں۔

مسجدِ رسولؐ میں بھی حسینؑ کی شان کچھ خالی ہی ہے، مسلمانوں کا مجمع ہو

نماز کا عالم ہے، بندگی کی منزل ہے، عبدیت کی سراج ہے، رسول اکرمؐ کا سجدہ ہے، اور پشت پر ہڑکالا ہے، سجدہ کو طول دیا جا رہا ہے لیکن حسینؑ کو اتنا نہیں جانا، کہا جاتا ہے کہ جب میں نے رسولؐ کے بازو تھام لئے، خبردار! جب تک میرا حسینؑ پشت سے نہ اتر جائے سجدہ سے سر نہ اٹھائیے گا، میں نہیں جانتا کہ جبریلؑ آئے یا میکائیلؑ، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ رسولؐ کی بشری زندگی کا واقعہ نہیں ہے کہ بچہ کی محبت کہہ کر طال دیا جائے، یہ عبادتِ الہی کا معاملہ ہے، شریعتِ اسلام کا مسئلہ ہے، سجدہ کی منزل ہے، اسے رسالت کا مسئلہ ماننا پڑے گا۔ اور رسالت کی منزل میں کوئی کام بغیر وحیِ الہی کے نہیں ہو سکتا جبریلؑ نہ آئے بول کوئی ادا کیا ہو، مجھے بحث کی کیا ضرورت ہے، مجھے تو صاف یہ کہنا ہے کہ سجدہ کو طول دینی الہی سے، جو رہا ہے، رسالت کی منزل میں رسولؐ کا کوئی کام بغیر وحیِ الہی سے ہو سکتا نہیں، اب وحیِ الہی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ رسولؐ کو روک کر سارے نمازیوں کو مصیبت میں مبتلا کرے، یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ میں کوئی تبصرہ کرنے والا۔ میں تو صرف واقعہ جانتا ہوں کہ سجدہ کو طول ہڑا اور جب سر کا رنے سے اٹھایا تو مسلمانوں نے پوجا کیا خدا نخواستہ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ فرمایا، انہیں! میرا حسینؑ میری پشت پر آگیا تھا، اب کوئی کہتا کہ اتار دیا ہوتا، گرا دیا ہوتا، یہ کوئی طریقہ ہے کہ آپ کے بچہ کے لئے ہم اتنی دیر تک سجدہ میں پڑے رہیں، یہ غازیہؑ کے بچے کا کھیل نہیں ہے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات ذہن میں آئے ہوں گے لیکن کسی میں بولنے کی جرات نہیں ہے اور حسینؑ مسکرا رہے ہیں، آج کیسا سجدہ کر دیا، اتنا نہ بھی خوب طول دیا اور امت کو بھی ہر شے آگیا، اب تو دنیا

پہچانے گی میرا رتبہ کیا ہے۔ اور میرا منصب کیا ہے؟ یاد رکھو میں نماز میں بھی آجاتا ہوں تو منزلِ پشتِ رسولؐ ہوتی ہے اور میرا کام سجدہ کو طول دینا ہوتا ہے، دنیا پہچان لے میری منزل صاحبِ سراج کی پشتِ اقدس ہے اور میرا مقصد سجدوں کی زندگی ہے۔ خبردار! میرا ہانڈے کہ سجدوں کو ترک نہ کر دینا۔ سجدہ میری زندگی ہے سجدہ میری ادا ہے، سجدہ میری آرزو ہے، سجدہ میری آبرو ہے، جو عمر دنیا داروں میں کھلنے کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ کرانا ہوں اور جو عمر دنیا میں آہم کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ میں سرکھٹا ہوں۔

امت پر کیا گزر گئی یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن خدا نے طے کر لیا کہ جب تک حسینؑ پشت سے نہ اتریں گے نبیؐ کا سر سجدہ سے نہ اٹھے گا، کسی کو برا لگتا ہے تو کہے کوئی کڑھتا ہے تو کہہ کسی کے دل پر پکلی عورتی ہے تو کہے ہم تو اپنے حسینؑ کے فضائل کا اظہار یوں ہی کریں گے انھیں حسینؑ کے علل کی اہمیت نہیں معلوم، میں تو جانتا ہوں کہ یہ حسینؑ کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ مجھے تو معلوم ہے کہ یہ آج پشت پر بیٹھ کر سجدہ کو زندگی دے۔ رہا ہے اور کل کر بلا کے میدان میں سجدہ کر کے رسالت کو زندگی عطا کرے گا۔

عزیزانِ محترم! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے فضائلِ اہلبیتؑ کے اظہار و اعلان میں ایک نیا ہی طریقہ اختیار کیا ہے، امت پر کیا گزر جائے اس کی کوئی پروا نہیں ہے آلِ محمدؑ کے فضائلِ نظر عام پر آجائیں کسی سے برداشت ہو سکے باز ہو سکے محفل میں نہ ہر آن کی تعظیم کی جائے گی، کوئی آنکھ دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے عید کے دن واقعہ بنا جائے گا کسی کے دل پر قیامت گزر جائے سجدہ کو طول دیا جائے گا اور کسی کے پیر میں چو نے پڑیں یا دل میں پھونچو لے پھونچیں غور کریں وہ پیر میں مجھ کو رد کر

ولادت علی کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ وحیوں کی ذاتِ ادا میں تھیں ادا ان کے اپنے کمالات تھے، قدرت نے روزِ ازل سے حسین کو وہ جذبہ دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے گویا قدرت نے رافع کو ناپا جاتی ہے کہ ہم نے اس فرزند کو کس خاص مقصد کے تحت پیدا کیا اور اس سے ایک عظیم کار کیا ہے 'السانہ ہوتا تو حسین کی پوری تاریخِ زندگی الفاظِ قرآن میں بیان نہ ہوتی، ذرا آیت یاد کریں، ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرے اس کی ماں نے نانا صل میں بھی مصیبتیں برداشت کی ہیں ادا سے دنیا کے حوالے کرنے کے بعد بھی اس کے محلِ ادر دودھ پینے کا زمانہ ۳۰ ہینہ کا ہے، جب وہ انسان ۱۰ سال کا ہو گیا اور جسم میں توانائی آگئی تو اس نے ہماری بارگاہ میں دعا کی، پروردگار مجھے تو نہیں دے کر میں ان نعمتوں کا شکریہ ادا کر دوں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عنایت کی ہیں، ادریری ذریت میں ایک صالح نسل پیدا کر میں تیری مظلومیتوں اور میلِ سر تسلیم تیری بارگاہ میں خم ہے۔

تاریخِ اسلام بتلے کہ وہ کون سا بچہ ہے جس کا محلِ ادر رضاعت کا زمانہ ۳۰ ہینے کا ہے، رضاعت کے دو سال نکالنے کے بعد یکم ماہ میں پچھ ماہ کون بچہ رہا ہے جس کی ماں نے یہ سب رحمتیں برداشت کی ہیں کہ روزِ ازل سے نسلِ نبیہاوت کی خبریں سن رہی ہے جس نے اللہ سے دعا کی ہے ادا خوی لمات میں اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے، جس کے ماں باپ انعتِ عظیم کی منسل میں ہیں، ادر جس کا ذریت میں صالح نسل پیدا ہوئی ہے اور آج تک قائم ہے۔

تاریخ گماہ ہے کہ حسین بن علی کے سما کوئی اس آیت کا مصداق نہیں

پے اور یہ منہ نہ ہڑ کے لال کا شرف ہے کہ قرآن مجسم نے اس کی پوری سوانحِ حیات ولادت سے لے کر نسلِ ذریت تک بیان کر دی ہے اور اس نے بھی طے کر لیا ہے کہ خدا کی کتاب میری ولادت سے بری ذریت تک کے واقعات بیان کر چکی اور میں آؤک نیزہ پرستنا کر محفوظ کر دوں گا۔

اب ذرآن حسین سے جہلم ہو گا اور وحی قرآن سے، جب تک قرآن زندہ رہیگا تاریخِ وحی زندہ رہے گی اور جب تک نامِ حسین زندہ رہیگا قرآن قائم دوام رہے گا اور آخری دور میں قرآن اپنی پوری آپ کتاب کے ساتھ منظرِ عام پر آئے گا تو وہ بھی فرزندِ حسین ہی کے ذریعہ آئے گا۔

دنیا والوں نے نہیں پہچانا کہ حسین کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ آسمان والے پہچانتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت اور عظمت و جلالت کیا ہے؟ واقعتاً کچھ جب غافل کے گھر اس فرزند کی ولادت ہوئی اور یہ فرزند سے آسمان تک پہنچی، جنتِ آراستہ ہوئی، کونہ کو گوش آیا طوطی نے موتی لٹائے، حوصلہ نے جشن منایا تو فرشتوں کا بھی ایک گروہ جبریل امین کی قیادت میں درہزہ ہر پر مبارکباد کیلئے حاضر ہوا۔ راستہ میں ایک جریسے سے گزرتے ہوئے، دیکھا کہ اللہ کا ایک محبوب فرشتہ فطرس چڑھا ہوا ہے، وہی کتاب یہ ہے کہ فطرس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں بھی ایک بڑی مخلوق ہوں، اللہ نے مجھے بہت کچھ عنایت کیا ہے اور اللہ کو یہ ادب پسند نہیں آئی، جبریل کی نظر پڑی، پھر گئے، فطرس کیا حال ہے؟ فطرس نے گھر کر کہا۔ جبریل اکیلا قیامت آگئی ہے؟ یہ زمین کی نظر میں جارہے ہو؟ فرمایا کہ آخری نبی کے بیان ایک فرزند پیدا ہوا ہے ہم اسکی مبارکباد کیلئے جارہے ہیں۔ فطرس

کہا گیا یہ کن ہے کہ میں بھی لے چلو، شاید اسی مولود کے طفیل میرا یہ عتاب بظن ہوجائے
منشائے الہی تھا کہ فطرس کا عتاب حسینؑ ہی کے طفیل بظن ہو چرلے پردوں پر
اٹھایا، اسلئے اہم کی خدمت میں لائے، ورنہ بیان کیا، پیغمبرؐ نے فرمایا حسینؑ
کے گہوارہ کے قرب، لے جاؤ، اس کے بال و پر کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کر دو
نئی زندگی عطا ہوگی جبریلؑ گہوارے کے قریب لائے بازوؤں کو مس کیا، نئے بال و پر
ملے، اور فطرس یہ کہتا ہوا چلا، "مَنْ جَشَى أَمَامِي نَحْنُ الْخَيْرُ"۔ مومن مجھے شل
ہے، میں حسینؑ کا آنا دیکھا ہوا ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ فطرس رسول اکرمؐ کی خدمت میں آیا تھا اور اپنے حسینؑ
کے گہوارے کی طرف بھیج دیا، کیوں سر کا کیا آپ دُعا میں کو سکتے، کیا آپ بال و پر عطا
نہیں کر سکتے؟ آپ فرمائیں گے، میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن آج حسینؑ کا حال
ظاہر کرنا ہے اور امت کو بتا دینا ہے کہ بخشش درکار ہے تو حسینؑ کے دروازے
پر آؤ حسینؑ کے بیڑ میں نہیں بخشواتا تو کوئی اور کیا بخشواتے گا۔

آئیے جبریلؑ امین سے کہیں یہ آپ یہاں کہاں لے آئے؟ عتاب خدا کا ہے اسی
سے کہنے کو کہ وہ بظن کر دے، حسینؑ سے کیا مطلب؟ خدا کے معاملات میں حسینؑ
کیا کر سکتے ہیں؟ جبریلؑ آواز دیں گے، ناہم میں اسی لئے لایا ہوں کہ دنیا بپان لے
کو قدرت کے یہاں بھی کوئی کام بغیر وسیلہ کے نہیں ہوتا اب جو لوگ وسیلہ آل محمدؐ
کے قائل نہیں ہیں وہ اپنے باپ سے میں سوچیں کہ ان کا کیا انجام ہوگا؟

پیغمبرؐ نے فطرس کے بازوؤں کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کر لیا، جسم خیر
نا کہ غلاموں کو ایک مستقل سہا مل جائے کہ سلاہ کے بعد حسینؑ جہم توڑنے کا لیکن
وہ جگہ فردر لے گی جہاں حسینؑ آرام فرما رہے ہیں۔ اب اگر امت کو بخشش ہو تو

فطرس سے سبق لینا، اس نے گہوارے سے بازوؤں کو مس کیا تو نئے بال و پر ملے، تم فطرسؑ
حسینؑ سے اپنے جسم کو مس کرنا نئی زندگی ملے گی اور تمہاری زندگی کیا ہے، حسینؑ نے اسلام
کو زندگی دیا ہے، مذہب کو زندہ کیا ہے، قرآن کو زندہ کیا ہے، اور مختصر یہ ہے کہ اسلام
زندہ ہو گیا جس کو جلا کے بعد خاتمہ کیا، میں ایک فقرہ فطرسؑ بھی کہ چلوں فطرسؑ جبریلؑ کی بات
کر لیا، ابھی کل نصیرؑ نے دی پر عتاب نازل ہو چکا اور آج یہ دعویٰ ہے کہ کون پر افسل ہو ایک دفعہ ٹھوکر کھائی
دوبارہ نازل جاتا ہے، مجھے کیا ہو گیا کہ اتنے دن متروک رہنے کے بعد پھر مجھے ہوش نہیں آیا اور ایسے ناز و بار
کر رہا، اب اگر کہیں عتاب نازل ہو گیا تو دوسرا کوئی بخشواتے والا بھی نہ ملے گا، فطرسؑ کے گانا ناؤ با تم نے
نہیں بیچا، میں اپنے انجام کو خوب پہچانتا ہوں، میں عتاب کی معیت جمیل چکا ہوں، مجھے حالات
کا صحیح اندازہ ہے، مجھے معلوم ہے کہ کل عتاب نازل ہو گیا تھا لیکن آج عتاب نازل نہیں ہوگا
تم پوچھو گے کیوں؟ تو سرکل میرا دعویٰ بغیر دلیل کے تھا اسلئے عتاب نازل ہو گیا تھا آج دعویٰ کیسے
دلیل بھی ہے اسلئے عتاب کا کوئی خطر نہیں ہے یا دیکھو میں فقط بخشش ہو کر کا اعلان نہیں کیا ہے بلکہ یہ بھی
کہا ہے کہ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں، جب حسینؑ کا سہا مل گیا تو عتاب کا کیا سوال ہے؟

اباب نظر! مجھے تیری کہنا پڑتا ہے کہ جس کا وسیلہ ملک کرے بخش بنا دے وہ خود
کیسا لاجواب ہوگا۔

اور فطرسؑ کے مقدمے نے غلاموں کا مقدر کھول دیا، اب کہنا پڑے گا کہ وہب بخشش
نہیں بخش، صرف بخش اور جب یہ سب بخشش تو حیرت بخش، میں بھی بخشش، ستم بھی بخش اور
جب غلام بنے تو سبائی کیسا بخش ہوگا، جیسا کیسا بخشش ہوگا، دل کے ٹکڑے کیسے بخشش
ہوں گے اور خود کیسا لاجواب ہوگا۔



امام زین العابدین علی اکبر علیہ السلام

اسم مبارک :- علی

کنیت :- ابو محمد

والد ماجد :- امام حسین علیہ السلام

والدۃ ماجد :- حضرت شہربانو (شاد زنان)

ولادت :- ۱۵ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ یا ۵ شعبان المعظم

اولاد :- گیارہ فرزند - چار دختر

شہادت :- ۲۵ محرم ۹۵ھ

عم مبارک :- ۵۷ سال

قبر مطہر :- جنت البقیع - مدینہ منورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء
والمرسلين خاتمة النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد وآله
الطيبين الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد
فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم - بسم الله الرحمن الرحيم
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَارْتَاٰ لَنَا الْاٰخِرَةَ وَالْاُولٰٓئِ

ارثنا: جناب رب العزت ہوتا ہے۔ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے
اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آیت کریمہ کے ذیل میں جو بات قابل توجہ
ہے وہ یہ ہے کہ مالک کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام خود انسان کے حوالے نہیں کیا
بلکہ اپنے لطف و کرم کی بناء پر یہ ذمہ داری اپنے اوپر رکھی ہے۔

کون تھا دنیا میں جو اس کے سر کوئی ذمہ داری ڈال سکتا - کس کی مجال تھی جو
اس پر کوئی فریضہ عائد کر سکتا۔ وہ قادر مطلق تھا اور بندہ عاجز و ناتواں۔ وہ خالق
کائنات تھا اور بندہ ذر ذہ ناچیز۔ وہ عالمین کا پالنے والا تھا اور بندہ ایک حقیر بے مقدار
کس انسان کی مجال تھی جو اللہ پر کوئی ٹوہڑی عائد کر سکتا۔ یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے اتنا
عظیم فرض خود اپنے ذمہ عائد کر لیا اور اپنے بندوں کو اس بارگراں سے سبکدوش کر دیا۔ اب
بندوں کا ذمہ داری صرف اطاعت ہے۔ ان کا کام صرف فرماں برداری ہے اور بس۔

کون تصور کر سکتا ہے اس کرم بے پایاں کا۔ کہ جس مسئلہ کو حل کرتے ہوئے
عالم کفر کی صدیاں گزر گئیں اور مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس مسئلہ کو مالک کائنات نے محو
میں حل کر دیا اور انسان کو کسی رحمت میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ اور نہ فقط مسئلہ کو
حل کر دیا بلکہ انسان کو باخبر بھی کر دیا کہ وہ انتظام ہدایت کے سلسلے میں کوئی رحمت نہ کرے

اور مالک کائنات کے کرم پر اعتماد کرے اور یہ حق بھی دے دیا کہ بندہ خدا سے ہادی اور رہنما کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ جب تو نے ہدایت کا وعدہ کیا ہے تو آج ہمارا ہادی رہنما کہاں ہے اور اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے؟

اسی سوال اور اسی تقاضے کا لحاظ تھا کہ اس نے ہر دور میں حجت کا اہتمام کیا اور کسی دور کو حجت خدا سے خالی نہیں رکھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہدایت لینے والے موجود رہیں اور ہدایت دینے والا نہ رہے۔ دنیا ئے اسلام کو آج بھی حق ہے کہ وہ رب العالمین سے یہ مطالبہ کرے کہ تو نے اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے اور مالک کائنات کا فرض ہے کہ وہ ہدایت کا اہتمام کرے ورنہ اپنے نظام کو ناقص و ناقص تسلیم کرے۔

نظام قدرت ناقص و نامکمل نہیں ہو سکتا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ آج بھی کوئی ہادی درہنما ہے جو امت کی ہدایت کا اہتمام کر رہا ہے اور بندوں کی طرف سے تین بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اب یہ قدرت کے اختیار کی بات ہے کہ وہ اسے کہاں رکھے اور کس حال میں رکھے۔ اس مقام پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر نگاہوں سے غائب ہے تو ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح تو خود خدا پر سے اعتبار اٹھ جائے گا اور اس کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ جب نگاہوں سے غائب ہے تو کیا انتظام کرے گا؟ قدرت نے واضح کر دیا کہ جس طرح میری غیبت پر ایمانی رکھنا ضروری ہے اسی طرح میری حجت کی غیبت پر بھی ایمانی رکھنا ضروری ہوگا۔ قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور ایک نہ ایک ہادی درہنما ضرور مبعوث کیا ہے اور یہ انسان کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو ایک عظیم رحمت سے بچالیا اور کائنات کے عظیم ترین مسئلہ کو لمحوں میں حل کر دیا۔ مذہب اسلام میں المصطفیٰ کی ولادت کے موقع پر

جو اعمال بیان کئے گئے ہیں اور جن میں نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ کی تاکید کی گئی ہے اس کا بھی شاید اسی طرف اشارہ ہے کہ آج کے دن مالک کائنات کے کرم کی تحدید ہوئی ہے لہذا بندہ کا فرض ہے کہ اس کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرے اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے تا وہ ہے۔ خود مصطفیٰ نے بھی پوری زندگی اسی شان سے عبادت اور سجدہ گزاری میں طے کی ہے کہ تاریخ کائنات میں کیس اس کا جواب نہیں مل سکتا اور یہ اسی لئے ہے کہ جب ہادی پانے میں سجدہ شکر ضروری ہے تو جس کو ہادی یا درہنما بنایا گیا ہے وہ کس طرح سجدہ شکر ادا کرے گا۔ صلوٰۃ اہلبیت طاہرین کو اللہ نے کچھ ایسے فضائل و کمالات عطا کئے ہیں جن کی مثال آدم و عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک امت پیغمبر ہی کا کیا ذکر ہے عبادت و اطاعت کے ذیل میں تو میرا دل چاہتا ہے کہ ایسے بندہ پروردگار کا تذکرہ کروں جس کی عبادت شاہکار اور اس کے سجدے یادگار ہوں۔ ایسا عابد و زاہد کہ بزم عبادت بے روتق ہو جائے اگر وہ نہ رہے اور ایسا سجدہ گزار کہ کاروان عبدیت بے قافلہ سالار ہو جائے اگر وہ نہ رہے۔ وہ عظیم انسان جسے اللہ نے عرب و عجم کی شرافت و سیادت کا مرکز بنایا ہے جس کی ذات اقدس پر عرب کو بھی ناز ہے اور عجم کو بھی۔ عربیت کا وہ عالم کہ میان ہاشم، روح بعد المطلب، قلب ابو طالب۔ راحت علیٰ اور نور نگاہ حسینؑ منظر اور عجبت کا وہ امتیاز کہ شہزادی عجم شہر بانو کا لالہ بادشاہ فارس یزدجرد کا نواسہ اور آخریں اس کی نسل میں جس کے دور حکومت پر مرسل اعظم کو ناز کہیں ایک بادشاہ عادل کے دور میں پیدا ہوا ہوں اور میں یہ آکر تجھے کنپڑا تا ہے کہ اگر دور حادث میں پیدا ہو جانا اپنی عدالت کی نشانی اور امتیاز ہے تو نسل عادل میں آنا کتنی بڑی حسینیت ہوگی اور پھر جب عدالت پر عصمت کا رنگ

چڑھ جائے گا تو کردار کی بلندی کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ تو کوئی معصوم ہی کر سکتا ہے۔ غیر معصوم کے بس کی بات نہیں ہے۔

دنیا اے اسلام کے فاتحین نے قوم عجم کو ذلیل کر کے عرب و عجم کی تفریق کی وہ بنیاد رکھی تھی جو آج تک ختم نہیں ہو سکی اور اسلام میں عرب و عجم کا سلسلہ باقی ہے۔ وہ پیغمبر اسلام جس نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ عجم پر عرب کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ اس کی امت نے قومیت کو میاں فضیلت بنالیا اور اس کی مسند پر بیٹھنے والوں نے تفریق کی خلیج کو اتنا وسیع کر دیا کہ آج تک پُر نہ ہو سکی۔ قربان جائیے فلسفہ آل محمدؐ کے کہ انھوں نے اپنے جد کے دین کو بچانے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں نہ رکھا اور جہاں جہاں اہل دنیا نے دین کو دوسرا کرنے کی کوشش کی وہیں آل محمدؐ نے کردار کی شمعیں روشن کر دیں اور اپنے جد کے دین کو رسوائی و ذلت سے بچالیا۔

تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتی کہ جب امیر المومنینؑ کے دور حکومت میں آپ کے عامل ”خریش“ نے عجم کی دو خواتین کو قیدی بنا کر بھیجا تو سارا سماج قیدیوں کو ذلت و رسوائی کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور اسلام کا سرخ شدہ تصور ذہن میں رکھنے والے یہی امید کر رہے تھے کہ اب علیؑ ان خواتین کے ساتھ کینزوں جیسا برتاؤ کریں گے اور انھیں عجمیت کی قراداد فنی سزا دیں گے۔ لیکن ایک مرتبہ پورے ماحول کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب مولائے کائنات نے یہ فیصلہ سنایا کہ ان میں سے ایک کا عقد میرے فرزند حسینؑ کے ساتھ ہوگا اور دوسری کا عقد محمد بن ابی بکرؓ کے ساتھ — یعنی امامت کی نسل میں بھی یہ شرافت چلے گی اور حکومت کی نسل میں بھی اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محمدؐ سے عقد کرنے میں شاید ایک مصلحت یہ بھی رہی ہو کہ حکومت کا

بس چلتا تو قومیت کا فساد پھیلنے کے اسلام میں تفریق پیدا کر دیتی — یہ امامت ہے کہ اسے اختیار ملتا ہے تو حکومت کے ایوان کو بھی قومی تفریق کے نشانے کامرکز بنا دیتی ہے۔

عقد ہو گیا اور بظاہر عقد کوئی اتنا اہم مسئلہ بھی نہیں تھا لیکن حالات و ماحول کا جائزہ لیا جائے تو اس عقد کی صحیح عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ امام حسینؑ جیسا عظیم الشان اور عظیم المرتبت انسان جس پر ذاتی شرافت اور نسبی نجات دونوں کو ناز تھا۔ ہاشمی گھرانہ۔ اہل طالب کا لال۔ پیغمبر اسلامؐ کا نواسا۔ بھلا کون گھرانہ تھا جس میں حسینؑ کا پیغام دیا جاتا اور انکار ہو جاتا۔ کون سا انسان تھا جو حسینؑ کی دامادی پر ناز نہ کرتا۔ لیکن یہ مولائے کائنات کا کمال کردار تھا کہ آپؐ نے ایک عجمی خاتون کو اپنی بیوی بنا کر دنیا پر واضح کر دیا کہ قومی تعصب کا شکار ہونا تھا کہ اکام ہے اور قومی تفریق کو شرافت کر دینا ہمارا کام ہے۔ اور شاید یہی راز تھا کہ قدرت نے بھی اس کا یہ انعام دیا کہ عجم کو فتح کرنے کا کام حکومت نے کیا اور کلمہ آج تک امامت ہی کا پڑھا جا رہا ہے۔ جو اسلام بزرگ شمشیر پھیلایا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے اور جو اسلام بزرگ کردار آگے بڑھتا ہے وہ زندہ دیا زندہ ہو جاتا ہے۔

ماحول پر ماحول پڑھنے کی تاریخ میں یہی دو عظیم مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بیٹی کو زندہ دفن کر دینے والے سماج کے سامنے بیٹی کی تعظیم کے لئے اٹھنا اور ایک عرب و عجم کے تعصب کی مادی ہوئی قوم کے سامنے عجمی قیدی خاتون کو بوسہ دینے کا شرف دینا اور حسن اتفاق سے یہ دونوں مثالیں ایک ہی خاندان میں ملتی ہیں۔ بیٹی کی عظمت کا اظہار نبیؐ نے کیا ہے اور عرب و عجم کی تفریق کو مٹا دینے کا سہرا دہی کے سر پہا ہے۔ مکمل بیٹی نہ یہ مردادہ کی کہ میرا سماج کیا ہے گا اور نہ آج دہی کو اس کی قدر ہے کہ لوگوں پر

اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ کل پیغمبر ہی سوچ رہے تھے کہ جو قابل تعظیم ہے اسکی تعظیم ہونی چاہیے چاہے سارا سماج مخالف ہو جائے اور آج علیٰ یہی سوچ رہے ہیں کہ جسے سرکل انظم نے خواب میں بتاوت دی ہے اسے ہو بنانا ہے چاہے ساری دنیا مخالف ہو جائے۔ دنیا کا منہ دیکھ کر عمل کرنے والے دنیا دار ہوتے ہیں اور دنیا سے منہ موڑ کے سرمنی پروردگار تلاش کرنے والے "إِنِّي رَجَعْتُ وَجْهِي" کے مصداق ہوتے ہیں۔

عقد ہوا اور بڑے اہتمام سے ہوا عجیت کی عزت بڑھی۔ عربیت کا غرور مٹا اور ایک قیدی خاتون خاندان رسالت کی بیو بن گئی۔ دنیا نے تعصب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یہ کیسا انقلاب آیا اور یہ کیا ہو گیا۔ قدرت نے غرور کے منہ پر ایک اور طایفہ مارا کہ جس عجم خاتون کی زوجیت برداشت نہیں ہو رہی تھی اور لوگ حیرت سے امامت کا منہ دیکھ رہے تھے آج وہی خاتون ایک امام وقت کی ماں قرار پا رہی ہے۔ ۵۔ ارجادی الادوی کی وہ مبارک تاریخ آئی جب شہر بانو کی گود آباد ہوئی اور قدرت نے انھیں وہ فرزند عنایت کیا جو بزم عابدین کی رونق اور کاروان ساجدین کا سردار قافلہ ہے۔

قدرت نے بنو امیہ سے باقاعدہ طور پر سردار بار ملک انے کا کام انھیں عجم خاتون کے فرزند کے ذمہ رکھا اور ایک مرتبہ اموی غرور کو پھر آواز دی کہ عرب عجم کی تفریق پر تازہ کرنے والو۔ ذرا فرق تو محسوس کر۔ کل ایک عجم خاتون علیؑ کے دربار میں آئی تھی تو اسے رشتہ کا شرف عطا کیا گیا تھا۔ اور آج رسول کی بیٹیاں کھائے دربار میں قیدی بن کر آئی ہیں تو انھیں اس طرح ذلیل دُروا کیا جا رہا ہے۔ پہچان لو اسلام کس کے پاس ہے اور کس کے پاس نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ کس کا رشتہ ہے اور کس کا رشتہ نہیں ہے اور میں تو یہ عرض کر دوں گا کہ پروردگار نے شرم کا تختہ اُٹھنے کا

کام بھی انھیں جناب شہر بانو کے فرزند سے لیا۔ تاکہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر لیں والا دربار کی چولیں ہلا دے تو یزیدیت کو احساس ہو کہ ہاشمی گھرانے کا رشتہ عجم سے بھی ہوتا ہے تو ہلال و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا اور امویت عربیت پر بھی نازل کرتی ہے تو شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔

بعض مورخین نے جناب شہر بانو کی آمد کو خلیفہ دوم کے دور میں لکھا ہے اور اور یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ یہ "خلافت مآب" کا احسان تھا کہ انھوں نے شہر بانو کا عقد امام حسینؑ سے کر دیا لیکن اولاً تو یہ داستان بالکل بے بنیاد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں احسان یا تعلقات کا کوئی دخل نہیں ہے اس روایت کا مضمون یہی ہے کہ خلیفہ وقت نے انھیں کینز بنا کر بھیجنے کا امدادہ کیا تو امیر المومنینؑ فرمایا کہ شہزادیاں فروخت نہیں ہوتیں اور اس طرح بھی دونوں شخصیتوں کا کردار کھل کر سامنے آگیا کہ دولت کی ہوس کہاں ہے اور عزت کی پاسداری کہاں ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہاں عشق کی داستانیں گر مٹھنے کی بنیاد ہے اور ہر رشتہ میں اپنا دخل ضروری ہے کبھی عقد شہر بانو میں اپنا حصہ ثابت کیا جائے اور کبھی عقد ام کلثوم کی داستان دفع کی جائے۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ جو روایت بھی تیار کی گئی اس میں مذمت ہی کا پسلو نکلا۔ مدح نہ نکل سکی۔ آل محمد سے رشتہ جوڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ جب کوئی نا اہل رشتہ جوڑا گیا تو نتیجہ میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور قدرت نے واضح کر دیا کہ جنھیں رشتہ کا پاس مل گیا نہیں ہے انھیں کمالات و فضائل کا کیا خیال ہوگا۔

یہ حادثہ ضرور ہے کہ جناب شہر بانو کا انتقال اپنے فرزند کی ولادت کے دس دن کے اندر ہی ہو گیا اور علیؑ لم ظاہر میں اپنے لال کے کمالات کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔

لیکن اس انتظام قدرت میں بھی ایک مصلحت تھی اور اس کا راز اس وقت کھلا جب بچپن سے پالنے والی ماں دسترخوان پر بیٹھیں اور امام زین العابدینؑ نے کھاتے میں ساتھ نہ دیا اور کسی نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ آپ اپنی پالنے والی ماں کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میرا ہاتھ اس شے کی طرف نہ بڑھ جائے جس طرف میری ماں کی نگاہ ہو اور اس طسرح ماں کے احترام میں فرق آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ خاتون واقعی ماں نہیں تھیں اور امام کے بارے میں یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرف ہاتھ بڑھا دیں گے جس طرف ماں کی نگاہ اٹھ رہی ہے۔ اس لئے کہ امام معصوم اور صاحب علم غیب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایسے اقدامات کا امکان نہیں ہے لیکن بتانا یہ ہے کہ جب میں ایک پردوش کنووالی ماں کا اتنا احترام کرتا ہوں تو حقیقی ماں کا احترام کیا ہوگا۔

امام کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اُدھر بڑھ جائے گا بعد صراحت کی نگاہ ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ اُن کا ہاتھ اُدھر بڑھ سکتا ہے بعد صراحت ہاتھ بڑھ رہا ہے اس لئے کہ میں صاحب علم غیب ہوں اور وہ عالم غیب نہیں ہیں۔ یہ ایک اخلاق آل محمدؐ ہے کہ بیان کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ دامن تہذیب و احترام پر دھبہ نہ آئے پائے اور میرے اس دعویٰ کی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب معصوم عالم کی وفات کے بعد شہزادے گھر میں آئے اور جناب اسماءؑ نے کھانا پیش کیا اور شہزادوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے کبھی ماں کے بغیر کھانا نہیں کھایا۔ سوال یہ ہے کہ امام حسینؑ اور امام حسینؑ ماں کے بغیر کھانا نہیں کھاتے اور ان کے فرزند کا یہ عالم ہے کہ وہ ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے

کیا امامت کے کردار میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور کیا امام کا انداز بھی دنیا والوں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ راز صرف یہ ہے کہ امام حسینؑ اور امام حسینؑ اور حضرت زین العابدینؑ کے حالات میں ایک نمایاں فرق ہے ان کی ماں معصومہ تھیں۔ وہاں کسی طرف سے غلطی کا امکان نہیں تھا اور یہاں امام زین العابدینؑ کی ماں غیر معصومہ ہیں۔ غیر معصومہ کے اقدام میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ سیرت اختیار کی۔

امام زین العابدینؑ کا دور حیات اس انداز سے گذرا کہ سترہ سال سے سترہ سال تک دادا کے زیر سایہ رہے سترہ سال بولائے کائنات کی شہادت کے بعد سترہ سال تک کا زمانہ باپ اور چچا کے ساتھ گذرا۔ سترہ سال کے بعد سترہ سال تک باپ کے ساتھ رہے اور سترہ سال کے بعد سے ۳۵ سال تک تنہا زندگی گزار دی اور آپ کے شریک کار آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ رہے جن کی عمر واقعہ کربلا میں صرف ۳ سال تھی۔

یعنی یوں کہا جائے کہ امام زین العابدینؑ نے دنیا میں قدم رکھا تھا تو شہزادگی کے عالم میں۔ ماں شہزادی عجم۔ باپ شہزادہ عرب۔ دادا حاکم اسلام اور خلیفۃ المسلمین۔ لیکن وہی برس میں یہ بساط اٹ گئی۔ ادھر ماں کا انتقال ہوا۔ ادھر دادا کی شہادت ہوئی۔ ادھر مصائب کا ہجوم۔ ادھر واقعہ کربلا۔ واقعہ کربلا کے بعد تاراجی مدینہ۔ تاراجی مدینہ کے بعد غارت گری مکہ۔ غرض کہ امام کی پوری زندگی مصائب برداشت کرنے میں گذر گئی لیکن ان مصائب کا نہ کردار پر کوئی اثر پڑا نہ خدمت اسلام پر۔ بلکہ مصائب نے خدمت کا اور موقع دے دیا اور تاریخ کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ آپ نے دین اسلام کو اس وقت زندہ کیا

جب کوئی دوسرا زندہ کرنے والا نہیں تھا۔ سر کا وسیع الشہداء و معات قرآن مجید میرا یہ کہتے
 کہ جی چاہتا ہے کہ امام حسینؑ حفاظت اسلام کے لئے اٹھتے تو انھیں کم از کم ۷۰ ساتھی
 مل گئے لیکن امام زین العابدینؑ نے اس وقت یہ ذمہ داری سنبھالی ہے جب چند خواتین
 اور ایک کسی فرزند کے سوا کوئی نہ تھا اور پھر مقصد کو اس طرح بچایا کہ دین بھی رہ گیا
 اور دین دلے بھی رہ گئے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں جو نسل رسولؐ اور سادات کرام
 کا سلسلہ ہے وہ کم ہے اسی وجود امام زین العابدینؑ کا اور صدقہ ہے اسی محافظ
 اسلام کا کہ اس نے مصائب برداشت کر کے اتنی بڑی قوم بھی بچالی اور آنا عظیم مذہب
 بھی بچالیا اور اب کتاب پڑتا ہے کہ امریت آگے دیکھئے "انا اعطیناک الکوثر" کہے
 کہتے ہیں جس کی نسل میں ایک کے باقی رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کی نسل میں ایک سے
 کہتے ہوئے۔ اب اگر امام زین العابدینؑ کو آدم آل محمدؑ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے بلکہ میں
 تو یہ کہوں گا کہ آدم کی نسل طوفان نوح میں تباہ ہو گئی اور نوح آدم ثانی قرار پائے لیکن
 امام زین العابدینؑ نے جو نسل پھوڑی ہے اس پر کسی طوفان اور سیلاب کا زور بھی نہیں
 چل سکا اور کیوں نہ ہوتا جنتی ماحول کے پروردہ ماں باپ کی نسل طوفانوں کو برداشت
 نہیں کر سکتی لیکن کر بلا کے مصائب بھیلنے والے بزرگوں کی نسل پر طوفانوں اور سیلابوں
 کا اثر نہیں ہو سکتا۔

کیا کہتا اس امام شجاع کا جس کی زندگی میں ہر شے زوالی ہے اور جس کی فضیلت
 کا ہر گوشہ دنیا ہے۔ یاں شہزادی عجم۔ یاں سپہ سالار جنت۔ خود آدم آل محمدؑ سجدہ زینت
 ساجدین۔ عبادت رزق عابدین۔ کتاب زبور آل محمدؑ۔ صحیفہ انجیل اہلبیت۔ خوشی مرضی
 پروردگار اور حکم فاتح دربار دیار۔

آپ کے مشہور القاب زین العابدین اور سید الساجدین ہیں۔ عبادت کرنے والوں کی

زینت اور سجدہ گزاروں کا سردار۔ عبادت کا یہ عالم ہے کہ باغ میں ۵۰۰ درخت
 ہیں اور دو درخت ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور دنیا کو محسوس
 کرایا جاتا ہے کہ شکر پروردگار ادا کرنے والے ایسے ہوتے ہیں ہزاروں نعمتیں
 کھا کر نام خدا نہ لینے والے اور ہوتے ہیں اور ایک ایک برگ و ثمر پر شکر خدا
 ادا کرنے والے اور۔

اور جب کسی نے آکر عرض کی فرزند رسولؐ۔ آپ سجد عبادت کرتے ہیں اتنی عبادت
 کس کے امکان میں ہے تو آپ نے فرمایا بیٹا محمد یا قرۃ زراہہ صحیفہ تولاؤ جس میں
 میرے جد امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کی عبادتوں کا تذکرہ ہے۔ امام محمد یا قرۃ صحیفہ
 لائے۔ آپ نے سامنے رکھ کر فرمایا۔ ذرا میرے بعد کی عبادتوں کا حال تو دیکھو۔ اور یہ
 کہہ کر ارشاد فرمایا کہ کسی کی مجال ہے جو علیؑ کی منزل عبادت تک پہنچ سکے۔
 میں عرض کر دوں گا مولا۔ آپ زین العابدینؑ ہیں۔ بزم عابدین کی زینت ہیں۔ یہ آپ
 کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کی عبادت کے برابر کسی کی عبادت ہو سکتی ہے؟ آپ فرمائیں گے
 تجھے نہیں معلوم میری عبادت یقیناً ایسی ہے کہ پروردگار نے مجھے زین العابدینؑ قرار دیا
 ہے اور روز قیامت مجھے اسی لقب سے پکارا جائے گا لیکن میری عبادتوں کا سارا
 میری نمازوں سے ہے میرے سجدوں سے ہے۔ میرے تضرع و زاری سے ہے۔ میرے
 خضوع و خشوع سے ہے۔ میری خاکساری سے ہے۔ میری بندگی سے ہے۔ لیکن میرے
 بعد کا تو یہ عالم تھا کہ ان کی ایک ضربت عبادت ثقلین پر بھاری تھی تو اب سوچو کہ
 جس کی ایک ضربت کا یہ عالم ہے اس کی ساری ضربتیں کیسی ہوں گی اور جس کی ضربتوں
 کا یہ عالم ہوگا اس کی نمازیں کیسی ہوں گی۔ اُس کے سجدے کیسے ہوں گی اس کی عبادتیں
 کیسی ہوں گی اور اس کی بندگی کی شان کیا ہوگی۔

اس کے بارے میں تصرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مصلیٰ پر آجائے تو بھی جہاد اور مصلیٰ چھوڑ کر سوجائے تو بھی جہاد۔ سجدہ میں بھک جائے تو عین رضا پروردگار اور ہر رسول پر سوجائے تو رضا پروردگار کا سودا۔

جہادوں کی اس کثرت میں بھی محویت اور توجہ کا یہ عالم تھا کہ ابلیس ملعون اژدہ کی شکل میں مصلیٰ کے قریب آتا ہے اور آپ کے پائے اقدس کے انگوٹھے چبائے لگتا ہے اور جب آپ کے حضور و حضور میں کوئی فرق نہیں آتا ہے تو عاجز آکر چلا جاتا ہے اور فضائیں ایک آواز گونجتی ہے۔ ”انت زین العابدین“ تو زینت عابدین ہے۔ تیری جہاد پر شیطان کا اثر نہیں ہے۔ تیری توجہ پر دنیا کی کوئی طاقت اثر نہیں ڈال سکتی۔

اس مقام پر چند باتیں قابل غور ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ شیطان اژدہ کی شکل میں کیوں آیا۔ کیا کوئی اندر کل ممکن نہیں تھی۔ وہ تو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ پھر یہی شکل کیوں پسند آئی شاید راز یہ رہا ہو کہ اسی شکل میں آدم کے پاس آکے آزما چکا تھا اور ”اپنے خیال میں“ کامیاب بھی ہو چکا تھا تو چاہا کہ اس آدم کو بھی اسی انداز سے اپنی طرف کھینچ لیا جائے لیکن جلالِ امامت نے آواز دی۔ ابلیس آدم کی منزل اور ہے۔ سید الساجدین کی منزل اور۔ تو نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ تو نے خود بھی اقرار کر لیا تھا کہ مخلص بندوں کو نہیں گمراہ کر سکوں گا تو اب کس لئے آیا ہے۔ ابلیس کہے گا میں بھی چاہتا تھا کہ دنیا پہچان لے کہ جن بندوں کے مقابلہ میں میں نے شکست کا اقرار کیا ہے وہ ایسے بندے ہیں۔ دنیا داروں کے مقابلہ میں شکست کا اقرار نہیں کرتا۔

واقعہ کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب امامؑ نماز تو ڈر رہے گے۔

جان بچانے کی فکر کریں گے۔ اذیت سے فراہم کریں گے اور کچھ نہ ہوگا تو کم از کم سانپ کو دیکھ کر رو دیں گے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ نہ گریہ ہے نہ فرار۔ نہ پریشانی ہے نہ اضطراب میں عرض کر دوں گا مولیٰ! یہ آپ کا کیا عالم ہے۔ ایسے حالات میں ایسا سکون؟ آواز دیں گے فرار کا بیٹا ہوتا تو فرار کر جاتا۔ جیسے درگاہ کلال ہوں۔ دنیا کا نمائندہ ہوتا تو سانپ کو دیکھ کر رونما شروع کر دیتا لیکن نمائندہ پروردگار ہوں رونے کا کیا سوال ہے۔

عرض کر دوں گا مولیٰ! یہ سب کچھ صحیح ہے۔ جہادی جانیں نثار بینک آپ نمائندہ پروردگار ہیں۔ فرزند رسولؐ۔ زین العابدین ہیں۔ سید الساجدین ہیں فاتح کوئٹہ و شام ہیں۔ جان حسینؑ اور وارث حسنؑ ہیں۔ لیکن مولیٰ یہ بھی اژدہا ہے۔ موزی ہے کاٹنے والا ہے۔ زہر ملا ہے۔ آپ فرمائیں گے یہ سب صحیح ہے لیکن میں علیؑ کلال بھی ہوں۔ کاش تم نے علیؑ کی تاریخ بھی پڑھی ہوتی تو یقیناً تعجب نہ ہوتا۔ جب ایک علیؑ گوارے میں اژدہ کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے تو دوسرا علیؑ نماز میں مطمئن کیسے نہیں رہ سکتا اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں الٰہی نمائندہ ہوں اور الٰہی نمائندوں کی شان یہ ہے کہ وہ سانپ سے نہیں ڈرا کرتے۔ موزی قوم کی گمراہی سے خائف تھے سانپ سے نہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ سانپ غاریں آیا تو بتی نہیں ڈرے اور گودائے کے پاس آیا تو علیؑ نہیں ڈرے۔ تو جس گھر میں ڈرنے کی رسم ہی نہیں ہے وہاں ڈرنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہوتا ہے جہاں ڈرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

امام کے بعدوں کے بارے میں یہ امتیاز بھی قابل توجہ ہے کہ آپ نے جن حالات میں سجدہ کیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ یوں تو آپ کی

زندگی کا معمول تھا کہ ہر نعمت پر سجدہ۔ ہر آیت سجدہ پر سجدہ۔ ہر نماز کے بعد سجدہ اور ایسا سجدہ کہ پشانی پر گھٹے پر گھٹے گھٹے اور ہر سال اسے جدا کیا جاتا تھا لیکن ان سجدوں کے درمیان وہ سجدہ جو عمر عاشور کے بعد کربلا کی خاک پر ہوا ہے۔ وہ سجدہ جو چلے ہوئے خیمہ کی راکھ پر ہوا ہے۔ وہ سجدہ جو شام غریباں کے سناٹے میں ہوا ہے۔ وہ سجدے جو شام کے زندان میں ہوئے ہیں۔ یہ وہ سجدے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں مل سکتی اور دنیا جانتی ہے کہ عمل کی اہمیت حالات کے اعتبار سے بڑھ جاتا کرتی ہے۔ پرسکون حالات میں نماز اور ہوتی ہے اور مصائب و آلام کے وجوم میں سجدہ اور۔ سردی کے سکون آمیز دریں روزے اور ہوتے ہیں اور گرمی کی پیش خیز ہوا میں روزے اور۔ مکہ میں رہ کر حج کرنا اور ہوتا ہے اور مدینہ سے چل کر پیدل حج کرنا اور۔ یہ آل محمد کا امتیاز تھا کہ انھوں نے ہر عمل میں اپنی انفرادیت محفوظ رکھی ہے اور کسی منزل پر دامن بندگی کو ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ سجدہ کا ذکر آگیا ہے تو یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ امام زین العابدینؑ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے خاک شفا کی تسبیح اور سجدہ گاہ ایجاد کی ہے۔ اس سے پہلے معصومہ عالم کی زندگی میں تسبیح کا ذکر ملتا ہے لیکن دھبائے میں گرہیں بنا کر یا قبر خراب حمزہ کی خاک سے۔ امام زین العابدینؑ نے خاک کربلا سے تسبیح بنائی ہے اور اور گویا یہ واضح کر دیا ہے کہ تسبیح پر در و در گار کے لئے موزوں ترین خاک قبر سید الشہداء کی خاک ہے۔ اپنے دور میں حمزہ سید الشہداء تھے تو وہ ادی نے ان کی قبر کی مٹی سے تسبیح بنائی تھی اور اب میرا باب سید الشہداء ہے تو میں نے اس کی خاک قبر سے تسبیح تسبیح تیار کی ہے اور اس خاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر تسبیح پڑھنے والا خاموش بھی ہو جاتا ہے تو تسبیح کے دانے خود ذکر پر در و در گار کرتے رہتے ہیں۔ اور کیوں

نہ ہوتا جس خاک میں خون حسینؑ جذب ہو گیا ہو اس کا ذرہ ذرہ تسبیح پر در و در گار نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ گلے سے لہو کی دھار نکلتی ہے تو بقول اقبالؒ "نقش الا اللہ ہی ثبت ہوتا ہے۔"

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں تسبیح تھی اور آپ جو گفتگو تھے۔ درمیان گفتگو تسبیح کے دانوں کو گردش دیتے جارہے تھے۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آپ تسبیح سے کھیل رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا تھے اس خاک کی حقیقت کیا معلوم؟ یہ خاک خود تسبیح پر در و در گار کر رہی ہے۔

کیوں نہ ہو ایک امام کی خاک قبر ہے اور ایک امام کا دست حق پرست۔ ایک سجدہ گزار کی تربیت ہے اور ایک سید الساجدین کا ہاتھ۔ اب تسبیح میں کیا کمر باقی رہ جاتی ہے۔

خاک کربلا کی سجدہ گاہ بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ اس کے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ میں سجدہ گاہ کا رواج تھا اور مختلف اسلامی حدیثوں میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ آپ جانماز کے علاوہ ایک کھجور کا ٹکڑا بطور سجدہ گاہ استعمال کیا کرتے تھے۔ اب میں نہیں جانتا کہ حضور کو جانماز پر سجدہ کرنے میں کیا نہحت تھی کہ الگ سے ایک شے رکھا کرتے تھے اور حضور کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس طرح بت پرستی کا الزام آجائے گا اور اگر ایسا نہیں ہے اور حضور جان بوجھ کر الگ شے پر سجدہ کر رہے تھے تو ماننا پڑے گا کہ سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا بدعت نہیں بلکہ سجدہ گاہ کو ہٹا کر سجدہ کرنا بدعت ہے۔

اور اس سے بالاتر یہ کہا جائے کہ اگر سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے سے بت پرستی کا الزام آتا ہے تو ہم سے پہلے یہ الزام سرکارِ دو عالمؐ پر آئے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ

معاذ اللہ! ان کے ایمان و یقین میں کوئی کمی آگئی ہے۔ یہی نہیں۔ یہ بشریت کے تقاضے ہیں جن پر عمل کیا جا رہا ہے اور یہی تقاضے جب دب جاتے ہیں تو عصمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امام کا اطمینان آواز دے رہا ہے کہ مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جب کنواں یوسف کی زبان نہیں لے سکا تو فریوسف کو کیسے ہلاک کر سکتا ہے اور یاد رکھو۔ یہ اتفاقی حادثات نہیں ہیں کہ انسان مضطرب ہو جائے۔ اتفاق سے وہ گرتا ہے جس کے پیر میں لغزش آجاتی ہے۔ میرا فرزند معصوم ہے اس کے قدم میں لغزش کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو ایک امتحان قدرت اور اہتمام ہدایت تھا کہ میرا خلوص بھی ظاہر ہو جائے اور بچہ کا سکون بھی سامنے آجائے۔ امت کے لئے دوس ہدایت بھی فراہم ہو جائے کہ شرت مصائب میں بھی مالک کائنات پر اعتبار کرنا چاہیے اور پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اور وہ کیسے پریشان ہو گا جو نماز میں مصیبت پر آکر اپنے پروردگار سے جو گفتگو ہو اور — "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کی تلاوت کر رہا ہو۔ اضطراب اُن کا حصہ ہے جو اطاعت شیطان کر کے نماز پھوٹ دیتے ہیں اور اس لائق نہیں رہ جاتے کہ پروردگار کی بارگاہ میں ماضی دے سکیں۔ اور اطمینان ان کا حصہ ہے جو زندگی عبادت الہی میں بسر کرتے ہیں اور اتنی عبادت کرتے ہیں کہ پروردگار انھیں زمین العابدین کا لقب دے دیا کرتا ہے۔

تاریخ میں ایک واقعہ اور ملتا ہے کہ امام مصروف نماز تھے اور اتفاقاً گھر میں آگ لگ گئی۔ چاروں طرف سے شور برپا ہو گیا۔ لوگ بھانے کی دُکریں لگ گئے اور امام کی نماز کو طول ہوتا جا رہا ہے۔ خدا اُفد اگر کے نماز تمام ہوئی تو کسی نے بڑھ کر عرصہ کی۔ فرزند رسولؐ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور آپ کو فکر ہی نہیں ہے۔ یہ کون سا نذر عبادت

ہے کہ انسان اس قدر غافل ہو جائے؟ فرمایا۔ بھائی مجھے وہاں کی آگ نے یہاں کی آگ سے غافل بنا دیا تھا۔

یہ ہے انداز تبلیغ۔ ایک لفظ نے ذہن کا دھارا موڑ دیا۔ کوئی صاحب ایمان انسان ہے جو اس فقرہ کو سننے کے بعد ایک لمحہ کے لئے چونک نہ جائے۔ اور کوئی صاحب شرافت ہے جس کے ذہن میں عبادت الہی کی اہمیت کا شعور بیدار نہ ہو جائے۔ ایک معصوم اور آخرت کی آگ کا اتنا خیال اور ہم غیر معصوم اور اس قدر غافل — میں تو یہ عرض کر رہا ہوں کہ معصوم نے دو مسئلے بیک وقت حل کر دیئے۔ یہ بھی بتا دیا کہ جسے آخرت کا خیال ہوتا ہے اسے دنیا کے مصائب کی پرواہ نہیں ہوتی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ جو اُدھر متوجہ ہو جاتا ہے اس کا ادھر کا انتظام خود بخود ہو جایا کرتا ہے۔ میں نماز توڑ بھی دیتا تو کیا کرتا آگ ہی تو بجھاتا۔ وہ کام تو بالآخر ہو ہی گیا اور میرے خلوص میں بھی کوئی فرق نہیں آیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی غیر ذمہ دار ہو جائے اور گھر میں آگ لگ کر نماز شروع کر دے۔ نہیں نہیں اسلام مقابلہ کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام خلوص کا مذہب ہے۔ اب سادہ دنیا بھی ایسا ہی عمل کرے تو امام کی منزل کو نہیں پہنچ سکتی۔ ان کا عمل ان کے خلوص کی پیداوار تھا اور یہ عمل ان کے عمل کی پیداوار ہو گا۔ یہ ایمان یقین کی ایک منزل ہے جو ہر کس و نا کس کو حاصل نہیں ہوتی۔ بس انسان کا فرض ہے کہ ایسا یقین ایسا ایمان۔ ایسا عقیدہ اور ایسا عمل پیدا کرے کہ مسائل حیات خود بخود حل ہو جائیں اور عبادت الہی میں فرق نہ آئے پائے۔ یہ عبادت سے کنارہ کشی ہی کا اثر ہے کہ آج زندگی میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور حل کرنا آلا کوئی نہیں ہے۔ انسان نصرت الہی پر اعتماد کرتا تو نہ آگ سے مرعوب ہوتا نہ پانی سے شہزادہ کنویں میں گرے تو امام کے خلوص عمل پر اثر نہیں پڑا اور گھر میں آگ لگی تو اخلاص عبادت پر کوئی اثر

نہیں پڑا۔ اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے انہیں دونوں واقعات میں کردار کے دو عظیم جلوے
دیکھے ہیں۔ کل بھی ابراہیم کو آگ میں جاتے دیکھا تھا اور موسیٰ کو پانی میں اور وہاں بھی
سکون ہی نظر آیا تھا۔ بس فرق یہ ہے کہ وہاں آگ حکم خدا سے جگزا رہ گئی تھی اور موسیٰ
حکم خدا سے نریل کی بوجوں میں رہے اور زندہ رہے اور یہاں حکم خدا نہیں ہے بلکہ زندگی
خدا ہے جو آگ کو خاموش کئے ہوئے ہے اور پانی کو فرمانبردار بنا لے ہوئے ہے۔ ہمت
نہیں ہے لیکن ایک فقرہ کہہ کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں کہ جو کام کل براہ راست حکم
خدا سے ہو رہا تھا وہ کام آج زندگی خدا سے لیا جا رہا ہے اب جو حکم خدا کے سہارے
زندہ رہے وہ جناب ابراہیم اور جناب موسیٰ اور جس نے زندگی کے سہارے مشیت
کو اپنا بنا لیا وہ زمین العابدین اور سید الساجدین ہیں۔

~~~~~

## امام محمد باقر علیہ السلام

|             |                                   |
|-------------|-----------------------------------|
| اسم مبارک   | محمد                              |
| لقب         | باقر، شاکر، ہادی، امین            |
| کنیت        | ابو جعفر                          |
| والد ماجد   | امام زین العابدینؑ                |
| والدہ ماجدہ | فاطمہ بنت حسنؑ                    |
| ولادت       | یکم رجب ۵۰ھ مدینہ منورہ بروز جمعہ |
| ازواج       | دو                                |
| اولاد       | سات                               |
| شہادت       | ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۳ھ مدینہ منورہ      |
| عمر مبارک   | ۵۷ سال                            |
| قبر مطہر    | جنت البقیع                        |

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی اشرف الاولین  
والاخرین خاتم النبیین سیدنا مولانا ابی القاسم محمد وآلہ  
الطیبین الطاہرین ولعنة الله علی اعدائہم اجمعین اما بعد  
فقد قال الله الحکیم فی کتابہ الکسبیم — بسم الله الرحمن الرحيم  
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْاُولٰٓئِ

ارشاد جناب اقدس الہی ہے۔ "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے  
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" آیت کریمہ نے  
صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے ہر دور میں اپنے فریضہ ہدایت کو ادا کرنے  
کے لئے ہادی و رہنما معین کئے ہیں اور تاریخ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا  
جس میں دنیا و آخرت خدا سے خالی رہ گئی ہو۔

ہدایت کے معنی ہیں راستہ دکھانا۔ اچھ کچھ کر منزل تک پہنچا دینا ہدایت  
کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہدایت کا مفہوم منزل تک پہنچا دینا بھی اسی معنی کے  
اعتبار سے ہے کہ اگر چلنے والا راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہے تو رہنما آخری منزل تک  
اسے راستہ بتاتا رہے گا۔ ورنہ جبر و اکراہ کی صورت میں ہدایت ہدایت نہ رہ جائے گی  
قبر و استبداد کی شکل اختیار کرے گی۔ اور اس طرح عدالت پروردگار پر بھی حرف  
آجائے گا کہ ایک انسان کی مجبور و قہر منزل تک پہنچا دیا اور دوسرے کو مختار و  
آزاد بنا کر چھوڑ دیا۔

ہدایت کے مفہوم میں راستہ دکھانا شامل ہے تو ہدایت کا کام وہی شخص  
انجام دے سکتا ہے جو خود راستہ جانتا ہو۔ ورنہ اگر کوئی شخص خود راستہ سے بے خبر

ہے تو وہ کسی کو کیا راستہ دکھا سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے "کو فوشتین گم است کہ را  
رہبری کند"۔ جو خود ہی راستہ گم کئے ہوئے ہے وہ دوسرے کی کیا رہبری کرے گا۔  
رہبری کے لئے شرط اول یہی ہے کہ انسان خود راہ و چاہ سے باخبر ہو اور راستہ کے ایک  
ایک خطرہ سے آگاہ ہو تاکہ قافلہ اس کے اعتماد پر چلے تو نہ خود گمراہ ہو نہ قافلہ کو گمراہ کر سکے  
ورنہ شوق رہنمائی میں قافلہ کو بے کر چل پڑا تو ایک منزل کے بعد اعلان کرنا پڑے گا  
کہ میں تمہاری برادری کا انسان ہوں مجھ سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ خطائیں بھی ہوتی  
ہیں۔ میں راستہ بھٹک بھی جاتا ہوں۔ مجھ پر شیطان غالب بھی ہو جاتا ہے۔ لہذا اگر مجھے  
راستہ سے بھٹکا ہوا دیکھو تو راستہ پر لگا دو تاکہ دونوں صحیح راستہ پر چلیں۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ کو صحیح راستہ نہیں معلوم ہے تو آپ سے رہنما بننے کے لئے  
کس نے کہا تھا۔ اور آپ نے کم سے کم یہ تو سوچا ہوتا کہ جب رہنما کو خود ہی راستہ نہیں معلوم  
ہوگا تو قوم کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ سیدھے راستہ پر ہیں یا بھٹک گئے۔ یہ تو دوسری جہات  
کی بات ہے۔ اور اگر قوم کو راستہ معلوم ہے تو وہ کتنی بد نصیب قوم ہے جو راہ و چاہ کو  
جانتے ہوئے ایسے انسان کے پیچھے چل پڑے جسے راستہ کی فہم نہ ہو۔

ہم نے اسلام میں ایسے رہنما کے نقش قدم اختیار کئے ہیں جو کہتا ہے "مجھ  
سے جو چاہو پوچھو۔ میں آسمان کے راستوں کو زمین کی راہوں سے بہتر جانتا ہوں۔ جو ایسے  
راستوں کا جانتے والا ہوگا وہی منزل مقصود تک پہنچا بھی سکتا ہے اور میں تو یہ کہنے کا حق  
رکھتا ہوں کہ مولائے کائنات کا یہ ارشاد گرامی کہ میں آسمان کے راستوں کو زمین کے راستوں  
سے بہتر جانتا ہوں۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آسمان میں جاتے سے بھی  
راتے ہیں مادہ و انسان آسمان کی طرف بھی جاسکتا ہے۔ اور یہ اشارہ اس لئے کر دیا کہ  
سیکڑوں سال کے بعد اگر انسان آسمان کی طرف جانے لگے تو اس کے ذہن میں یہ  
حور نہ پیدا ہو کہ اس نے وہ کام انجام دیا ہے جس کی طرف اسلام کے رہنما

کاذب بھی نہیں پہنچا تھا۔ اسلام کے رہنمائے یہ عقدہ ۴۴ سو سال پہلے ہی کھول دیا تھا۔ اور واضح کر دیا تھا کہ علمی راہ میں ترقی کرنے والا اتم مسیحا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ فرض ہے کہ میری بارگاہِ علم میں سر تسلیم خم کر دو۔ جب ۴۴ سو سال بعد کے ترقی یافتہ اہل علم علیٰ مقابلہ نہیں کر سکتے تو کل کے عرب صحرائی کیا مقابلہ کرتے جنہیں اپنے برابر والوں کے برابر بھی علم نہیں تھا۔ صلوات

آسمان کے راستوں سے واقفیت کے اعلان میں یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ زمین والوں کا کیا ذکر ہے آسمان واسے بھی ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو مجھ سے بہتر کوئی راہ نشانہ ملے گا اور اس بستی میں بھی کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو مجھ سے بہتر راہ چاہے یا خبر ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ امت اسلامیہ نے ایسے عالم آگاہ راہ نما کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مستند صدارت پر جگہ دے دی جنہیں خود اپنی بھی خبر نہیں تھی اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کب تک راہ راست پر رہتا ہوں اور کب راتہ سے بھٹک جاتا ہوں۔ ورنہ اتنا بھی معلوم ہوتا تو میرے راستہ پر چلنے میں کیا زحمت تھی۔ صلوات

دین اسلام کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے کسی دگر میں بھی جا بن رہنمائوں کو اختیار نہیں کیا۔ اور روز اول سے اپنا امتیاز علم و کمال کو قرار دیا ہے۔ ملائکہ کے علمی کمال میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی تبلیغ و تہلیل میں کوئی نقص نہیں تھا۔ ان کے تقدس پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کی عصمت مسلم تھی۔ ان کی عقاد کا یہ عالم تھا کہ جو رکوع میں ہے وہ رکوع میں ہے۔ جو سجدہ میں ہے وہ سجدہ میں ہے۔ جو قیام میں ہے وہ قیام میں ہے۔ کوئی ہواؤں کا ذرہ دار ہے۔ کوئی بارش کے قطرہوں کا محاسب و محافظ ہے۔ کوئی تخلیق بشر کا نگراں ہے۔ کوئی وحی کا امین ہے۔ کوئی جنت کا رضوان ہے۔ کوئی جہنم کا مالک ہے۔

کوئی ارواح کا قابض ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی منصب ہدایت کا حقدار نہیں تھا۔ اور سب کے سب آدم کے مقابلہ میں آئے تو خلافت الہیہ کے لئے ناموزوں ثابت ہوئے۔ اس لئے کہ دین الہی میں ذاتی تقویٰ اور تقدس معیار نہیں ہے۔ ہدایت قوم و ملت معیار ہے اور ہدایت کے لئے علم ضروری ہے۔ یاد دہرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ منزل ہدایت میں صرف علی کافی نہیں ہے، علم بھی لازم ہے اور اب ہر انسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جب ملائکہ معصوم تھے اور صرف علم میں آدم سے کم تھے تب تو خلافت الہیہ ملی نہیں۔ تو اگر کوئی علم میں بھی خالی اللہ ہیں ہوا اور علی میں بھی غیر معصوم ہو تو وہ منصب خلافت کا کیوں کر حقدار ہو سکتا ہے۔ صلوات

قانون ہدایت کا یہی تحفظ تھا کہ ملائکہ کائنات نے ہر دور میں صاحبان علم و کمال کو پیدا کیا اور انہیں ہدایت امت کا ذمہ دار بنایا۔ ان کی تخلیق دنیا کی تخلیق سے الگ رہی۔ ان کا کمال دنیا کے کمال سے الگ رہا۔ ان کا کردار دنیا کے کردار سے الگ رہا۔ اور یہ سب اس لئے رہا کہ انہیں دنیا کو ہدایت دینے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ اور کائنات کو ہدایت لینے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ ان کے بچنے کے حالات دیکھئے تو اندازہ ہو گا کہ جتنا علم اہل دنیا زندگی بھر میں نہیں حاصل کر سکتے اس سے زیادہ علم وہ اپنے ہمراہ لے کر آتے ہیں۔ بچنے میں ایسے ایسے عقدے حل کرتے ہیں کہ بورہوں کے دماغ چکر اجاتے ہیں۔ امیر المومنین کا آغوش رسول میں تلاوت صحف کرنا آپ نے سنا ہی ہے۔ تین دن کی عمر ہے اور توریت داخیل و زبور کی تلاوت ہو رہی ہے۔ اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ آج موقع ہے دیکھ لو اور سن لو۔ لیکن ہے کہ میری جنت کے بچنے کے حالات نہ دیکھ سکو تو یہ ذہن میں رہے کہ میری نسل میں جو بھی امام بن کر آئے گا وہ اسی انداز سے کمال کا حامل ہو گا اور اس

کے علم کا یہ عالم ہوگا۔۔۔ وہ اپنے علم کا اظہار نہ کرے یہ ممکن ہے لیکن علم سے  
خانی ہو یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔ اور اظہار بھی کرے تو کس کے سامنے کرے۔  
جب خود سے خود علم کے اظہار پر دینا بہک جاتی ہے۔ اور کبھی دیوانہ کہنے  
لگتی ہے کبھی خدا۔۔۔ تو اگر سارے علوم کا اظہار کر دیا جائے تو کائنات کا  
دماغ ہی اٹ جائے گا۔ یہ تو میرا مقدّر تھا کہ مجھے ایسا حسین موقع مل گیا جیسا موقع خود پتھر  
اسلام کو بھی نہیں ملا تھا۔ تو نے تلاوت کر دی لیکن میری تلاوت کا مقصد یہ نہیں تھا  
کہ میں وہ جانتا ہوں جو حضور سرور کائنات بھی نہیں جانتے (معاذ اللہ)۔ سرکار  
مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اور میں ان کا وہی۔ میرے سوا نہ کرنے  
کی منزل صرف یہ ہے کہ مجھے مقدر سے ایسا موقع مل گیا کہ حضور بیٹا سننے والا موجود  
تھا تو میں نے تلاوت کر دی۔ اور سرکار کو کوئی ایسا مخاطب نہیں ملا اس لئے  
آپ نے تلاوت نہیں کی۔ خبردار یہ نہ سوچنا کہ سرکار کے علم میں کوئی نقص تھا یہ  
موقع کی بات ہے۔ کسی کو سامعین مل جاتے ہیں کسی کو نہیں ملتے۔ اپنے ہی ماحول میں  
اذانہ کر لیجئے کہ جیسا مجمع ہوتا ہے ویسی ہی مجلس پڑھی جاتی ہے۔ اہل علم کا مجمع ہوتا ہے  
تو علمی مسائل جھڑے جاتے ہیں اور میدے سادے عوام ہوتے ہیں تو فضائل و  
مصائب کا تذکرہ کر کے ثواب حاصل کر لیا جاتا ہے۔ جیسا مجمع ہوتا ہے ویسا ہی  
بیان ہوتا ہے۔ یوں ہی اذانہ کر لو کہ سرکار دو عالم کے وقت ولادت ایسا کون  
تھا جسے قرآن پڑھ کر سناتے اور اس کے سامنے آسمانی کتابوں کی تلاوت کی جاتی  
میرے سامنے تو سرکار جیسا مخاطب موجود تھا۔ میں نے اپنے کمال کا مظاہرہ  
کر دیا اور شاید قدرت کا یہی اہتمام تھا کہ حضور کو کوئی مخاطب ملے یا نہ ملے مجھے  
ضرور مل جائے۔ اور وہ تلاوت کریں یا نہ کریں لیکن میں اپنے علم و کمال کا اظہار  
ضرور کر دوں۔ اس لئے کہ مرسل اعظم نے تلاوت نہیں کی لیکن دینا نے انہیں

نبی مان لیا۔ اور میں نے تلاوت کر دی جب بھی مجھے امام نہیں مانا گیا۔ تو آپ سوچیں  
جب تلاوت کرنے کے بعد بٹ دھرمی کا یہ عالم ہے تو اگر کہیں تلاوت نہ کی ہوتی  
تو کیا ہوتا۔ صلوات۔

تاریخ عصمت میں جس فرد کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اس میں کمالات کا یہی  
انداز نظر آئے گا۔ اور فضائل کا یہی احکام نگاہ کے سامنے آئے گا۔ یہ ادراکات ہے  
کہ قدرت نے حالات کے اعتبار سے اظہار کمال کے مواقع الگ الگ عنایت کئے ہیں اور  
جیسا موقع ہوا ویسے کمال کے اظہار کا حکم ہوا۔ کسی کی شجاعت ظاہر ہوئی۔ کسی کا کرم  
ظاہر ہوا۔ کسی کے صبر کا اظہار ہوا۔ کسی کی عبادت کا اظہار ہوا۔ کسی کا علم سامنے  
آیا۔ کسی کی صداقت سامنے آئی۔ کسی کا علم دیکھنے میں آیا۔ کسی کی شان تسلیم و رضا  
نظر آئی۔ کسی کا تقویٰ دیکھا گیا۔ کسی کی بہارت نظر آئی۔ کسی کا عسکری جلال  
دیکھنے میں آیا۔ اور کسی کی شان ہدایت انشہ دیکھنے میں آئے گی کہ ایک مرکز پر  
سارے کمالات جمع ہوں گے۔ ایک نقطہ میں سارا قرآن سمٹا ہوگا۔ اور ایک فرد ہوگا  
جو بیک وقت محمد بھی ہوگا۔ علی بھی۔ حسن بھی ہوگا حسین بھی۔ عابد بھی ہوگا باقر  
بھی۔ صادق بھی ہوگا کاظم بھی۔ رضا بھی ہوگا تقی بھی۔ فقی بھی ہوگا عسکری  
بھی اور روح صداقت آواز دے گی۔ ادلنا محمد داو سطن محمد و آخونا  
محمد و کلنا محمد۔ صلوات

حالات ہی کے اعتبار سے جس شخصیت کو سب سے پہلے اظہار کمال کا ایک  
مدت کے بعد موقع ملا وہ امام محمد باقر تھے۔ جن کا جشن ولادت یکم رجب کو منایا  
جاتا ہے اور جن کی تاریخ سے اس پر بہارِ مہینہ کا آغاز ہوتا ہے جس کے آغاز میں امام  
محمد باقر کی ولادت ہے اور انجام کے قریب سرکار دو عالم کی بعثت و مہراج۔ اب  
آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کتنا با عظمت زمانہ ہے جس میں کوئی علم لے کر آ رہا ہے کوئی

معراج کی منزلوں میں جا رہا ہے۔ صلوات

آپ سے پہلے کمالات کے اظہار کا کچھ موقع مولائے کائنات کو ملا تھا۔ لیکن آپ کے دور میں وہ مشکلات تھیں۔ ایک تو یہ کہ علمی ماحول اس منزل تک نہیں پہنچا تھا کہ لوگ آپ کے علم سے باقاعدہ فائدہ اٹھا سکتے۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ براہ راست محاذ پر تھے۔ اس لئے آپ کی زندگی کو خانہ جنگیوں میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ کہ آپ کے کمالات سامنے نہ آنے پائیں۔ امام محمد باقر کے ساتھ یہ امتیاز تھا کہ آپ کے دور میں علم و فلسفہ کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا۔ اور امت اسلامیہ کے علاوہ دوسرے افراد بھی علوم و فنون سے کافی دلچسپی لینے لگے تھے۔ اہل علم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ اور تشنگان علوم کی ایک اچھی خاصی تعداد فراہم ہو گئی تھی اور یہ بھی ایک امتیاز تھا کہ آپ براہ راست محاذ جنگ پر نہیں تھے اور جب آپ کے سامنے ریاست کی پیش کش ہوئی تو آپ نے نہایت خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا تاکہ ارباب اقتدار حکومتی دائرہ گیر میں معروف ہو جائیں۔ اور ہم تصور ساز وقت نکال کر اپنے فضائل کمالات کا اظہار کر دیں۔ حکومتیں آپ کی طرف سے غافل نہیں تھیں۔ اور برابر درجے آزار تھیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ سامان آزار ہی ذریعہ تبلیغ بن گیا جیسا کہ آئندہ اشارہ کیا جائے گا۔ فی الحال تو صرف یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ مالک کائنات نے رسولؐ کے اس وارث کو علمی کمالات کے نشر کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اس لئے نام محمدؐ دیا اور لقب باقر۔ باقر کے معنی خشکافہ کرنے والا۔ اور چونکہ آپ نے علمی سائل میں کافی دست دی ہے۔ اور ایسے ایسے اسرار و اسرار کئے ہیں جہاں تک عام انسانوں کا ذہن بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اس لئے اہل دین نے بھی آپ کو باقر تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کے اس علمی کمال کا اعتراف کیا ہے۔ امت اسلامیہ کے چند امام۔ ابوحنیفہؒ، زہریؒ، اوزاعیؒ اور عطاء اللہؒ آپ کے شاگرد تھے

اور آپ کے علوم و کمالات سے استفادہ کر رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شاگرد کو امت کا امام تسلیم کر دیا گیا۔ اور اتنا دیکھتے ہی نہ اس کی اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے جس کو علمی نے ہلاکت سے بچایا تھا وہ امت کا راہنما ہو گیا۔ اور جس علمی نے بچایا تھا وہ دنیا کی نگاہ میں کچھ نہ ہو سکا۔ صلوات

امام محمد باقرؑ کی ولادت دیجات میں قدرت نے ایک نیا اہتمام کیا ہے کہ شہرہ میں یکم ربیع کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۱ سالہ میں ۷ ذی الحجہ کو شہادت۔ ۵ سال اس راہ دنیا میں زندگی گزاری۔ مختلف حکام دنیا کا دور حکومت دیکھا اور ہر ایک کے حکمرانی کو موسمی انداز سے باطل کرتے رہے جس کی تفصیل چند نمونوں کے بعد عرض کی جائے گی۔ اس وقت تو صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ آپ کی حیثیت سلسلہ امامت میں پانچویں امام کی ہے اور سلسلہ عصمت میں ساتویں معصوم کی۔ اور انیس و دونوں چیزوں کو جو کر لیا جائے تو آپ کا سن ولادت بھی مکمل آتا ہے اور عمر مقدس بھی ۵۵ اور ۷۷ کرے ہوتے ہیں اور شہرہ ہم ہی آپ کی ولادت کا سال ہے۔ اور حسن اتفاق سے یہی ۵۵ سال عمر شریف بھی ہے۔ گویا فطرت اعلان کر رہی ہے کہ آج جو فرزند عالم وجود میں آ رہا ہے وہ عصمت کا بھی وارث ہے اور امامت کا بھی۔ اور اس کی زندگی عصمت کے اظہار کمال میں بھی گزرے گی اور امامت کے اعلان جمال میں بھی۔ صلوات

آپ کی ولادت باسعادت کی خیر سیر ایک مدت پہلے خود مرسل اعظمؐ دے گئے تھے۔ جب آیت اولی الامر نازل ہوئی اور جابر بن عبد اللہ انصاری نے سوال کیا کہ حضورؐ وہ اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت واجب کی گئی ہے تو آپ نے اپنے ظل وارثوں کے نام یکے بعد دیگرے بیان فرمائے۔ اور جب پانچویں وارث کا نام آیا تو فرمایا جابر تم میرے اس وارث سے ملاقات بھی کر دو گے۔ اور دیکھو جب اس سے

طلاقات کرنا تو میرا سلام کہہ دینا۔ زمانہ گزر رہا گیا۔ مرسل اعظم نے انتقال بھی فرمایا ایک عرصہ کے بعد مولائے کائنات کی شہادت بھی ہوئی۔ مولائے کائنات کے بعد امام حسن مجتبیٰ شہید ہوئے۔ امام حسن کے بعد ائمہ مد میں واقعہ کربلا بھی پیش آیا۔ اور جابر کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی ہے۔ ضعیف نہیں ہو گئے ہیں اور تقریباً نابینا بھی۔ لیکن اعتماد یہ ہے کہ جب تک رسول کے پانچویں وارث سے طلاقات نہ ہو جائے گی اور اس تک حضور کا سلام نہ پہنچا دیں گے۔ موت نہیں آسکتی اسی انتظار میں کبھی مسجد نبوی میں آگے بیٹھتے۔ کبھی مدینہ کی گلیوں میں یا باقر یا باقر کی آوازیں بلند کرتے۔ عالم یہ تھا کہ سننے والے جابر کو دیوانہ کہنے لگے تھے۔ اور عوام کا خیال یہ تھا کہ ضعیفی کی وجہ سے دماغ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ اور یہ اس طرح یا باقر یا باقر کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ کسمانے پوچھا جابر کسے تلاش کر رہے ہو؟ جابر نے فرمایا۔ پیغمبر نے اپنے پانچویں وارث سے طلاقات کی خبر دی ہے۔ اس کا جستجو کر رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا جابر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ معاذ اللہ عجیب و غریب ہے۔ جابر نے کہا کچھ سہی جب میرے حبیب نے کہا ہے تو طلاقات ضرور ہو گی۔ لوگ مذاق اڑاتے رہے دیوانہ کہتے رہے۔ اور جابر اپنا نعرہ لگاتے رہے۔ اور دل کر یہ اطمینان رہا کہ لوگوں کے مذاق اڑانے سے بیان یا پیغمبر غلط نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے دیوانہ کہنے سے کوئی دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا کیا بھروسہ ہے یہ تو کل حضور کو بھی دیوانہ کہہ رہے تھے۔ اور جب امت امامت کے مسئلہ میں سرکار پر ہدیان کا الزام لگا سکتی ہے تو میری کیا حیثیت ہے۔ یہ صلوٰات تلاش جاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن امام محمد باقر سے طلاقات ہو گئی۔ آپ نے فرمایا جابر جیسے تلاش کر رہے ہو وہ میں ہی ہوں۔ جابر نے کہا شہزادے ذرا دو قدم آگے بڑھو۔ امام آگے بڑھے۔ کہا ذرا پیچھے ہٹو۔ امام پیچھے ہوئے۔ جابر نے بڑھ کر گئے سے لگایا۔ کہا یہ وہی علامت ہے جو حضور نے بیان کی تھی۔ یہ وہی انداز رفتار

ہے جو سرکار دو عالم کا تھا۔ آپ نے فرمایا جابر وہ سلام کیوں نہیں پہنچاتے جو میرے جد نے بطور امامت تمہارے پاس محفوظ کر لیا ہے۔ جابر نے عرض کی فرزند رسول میں اسی سلام کے لئے تو آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر پیشانی اقدس کو بوسہ دیا۔ اور اب یہ معمول ہو گیا کہ روزانہ در دولت پر حاضر ہوتے اور امام سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ کہاں جابر کی ضعیفی اور کہاں امام کا بچپنا۔ لیکن جابر نے علوم و کمالات حاصل کر کے واضح کر دیا کہ علم و کمال سن و سال کا باند نہیں ہوتا۔ اور یاد رکھو امامت کا بچپنا صحابیت کے بڑے بڑے سے بہتر ہوتا ہے۔ صحابیت اہل عقل کا شرف ہے اور امامت اہل بیت کا حصہ ہے اور اہلیت گھر کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ — صلوٰات (مناقب)

اس منزل کمال پر یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقر نے فرمایا جابر تم میرے جد کی خدمت میں رہے۔ مولائے کائنات کا دور دیکھا۔ امام حسن مجتبیٰ اور امام حسین سے شرف استفادہ حاصل کیا۔ بتاؤ اب تمہاری منزل ایمان کیا ہے؟ — عرض کی فرزند رسول میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ لیکن جب آپ نے سوال کر لیا ہے تو عرض کر رہا ہوں کہ اب دنیا لنگا ہوں سے یوں گر گئی ہے کہ غربت کو دولت سے بہتر سمجھتا ہوں۔ ضعیفی کو جوانی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ مرض کو صحت پر ترجیح دیتا ہوں اس لئے کہ دولت میں بہکنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور غربت میں خدایا داتا ہے۔ جوانی میں لغزش کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور ضعیفی میں انسان موت کو یاد کرنے لگتا ہے۔ صحت میں خدا کو بھول جاتا ہے اور مرض میں خدایا داتا ہے۔

آپ نے فرمایا بس! جابر جتنی مغلوں میں رہنے کے بعد ابھی ایمان اس منزل سے آگے نہیں بڑھا ہے؟ عرض کی فرزند رسول۔ اب اس سے بہتر یہ ہے۔

منزل ہے۔ ہماری منزل تمام ہو گئی۔ لیکن فرزند رسولؐ یہ تو فرمائیے کہ آپ کی شان ایمان کیا ہے۔ اور آپ حضرات کی معرفت کا کیا انداز ہے؟

امام کے جواب کو عرض کرنے سے پہلے ایک فقرہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہر سوال ہمارے آپ کے سامنے آتا تو کیا ہم اتنا بھی کہہ سکتے تھے جتنا جابر نے کہا۔ خدا کی قسم ہم اظہار ایمان میں مبالغہ بھی کرتے تو شاید اتنا بلند جواب نہ دے سکتے جتنا عظیم جواب جابر نے دیا ہے۔ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی انسان غربت کو دولت پر ترجیح دے گا۔ مرض کو صحت پر ترجیح دے گا۔ ضعیفی کو جوانی پر ترجیح دے گا۔ ہمارے یہاں تو ہر آن دولت کی دعا ہے۔ صحت کی تمنا ہے اور جوانی کو باقی رکھنے کی کوشش ہے۔ دنیا کا کون انسان ہے جو دولت کے بجائے غربت کی تمنا کرے۔ صحت کے بجائے مرض کی آرزو کرے۔ جوانی کے بجائے ضعیفی کی تمنا کرے۔ یہ جابر کا کمال ایمان تھا کہ جتنا ہم نے سوچا بھی نہیں اتنا انہوں نے کر کے دکھلایا۔ لیکن امامؑ نے اسے بھی ناکافی کہہ دیا۔ اب آپ خود تصور کریں کہ جابر کے دل پر کیا گزری ہوگی اور جابر کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزر جاتی۔ یہ جابر کا ظرف تھا کہ جانتے تھے کہ اہلبیتؑ اور عزت رسولؐ کا مرتبہ صحابیت سے بلند تر ہوتا ہے اور ان کے پاس کوئی منسل ایسا نہیں ایسا ضرور ہوگی۔ جس پر دوسرے افراد امت فائز نہیں ہیں۔ اسی لئے عرض کی کہ فرزند رسولؐ! وہ منسل ایمان کیا ہے جس پر آپ حضرات فائز ہیں۔ امامؑ نے فرمایا جابر تمہارے ایمان میں نقص یہ ہے کہ تم نے اپنے حالات کا فیصلہ خود کر لیا اور یہ کہہ دیا کہ میں غربت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں ضعیفی کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں مرض کو ترجیح دیتا ہوں۔ جابر یہ "میں" کیا ہے۔ ایمان میں اس "انا" کی گنجائش نہیں ہے۔ یاد رکھو۔

جب تک "میں" سلامت رہے گا ان کامل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اور تمہارے ایمان میں یہی فرق ہے کہ تم اپنی بہتری کا فیصلہ خود کرتے ہو۔ اور ہم اس فیصلہ کو رب العالمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہماری نظریں نہ غربت بہتر ہے نہ دولت نہ صحت بہتر ہے نہ مرض۔ نہ جوانی بہتر ہے نہ ضعیفی۔ ہم تو اسی کو بہتر سمجھتے ہیں جسے پروردگار ہمارے حق میں بہتر سمجھتا ہے۔ صلوات

ارباب کرم! امامؑ اور غلام کے ایمان و عرفان میں کتنا فرق ہے اور میرے خیال میں اتنا فرق تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ صحابیت کا ایمان اس سے آگے بڑھ بھی نہیں سکتا اور امامت کا ایمان اس سے گھٹ بھی نہیں سکتا اور راز بھی یہ ہے کہ صحابیت لاکھ ٹیک کر دار ہو جائے اس کا ارادہ اپنا ارادہ ہوتا ہے اور اس کی مشیت اپنی مشیت رہتی ہے۔ امامت کا مسئلہ اس سے مختلف ہو یہاں ارادہ و مشیت سب رب العالمین کے ہاتھوں میں ہے اور اس کا اعلان ہے "اے اہلبیت! تم وہی چاہتے ہو جو خدا چاہتا ہے" اور جب ارادہ و مشیت بھی ارادہ و مشیت پروردگار کا تابع ہے تو اپنے فیصلہ کا امکان ہی کیا ہے۔ اب تو یہ وہی چاہیں گے جو خدا چاہے گا۔ وہی بولیں گے جو خدا چاہے گا۔ وہی کریں گے جو خدا چاہے گا۔ ان کی زندگی ہے تو اللہ کے لئے۔ ان کی موت ہے تو اللہ کے لئے۔ اور ان کا غرہ ہے تو اللہ — صلوات

عزیزان محترم! ہمیں سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا کہ کل جب جنگ خندق میں مولائے کائنات میدان کی طرف چلے تو رسول اللہؐ نے فرمایا۔ آج کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ اور دنیا حیرت زدہ تھی کہ یہ کل ایمان کا کیا مطلب ہے اور اگر ایک انسان کل ایمان ہو گیا تو باقی افراد کا کیا حشر ہو گا۔ کیا وہ سب ایمان سے خارج ہو جائیں گے۔ کیا ایمان میں

علیؑ کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن آج واضح ہو گیا کہ جب تک ذات اور مشیت کی نسبت انسان کی طرف رہتی ہے ایمان کامل ہوتا ہے اور انسان کل ایمان نہیں ہوتا۔ اور جب ذات اور مشیت بھی اسی کے حوالے ہو جاتی ہے تو کل ایمان کی منزل آ جاتی ہے۔ علیؑ کے ساتھ یہ منزل تھی۔ علیؑ نے ہجرت کی ذات نفس چھ کر ذات کو اس کا بنا دیا۔ اور منزل علیؑ میں رسالت کے نقش قدم پر قدم جما کر ذات کو اس کا بنا دیا۔ اب اس کے بعد پیغمبر کا فریضہ ہے کہ کمال کر دے اور اس کا اعلان کریں۔ اور یہ بتادیں کہ اب نہ نفس علیؑ کا نفس ہے اور نہ ارادہ علیؑ کا ارادہ ہے۔ چنانچہ پیغمبر نے دونوں حقیقتوں کو ایک لفظ میں سمیٹ کر خندق کے دن اعلان کر دیا کہ کہ آج کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ صلوات

یہیں سے کل کفر کے معنی بھی سمجھ لیجئے کہ رسالت کی نگاہ میں کفر کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ذات کو اپنی ذات اور ارادہ کو اپنی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اور دونوں پر خدا سے زیادہ بندہ کا حق تصور کیا جاتا ہے ایمان کے لئے اولیٰ بالتصرف کا عقیدہ واجب ہے۔ جہاں سے اس عقیدہ میں فرق آیا اور کسی شے کے اپنی ملکیت ہونے کا تصور پیدا ہوا وہیں سے سرحد کفر شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر آپ دونوں کی علامتیں پہچانتا چاہتے ہیں کہ کب ذات خدا کی ملکیت رہتی ہے اور کب اپنی ملکیت بن جاتی ہے کب ارادہ تابع مشیت ہوتا ہے اور کب ارادہ اپنا بن جاتا ہے۔ تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میدان جہاد میں چلے آئیے اور دیکھئے اگر خدا ذات کو واپس لینا چاہتا ہے اور بندہ واپس کر دے تو یہ ہے ایمان اور اگر واپس کرنے میں شکست کرنے تو یہ ہے آغاز کفر۔ اگر نبیؐ اپنے فیصلہ پر عمل

کرنے کے لئے بلائے اور عجاہ پلا آئے تو یہ ہے ایمان اور اگر عجاہ اپنی جان کی فکر میں نبیؐ کے فیصلہ کو نظر انداز کر دے تو یہ ہے ابتدائے کفر۔ اور شاید اسی نکتہ کی طرف جنگ احد میں مولائے کائناتؑ نے اشارہ فرمایا تھا کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے پوچھا یا علیؑ! سب چلے گئے تم کیوں نہیں گئے تو فرمایا یا رسول اللہؐ کیا ایمان کے بعد کفر اختیار کروں۔ مولائے کائنات کا یہ اعلان صاف واضح کر رہا ہے کہ نفس کو اپنا نفس سمجھنا کفر ہے اور ارادہ کو اپنا تابع سمجھنا شرک۔ کمال ایمان یہی ہے کہ خدا کی راہ میں جان بھی قربان کر دے اور نبوت کے سانچے میں زندگی بھی ڈھال دے۔ صلوات

جناب جابرؓ کا ذکر آ گیا ہے تو ایک واقعہ کی طرف اور اشارہ کر دوں ایک مرتبہ جناب جابرؓ حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ رقم کی درخواست پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا ہم اہلبیت کے پاس مال دنیا سے کیا ہے۔ جابرؓ خابوش ہو گئے۔ حضورؐ فرمادے کہ ایک شاعر آگیا۔ عرض کی فرزند رسولؐ! آپؐ کی شان میں ایک قصیدہ عرض کیا ہے۔ سننا چاہتا ہوں آپؐ نے فرمایا بیشک سننا۔ اس نے قصیدہ عرض کیا۔ آپؐ نے خادم کو حکم دیا۔ اس نے اندر سے ایک عقلی لا کر دیدی۔ اس نے عرض کی حضورؐ ایک اور کہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ بھی سننا۔ اس نے وہ بھی سنایا۔ آپؐ نے ایک عقلی درہم دینار کی اور عنایت کر دی۔ اس نے عرض کی حضورؐ ایک قصیدہ اور ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ بھی سننا۔ اس نے قصیدہ سنایا اور آپؐ نے ایک عقلی اور عنایت کر دی۔ اس نے عرض کی کہ فرزند رسولؐ! یہ اشعار میں نے غلو سے کہے ہیں۔ میرا مقصد آپؐ کی مدح و ثناء ہے۔ درہم دینار نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہ صحیح ہے لیکن وہ تھلا کام تھا یہ بیسرا کام ہے۔ یہ کہہ کر وعلیؑ آخرت بھی دی۔ کیا کہنا اس شاعر کا جس

غلوں سے مدح امام کے دنیا بھی حاصل کر لی اور دین بھی حاصل کر لیا۔ شعراء کرام کے لئے یہ ایک درس عبرت ہے کہ مدح معصوم میں دنیاوی جذبات مثال نہ کریں۔ اور غلوں دل سے مدح سولا کریں۔ پھر دیکھیں کہ اس بارگاہ سے کیا طلب ہے اور مومنین کرام کے لئے بھی ایک درس نصیرت ہے کہ غلوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے معاملات کو آخرت پر ڈال دیا جائے۔ اور مذہبی معاملات کو مفت کا کام بنا دیا جائے۔ امام عہد باقرؑ نے واضح کر دیا کہ غلوں سے مدح کرنا شاعر کا کام ہے اور شاعر کی خدمت کرنا قوم کا فرض ہے۔ صلوات

اس واقعہ سے وہ تمام مسائل بھی حل کئے جاسکتے ہیں جو اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور محال و محسوس کی بحثیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ امامؑ نے درہم و دینار سے شاعر ہی کو نوازا ہے۔ اور آج ذکر اہلبیت پر تحفہ و ہدیہ و نذرانہ لینے پر شاعر ہی اعتراض کرتا ہے۔ اس سے زیادہ احسان فراموشی کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ شاعر غفلت ہو تاکہ تو عاقبت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور فن کار ہوتا ہے تو اعتراض پر نگاہ رکھتا ہے۔ صلوات

امام نے شاعر دربار کو درہم و دینار کی مثالی عنایت کر دی لیکن جابر کے ذہن میں ایک پہلی جگہ گئی۔ منتظر ہیں کہ یہ شاعر جائے اور میں اپنا مدعا بیان کروں۔ خدا خدا کر کے وہ رخصت ہوا اور جابر کا بیان شروع ہو گیا فرزند رسولؐ ابھی تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے اور اتنی دیر میں درہم و دینار کی تمیلیاں نکل آئیں۔ آخر یہ کیا مصلحت ہے کہ ایک چاہنے والے کو یوں نواز دیا جائے اور ایک کو کو یوں محسوس و م رکھا جائے۔ آپؐ نے فرمایا جابر! حجرہ کے اندر جا کر دیکھ

لو حجرہ اب بھی خالی ہے۔ لیکن ہم اہلبیت کو پروردگار نے کچھ اسرار و اختیار دے رکھے ہیں جنہیں دوسروں پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔ جابر یہ ایک راز الہی ہے جو تمہارے سامنے آیا۔ ہم اہلبیت صاحبان اقتدار بھی ہیں اور بظاہر مفلس و نادار بھی۔

امام کی مصلحت امام ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ جابر کو ایک قسم کی تعلیم تھی کہ انسان کو حالات پر سبیر کرنا چاہئے۔ اور حتمی الامکان قناعت سے کام لینا چاہئے۔ ہفتہ بھیلانا مناسب نہیں ہے۔ وہ کسی کے سامنے ہو۔ اور پھر جب امامؑ کے دربار میں آگئے تو وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو خود ہی عنایت کر دیں گے۔ انہیں تو سب کے حالات کا علم ہے۔ یہی فرق ہے صحابی کے ایمان میں اور آل محمدؑ کے عرفان میں۔ صحابی ضرورت مند ہو جائے تو دست سوال بھیل دیتا ہے۔ اور آل محمدؑ فاسق بھی کرتے ہیں تو دست سوال دراز نہیں کرتے۔ ان کی شان عمل یہ ہے کہ اپنی منزل ہوتی ہے تو جو کی سوکھی ردی زانو سے دبا کر توڑتے ہیں۔ اور دوسروں کا معاملہ ہوتا ہے تو بھرا گھر لٹا دیتے ہیں۔ سورہ دہران کی اسی شان کرم کا گواہ ہے کہ سائل کو کھانا کھلا دیتے ہیں لیکن خود پانی سے افطار کر کے سو جاتے ہیں۔ صلوات

امام محمد باقرؑ کی زندگی کے تذکرہ میں چند مسائل کا تذکرہ کرنا یہ حد ضروری تھا لیکن اب اس کا عمل نہیں رہ گیا۔ خاتمہ کلام میں صرف بعض نکات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے علم کے سلسلے میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ حاکم شام ہشام بن عبد الملک کو حضرت کے علوم و کمالات اور آپ کی طرف دینائے اسلام کی توجہ خاص کی خبر ملی تو اس نے بابا کہ آپ کو مدینہ سے دمشق

بلکہ نظر بند کر دیا جائے اور لوگوں کو ملاقات کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر حضرت کو طلب کر لیا۔ آپ مدینہ سے روانہ ہوئے تو امام جعفر صادق آپ کے ہمراہ تھے۔ منزلیں طے کرتے ہوئے دمشق پہنچے۔ یہاں تین دن بیرون دربار روکا گیا تاکہ قوم کی نگاہ میں ان کی عزت ٹھٹھٹ جائے اور تین دن کے بعد داخلہ کی اجازت ملی تو اس اہتمام کے ساتھ کہ دربار میں تیر اندازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہشام نے حضرت کو دیکھتے ہی کہا کہ آپ بھی تیر اندازی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ضعیفی میں تیر اندازی کی تاب کہاں۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس نے اصرار کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ عاجز رہ جائیں تو قوم کو یہ سمجھانے میں آسانی ہوگی کہ آل محمد کے پاس دعوے بہت ہیں جو ہر کچھ نہیں ہے۔ لیکن قدرت کا اہتمام تھا کہ تو سبھی تیرے ہی ذریعہ کمال کا اعلان ہو۔ اصرار تمام کے بعد تیر و کمان حضرت کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ آپ نے ایک تیر نشانہ پر مارا۔ ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ دوسرا تیر اس تیر پر مارا۔ تیسرا تیر اس تیر پر مارا۔ یہاں تک کہ نو تیر اسی طرح مارے کہ فضا میں تیروں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ ہشام یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ اور کہنے لگا یہ فن آپ نے کہا ہے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اہلبیت دنیا میں کچھ نہیں سیکھتے۔ ہمارے کمالات پروردگار کا عطیہ ہیں۔ ہشام یاد رکھنا چاہئے میں ایک مرتبہ تیر اندازی کی تھی یا بڑھاپے میں آج تیر اندازی کی ہے۔ لیکن کمال میں فرق نہیں آیا۔ اب دنیا سمجھ لے کہ امامت میں بیچنے اور ضعیفی میں فرق نہیں ہوتا۔ صلوات اور باب کرم! یاد رکھیے اگر ظالم نے یہ اہتمام نہ کیا ہوتا تو شاید امام کے اس کمال کے اظہار کا کوئی راستہ بھی نہ نکلتا۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام

تھا کہ جتنا ہی تم ذلیل کرنا چاہو گے اتنا ہی ہم مرتبہ کو بلند کرتے رہیں گے اور تو سبھی کہ تمہارے ہی دربار میں فضائل و کمالات کا اعلان ہو۔ دربار تمہارا ہوگا اور فضائل اس کے بیان ہوں گے۔ بارگاہ تمہاری ہوگی اور قبضہ اس کا ہوگا یا یوں کہا جائے کہ قصر فرعون کا ہوگا۔ اور پرورش موسیٰ کی ہوگی۔ صلوات

ہشام نے حالات کو دیکھ کر امام کو رخصت کر دیا۔ آپ واپس چلے تو راستہ میں ایک مقام پر غیسیائیوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ دریافت فرمایا یہ ہجوم کیسا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ عیسائیوں کا ایک عالم ہے جو سال میں ایک مرتبہ گر جائے باہر نکلتا ہے اور لوگ اس کی زیارت کو جمع ہوتے ہیں آج وہی دن ہے اور قوم اپنے عالم کی زیارت کے لئے جمع ہوئی ہے۔ آپ جمع کی طرف بڑھ گئے اور صحنوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ غور و دیر کے بعد وہ عالم برآمد ہوا اور جمع پر ایک نگاہ دوڑائی۔ نگاہ چہرہ امامت پر جا کر ٹھہر گئی۔ گھبرا کر پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے؟ آپ تو کوئی شخص اجنبی ہیں۔ آپ ہماری امت میں ہیں یا امت مرحومہ میں۔ آپ نے فرمایا امت مرحومہ میں۔ اس نے پوچھا اس کے عالموں میں ہیں یا جاہلوں میں؟ آپ نے فرمایا میں جاہل نہیں ہوں۔ اس نے کہا کچھ بوجھنے آئے ہیں یا میں ہی آپ سے سوال کروں۔ آپ نے فرمایا آپ ہی سوال کر لیں۔ اس نے کہا اگر آپ امت محمدیہ کے عالم ہیں تو بتائیے کہ وہ کون سا وقت ہے جو نہ دن میں ہے نہ رات میں؟ آپ نے فرمایا طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کا وقت ہے کہ یہ ساعت بہشت ہے۔ اس میں بیماروں کو ہوش آ جاتا ہے۔ درد مندوں کو سکون مل جاتا ہے اور رات بھر کے جاگے ہوئے لوگوں

کو نیندا جاتی ہے۔

اس نے کہا آپ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اہل جنت غذا میں استعمال کریں گے لیکن پیشاب پچانہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیا دنیا میں اس کی کوئی مثال ہے؟ آپ نے فرمایا بیشک۔ شکم مادر میں بچہ غذا کو استعمال کرتا ہے اور اسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس نے کہا کہ آپ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت کے لوگ ساری غذائیں استعمال کریں گے لیکن غذاؤں میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ کیا اس کی بھی کوئی مثال ہے؟ آپ نے فرمایا بیشک۔ شمع ہے کہ ایک شمع سے ہزار شمعیں جلائی جاتی ہیں۔ اور نور میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس نے کہا کہ وہ کون سے دو بھائی ہیں جو ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ایک ساتھ مرے لیکن ایک کی عمر ۵۰ سال کی تھی اور دوسرے کی عمر ۵۰ سال کی۔ آپ نے فرمایا کہ جناب عزیز اور جناب عزیز کہ دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ۳۰ سال کے بعد جناب عزیز کو اللہ نے سال بھر کے لئے موت دیدی

پھر جب بیدار ہوئے تو ۲۰ سال مزید زندہ رہے اور اس طرح وقت موت ان کی عمر ۵۰ سال تھی اور ان کے بھائی کی عمر ۱۵۰ سال۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ تو کہتے تھے کہ میں عالموں ہر نبی ہوں۔ یہ کیسا علم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے فرمایا محمد بن علی بن حسین نہیں ہوں۔ اس پر چہی نہیں۔ فرمایا انہیں وہ میرے جد تھے۔ کہا آپ ایلیا (علی) کے بیٹے ہیں۔ فرمایا ہاں۔ ان کے فرزند شبیر کا بیٹا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ راہب مسلمان ہو گیا۔ اور کہنے لگا بیشک آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اور

اللہ ایسے افراد کو ایسا کمال عنایت کرتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! واقعہ پر تبصرہ کا وقت نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ سن لیجئے اور بیان تمام کر دوں۔ امام نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ شیخ جہاں بھی رہے گی روشنی رہتی رہے گی۔ شام یہ سمجھا تھا کہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ہم دربار میں بھی گئے تو ہوش اڑا دیے اور گر باکی طرف مڑ گئے تو اسلام کی شمع روشن کر کے آئے اور یہی وہ شمع ہے جس سے ہزاروں شمعیں روشن ہوں گی۔ اور کیوں نہ ہوں۔ فتح ہمارا مقدر ہے اور کامیابی ہماری میراث۔ پہلے محمدؐ نے عیسائیت کو باطل میں شکست دی تھی۔ اور دوسرے محمدؐ نے اس کے گھر میں شکست دی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کل کے محمدؐ کی گود میں حسینؑ پلے تھے اور آج کا محمدؐ حسینؑ کی گود میں پلا ہے۔ کل کے محمدؐ نے صرف جزیہ لیا تھا اور آج کے محمدؐ نے کلمہ بھی پڑھوا لیا ہے۔ صلوات

# امام جعفر صادق علیہ السلام

جعفرؑ

اسم مبارک

صادقؑ

لقب

ابو عبد اللہ

کنیت

امام محمد باقرؑ

والد ماجد

ام فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر

والدہ ماجدہ

۱۷ ربیع الاول ۸۰ھ بروز جمعہ مدینہ منورہ

ولادت

قائم بن ابیہن - حمیدہ مصفاة

ازواج

امام موسیٰ کاظمؑ اسماعیل عبد اللہ ام فروہ

اولاد

اسحاق محمد عباس علی امام صفری

شہادت

۱۵ شوال ۱۴۰ھ مدینہ منورہ

۶۵ سال

عمر مبارک

جنت البقیع

قبر مطہر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ  
وَالْمُرْسَلِيْنَ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِيْنَ  
الطَّاهِرِيْنَ وَلَعَنَ اللّٰهُ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَتَعَدَّى تَالِ الشَّهْرِ  
الْمُبَكَّرِ فِي سَنَةِ اَوَّلِ الْكَلْبِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِنَّ عَيْنَنَا لَلْعَدُوِّ وَبَيْنَ لَنَا لَلْاٰخِرَةِ وَالْاَوَّلِيْ

اَللّٰہ کا ذات کا ارشاد ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہم سے اوپر ہے اور  
دنیا و آخرت کا اختیار ہم سے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک ایسے صادق القول کا قول ہے جس کے کلام میں غلطی اور فریب کا کوئی  
امکان نہیں ہے، اور جب اس نے کہہ دیا ہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہم سے اوپر  
ہے تو چاہے تاریخ میں کوئی ثبوت نہ ملے یا نہ ملے یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے ہر  
دور، ہر عہد، ہر زمانے اور زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت کا انتظام کیا ہے  
اور ایسا نہ ہوتا تو چند ہزار سال کی موت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور پیغمبر  
ان کے اوصیاء و خلفاء کی گنجائش کہاں ہوتی۔ انبیاء کی کثرت خود اس بات  
کی دلیل ہے کہ اس نے کوئی خطہ زمین کوئی علاقہ زمین اور کوئی زمانہ ایسا نہیں  
چھوڑا جس میں ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو، اور اس انتظام میں یہ لحاظ نہ رکھا ہو  
کہ میں دور میں بھی ضرورت ہو دیا ہی بنی بھیجا جائے، ویسی ہی کتاب نازل  
کی جائے، دیا ہی قانون بنایا جائے اور ویسی ہی شریعت مقرر کی جائے تاکہ ان  
اس قانون سے فائدہ اٹھاسکے اور نماندہ پروردگار حالات زمانہ کے مطابق دنیا

کی ہدایت کر سکے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار  
انبیاء میں ایک کو بھی عورت نہیں بنایا، اور پوری تاریخ ہدایت میں کسی ایک عورت  
کو بھی یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ منصب نبوت و رسالت کی حامل ہو، ایک سے ایک  
صاحب ایمان و کردار خرامن گزریں اور ایک سے ایک بے نفس منکلات و فرائض پر سامنے  
آئیں لیکن کسی ایک کو بھی منصب الہی نہیں دیا گیا، تو کیا یہ موضوع لیا جائے کہ معاذ اللہ  
دین خدا میں عورت کا کوئی مرتبہ نہیں ہے یا دین الہی بھی عورت کے حق میں اتنا ہی  
خالص ہے جتنے خالص دنیا کے دوسرے قوانین ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو عورتوں  
کو منصب ہدایت کیوں نہیں دیا گیا اور انھیں اس شہرت سے کیوں محروم  
رکھا گیا؟

تاریخ انسانیت میں بے شمار عورتیں گزری ہیں جنہوں نے قیادت کا منصب  
سنبھالا ہے اور با محسن و جہد انجام دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ عورت کی  
حکومت کبھی کامیاب نہیں ہوئی، اس نے دنیا کو صالح نظام زندگی نہیں دیا تو مجھے  
مناظر فرمائیں، مردوں کے فائز میں کچھ کم مانگ دار نہیں ہے، زبان سے کھدینا  
بہت آسان ہے لیکن ایک مرتبہ دونوں کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو سارا  
مال معلوم ہو جائے گا۔ روئے زمین پر پہلا خون مروی نے پیایا ہے، پہلی نوح  
کے کھل بنائے مرد ہی نے کہ ہے جناب اہل جہم کو آگ میں مروی نے پھینکا ہے  
جناب موسیٰ کو آواز دین مروی بنایا ہے، جناب عیسیٰ کو اپنی جانب میں سولا پر مروی نے  
چڑھا یا ہے، بندگان خدا کو لوٹ کر خزانے سے کئے والا قارون مروی تھا، خدا  
کے مقابلہ میں دعائے خدائی کرنے والا فرعون مروی تھا، کعبہ کے مقابلہ میں

گر جاننے والا ابراہیم مروی تھا، اور اس کے مقابلہ میں دوسری طرف قصر فرعون میں  
مروسی کی پھر پرشش کو سننے والی آسیہ عورت تھیں، عیسیٰ کو شہید دوسے پناہ میں  
رکھنے والی مریم عورت تھیں، جناب اسماعیل کے لئے شدت مطش میں پانی فراہم کر نیوالی  
اجسہ و عورت تھیں، اہل اعظم کو سکون زندگی عطا کرنے والی خدیجہ عورت تھیں، بلکہ  
ہر ایک عورت نہ ہوتی تو نہ جنت کی غربت و دولت سے تبدیلی ہوتی، نہ تکذیب کا احوال  
تصدیق میں منقلب ہوتا، نہ کارسوں کا مجمع ہوتا، نہ سکھ گویوں کا جہم ہوتا، نہ بزم  
پیغمبر میں بیٹھ بجا رہتی، نہ اسلام میں برہان و حقیقت نظر آتی اور مجھے تو یہ بھی  
کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ اسلام میں صدر اسلام کے ٹکڑے توڑنے والے اور دولت  
لے کر غنی و مالدار بن جانے والے مرد تھے اور اپنے ٹکڑوں پر پوری امت  
کو پالنے والی خاتون زہرا کی مال خدیجہ اکبر بھی عورت تھیں، صلوات،  
یہ نہ کہئے کہ عورت کو کوئی شعور نہیں ہے، عورت کا کوئی کردار نہیں ہے،  
عورت کا کوئی ایمان نہیں ہے اور جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر سوال اپنے مقام  
پر ہے کہ اللہ نے عورتوں کو منصب دار کیوں نہیں بنایا۔

ساری دینائے اسلام اس ایک سوال کے سامنے انکسرت ہنساں ہے اور  
تقریر و تحریروں سے اسلام میں عورتوں کے حقوق ثابت کرنے والے علماء اسلام  
اس سوال کے مقابلہ میں ساکت و صامت نظر آتے ہیں، بہر حال انکار اسلام نے  
عورتوں کو عزت دی ہے، وقار بخشا ہے، مرتبہ دیا ہے، میراث میں حصہ دیا ہے،  
شہادت کا حق دیا ہے، کسب معاش کی اجازت دی ہے، نکاح کرنے کا اختیار  
دیا ہے، تعلیم و تدریس کے حقوق دیئے ہیں، اولاد پر اطاعت واجب کر کے خیر اوی  
کا مرتبہ دیا ہے، شوہر کی شریک حیات بنا کر گھر کا زور دار بنایا ہے، اب ک

آغوش میں رکھ کے قابلِ عظیم و احترام بنایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کواقی عزت و حرمت کے باوجود منصب کیوں نہیں دیا۔ اور سوال کہ نبیوں میں ایک آدھ عورت کو یہ عہدہ کیوں نہیں بخشا؟

میسے خیال میں یا تو دنیا نے اسلام اس اعتراض کا جواب دے اور دنیا نے کفر و الحاد کو مطمئن کرے کہ حقوق نسواں کا نعرہ بلند کرنے والا اسلام اس منزل پر کیوں خاموش ہے اور یہاں عورتوں کے حقوق کی حمایت و رعایت کیوں نہیں کی گئی، اگر یہ امر ممکن نہیں ہے اور اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے تو مان لفظوں میں اعتراض کرے کہ جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلام نے کسی منزل پر عورتوں کو محروم نہیں رکھا اور نہ مردوں سے پیچھے رکھا ہے، لیکن منصب کے معاملہ میں اس کی دنیا دوسری ہے، اس کا تعلق مرد و عورت سے نہیں ہے بلکہ مصلحت الہی اور علم پر مددگار ہے۔ بات صرف مرد و عورت کی ہوتی تو دنیا کے سارے مرد و عورت و رسالت کے دعویدار ہو جاتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد سے کہ دروں اور اربوں مرد صاحبِ ایمان و کردار گزرے ہیں اور ہیں لیکن کسی کو منصب نبوت و رسالت نہیں ملا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منصب خدائی مصلحت سے وابستہ ہے، اس میں علم و قابلیت اور استعداد و صلاحیت کی بحث نہیں ہے، قابلیت و صلاحیت اور کردار و ایمان شرط منصب ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر صاحبِ ایمان و کردار کو منصب دے دیا جائے اور ہر قابل و فاضل انسان نبی اور رسول بن جائے۔ اور جب دنیا نے اسلام نے عاجز آکر یہ اعتراض کر لیا تو ایک قدم مجھے بھی بڑھنا پڑا کہ جب عورتوں کی نبوت و امامت کا مسئلہ آیا تو رہنے

تسلیم کر لیا کہ یہ کام خدا کا ہے، بنایا نہیں ہے، اور جب اپنے گھر کی قیادت و خلا کا مسئلہ آیا تو سب نے طے کر لیا کہ یہ حق بندوں کا خدا کا نہیں ہے۔

ایبابِ کرم! میرا تمام دنیا نے اسلام کو چیلنج ہے کہ یا تو عورتوں میں کوئی ایسا شخص ثابت کریں جس کے بعد ان میں منصب کی صلاحیت نہ رہ جائے یا یہ اعتراف کر لیں کہ عہدہ الہی اللہ کے اختیار میں ہے، اس میں امت کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مصلحت،

اس مقام پر یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی صاحبِ یہ نہ سوچیں کہ آپ نے نبوت کا قیاس خلافت اور امامت پر کیوں کر لیا؟ ہم اس بات کے قابل ہیں کہ نبوت و رسالت میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کا وجود عورت میں نہیں ہو سکتا اور اس کا علم صرف ذات پروردگار کو ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مردوں کو نبی و رسول بنایا ہے عورتوں کو نہیں بنایا۔ لیکن اس کا قیاس خلافت و امامت پر نہیں ہو سکتا اور امت نے بعد پیغمبر جو اختیار لیا ہے وہ خلافت و امامت کا اختیار ہے، نبوت و رسالت کا اختیار نہیں ہے، لیکن ایبابِ کرم! مجھے پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اگر یہ طے ہو جائے کہ نبوت و رسالت میں ایسی خصوصیت ہے جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور خلافت و امامت میں ایسی کوئی شے نہیں ہے تو امت اسلام نے پیغمبر اسلام کے بعد امامت المؤمنین کو خلیفہ رسول کیوں نہیں بنایا؟ جبکہ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ محبت رسول، علم و فضل، رہایت و حدیث و غیرہ کے اعتبار سے وہ ہر خلیفہ سے بہتر تھے، جملہ خلفائے اسلام کی حدیثیں سب ملا کر اتنی نہیں ہیں جتنی حدیثیں صرف ام المؤمنین عائشہ کی ہیں کس خلیفہ المسلمین کو رسول سے

وہ قرب اور محبت حاصل نہیں تھی جوام المؤمنین کو حاصل تھی، اور جس کے ساتھ پیغمبر اسلام نے اتنی رعایتیں نہیں برتی تھیں جتنی ان کے ساتھ برتی ہیں، اور کسی کی اس قدر ناز برداری نہیں کی ہے جتنی ان کی ناز برداری کی ہے تو ہجرت نے یہ عہدہ انھیں بھریا دیا، اور گستاخی مٹا دی، چچے تو یہ شکوہ خود ان کے والد بزرگوار سے ہے کہ انھوں نے منبر رسول پر جا کر یہ تو کہہ دیا کہ علیؑ کے ہوتے ہوتے میں خلافت کا اہل نہیں ہوں، یہ کیوں نہ کہا کہ اپنی دختر نیک اختر کے ہوتے ہوتے یہ حق مجھے نہیں پہنچتا اور قاعدہ کے اعتبار سے یہ منصب انھیں ملنا چاہیے۔

مکن ہے کوئی نا فہم یہ اعتراض کرے کہ نبی کے بعد امت اسلامیہ اور شہر نبی پر چاروں طرف سے حملے کے امکانات تھے، منافقین منتظر بیٹھے تھے، مشرکین خار کھائے تھے، یہودی اپنی شکست کے انتقام کی فکر میں تھے، عیسائی الگ چلے ہوئے تھے اور مرتدوں کا فتنہ الگ سر اٹھا رہا تھا ایسے وقت پر اسلام کو علم و فضل، جمال و کمال، روایت و حدیث سے زیادہ لشکر کشی اور سرکردگی کی ضرورت تھی، اس لئے یہ منصب کسی عورت کو نہیں دیا جاسکتا تھا، ورنہ اسلام کے تباہ ہوجانے کا اندیشہ تھا، لیکن ارباب کرم! میں کس عام عورت کی گفتگو نہیں کر رہا ہوں، میں ایک مخصوص خاتون کی گفتگو کر رہا ہوں، میری بحث جناب فاطمہ زہراؑ سے نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ ان میں سرکردگی اور لشکر کشی کی صلاحیت نہیں تھی، میری گفتگو ایک ام المؤمنین سے ہے جن میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اور وقت کے خلیفہ سے کچھ زیادہ ہی تھی، خلیفہ وقت کو تو میدان میں مقابلہ کرنے نہیں دیکھا گیا لیکن ام المؤمنین کو

بہر حال میدان جنگ میں دیکھا گیا ہے، ہجرت کی خلافت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ جہاں جہاں خلیفہ وقت کے دل میں مروت پیدا ہو گئی تھی وہاں بھی وہ سنت اقدامات کرتیں اور کسی سے مروت سے کام نہ لیتیں۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ خالد بن ولید کے معاملہ میں خلیفہ رسولؐ نے صحابی رسولؐ کو مروت سے کام لیا اور انکی ناقابل معافی غلطی کو نظر انداز کر دیا لیکن ام المؤمنین اپنے نظریات میں اتنی سخت تھیں کہ صحابی رسولؐ کا انھیں رسولؐ کو بھی صاف نہیں کر سکیں اور لشکر لے کر مقابلہ پر آگئیں۔

تاریخ کے یہ حقائق گواہ ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد اسلام میں اتنا عظیم انقلاب آیا تھا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا اور جب یہ امت رسولؐ کی چھٹی بیوی کا نہ ہوتی تو انکوئی بیٹی کی کیا ہوگی اور جب خلافت کی دوڑ میں بزرگوں کو بچوں کا خیال نہ رہ گیا تو وہ سردوں کا کیا خیال آئے گا؟

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام میں نہ خدا نے عورتوں کو عہدہ دیا ہے نہ امت نے، تو اب یہ سوال بہر حال رد جاتا ہے کہ پروردگار اگر عورت اس قابل نہیں ہے تو اس کی ہدایت کا کیا انتظام ہوگا؟ اور مرد اس کی عملی ہدایت کیسے کر سکیں گے، وہ اس کے اعمال بہالانے سے قاصر ہیں اور وہ ان کے اعمال سے استفادہ کرنے سے عاجز ہے تو پھر درمیان راہ چنانکے گی؟

قدرت نے آواز دی گھبراؤ نہیں، میں منصب نہ دوں گا لیکن عورتوں میں ایسی پاکیزہ کردار خاتونیں پیدا کروں گا جن کا عمل عورتوں کے لئے شیع ہدایت بن جائے گا اور جن کے نقش قدم پر چل کر دنیا کو عزتیں دینا و آخرت کی نیکیاں

خامل کر لیں گی، میں ان کے کردار کی منہانت لوں گا، میں انہیں زلیلہ عصمت سے آراستہ کر دوں گا اور اتنی طیب و طاہر بناؤں گا کہ مردوں کی طہارت کا اعلان کر دوں یا نہ کر دوں ان کی طہارت کا اعلان ضرور کروں گا عصمت مبرم پر وقت پڑے گا تو ان کی طہارت کا اعلان کر دوں گا اور چادر نہ ہر آ میں اجتہاد ہو گا تو ان کے حق طہارت کا اعلان کر دوں گا۔

اربابِ کرم! میں نے بار بار عرض کیا ہے کہ جسے خداوند عالم ہدایت کا انتظام پروردگار ہے اس کی خلقت میں بھی ایک خاص اہتمام رکھتا ہے چنانچہ مریم کو نمونہ عمل بنایا تو انہیں اپنے گھر کے لئے وقف کر دیا اور ناطقہ نہر آ کو قیامت تک کے لئے شریکۃ الرسول بنایا تو ملاوت میں وہ اہتمام رکھا کہ کائنات کی کس خاتون کے لئے نہیں کیا گیا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب جنابِ خدیجہ نے تمام اشرافِ قریش سے عقد کرنے سے انکار کر دیا اور امانت و دیانت پیغمبر کو دیکھ کر از خود پیغام عقد دے کر رسول اکرم سے عقد کر لیا، تو عرب میں ایک گھلبلی تڑ گئی۔ خدیجہ نے پیغمبر عبد اللہ سے عقد کر کے ہماری سیادت و قیادت کی توبہ میں کی ہے، ایک غریب و نادار سے عقد کر کے ہماری دولت و ریاست کا مذاق اڑایا ہے، اپنی طرف سے تحریکِ عقد کر کے ہمارے رسوم و قوانین کی تذلیل کا ہے، اور ایک غیر مذہب کے مرد سے عقد کر کے ہمارے عقائد و نظریات کی توبہ میں کی ہے۔ عقد کے بعد جیسے جیسے ملِ اعظم کے نظریات سامنے آتے گئے مخالفتوں کا رخ خدیجہ کی طرف تیز تر ہوتا گیا، اب مکہ کی گلیوں میں صرف پیغمبر پر ہنر نہیں پڑا ہے، نئے، نئے کے ساتھ مخالفت و بغاوت کی

جنگی میں سب گھروالے بھی پس رہے تھے، اور دنیا جاتی ہے کہ عورتوں کا مزاج زیادہ جذباتی ہوتا ہے اور وہ رسم و رواج کی زیادہ پابند ہوتی ہیں، عرب عورتوں کی نظر میں خدیجہ کا یہی ظلم کیا کہ تمہارا انہوں نے رسم و رواج کی مخالفت کی ہے اور ایک ایسے مرد سے عقد کیا ہے جو ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، ان کی مخالفت کرتا ہے انہیں بھیس، بیجان اور بے معرفت کہتا ہے اور خدیجہ طلاق بھی نہیں لے لیتیں اور عقد سے نکل بھی نہیں آتیں بلکہ ان کی نہرت کر رہی ہیں، ان پر ایمان لے آئی ہیں، اور اپنی دولت سے، ان کی امداد بھی کر رہی ہیں، ان کے مذہب کو آگے بڑھا رہی ہیں اور سنا گیا ہے کہ ان کے شکم میں کوئی فرزند بھی ہے، یعنی ایک وارث کا بھی بندوبست ہو گیا ہے، غضب ہو گیا، قیادت آگئی، کاش کوئی انہیں ختم کر دینا کاش ایسی عورت سماج میں نہ پیدا ہوتی، کاش اسے موت آگئی ہوتی کہ ہمارا مذہب نہ بدنام ہوتا، ہمارے قبیلہ کی ناک نہ گھٹی، خدا جانے یہ عورت کہاں سے آگئی؟ اور ابھی تک زندہ ہے۔ اب تو ایک ہمارا ستہ ہے کہ ولادت کے موقع پر سب اس کا بابیکاٹ کر دیں اور کوئی اس کے قریب نہ جائے ہمارے بڑوں نے چاہا تو یہ تڑپ تڑپ کے مرجائے گی اور ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون مل جائے گا۔ عورتوں کے مزاج سے جتنے سخت اقدام کی توقع کر سکتے ہوں، اسی رنجش میں حالات کا جائزہ لیجئے اور سوچئے کہ خدیجہ کا عالم کیا ہے اور کس طرح سارے سماج کی مخالفت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ مگر اللہ سے صبر و خبات کو پائے استقلال میں کوئی جھنش نہیں، عقیدہ میں کوئی فرق نہیں، حمایتِ اسلام اور خدایتِ پیغمبر میں کوئی کوتاہی نہیں۔ اور دل آواز دے رہا ہے کہ حق کے جادہ پر ہوں تو خدا مددگار ہے، اس کے نبی کا ساتھ دیا ہے تو

وہ حفاظت کرنے والا ہے، اس کے مذہب کی راہ میں قربانی دی ہے تو وہ قدر دان ہے  
لیکن بشریت کہہ رہی ہے خدیجہ! جب اپنے وقت میں عورتیں نہ آئیں گی تو کیا ہو گا؟  
جب کوئی مددگار نہ ملے گا تو کیا حشر ہو گا؟ کہ دفعتاً کافلوں میں آواز آئی۔ اہاں  
گجولے گھانپیں، اپنے ایمان پر ثبات قدم رہیے، خدا گھبرانے ہے، خسر ہمارا!  
کفار کی عورتوں سے مدد نہ لیجئے گا، پروردگار آجکی مدد کا انتظام کرے گا۔ خدیجہ  
چرنک پڑیں، یہ کہنے نے سہارا دیا ہے، یہ کہنے کی آواز آئی ہے، یہ دفعتاً دل کو سکون  
کیوں حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے نکر کرنے کی کیا  
ضرورت ہے، مجھے قریا دے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد پر یہ وقت پڑا تھا تو ان کے  
پاس کوئی نہ تھا اور وہ خانہ خدا میں تھیں تو جو خدا ان کے لئے انتظام کر سکتا ہے  
وہی خدا میرے لئے بھی انتظام کر سکتا ہے، بلکہ عجیب نہیں کہ یہ بھی مصلحت خدا ہے  
کہ عرب کی عورتیں قریب نہ آئیں اور میری مدد کے لئے جنت سے حوریں آئیں  
آسمان سے ہاجرہ، مریم، سارہ اور آسیہ آئیں اور سب مل کر میرا ہاتھ  
بٹائیں، اور میں یہ گھوٹ کہ خدا کی طرف سے ہدایت کے ذمہ دار کی شان ہی کچھ  
اور ہوتی ہے اور مجھے تو ایک انتظام قدرت یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ پروردگار!  
میری لاڈلی کارشتہ فاطمہ کے فرزند سے کوٹنا چاہتا ہے جبھی تو اپنے گھر میں  
لڑکے کو پیدا کیا اور رسالت کے گھر میں لڑکی کو اتارا ہے۔ صلوات،

عزیزانِ کرم! مجھادہی جو خدیجہ نے سوچا تھا، حورانِ جنت آئیں  
مریم و سارہ و حمزہ و ہاجرہ آئیں اور حذیقہ طاہرہ کی ولادت با سعادت ہوئی،  
وہ کتنی مبارک صبح تھی جب نبی کے گھر مصداق کوثر آ رہی تھی، خدیجہ کی گود  
آباد ہو رہی تھی اور ابتر کا طعنہ دینے والے ابتر ہو رہے تھے، مسرتوں کا

اندازہ کون کر سکتا ہے، امامت خوش تھی کہ ام المومنین، اسلام خوش تھا کہ گھبران  
آئی، عالم نسواں خوش تھا کہ راہنما آئی، جنت خوش تھی کہ خاتونِ جنت آئی، خدیجہ  
خوش تھیں کہ میری راحت جان آئی، رسول اکرم خوش تھے کہ سیدی نور نظر آئی، تو عبد  
خوش تھی کہ مبارک میں میرے وقار کی محافظ آئی، مستہ آن خوش تھا کہ میری منزل  
تہلیلہ آئی۔ صلوات،

آئی اور کس شان سے آئی، فاطمہ بن کر آئی تو قوم کو جہنم سے نجات دلانے  
کا بیٹنام سنایا، قرآن بن کر آئی تو آیتِ تہلیلہ کے لئے ایک عظیم مفہوم آیا، اعزاز  
بن کر آئی تو طہارت کو ایک عظمت ملی صدیق بن کر آئی تو صداقت کو ایک مبارک اور  
مبارک کو ایک مصداق ملا، نہرا بن کر آئی تو دولتِ عالم روشن اور نمود ہو گئے، خاتونِ  
جنت بن کر آئی تو حورانِ جنت نے تار و پود شروع کر دیا اور درختِ طوبی نے سرتی  
بجھا کر دینے، سیدیۃ النساء بن کر آئی تو عورتوں کو راہنما بن گیا، شریعتِ رسول  
بن کر آئی تو رسالت کو نگہسار بن گیا اور آئینہ کے انتقال کے بعد آئی تو ام ایما کا  
بمصداق بن گئی۔ صلوات،

اتنے انتظام و اہتمام کے بعد یہ نہ سوچئے گا کہ اگر منصب رسالت و امامت  
نہیں ملا تو کردار میں کوئی کمی رہ گئی۔ نہیں! یہ بھی ایک مصلحت الہی ہے کہ اس نے  
فاطمہ کو منصب نہیں دیا۔ درختِ فاطمہ کے کمالات و ادھان میں کوئی کمی نہیں تھی،  
اور شاید مصلحت یہ بھی ہو کہ اللہ نے باپ کو منصب رسالت سے نوازا اور شہر  
کو منصب امامت سے سرفراز کیا اور دنیا میں فاطمہ دہرا کو ہر منصب سے انکس  
رکھا۔ اب اگر کبھی منصب میں جھگڑے پیدا ہوں اور لوگ منصب کے نام پر اختلاف  
کریں، مگر پیدا ہوں، مخالف پیدا ہوں، باغی پیدا ہوں، غاصب پیدا ہوں

دشمن پیدا ہوں تو ایک معصوم کردار ایسا بھی رہے جو منصب کے جھگڑوں میں نہ پڑے اور اس کی عصمت ہر منصب دار کے کام آئے، چنانچہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب منصب نبوت پر وقت پڑا تو بھی فاطمہ ہی کام آئیں اور جب منصب امامت پر وقت پڑا تو اس وقت بھی فاطمہ ہی کام آئیں۔

دُنیا اس تاریخی حقیقت کو ٹھکلا نہیں سکتی کہ مہابہ کے میدان میں اسات پر وقت پڑا تو فاطمہ زہراؑ ہی گواہی کے لئے آئی تھیں اور مذکور کے مسئلہ میں اس پر وقت پڑا تھا تو فاطمہ زہراؑ ہی نے ترجمانی کی تھی اور دُنیا پر واضح کر دیا کہ اختلاف منصب کا نہیں ہے یہ انت آیت تطہیر کو بھی بھلا جی ہے اور جرات اپنے نبی کی جی کی دفاع و انہیں ہے وہ کسی اور کی وفادار نہیں ہو سکتی مصلوات،

ولادت کے بعد صدیقہ ظاہرہ پانچ سال تک مادر گرامی کے ساتھ رہا شہرہ میں خدمت اکبرہؑ کا انتقال ہو گیا تو فاطمہ کی کفالت کا ذمہ دار بن گیا اب ام سلمہ کے سر آئی، مگر اللہ رے بلند نبی کو دار کہ خود جناب ام سلمہ کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ نے مجھے فاطمہ کو تربیت دینے کے لئے میکے روانے کیا تھا لیکن خدا گماا ہے کہ میں نے فاطمہ سے سیکھا ہے، فاطمہ کو سکھا یا نہیں۔

یسا کہ غیب منصب دار کی شان ہے، کافز دنیا کو اب بھی ہوش آجاتا کہ جب اس گھرانے کے غیر منصب دار تعلیم تربیت کے محتاج نہیں ہیں تو منصب دار کیسے محتاج ہو جائیں گے؟ فاطمہ کے کردار نے رسالت کی عظمت کو بھی واضح کر دیا اور امامت کی جرات پر بھی روشنی ڈالی کہ یاد رکھو! میرے گھرانے میں نہ رسالت کی محتاج ہے نہ امامت اور اس سلسلہ کو کم ایام انہیں فرد پہننا چاہئے،

جس سے میرا کوئی رشتہ ہے، البتہ اگر کوئی مجھ سے ہی شعل نہیں رکھتا تو اس سے شکوہ بھی نہیں ہے، جو میرا نہ ہو گا وہ کسی اور کا ہو گا مصلوات،

صدیقہ ظاہرہ کے فضائل و کمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انسان کے فضائل و دد طرح کے ہوتے ہیں، بعض فضائل اس کے اختیارات و اعمال و افعال سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کمالات خدا واد ہوتے ہیں جن میں کسی انسان کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ کمالات پروردگار کیوں عطا کرتا ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کا عمل نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ کمالات مستقبل کے پیش نظر دیئے جاتے ہوں اور یہ ظاہر کرنا ہو کہ یہ انسان مستقبل میں ایک عظیم منصب یا کمال کا حامل ہونے والا ہے، اس لئے ولادت ہی سے اسے غیر معمولی فضائل و کمالات کا حامل بنا دیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ بعض خصوصیات بر بنائے امتحان ہوں کہ ہم نے تجھے اس قدر کمالات عطا کئے ہیں اب دیکھنا ہے تو ان کمالات کی کہاں تک لاج رکھتا ہے، اور ان کے وقاء کا کہاں تک تحفظ کرتا ہے؟

خال کے طور پر انسانیت ایک خرافات و عزت ہے اور کسی انسان کا پروردگار پر حق نہیں تھا کہ اسے انسان ہی بنایا جاتا، اس کے اختیار میں تھا کہ وہ چاہتا تو انسان بنانا اور چاہتا تو جانور بنا دیتا۔ یہ اس کے کم کی بات ہے کہ اس نے انسان کو انسان ہی پیدا کیا اور اسے پیدا نشی طور پر عقل اور اس فکر و نظر، تدبیر و دماغ، شعور و عقل کی دولت سے سرفراز کر دیا، اب یہ اس کے اختیار کی بات ہے کہ چاہے ان جوہرات کی قدر کرے اور اپنی انسانیت کا تحفظ کرے کہ امت و خرافات کا تاج اپنے سر پر رکھے یا انہیں خاک میں

ملا دے اور خود بھی حیوان سے بدتر بن جائے، ہم نے تاریخ میں دونوں طہرت کے انسان دیکھے ہیں، وہ انسان بھی دیکھے ہیں جنہوں نے انسانیت کا اس قدر خون کیا کو آخر کار جانور ہونے کی تمنا کرنے لگے، کاش میں جانور ہوتا، کاش میں حیوان ہوتا، کاش میں چڑیا ہوتا، اور ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنہوں نے جبراً آدمیت کو مٹا بلند کیا کہ مقابلہ پر آنے والے فرشتے بھی دروازہ کے بھکاری بن گئے، کوئی پکڑے لئے چلا آ رہا ہے، کوئی کھانا لئے چلا آ رہا ہے، کوئی بھولا بھلا رہا ہے، کوئی چکی پیں رہا ہے، کوئی سلام کرنے آ رہا ہے، کوئی روٹی مانگنے آ رہا ہے، کوئی آیت لارہا ہے، کوئی انگوٹھی لئے جا رہا ہے۔ صلوات،

مقصود یہ ہے کہ پیدائشی کمالات میں دونوں قسم کے احتمالات پائے جاتے ہیں، امتحان بھی ہو سکتا ہے اور امتحان بھی، لیکن انسانیت کے مشترکہ صفات کے علاوہ کوئی کمال اسی وقت دیا جاتا ہے جب انسان میں کوئی خصوصیت پائی جاتی ہو اور قدرت کو اس سے کوئی مقصود کام لینا ہو ورنہ عدالت پر درکار پر صرف آئے گا۔ علمائے اسلام نے آباء و اجداد نبیؐ کی شرافت و جلال کی شرط اسی لئے لگائی ہے کہ مذہب الہی کا ذمہ دار اور منصب الہی کا ورثہ دار کوئی بہت ذلیل انسان نہیں ہو سکتا، ورنہ عہدہ بھی بدنام ہو جائے گا اور مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس تہذیب کی روشنی میں آل محمدؐ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کے یہاں مخصوص امتیازات و خصوصیات نظر آئیں گے۔ اس وقت صرف مصروف عالم کے خصوصیات پر روشنی ڈالنا ہے اور مختصر لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اللہ نے صدیقہ طاہرہ کو ابتدا ہی سے ایسے کمالات و فضائل عنایت کئے تھے جو کائنات

کی کسی قانون کو نہیں ملے، نسب و خاندان کے اعتبار سے باپ سید الانبیاءؐ ماں ملکۃ العربؐ، بیٹے سردارانِ جہان ابنِ جنتؐ، بیٹیاں مہرِ اسلام کی بے سپاہ محافل اور شہرِ ایسا جس کے ایک چہرہ میں آدم کا علم، نوح کا ذہن، ابراہیم کی غلت، موسیٰ کی ہیبت، عیسیٰ کا حقویٰ سب سمٹ آئے۔ گھیا ایک نقطہ ہے جس میں سارا قرآن سمٹا ہوا ہے۔ صلوات،

حالات کے اعتبار سے یہ امتیاز ہے کہ پیدا ہوئیں تو خاتم المرسلینؐ کے گھر، خدمت کے لئے آئیں تو حور ابنِ جنتؐ، پاسبانی کا فرما، انجام دیا تو مریم و حوا اور اہرہ و آسیہ نے، دریائی کے لئے آئے تو آسمان کے ملک، سجدہ کرنے کے لئے آیا تو ستارہ ٹہرا، پکڑے لایا تو منوانِ جنتؐ، آسیہ گردانی کے لئے آئے تو روح الامین اور سلام کرنے آئے تو رحمتہ للعالمینؐ صلوات،

جسٹانِ اعتبار سے بھی مردہ جس کی بلندی کو کوئی پازہ سکے، ہا کہتہ وہ جن کے کوم پر ہل اٹل قرآن، قدم وہ جن کی رفتار رسول اللہؐ کی رفتار، زبان وہ جس کا انداز رسول اکرمؐ کا انداز، نگاہ وہ جس کے تہرہ باپ کے تہرہ، ہمسہ وہ جس کی جھنجھکار شہر کی ذوالفقار، گھر میں بیٹھ جائیں تو صلح خاتم النبیینؐ کا نور، دربار میں آجائیں تو فاتحہ فیصلہ کی زحمان، چادر اور حصہ کے لیٹ جائیں تو آیتِ قطعیہ نازل ہو جائے، نقاب ڈال کر بیت اللہؐ سے باہر آجائیں تو مہلبہ کا میدان سر ہو جائے، نرم رسالت میں آجائیں تو نبیؐ کا تسلیم کے لئے اٹھ جائیں، دربارِ حکومت میں آجائیں تو چہرہ دل سے نقابیں اٹ جائیں۔ صلوات،

معنوی اعتبار سے تو کمالات کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا، مستحقانِ کرامتیں گواہ کہ زہرا، صدیقہ، طاہرہ، معصومہ، راضیہ، مرغیبہ اور مرکز عصمت ہیں، انہی کے ارشادات گواہ کہ فاطمہ سرورہ خواتینِ جنت، بہترینِ نساء عالم، مرکزِ مرغی پروردگار، محبوب ترین خلایق، انسانیت کے پسندیدہ حورِ صفت، شفیقہ محشر اور مالکِ جنت ہے۔ اور فقیر یہ کہ ابوالبشر آدم بھی وہ نہیں جو فاطمہ نہر ہیں۔ ان کی خلقت کا اقیانوس تھا کہ اللہ نے بنیہ ماں باپ کے پیدا کیا تھا لیکن آسمان پر پیکر بنانے کے لئے مٹی زمین سے تنگائی تھی اور سیدہ کا اقیانوس ہے کہ زمین پر تخلیق کے لئے سیبِ جنت آسمان سے فراہم کیا جاتا ہے۔

آبِ اربابِ نظر خود فیصلہ کریں کہ آدم کا رخ کدھر ہے اور سیدہ کدھر کدھر ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، خاک کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور نور کا رخ بلندی کی طرف ہوتا ہے۔ صلوات،

اور یہ باتیں میں کہتا تو شاید دنیا اعتبار نہ کرتی اور اسے عقلِ مبالغہ اور خطابت و شاعری کا نام دے دیتی لیکن اسے کیا کیا جانے کہ خود مرسلِ اعظم کہیں اعلان فرمائیں کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ نہ آدم نہ غیر آدم، آدم و غیر آدم کا دوست دیکھئے، اور سیدہ کی عظمت کا اندازہ لگائیے۔ بچے تو کہنا پڑتا ہے کہ بیٹی کو چھوڑ کر انبیاء میں، اولیاء میں، مرسلین میں، صاحبانِ کتاب میں، صاحبانِ شریعت میں کوئی ایسا نہیں ہے جو فاطمہؑ کا جواب بن سکے۔ اور جب انبیاء جواب دہ تھے تو تھے تو خدا و سارہ اور ہاجرہ و مریم و آسیہ کا کیا ذکر ہے؟ عطا ایک

معصوم کی شہر یک زندگی ہیں اور لبرہ سارا ایک معصوم کا زوجہ ہیں اور اسے ایک بیک کر فارغالتو ہیں اور لبرہ، حاجرہ ایک معصوم کی زوجہ ہیں اور ایک معصوم کی ماں ہیں اور لبرہ اور مریم ایک معصوم کی ماں ہیں اور لبرہ کی بیٹی فاطمہؑ کا، عصمت ہر طرف سے حصار کئے ہوئے ہے، چادرِ ظہیرِ رعدہ کھینچے ہوئے ہے، عطا طمان کر رہی ہے، عظمت آستانہ پر سجدہ رہ رہے، بلندی بھیک مانگ رہی ہے رفیقینِ سلام کہہ رہی ہیں، جو حوروں کے جلالت کا پہرہ ہے، جو ہر نظر اٹھائیے عصمت و عظمت کی پاس بانی ہے، باپ ہے تو سید المرسلینؑ اور معصوم، خرم ہر ہے تو سیدہ ہاجرہ اور معصوم، بچے ہیں تو سرورہ جبرائیلؑ ال جنت اور معصوم ایک ایک رشتہ کی عظمت گزشتہ خواتین کو مبارک اور ہر رشتہ کی عظمت فاطمہؑ زہراؑ کو مبارک،

مریم ازبک نسبت عیسیٰؑ عزیز  
وزرہ نسبت فاطمہؑ زہراؑ عزیز  
نورہ ملکہ

اللہم صل علی محمد و آل محمد

۱۷۳

## امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

اسم مبارک

موسیٰ

لقب

کاظم

کنیت

ابو ابراہیم

والد ماجد

امام جعفر صادقؑ

والدہ ماجدہ

جناب حمیدہ

ولادت

۲۸ صفر ۱۴۸ مقام ابواء (مدینہ منورہ)

ازواج

ایک

اولاد

فرزندان و دختران

شہادت

۲۵ رجب ۱۸۱ھ (جمعہ) بغداد

عمر مبارک

۵۵ سال

قبر مبارک

کاظمین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء  
والمرسلین نحاتہ النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین  
الظاہرین ولعنة الله علی اعدائہم اجمعین۔ اما بعد قال الله الحکیم  
فی کتابہ الکریم  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی وَ اِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَ الْاُولٰٓئِیَ

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر  
ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔  
مالک کائنات کے اس اعلان نے صاف واضح کر دیا کہ ہم نے ہر دور میں  
عالم بشریت کی ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور کوئی دوزیسا نہیں چھوڑا جس میں  
ایسے بلند کردار اور پاکیزہ صفات افزا نہ رہے ہوں جنہیں ہماری طرف سے  
نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ اور وہ روسے زمین پر ہماری جانشینی کا فرض انجام  
دے رہے تھے۔ آدم سے لے کر خاتم تک ہم نے انبیاء کا سلسلہ قائم رکھا اور حبیب  
نبوت کو آخری مرحلہ پر پہنچا دیا تو اپنے حبیب کو حکم دیا کہ خبردار اس وقت تک دنیا  
سے رخصت نہ ہونا جب تک اپنے بعد کے لئے ہادی و راہنما کا انتظام نہ کر دینا۔ اگر  
تم نے ایسا نہ کیا تو گویا اپنی رسالت کا بھی فرض انجام نہیں دیا۔ ایسی رسالت بیکار  
ہے جس کا سلسلہ قیامت سے پہلے ختم ہو جائے۔ اور دنیا بادی و راہنما سے خالی ہو  
جائے۔ کمال رسالت یہ ہے کہ اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے۔ تم ایک بشری  
شکل میں نہ ہو لیکن تمہارا پیغام رہے۔ تمہارا اسلام رہے۔ تمہارا نظام رہے تمہارا  
قرآن رہے۔ تمہارا ایمان رہے اور اس نشان سے رہے کہ گویا تم زندہ اور موجود

ہو اور اس انداز سے رہے کہ ہر دیکھنے والا سمجھ لے کہ ابھی محمد زندہ ہیں اور محمدیت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ کردار خود آواز دے کہ یہاں اول بھی محمد ہے اور سبھی محمد ہے آخر بھی محمد ہے اور رکھ کے کل محمد ہیں۔ صلوات

مسئلہ ہدایت انتہائی نازک مسئلہ ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا اہل دنیا نے آسان سمجھ رکھا ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ انسان تمام احکام الہیہ سے مکمل طور پر باخبر ہو اور کسی مقام پر یہ نہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم نہ یہ کہے کہ میرا خیال یہ ہے۔ ایسا وسیع علم ہو کہ ہر مسئلہ میں حکم پروردگار بیان کرے اور ایسا محیط علم ہو کہ کسی مسئلہ پر ساکت نہ رہ جائے۔

تاریخ عصمت کا مطالعہ کیا جائے تو یہاں ہر شخص اسی شان کا حامل نظر آئے گا۔ جسے دیکھو علم کا بحر پیدا کرنا۔ جسے دیکھو تفصیلات کا ٹھکانا مازما مومند جسے دیکھو کمالات کا خزانہ۔ جسے دیکھو مناقب کا مرکز۔ دنیا کی کون سی فیصلت ہے جو یہاں نہیں ہے۔ حدیث ہے کہ دنیا بہکی بھی ہے تو خدا ہی ٹپے کچھ اور نہیں مانا۔ صلوات کمالات کی یہ مرکزیت اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں مالک کائنات نے ہدایت کا ذمہ دار اور دین کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے کردار کا یہ عالم ہے کہ یہ دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو بندگی کا درس دیتے ہوئے آتے ہیں۔ تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ مرسل اعظم نے دنیا میں قدم رکھا تو سرسجدہ معبود میں رکھا۔ مولائے کائنات نے زمین کعبہ پر قدم رکھا تو سرسجدہ معبود میں رکھا۔ ہر لام کا یہی انداز رہا۔ ہر معصوم کا یہی انداز رہا۔ یہاں تک کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات میں بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جیسے ہی آپ نے دنیا میں قدم رکھا دونوں گھٹنے ٹیک کر پیشانی خاک پر رکھ دی۔ اور آغاز حیات سے واضح کر دیا کہ نہ ہم سجدہ دیکھنے کے محتاج ہیں نہ کسی کے سکھانے کے محتاج ہیں۔ ہم اپنی معرفت اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اور اپنا

ذوق بندگی اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ سیکھنے سکھانے کے محتاج وہ ہوتے ہیں جن کا کام ابتدائی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سجدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے کہ کسی کے سکھانے کے محتاج ہوں۔ ہم جب عالم انوار میں تھے جب بھی سجدہ کر رہے تھے اور اس دنیا میں آئے ہیں جب بھی سجدہ کر رہے ہیں۔ صلوات

ہدایت و راہنمائی کے لئے علم و کردار و صداقت کے ساتھ ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ انسان میں قوت علم و برداشت درجہ کمال پر ہو اس لئے کہ جب اہل دنیا نے اپنا نظام ہدایت الگ بنالیا ہے اور اللہ کے نمائندوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تو قدم قدم پر مقابلے بھی ہوں گے۔ مصائب بھی پڑیں گے۔ شائد بھی ہوں گے۔ راستے بھی روکے جائیں گے۔ کانٹے بھی بچائے جائیں گے۔ پتھر بھی مارے جائیں گے۔ اب اگر خدائی نمائندہ جذبات و خواہشات کا پیکر ہو گا تو اس کی ماری زندگی صرف مقابلوں میں گذر جائے گی اور کار ہدایت انجام نہ پاسکے گا۔ ضرورت ہے کہ نمائندہ پروردگار اتنا حلیم و بردبار ہو کہ مصائب پڑتے رہیں وہ ان نہ کرے۔ کانٹے بچھے رہیں اور پھولوں کی رکش کی طرح گذر جائے۔ پتھر برستے رہیں اور وہ انھیں بارش رحمت تصور کرتا رہے۔ زندان مبارک شہید ہو جائیں اور وہ اس نے دالوں کو ہدایت کی دعا دے۔ سنگے پر غنچہ چل رہا ہو اور وہ بخشش است کی دعا کرے۔ حق غضب ہو رہا ہو اور وہ قوم کی مشکل کشائی کرے۔ پہلو شکستہ ہو جائے اور اس کے رحم و کرم میں کمی نہ ہو۔ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور وہ تلوار اٹھانے سے مانعت کرے۔ انگوٹھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں اور وہ بد دعا کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے۔ حکومت زہر و فاکھلاوے اور وہ صبر و شکر سے کھالے۔ سلطنت آزار پر آزار پہنچائے اور وہ اپنے کام میں مصروف رہے اور ایک لمحہ کے لئے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ زندگی قید خانہ میں گذر جائے مگر سجدہ ٹوٹیں میں بھی مغفرت کی دعائیں

ہی کرے اور دنیا پر واضح کر دے کہ ستم کرنا تمہارا کام ہے۔ رحم کرنا ہمارا کام ہے۔  
مگر اہ کرنا تمہارا کام ہے اور ہدایت کرنا ہمارا کام ہے۔ قیدی بنانا تمہارا کام ہے۔  
اور قید و بند سے آزاد کرنا ہمارا کام ہے۔ ظلم و جور کی زندگی گزارنا تمہارا کام  
ہے اور سب سے ضبط کی نمائندگی کرنا ہمارا کام ہے۔ تم خدا و فرعون و فرزد  
کے بنائے ہوئے ہو اور ہم اَرْحَمُ الرَّاحِمِین اور رب العالمین کے  
نمائندے ہیں۔ — صلوات

خدا گواہ ہے کہ کائنات کی تاریخ میں سوائے آل محمد کے کہیں ایسا  
کردار نظر نہیں آتا۔ آل محمد میں بھی بعض افراد ایسے ہیں جن کے کردار میں یہ بات  
نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ ہے کہ جب ظلم پریشان رہتا ہے تو  
حق کو قدرے سکون مل جاتا ہے۔ اور جب باطل کو سکون مل جاتا ہے تو حق کے  
لئے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی کچھ ایسی ہی قیامت خیز زندگی تھی۔ جب ظلم و  
جور کے مجسموں کو زندگی کا سکون نصیب ہو گیا تھا اور بنی امیہ کے مقابلے میں بنی  
عباس فاتح ہو کر عالم اسلام پر قابض ہو چکے تھے۔

بنی عباس کے لئے آل محمد کو ستائنا یوں بھی زیادہ ضروری تھا کہ انھوں نے  
حکومت ہی آل محمد کے نام پر حاصل کی تھی اب اگر آل محمد منظر عام پر آگئے تو  
انھیں چھوڑ کر کوئی حکومت کی طرف توجہ بھی نہ کرے گا۔ ضرورت ہے کہ انھیں  
منظر عام سے ہٹایا جائے اور عوام پر یہ ظاہر کیا جائے کہ اسلام کے حقیقی  
دارت اور امت کے واقعوں و اہم وارث ہیں۔

اس راہ میں دو اہم وسائل درکار تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ مصائب  
کے لئے اسے منتخب کیا جائے جو بنی ہاشم کا سربراہ اور کمالات کا مرکز ہو۔

کہ اصلی خطرہ اسی کی ذات سے ہو سکتا ہے۔ اور عوام کے ذہنوں پر وہی مسلط ہو سکتا  
ہے دوسرے لوگوں سے وہ خطرہ نہیں ہے وہ ہیں جیسے انسان ہیں اور ان کا کام  
ہماری ہی جیسی زندگی گزارنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصائب میں بھی یہ اعتیاد  
برقی جائے کہ وہ منظر عام سے ہٹ جائیں۔ اور حکومت کا دامن و اختیار نہ ہونے  
پائے۔ اس کی ایک شکل یہ ہے کہ انھیں قید خانوں میں رکھا جائے یا گھروں ہی  
میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ عوام سے نہ ملنے پائیں۔ اور عوام ان کی بارگاہ  
تک نہ پہنچنے پائیں۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی عوام ان  
سے برگشتہ نہ ہو سکیں اور لوگوں سے قریب ہی رہیں تو ان کی زندگی خاتمہ  
کر دیا جائے اور اس طرح زہر دیا جائے کہ حکومت کے سر کوئی بدنامی بھی نہ آئے  
پائے۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت کا انتظام بالکل الگ تھا اور اس نے طے  
کر لیا تھا کہ جس قدر انھیں دنیا سے دور رکھا جائے گا دنیا اسی قدر ان سے  
قریب ہوگی۔ اور جس طرح ان کے خون ناحق سے دامن بچائے کی کوشش کی جائے  
گی اسی طرح خون ناحق خود آواز دے گا کہ اگر حکومت کی سازش نہ ہوتی تو  
صفائی کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جتنا جتنا حکومتوں نے اپنا  
دامن صاف رکھا یا اپنا ہی خون ناحق رنگ لایا اور قدرت نے آواز دی  
کہ اگر تم نے زمین کے سارے دھبے دھو ڈالے ہیں تو ہم شفق کی خون ناحق  
کا عکس بنا دیں گے۔ اور دنیا پر واضح کر دیں گے کہ اہل دنیا کی حکومت  
صرف زمین پر ہوتی ہے اور نمائندہ پروردگار کا اقتدار آسمان والوں  
پر بھی ہوتا ہے۔ — صلوات

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی انھیں مصائب و آلام اور اسی کشمکش  
حیات و موت کا شکار رہی۔ سفر و سیر میں منصور عباسی کے دور میں پیدا ہوئے۔

منصور کے مظالم کے لئے یہی کیا کم تھا کہ اس نے امام جعفر صادقؑ کو زیر دلوایا تھا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو باپ کو زندہ نہ رہنے دے وہ بیٹے کو کس طرح زندہ رہنے دے گا۔ جب تک حضرت کے کمالات منظر عام پر نہیں آئے حکومت کا رد یہ قدرے نرم رہا لیکن جیسے ہی کمالات کا اندازہ شروع ہوا یہ اساس تیز تر ہو گیا کہ ابھی جعفر صادقؑ کا وجود باقی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم نے انہیں زیر دے کر ختم کر دیا ہے لیکن موسیٰ بن جعفر کا کردار بتا رہا ہے کہ ابھی جعفر صادقؑ زندہ ہیں۔ میں کہوں گا منصور! ایک موسیٰ بن جعفر پر کیا منحصر ہے تو اگر پوری نسل کو بھی تباہ کر دے گا تو قیامت جو پیدا ہوتا رہے گا اپنے وقت کا جعفر صادقؑ ہی ہوگا۔ صلوات۔

جنی عباس کے پاس امام کو ستانے کے مختلف راستے تھے۔ ان کے سامنے ایسے مسائل پھیلے جائیں کہ یہ حکومت وقت کی مصلحت کے خلاف جواب دیں اور حکومت کو سزا دیے کا جواز مل جائے۔ ان کے خاندان کے افراد کو انعامات اور جائزے دے کر توڑ لیا جائے۔ اور پھر ان پر یہ الزام رکھا جائے کہ یہ اپنے گھر میں حکومت کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ اور ان کا ارادہ اقتدار کے خلاف خروج کرنے کا ہے۔

ایک راستہ یہ بھی ہے کہ مختلف افراد کو ان کے پاس جاسوس بنا کر بھیجا جائے اور وہ اپنے کو چاہنے والا ظاہر کر کے انہیں شرعی حقوق دیں اور جب یہ قبول کریں تو ہم یہ اعلان کر دیں کہ یہ ہمارے مقابلہ میں اپنے کو بادشاہ وقت اور حاکم امت سمجھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت جو کچھ سوچ سکتی ہے وہ سب ادھر ہی کا تو علم ہے۔ یہ علم ان افراد کے مقابلہ میں کام آسکتا ہے جو یہیں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن جو اپنے علوم و کمالات ادھر سے لے کر

آئے ہیں ان پر یہ جادو کہاں چل سکتا ہے۔ جادو جادو پر چلتا ہے معجزہ پر نہیں چلتا۔ اور معجزہ ہر جادو کا اثر باطل کر دیتا ہے۔ مقابلہ ہوتا رہا اور دنیائے دیکھ لیا کہ بالآخر فتح امامت ہی کے ہاتھوں رہی اور آج جب کہ منصور دوانیقی ہادی۔ جہدی ہارون جیسے سلاطین کی قبروں کا نام و نشان تک نہیں ہے بصرہ دینداد کے قیدی موسیٰ بن جعفرؑ کا روضہ آسمان سے آنکھیں ملا رہا ہے اور آواز دے رہا ہے سلاطین دنیا آؤ اور حق کی فتح کا شاہد کرو۔ یاد رکھو دولت کا زور کھٹ جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ اتر جاتا ہے کرسی الٹ جاتی ہے۔ تخت سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ تاج قدموں میں آجاتے ہیں۔ لیکن علم و کردار نہ پامال ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس کی تابانیاں باقی رہتی ہیں اور باقی رہیں گی۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ وہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ صلوات۔

آئیے امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی زندگی سے چند واقعات پیش کریں جن سے یہ صحیح اندازہ ہو سکے کہ حکومت نے کیا چاہا تھا اور امامت نے اس کے جادو کو کس طرح باطل کیا۔ علم و کردار کی بحث میں بعض واقعات علم کے ذیل میں پیش کئے جائیں گے۔ اور بعض کردار کے ذیل میں۔ علم کی منزل میں وہ مشہور و معروف واقعات کافی ہیں کہ جب ہارون رشید نے علی ابن یقین کو وزیر بنانا چاہا اور حضرت نے اجازت دیدی کہ شاید اسی طرح میں سے چاہئے۔ اے حکومت کہ شر سے محفوظ رہیں اور حکومت کو خیر پہنچائی گئی کہ علی بن یقین موسیٰ بن جعفرؑ کے مرید ہیں۔ انہیں بلا وجہ اپنا وزیر کیوں بنا رکھا ہے تو حضرت نے ایسے وسائل اختیار فرمائے کہ علی بن یقین کی عزت میں بھی اضافہ ہوا اور دشمنوں کو ذلیل اور رسوا بھی ہونا پڑا۔

ایک مرتبہ لوگوں کے درمیان وضو کے مسئلہ پر بحث ہو گئی کہ وضو کا طریقہ کیا ہے۔ علی بن یقین نے امام موسیٰ کاظمؑ سے دریافت کیا۔ آپ نے اہلسنت کے طریقہ سے وضو کرنے کی تلقین کر دی۔ علی بن یقین حیرت میں پڑ گئے کہ یہ امامؑ نے کیا فرمایا ہے۔ لیکن امام کا حکم تھا بحث نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ادھر لوگوں نے ہارون کو اطلاع دی کہ علی بن یقین امام موسیٰ کاظمؑ سے مل گئے ہیں۔ اور انہیں کے مذہب پر عمل کر رہے ہیں۔ انہیں حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہارون نے کہا کہ اس کا امتحان میں خود کروں گا۔ ایک دن وضو کے وقت چھپ کر دیکھنے لگا۔ دیکھا کہ علی بن یقین سرکاری طریقہ سے وضو کر رہے ہیں۔ دوڑ کر بٹ گیا۔ کہنے لگا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑی بڑی شکایتیں کی تھیں لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ تمہارا عقیدہ صحیح ہے۔ لوگ تم سے حسد کرتے ہیں۔ ادھر دوسرے روز امام کا پیغام پہنچا کہ ابن یقین! اب ہمارے طریقہ سے وضو کیا کرنا۔ اب ضرورت ختم ہو گئی ہے۔

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے امام کا علم اور یہ ہے شان رہنما۔ کب کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ امام ہی جانتا ہے۔ دنیا نے چاہا تھا کہ امامؑ کے چاہنے والے کو تہ تیغ کرادے لیکن امامت نے فوراً ہی بجایا اور واضح کر دیا کہ ہم بچا بچا ہیں تو کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ جب کل ساز فرعون کل کے موسیٰ کو فنا نہیں کر سکا تو آج ساز فرعون آج کے موسیٰ کو کیا فنا کر سکتا ہے — صلوات

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی کتابوں میں ملتا ہے کہ ہارون رشید نے علی بن یقین کو ایک خلعت بطور انعام دیا۔ علی بن یقین نے اسے فرزند رسولؐ کی خدمت میں بھیج دیا کہ یہ آپ کے شایان شان ہے۔ آپ نے واپس کر دیا کہ ابن یقین! اسے محفوظ رکھو یہ تمہارے کام آئے گا۔ ابن یقین کو سہمہ ہوا کہ امامؑ نے قبول نہیں فرمایا۔ لیکن حکم

تمہا معفوفا کر دیا۔ ادھر کسی نے اس عمل کو دیکھ لیا تھا۔ فوراً جاکر ہارون کو خبر کی کہ جس خلعت کو آپ نے ابن یقین کے حوالے کیا تھا وہ انہوں نے اپنے امام کو دیدیا ہے۔ ہارون کو غصہ آیا فوراً ابن یقین کو طلب کیا۔ اور کہا یہ کیا قصہ ہے کہ جو کچھ میں تمہیں دیتا ہوں وہ تم دوسروں کے حوالے کر دیتے ہو۔ ابن یقین نے کہا کہ امیرسہ واقعہ کیا ہے؟ ہارون نے کہا کہ وہ خلعت کہاں ہے جو میں نے عنایت کیا تھا؟ علی بن یقین نے کہا کہ میکہ غلام کو میرے گھر بھیج دیا جائے۔ فلاں مقام پر رکھا ہے۔ غلام گیا اور خلعت لے آیا۔ ہارون کا حال غیر ہو گیا اور کہنے لگا یہ حاسد بے ایمان کب تک تم سے جلتے رہیں گے۔ مجھے خیبر سدی گئی تھی کہ وہ خلعت تم نے اپنے امام کو دیدیا ہے۔ لیکن اب یہ معلوم ہو گیا کہ سب جھوٹ ہے۔ ابن یقین دربار سے چلے آئے۔ اور شکر خدا بجا لائے۔ قربان ایسے ذرہ نواز اور غلام پرور امامؑ کے کہ خلعت کو واپس کر کے غلام کی جان بچا لی گویا امامؑ نے علی بن یقین کو دربار ہارون میں بھیج کر آواز دی ابن یقین میرے شیعوں کو بچانا تمہارا کام ہے اور تمہاری حفاظت کرنا میرا کام ہے۔ صلوات

یہ صرف جوانی کی بات نہیں ہے۔ بچپن ہی سے علم و کمالات کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ تاریخ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ امام کی صفت کیا ہے آپ نے فرمایا کہ امام بہو ولعب میں مصروف نہیں ہوتا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ ایک بکری کا بچہ لے چلے آ رہے ہیں۔ حیرت ہوئی یہ کیسے امام ہیں کہ بکری کے بچے سے کھیل رہے ہیں۔ متوجہ ہوا تو دیکھا کہ حضرت اس سے فرار ہے ہیں کیسا کفر! دیکھ رہا ہے۔ سجدہ پروردگار کیوں نہیں کرتا۔ اس نے اپنے دل میں کہا بیشک اللہ کے نمائندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ جانور سے سجدہ کرایا جائے مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو ہوش آجائے کہ جب ہم جانوروں کے

سجدہ نہ کرنے سے راضی نہیں ہیں تو انسانوں کی سرکشی سے کس طرح راضی ہو جائیں گے — صلوات

ظاہر ہے کہ اہل دنیا ان کمالات کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور ہر آن ان کو فکر تھی کہ کس طرح انہیں دنیا کی نگاہ میں ذلیل کر دیا جائے۔ اور دنیا پر ظاہر کر دیا جائے کہ ان کے پاس واقعا کوئی کمال نہیں ہے یا یہ دنیا کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ ایک شخص جس کا نام تھا قتیق النصاری — وہ خود بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں ہارون کے دربار میں باریابی کے لئے گیا اور دربانوں نے دروازہ پر روک دیا۔ دیر تک کھڑا رہا اور کوئی صورت نہ نکل سکی اتنے میں میں نے دیکھا کہ موسیٰ بن جعفر آئے اور جیسے ہی آئے دربانوں نے راستہ دیدیا اور فوراً دربار میں داخل ہو گئے۔ مجھے یہ بات بے حد ناگوار گذری اور میں نے یہ طے کر لیا کہ جب یہ باہر آئیں گے تو میں انہیں ذلیل کر دوں گا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ مجھے اجازت نہیں ملی اور یہ بلا اجازت اندر چلے گئے — چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد جب حضرت دربار سے باہر تشریف لائے تو اس نے بڑھ کر راستہ روکا اور جیسے ہی آپ نے گھوڑے پر سوار ہونے کا ارادہ کیا اس نے پوچھا جناب آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا تیرے سوال کا مطلب کیا ہے۔ اگر تو میرے شجرہ کے بارے میں سوال کرتا ہے تو میں محمد مصطفیٰ کا فرزند ہوں۔ اور اگر میرے وطن کے بارے میں پوچھتا ہے تو ایسی جگہ کا رہنے والا ہوں جس کی زیارت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور اسی میں مسلمان کی نجات ہے۔ اور اگر صرف تو ہیں کرنا چاہتا ہے تو یاد رکھ کہ ہماری فضیلت کو عرب کے کفار و شرکین بھی پہچانتے ہیں۔ کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ جب بدر کے میدان میں عتہ بنہ اور ولید جیسے افراد کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے۔ اور لشکر اسلام کی طرف سے انصار نے لڑنے کا ارادہ کیا تو کفار نے

یہی جواب دیا تھا کہ ہم کل سخت داروں کو اپنا مقابل نہیں سمجھتے۔ ہمارے مقابل میں انہیں بھی جو خاندانی وجاہت اور آبائی شرافت رکھتے ہوں۔ بتائیں کفار نے بھی اپنے برابر نہیں سمجھا۔ ہمارا کیا ذکر ہے اور میری شخصیت سے ہمارے میں پوچھتا ہے تو یاد رکھ ہم خاندان کی یادگار ہیں جن پر ہر نماز میں درود پڑھنا فرض ہے۔ اور اگر انسان درود نہ بھیجے تو نماز ہی نہ رہ جائے۔ یہ سننا تھا کہ مراد اللہ کے لئے گہرا کر گھوڑے کی جام چھوڑ دی اور اپنے راستہ چلا گیا۔

دیکھا آپ نے عداوت کا انداز۔ دنیا کسی فضیلت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی ہے اور قدرت نے طے کر لیا ہے کہ جب تم راستہ روکو گے تو ہم فضیلت کی ایک نئی راہ نکال دیں گے۔ بھلا ان کا راستہ کون روک سکتا ہے جن کے لئے لٹانہ کعبہ کی دیوار میں در بن گیا اور در نے بن کر فضیلت کا ایک نیا باب کھول دیا۔ صلوات

امام کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اپنے پرانے مسلمان غیر مسلم سب درپے آزاد تھے۔ غیر مسلمین کا منشا تھا کہ اسلام ذلیل ہو۔ مسلمانوں کا مقصد تھا کہ اہلبیت رسول کی توہین کی جائے اور درمیان میں ایک امام موسیٰ بن جعفر کی ذات تھی جو ہر محاذ پر مقابلہ کر رہی تھی۔ اور دشمنوں کو مسلسل شکست پر شکست دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک عیسائی راہب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھ سے بڑا تو ریت و انجیل کا عالم کوئی نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا بھائی یہ تو بتا دے کہ حضرت مریم کی والدہ کا نام کیا تھا؟ اور حضرت عیسیٰ کس روز کس وقت کس جگہ پیدا ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ تو مجھے نہیں معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا بس اسی علم پر عالیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ عیسائیوں کا راہب اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں بے خبر کہنے پر عرض کر دوں فرزند رسول یہ ایک

میسائی ہی پر کیا منحصر ہے۔ آپ کے جد کے ماننے والے بھی ایسے ہی عالم ہیں جنہیں آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ مرسل اعظم کس دن دنیا میں تشریف لائے اور کس دن تشریف لے گئے۔ اور عجب نہیں کہ فرزند رسولؐ فرمائیں کہ اسی لئے تو میں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ امت کو معلوم ہو جائے کہ جو اپنے نبی کے بارے میں اتنا بے خبر ہوتا ہے اسے امتی ہونے کا بھی حق نہیں ہے۔ امت کا ذمہ دار اور نبیؐ کا دارث ہونا تو بڑی بات ہے۔ صلوات

یہ کہہ کر حضرت نے فرمایا یا درکھ حضرت مریم کی والدہ کا نام یونانی زبان میں مرثا ہے۔ جس کا عربی ترجمہ "وہیبہ" ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کا محلِ جمعہ کے دن ظہر کے وقت قرار پایا تھا۔ جب جبریل امین حضرت مریم پر نازل ہوئے اور انہیں روح عیسیٰ سے سرفراز فرمایا۔ مرسل اعظمؐ نے اسی لئے اس دن کو عید قرار دیا ہے کہ یہ ایک قدرت پروردگار اور عظمت پروردگار کا دن ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس دن اور اس ساعت میں عبادت پروردگار کریں۔ اور معبود کی بارگاہ میں سر نیاز خم کریں۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سہ شنبہ کے دن ہوئی۔ جب ساڑھے چار گھنٹے دن چڑھ چکا تھا۔ اور وہ دریائے فرات کا کنارہ تھا جہاں حضرت عیسیٰ کے اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ پروردگار نے ان کی برکت سے فرات میں مابے حساب برکت رکھ دی ہے۔ اور اب اس سے سارے اطراف کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ولادت کے موقع پر حضرت مریم نے کسی سے بات نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب تمہارے خاندان میں کوئی بدگزار نہیں تھا تو تمہارے یہاں بغیر شوہر کا بچہ کیسا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ نے گہوارے سے اپنی مادر گرامی کی عصمت کی گواہی دی۔

راہب حیران ہو گیا اور کہنے لگا اچھا یہ بتائیے کہ میری ماں کا نام کیا ہے آپ نے فرمایا کہ تیری ماں کا نام سریانی میں عفتالہ ہے اور عربی میں "لمیہ" تیرے دادا کا نام عفتور ہے اور تیرے باپ کا نام عبدالمسیح ہے حالانکہ اللہ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ بندہ اللہ کا بندہ ہوتا ہے مسیح کا نہیں۔ اور اے راہب تیرے نانا کا نام جبریل ہے جسے جبرائیل بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ملائکہ کے نام میں شرکت جائز نہیں ہے۔ انسان کو انسانوں کا سامان رکھنا چاہئے ملائکہ جیسا نہیں۔

یہ کہہ کے فرمایا کہ کیا میں تیرے دادا کے قتل کا واقعہ بھی بیان کر دوں کہ شام والوں نے کس طرح اس کے گھر کا محاصرہ کر کے اسے قتل کیا ہے۔ اس نے کہا نہیں صرف یہ بتا دیجئے کہ میرا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا عبد الصلیب۔ حالانکہ تیرا نام بھی عبد اللہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ صلیب کا بندہ کیا مطلب؟ انسان خدا کا بندہ ہوتا ہے نہ کہ صلیب کا بندہ؟

یہ سننا تھا کہ راہب پریشان ہو گیا اور اس ہمہ گیر علم کے مقابلہ میں کوئی بات بن نہ پڑی۔ سوائے اس کے کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے بے ساختہ کہا کہ فرزند رسولؐ مجھے کلمہ پڑھو دیجئے اور مسلمان بنا دیجئے۔ جس مذہب میں ایسے ایسے صاحبان علم و فضل ہوں اس سے بہتر مذہب کون ہو سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے اسلام کی تبلیغ کس طرح ہو رہی ہے۔ یہاں "بزدل شمشیر" اسلام نہیں ہے۔ یہاں صرف علم ہے، اخلاق ہے، نکر وار ہے۔ اور یہ اعلان ہے کہ خدا کا نمائندہ علم و کردار کا حامل ہوتا ہے اور دنیا کا نمائندہ تیر و تلوار کا۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہے کردار کے سایہ میں کلمہ پڑھو یا تلوار کے سایہ

میں — صلوات

ارباب کرم! امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے اس واقعہ میں بے شمار مسائل کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور راہب کے جواب کے ساتھ امت اسلامیہ کو بھی ہوشیار کر دیا ہے۔ کہ صبح امتی وہی ہے جو اپنے رسول کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ واقعی گلہ گو وہی ہے جو خدا کا بندہ ہو رسول کا بندہ نہیں اور اگر نام میں بھی یہ احتیاط برقرار رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ رسول کا بندہ کہنا حرام اس لئے نہیں ہے کہ ہمارے رسول میں اور حضرت عیسیٰ میں فرق ہے۔ وہاں لوگ عیسیٰ کو خدا ہی کا شریک اور ابن اللہ کہتے تھے۔ اس لئے بعد المسیح میں شرک کا اندیشہ تھا۔ یہاں کوئی مسلمان پیغمبر کو خدا نہیں مانتا اس لئے شرک کا کوئی سوال نہیں ہے۔ بلکہ اسلام اور روشن ہو جاتا ہے کہ انسان اس کا غلام ہے۔ جو حقیقتاً عبد اللہ ہے۔ اور بظاہر محمد ابن عبد اللہ

ہے — صلوات

حضرت عیسیٰ کے مسئلہ نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ اللہ نے نبی کی خلقت سے دن کو بھی ابرکت بنا دیا ہے اور اس جگہ کو بھی جہاں نبی نے قدم رکھے تھے تاکہ مسلمانوں کو موش آجائے کہ نبوت کے قدم زمان و مکان کو بابرکت بنادیا کرتے ہیں۔ اب اگر مریم کا لال زمین و زمان کو بابرکت بنا سکتا ہے تو زہرا کے لال کی کیا منزلت ہوگی۔ وہاں فرات کا پانی بابرکت ہو گیا یہاں خاک خاک شفا ہو گئی — وہاں دریا مبارک ہو گیا یہاں زمین صحرا کر بلائے معلیٰ بن گئی — صلوات

اور پھر ایک منسزل وہ آئی کہ فرات پر بھی زہرا کے لال ہی کا قبضہ ہو گیا۔ اور عظمت نے آواز دی۔ دنیا میں اگر زمین کو بרכת دینا فرزند مریم کا

کا کام تھا اور دنیا سے جا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلندی دے دینا ابن زہرا کا کارنامہ ہے — اور کیوں نہ ہو ابن زہرا اور ابن مریم میں بڑا فرق ہے۔ دنیا اس فرق کو نہیں پہچانتی۔ یہ فرق تو اسی دن کھلے گا جب دونوں فرزند ایک نقطہ پر جمع ہوں گے۔ اور ابن مریم کی جماعت ہوگی اور ابن زہرا کی امامت ہوگی تب معلوم ہوگا کہ آسمان پر بلند ہو جانا بڑا شرف ہے یا زمین کو عرش معلیٰ بنا دینا بڑا شرف ہے۔ صلوات

تذکرہ آئیکہ ہے تو ایک علمی مکالمہ اور سن لیجئے جس میں مخاطب کوئی عیسائی یا یہودی نہیں ہے۔ بلکہ امت اسلامیہ کا ایک امام ہے اور امام بھی کیسا جسے امام اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس جو کچھ ہے سب اسی در کا صدقہ ہے۔ لیکن خدا برا کرے طمع دینا کا۔ جب حکومت نے سربراہانہ رکھ دیا تو ذہن ہی متقلب ہو گیا۔ اور اب یہ خیال پیدا ہو گیا کہ امت میں مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے اور امت کا کیا ذکر ہے خود پیغمبر اسلام کے ارشادات پر بھی اعتراضات فرمادیئے اور یہ فرمایا کہ یہ حکم پیغمبر صلیع نہیں ہے۔ واقعی حکم یوں ہونا چاہئے تھا — اس لئے کہ میرے قیاس کا تقاضا یہی ہے اور اسلام اب قرآن و سنت سے طے نہ ہوگا بلکہ سرکاری قیاس سے طے ہوگا۔ غیر۔ واقعی یہ ہوا کہ ایک مرتبہ آپ نے امام جعفر صادقؑ کے شکایت کی کہ آپ کے فرزند موسیٰ بن جعفرؑ ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے جہاں لوگ برابر سامنے سے گزر رہے تھے اور اس طرح خشوع و خضوع میں فرق آجاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا جواب انھیں سے حاصل کیجئے سکا۔ اتنے میں امام موسیٰ بن جعفرؑ آگئے۔ آپ نے فرمایا فرزند! انھیں تمھاری نماز پر اعتراض ہے اور یہ کہتے ہیں کہ تم ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے کہ جہاں گ

سامنے سے گذر رہے تھے اور اس طرح خضوع و خشوع میں فرق آجاتا ہے۔

آپ نے فرمایا بابا جان ان سے فرمادیجئے کہ میرا خدا مجھ سے اتنا قریب ہے کہ میرے اور اس کے درمیان سے کوئی گزر ہی نہیں سکتا۔ اور جب درمیان سے گزر نہیں سکتا تو خضوع میں فرق آنے کا کیا سوال ہے۔ (مناقب)

یہ سننا تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے بڑھ کر گھٹے سے لگایا۔ فرمایا شایاش فرزند شاہ باش۔ خاندان رسالت کے بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ صلوات اس واقعہ سے وہ ایک مستقل مسئلہ بھی حل ہو گیا جو آج تک امت اسلامیہ

میں زیر بحث ہے اور مسلمان اس نماز کو بیکار سمجھتے ہیں جس میں کوئی نمازی کے سامنے سے گذر جائے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ قابلیت دور دراز ملکوں ہی میں نظر آتی ہے۔ مگر مغفلہ میں خانہ کعبہ کے گرد کوئی اس مسئلہ پر عمل نہیں کرتا اور ہر ایک کی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ بس خانہ کعبہ سے جدا ہوئے اور نئے نئے مسئلے یاد آنے لگے۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے واضح فرمادیا کہ تمہارے خلوص اور ہمارے خلوص میں فرق ہے۔ تمہارا خلوص آدمی کے گذر جانے سے مجروح ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا خلوص تیرے محل جانے پر بھی مجروح نہیں ہوتا۔

رکوع میں انگوٹھی بھی دے دیتے ہیں تو ہماری شان میں آیت ولایت ہی نازل ہوتی ہے۔ یہ اپنے اپنے خلوص اور اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے۔ کسی کا خدا دور ہوتا ہے کسی کا خدا دگ گردن سے زیادہ قریب جس کا جیسا خدا ہوتا ہے اس کا ویسا ہی عمل ہوتا ہے۔ صلوات

تم نے ابھی ہمارے عمل کا فلسفہ ہی نہیں پہچانا۔ احکام یکہ کے عمل کرنا تمہارا کام ہے اور احکام کی حقیقت و حکمت پہچان کے عمل کرنا ہمارا کام ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شام بن الحکم نے فرزند رسولؐ سے سوال کیا کہ یہ نماز کے شروع میں سات

تکبیریں کیوں مستحب ہیں؟ یہ رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ“ کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ سجدہ میں ذکر سجدہ بدل کیوں جاتا ہے۔ اور وہاں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ وَبِحَمْدِهِ“ کیوں کہا جاتا ہے۔

سوال کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ تحت و تاج پر قبضہ ہے لیکن شریعت اسلامی کی خبر نہیں ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بنیاد تو روز اولیٰ سے پڑھیں تھی کہ تحت و تاج لینا ہے تو شریعت کا ساتھ چھوڑنا پڑے گا۔ اور شریعت کو سنبھالنا ہے تو تحت و تاج سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لہذا بہت سہی ہے کہ تحت و تاج پر قبضہ کر لو سائل تو عمل ہو ہی سکتے تھے۔ گویا حکمتوں کو بھی اعتماد تھا کہ انٹر اپنی محبت سے زمانے کو خالی نہ رکھے گا۔ اور محبت خدا سائل بیان کرنے سے گریز نہ کرے گا تو اپنے لئے زندگی بھی سلامت رہے گی اور جنت بھی امانت سے نہ جانے پائے گی۔

آپ نے فرمایا میں جب حضور سرور کائناتؐ معراج کی رات آسمانوں کی طرف چلے تو جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھتے گئے۔ ایک منزل آئی جہاں ایک پردہ ہٹا آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور آگے بڑھے دوسرا پردہ ہٹا آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور آگے بڑھے تیسرا پردہ ہٹا۔ آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ غرض اسی طرح آگے بڑھتے رہے اور عجائبات نکلا ہوں سے اٹھتے گئے۔ اور ہر جاب کے اٹھنے پر ایک تکبیر کی عبادت آتی رہی۔ یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے ہو گئیں اور سارے عجائبات نکلا ہوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ تو غفلت الہی کے احساس سے حضورؐ کو جھٹکا دیا اور حضورؐ نے جھٹک کر آواز دی ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ“۔

یہ کہنا تھا کہ ہندی کا ایک اور عالم نکلا ہوں کے سامنے آ گیا۔ جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اور اب آپ کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ ہر طرف عظمت و جلالت

کا منظرہ نکالوں میں جلوہ روبرویت۔ قدس کی فضا۔ خدائے قدوس کا جلوہ۔  
یہ دیکھ کر بے ساختہ آپ سجدہ میں گر پڑے۔ اور آواز دی ”سبحان ربی الاعلیٰ  
و جہلہ“ نماز اسی معراج کی یاد دہا رہے۔ اور اس کے اعمال اسی معراج کا  
پرتو ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب مومن غلوں و توجہ کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو  
آواز آتی ہے جا میں نے تیری نماز کو بھی معراج بنا دیا۔ صلوات

ظاہر ہے کہ جو شریعت کے ان اسرار و رموز سے باخبر ہوگا۔ اس کی نماز و  
عبادت کا عالم ہی کچھ اور ہوگا۔ دنیا پر سوچتی ہوگی کہ ہم نے قید خانہ میں تنہا ڈال  
دیا اور وہ یہ سوچنا ہوگا کہ یہی تو عبدیت کی معراج کی منزل ہے۔ جہاں کوئی تحریک  
بھی ساتھ نہیں ہے اور بندہ ہے جو معبود کی بارگاہ میں سرنیا زخم کئے ہوئے  
مناجات کر رہا ہے۔ خدا جانتا ہے دنیا میں قید خانہ کو زندان سمجھ کر خوش ہو رہی  
تھی امام اس قید خانہ کو عبدیت کی معراج سمجھ کر مطمئن تھے۔ صبح سے ظہر تک اور ظہر  
سے مغرب تک مسلسل سجدے اور ہر سجدے میں مسلسل دعائیں۔ دنیا حیران ہے کہ  
کسی طرح بندگی سے عاجز آجائیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ ہر مصیبت پر ایک نیا  
سجدہ شکر۔ آخر وہ ہنسٹرل آئی جب حکومت نے بھی یہ طے کر لیا کہ انھیں  
سجدوں سے نہیں روکا جاسکتا۔ اور سجدوں کی کشش انھیں نہیں روک سکتی  
بہتر یہی ہے کہ دنیا کو یہ یاد کر دیا جائے کہ یہ سجدے اور یہ بندگی صرف  
مجبوری کا سودا ہیں ورنہ دنیا بل جائے تو نہ سجدہ رہ جائے گناہ بندگی یہ طے  
کر کے ایک دن ملک کی ایک حسین و جمیل عورت کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ مقصد یہ کہ  
امام موسیٰ کاظمؑ کو عبادت خدا سے روک دے۔ اور ہم دنیا کو یہ سمجھا سکیں کہ یہی  
عبادت نمائش و ریاکاری ہے اور اس کا غلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔  
یہی اسلام کا نمائندہ ہے جس کی ساری ہم یہ ہے کہ اللہ کے بندوں

کو عبادت سے روک دے۔ سجدہ گزاروں کے سجدے میں غفلت پیدا کر دے۔ اب بھی اگر  
دنیا کو ہوش نہ آیا تو کب آئے گا کہ اسلام کا وارث اور بندگی پر در و گار سے ممانعت  
یہی تو فرق ہے اہل حکومت اور اہل امامت میں۔ سجدہ کرنا امامت والوں کا کام ہے  
اور سجدہ سے روکنا حکومت والوں کا کام ہے۔ اب یہ آدم آکر فیصلہ کر لیں  
گے کہ ان میں کون سا عمل معصوم عمل ہے اور کون سا کردار شیطانی  
کردار ہے۔ صلوات

عورت قید خانہ میں گئی۔ دروازہ بند کیا گیا۔ قفل لگا یا گیا اور اباب  
دولت اس بات کے منتظر رہے کہ اب کوئی آواز آئے گی اور عبادت کا سارا  
راز کھل جائے گا۔ میں کہتا ہوں انتظار کس بات کا ہے۔ کیا کسی اقدام ہی کی ضرورت  
ہے۔ آخر حکومت ہی کی فرستادہ تو ہے۔ ایک شور مچا دے گی اور سارا مسئلہ  
حل ہو جائے گا۔ لیکن کیا کہنا رعب و جلال امامت کا کہ عورت کھڑی لرز  
رہی ہے اور نہ ٹوکنے کی ہمت پڑتی ہے نہ شور مچانے کی۔ منتظر ہے کہ سجدہ سے  
سر اٹھائیں تو عرض مدعا کرے اور آپ کا سجدہ ہے کہ تمام ہی نہیں ہوتا۔  
عورت کھڑے کھڑے تھک گئی تو بیٹھ گئی اور دیکھنے لگی کہ واقعاً ان کی  
عبادت کا کیا عالم ہے اور یہ سجدہ اس قدر طولانی کیوں ہو رہا ہے۔ ایک  
مرتبہ دیکھا کہ امام کی زبان پر تسبیح پروردگار کا ورد فضا میں کچھ آواز گونج  
رہی ہیں۔ سر اٹھایا تو کیا دیکھا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ جنت  
کے نظارے نکالوں کے سامنے ہیں اور ”لبیک لبیک عبدی“ کی صدائیں  
آ رہی ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ عورت سے ضبط نہ ہو سکا اور بے ساختہ سجدے میں  
گر پڑی۔ ادھر امام کا سجدہ اور ادھر کثیر کا سجدہ۔ وہ خدا کا نمائندہ اور یہ  
حکومت کی نمائندہ۔ رات تمام ہو گئی لیکن نہ ان کا سر اٹھانا اس کا سر اٹھنا

صبح ہوئی حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ آخر عورت کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی آواز بھی نہیں دیتی۔ شاید دونوں میں ساز باز ہو گئی اور امامؑ نے اسے اپنا بنالیا۔ یہ سوچ کر ارباب دولت زندان کے دروازے تک آئے اور بڑی تمکنت کے ساتھ زندان میں داخل ہوئے۔ اب جو قید خانہ میں قدم رکھا تو عجب منظر دیکھا کہ دو اللہ کے بندے ہیں اور دونوں محسود ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو بدنیت عورت کا سجدہ دیکھ کر خوش ہوتا۔ لیکن سجدہ سے کسے قلق ہے وہاں تو ساری ایکسپیم ہی فیمل ہو گئی۔ عاجز آکر عورت کو اٹھایا اور کہنے لگے ہوئے باہر لائے۔ یہ کیا طریقہ ہے تجھے کس کام کے لئے بھیجا گیا تھا اور تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا امیر خدا جانتا ہے جو لذت عبادت میں اس بندہ خدا کے ساتھ ملی ہے وہ زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوئی۔ میں قید خانہ میں اسی ارادہ سے گئی اور منتظر رہی کہ یہ سجدہ سے سر اٹھائیں تو اپنا مدعا بیان کروں لیکن انھوں نے سر نہ اٹھایا اور میں نے یہ منظر دیکھا کہ آسمان سے بلیک بلیک کی آوازیں آرہی ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بھی سر سجدہ معبود میں رکھ دیا۔

ارباب کرم! یہ ہے زور امامت کہ قید خانہ کے فضائل دربار میں بیان ہو رہے ہیں۔ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ آج فضائل اہلبیتؑ کی حدیثیں غیروں کی کتابوں میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اور انھیں دشمنوں نے فنا کیوں نہیں کر دیا۔ لیکن عزیزان محترم یہ قدرت کا انتظام ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دئے جائیں کہ امام قید خانہ میں رہیں اور فضائل دربار میں بیان ہوتے رہیں۔ حکومت نے اپنا نمائندہ نہ بھیجا ہوتا تو اہل دربار کو امامؑ کی عبادت کا حال کیسے معلوم ہوتا۔ قدرت نے بھی آواز دی قید خانہ میں

ڈال دینا تھا اور کام ہے اور تمھارے نمائندہ سے کلمہ پڑھوا لینا ہمارا کام ہے۔ — صلوات

بس آخری لفظ اور سن لیجئے اور بیان تمام۔ تاریخ میں ایک بندہ خدا کا واقعہ اور بھی ملتا ہے۔ جس کا سابقہ ایک حسین و جمیل عورت سے پڑا تھا۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو بھی محفوظ کیا ہے۔ یہ جناب یوسف اور زلیخا کا واقعہ ہے۔ جہاں زلیخا سے سابقہ پڑا اور دامن یوسف محفوظ رہا۔ عصمت پر کوئی وجہ نہ آسکا۔ لیکن ارباب کرم! اتنا فرق ضرور ہے کہ یوسفؑ نے اپنا دامن بچایا لیکن زلیخا کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکے۔ اور امام موسیٰ بن جعفرؑ نے حکومت کی نمائندہ کو اپنا ہم خیال بھی بنالیا۔ تو اب مجھے کہنے دیجئے کہ جو اپنا دامن بچالے اسے عصمت نبوت کہتے ہیں اور جو دشمنوں کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لے اسے عصمت امامت کہتے ہیں۔ صلوات



# امام علی رضا علیہ السلام

اسم مبارک

لقب

کنیت

والد ماجد

والدہ ماجدہ

ولادت

شہادت

عمر مبارک

زوجہ

اولاد

قبر مطہر

علی

رضا - ضامن

ابو الحسن

امام موسیٰ کاظمؑ

نجمہ

۱۱ ربیعہ ۳۳۳ھ (جمعہ) مدینہ منورہ

۳۳ ربیعہ ۳۳۳ھ طوس

پچاس سال

جناب سبکہ

امام محمد تقیؑ

مشہد مقدس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء  
والمرسلين خاتم النبيين سيدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآل الطيبين  
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله  
الحكيم في كتابه الكريم - بسم الله الرحمن الرحيم  
ان علينا لاهدي دان لنا لاخرة والاولى

مالک کائنات کا ارشاد ہے: "یشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر  
ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

ذرت کریمہ میں مالک کائنات نے صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ دنیا میں  
کسی انسان کو ہدایت کا انتظام کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ کام ہمارا ہے اور ہمیں  
کو انجام دینا ہے اور ہم نے ہر دور میں انجام دیا ہے۔ آدم سے لے کر آج تک  
کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب ہم نے ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو۔ اور ایک نہ ایک  
ہادی اور راہنما نہ معین کیا ہو۔ ہجرت کی بات ہے کہ ہمارے اتنے مسلسل انتظام  
کے باوجود اور ایک لاکھ چوبیس ہزار تجربات کے بعد بھی امت اسلامیہ نے  
ہمارے اوپر اعتماد نہ کیا تو اب اس کا رسول اور امام پر کیا اعتماد ہوگا۔ وہ  
قرآن اور کعبہ پر کیا ایمان لائے گی۔ یاد رکھو جس نے ہمارے مقابلہ میں اپنی  
ہدایت کا انتظام کیا وہ نہ ہمارا راہنما نہ ہمارے رسول کا۔ نہ کعبہ کا راہنما نہ قرآن کا  
نہ اس کے کلمہ کی کوئی قیمت ہے نہ شہادت کی یہ باری نظر میں مسلمان وہاں ہے  
جو ہمارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور ہم جسے راہنما بنائیں اس کے

سامنے سر تسلیم خم کرتا جائے۔ ہم اپنی وحدانیت کا اعلان کریں تو "لا الہ الا اللہ" کہے۔ ہم اپنے رسول کو ہادی و راہنما بنائیں تو محمدؐ سے سؤل اللہ کہے۔ ہم میدان غدیر میں علیؑ کی ولایت کا اعلان کرائیں تو "علیؑ ولی اللہ" کہے۔

صلوات

اس کے بغیر نہ کسی کا ایمان مکمل ہو سکتا ہے نہ دین۔ اور ہم نے تو اپنے رسولؐ سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آپ نے یہ اعلان نہ کیا تو گویا رسالت کا کوئی کام انجام نہیں دیا۔ تو جب اس مسئلہ میں میں اپنے حبیب کو معاف نہیں کر سکتا تو کسی امتی کو کیسے معاف کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھو رسولؐ اعلان نہ کرتے تو رسالت بیکار ہو جاتی اور تم ایمان نہ لاؤ گے تو تمہارا ایمان بیکار ہو جائے گا۔

اسی عظیم نکتہ کی طرف نیشاپور کے بازار میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ نے اشارہ کیا تھا۔ جب آپ کی سواری نیشاپور سے گذر رہی تھی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ فرزند رسولؐ کی سواری گذر رہی ہے۔ ہزار ہا افراد سہراہ آکر کھڑے ہو گئے۔ اور اشتیاق زیارت میں بیچین تھے۔ حضرت ایک عماری کے اندر تشریف فرما تھے۔ مجھے بے قراری سے شور مچا رہا تھا۔ فرزند رسولؐ عماری کا پردہ اٹھائیے۔ ہمیں اپنے جمال مبارک کی زیارت کرایئے۔ زمانہ گذر گیا کہ ہم نے جمال رسالت کی زیارت نہیں کی۔ ایک مرتبہ عماری کا پردہ اٹھا۔ امامؑ نے روئے مبارک باہر نکالا۔ مجمع نے زیارت کی۔ کمال بے قراری سے خود گریہ بند ہوا۔ ۲۴ ہزار قلدان لکھنے کے لئے اکٹھا ہوئے۔ فرزند رسولؐ کوئی حد بیان فرمائیے۔ اپنے جد کا کوئی پیغام سنائیے۔ جمال رسالت تو دیکھ چکے اب ہجو رسالت کا اشتیاق ہے۔ فرزند رسولؐ نے بیان کا آغاز کیا۔

مجھ سے میرے پدر بزرگوار موسیٰ بن جعفرؑ نے ان سے ان کے پدر بزرگوار جعفرؑ بن محمدؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار محمد بن علیؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار حسین بن علیؑ نے۔ ان سے ان کے برادر نامدار حسن مجتبیٰؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار علیؑ بن ابی طالبؑ نے۔ ان سے ان کے ابن عم محمد مصطفیٰؐ نے ان سے ان کے امین و جبریل نے بیان کیا ہے کہ پروردگار عالم نے قلم قدرت سے لوح حکمت پر یہ لکھ دیا ہے کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ" میرا قلعہ ہے جو اس قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ حدیث بیان ہوئی محفل کا پردہ گرا دیوں نے کھلا۔ علماء نے محفوظ کیا۔ سواری آگے بڑھی۔ ایک مرتبہ پردہ محل پھراٹھا۔ آواز آئی "وَلَكِنْ يَشْكُرُهَا وَشَكَرْتُهَا" لیکن یاد رکھو کہ اس عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے شرائط بھی ہیں۔ "وَأَنَا مِنْ شُرَكَائِهَا" اور اس کی شرطوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہ کہہ کر محل کا پردہ گویا اور سواری آگے بڑھ گئی۔ محدثین نے کلام بلاغت نظام کو محفوظ کیا۔ اور امامؑ نے بنیاد مذہب کو واضح کر دیا۔ اسلام میں کلمہ تو عید بھی بیکار ہے۔ اگر شرائط تو عید پورے نہ ہوں اور امامت کا اقرار نہ کیا جائے۔ وہ خدا خدا نہیں ہے جو اپنے بندوں کی ہدایت کا انتظام نہ کرے اور وہ بندہ بندہ نہیں ہے جو خدائی انتظام پر ایمان نہ لائے۔

صلوات

واقعہ مشہور و معروف ہے اور تمام تاریخوں نے نقل کیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجمع کو اس قدر زیارت کا اشتیاق کیوں تھا۔ مامون عباسی بادشاہ موجود ہے۔ ہارون عباسی بادشاہ کل گذر چکا ہے۔ امین عباسی سلطان نگاہوں کے سامنے آچکا ہے۔ پھر یہ اشتیاق زیارت کیوں ہے۔

کیا ان زیارتوں سے قوم کی تسکین نہیں ہوئی جو آج ایک چہرہ کی زیارت کا اشتیاق ہے اور اس ایک چہرہ کی زیارت سے کیا مل جائے گا سلاطین کو دیکھیں گے تو انعام ملے گا۔ ایک بور یہ نشین کو دیکھا یا نہ دیکھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن مجمع کا اشتیاق بتا رہا ہے کہ سلاطین کو دیکھتے دیکھتے قوم عاجز آجکی ہے اور اب دل میں یہ تمنہ ہے کہ کبھی تو اس کا جمال مبارک بھی دیکھ لیں جس کا صبح و شام کلمہ پڑھتے ہیں اور ہر اذان و نماز میں نام لیتے ہیں۔ قوم کو معلوم ہے کہ جمال رسالت کی زیارت سلاطین کے چہروں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ شرف امامت ہی کے وسیلہ سے مل سکتا ہے۔ کاش دنیا نے یہی اندازہ کر لیا ہوتا کہ رسالت امامت سے ملتی ہے ریاست سے نہیں۔ صلوات۔

زیارت کے بعد حدیث کا اشتیاق بھی واضح کر رہا ہے کہ قوم بوجہ پیغمبرؐ کے لئے بے قرار ہے۔ اور کتنی بے چین ہے کہ ایک کلمہ گویا پیغمبر کی زبان سے سن لیں اور اسی کو سند آخرت بنالیں۔ امام علی رضی اللہ عنہ نے بھی حدیث سنا کر بتا دیا کہ ہم موقع پا کر اپنے فضائل کا اعلان نہیں کرتے۔ بلکہ حقیقت مذہب ہی کا اعلان کرتے ہیں۔ ہمارا وجود اپنے لئے نہیں ہے۔ ہم خدا کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کے لئے جی رہے ہیں۔ صلوات عزیزان گرامی! کیا مسلمانوں میں حدیثوں کی کمی تھی۔ کیا حدیثیں سب مرچکے تھے۔ کیا احادیث کے ذخیرے موجود نہ تھے۔ مومن تو خود ہی بڑا علم و دست اور ہر پروردگار آدمی تھا۔ اس کے دربار میں علماء و فضلاء کا مجمع رہتا تھا۔ پھر فرزند رسولؐ سے حدیث کی فرمائش کیوں اور اس کے لئے اس قدر بے قراری کیوں۔ ہ مجمع کا اندازہ ہی بتا رہا ہے کہ دینائے اسلام

کو یہ احساس ہے کہ حدیث اور ہے اور جو حدیث فرزند رسولؐ کی زبان سے بیان ہو وہ اور ہے۔ صلوات

حدیث سننے والوں نے بھی اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ ۲۴ ہزار قلمدان اکٹھا کئے کہ حدیث لکھ لی جائے اور ایسا نہ ہو کہ جمال مبارک کی محویت میں کوئی بات ذہن سے نکل جائے۔ میں کہوں گا یہ قدرت کا انتظام تھا یا منیت کا انتقام کہ فرزند رسولؐ سے حدیث سننے کے لئے اور اسے لکھنے کے لئے ۲۴ ہزار قلمدان جمع ہو گئے ہیں اور کل جب خود مرسل اعظمؐ حدیث بیان کرنا چاہتے تھے تو ایک قلم دوات بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ قدرت نے واضح کر دیا کہ تم ایک قلم دوات سے منع کرو گے تو سہی کہ ہم ۲۴ ہزار قلم دوات اکٹھا نہ کر دیں اور فرزند رسولؐ نے حدیث بیان کر کے اعلان کر دیا کہ اہل دنیا اب بتاؤ فتح کس کی ہے۔ رسالت نے امت کے سامنے سر جھکا یا امت نے امامت کے سامنے سر جھکا دیا۔ صلوات

اس مقام پر ایک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے کہ مجمع نے امامؐ سے حدیث سنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ سند نہیں دریافت کی تھی۔ آپ براہ راست حدیث بیان فرما دیتے۔ جسے اعتماد کرنا موتادہ خود ہی کر لیتا۔ اس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن امامؐ نے حدیث کے ساتھ اس کی مکمل سند بھی بیان فرمادی اور شاگردیہ اشارہ دیا کہ اگر براہ راست حدیث بیان کر دیتا تو امت کو یہ غلط فہمی ہو جاتی کہ کسی محدث سے سن لیا ہو گا اور امت کے کسی عالم سے علم حاصل کر لیا ہو گا۔ ضرورت ہے کہ دنیا پہچان لے کہ آلِ محمدؐ تمہارے علم کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا علم تمہارا عطیہ نہیں ہے۔ یہ عطیہ پروردگار ہے

جو انہیں براہ راست عطا ہوتا ہے۔ صلوات

دوسری بات یہ بھی ہے کہ امامؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام سے حدیث کے سلسلے دو ہیں۔ ایک سلسلہ وہ ہے جو امت کے پاس ہے۔ اور اس میں سوائے غیر معصوم راویوں کے کوئی نہیں ہے۔ ہر راوی غیر معصوم، ہر سند غیر معصوم، ہر سلسلہ غیر معصوم۔ اور ایک سلسلہ ہمارے پاس ہے جس میں ہر فرد معصوم۔ ہر کڑی معصوم۔ امامت ہے تو وہ بھی معصوم۔ رسالت ہے تو وہ بھی معصوم اور ملکوتیت ہے تو وہ بھی معصوم۔ اب امت کو اختیار ہے چاہے اپنا دین غیر معصوم سلسلے سے حاصل کرے یا معصوم سلسلے پر اعتماد کرے۔ اتنا یاد رکھے کہ غیر معصوم سلسلہ میں خطا کا امکان ہے اور معصوم سلسلہ میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ صلوات۔

اللہ کے بلاغت امامت۔ ایک منزل پر سارے مسائل اسلام حل کر دیے اور ایک لمحہ میں امت کی ہدایت کا مکمل انتظام کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نظام ہدایت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جو پروردگار کا قائم کیا ہوا تھا۔ امت ہوشیار ہو جائے کہ میں نے لوح و قلم سے لے کر اپنی ذات تک اتنے نام اسی لئے گنوائے ہیں کہ دنیا سمجھ لے کہ پروردگار نے جو ہدایت کا انتظام کیا ہے اس میں سرکارِ دو عالم سے اب تک کتنے ہادی اور راہنما گذر چکے ہیں اور قدرت نے کس دور میں کسے راہنما بنایا ہے۔ "بشروطھا و بشروطھا" کی لفظیں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ ایک شرط تو یہی ہوں اور سارے شرائط کو سمجھنا چاہو تو یہ پورا سلسلہ موجود ہے۔ اس سلسلہ کو چھوڑ دیا تو کلمہ "لا الہ الا اللہ" بھی بیکار

ہو جائے گا۔ اور اقرار تو یہ بھی کسی کام نہ آئے گا۔ صلوات

اربابِ کرم! مجمع کے بے پناہ اشتیاق سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی کہ پروردگار نے ہر علیؑ کو ایسا ترجمان رسالت بنایا ہے کہ جب علیؑ مجمع میں آجاتا ہے تو قوم کا عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے اور ذہنوں کے اضطراب کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ آپ پوری تاریخ پڑھ ڈالیں ہر منزل پر آپ کو یہی انداز نظر آئے گا۔ علی بن ابی طالب ہوں گے تو وہاں بھی وہی عالم ہو گا کہ نماز تمام ہوتے ہی انہیں پکارا نہیں گئے یا علیؑ آپ نے رسول اللہ کی غازیاد دلادی اور علی ابن الحسین ہوں گے تو وہاں بھی وہی عالم ہو گا۔ یزید کا پورا دربار آواز دے گا۔ امیر اجازت دیدے ہم نے مدت سے بنی ہشتم کا ہجر نہیں سنا اور علی ابن موسیٰ الرضا ہوں گے تو یہاں بھی یہی عالم ہو گا کہ ۲۴ ہزار قلمدان ایک حدیث لکھنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔ قواب کہنا پڑے گا کہ قدرت نے نام ہی چن کر رکھا ہے۔ اور جسے علی بنادیا ہے اسے ہر حال میں علی ہی رکھا ہے۔ انہوں میں رہا تو علیؑ غیروں میں رہا تو علیؑ اور رسولؐ کے ہاتھوں پر آیا تو علیؑ۔ صلوات

گذارشیں یہ کہ رہا تھا کہ مالک کائنات نے اپنا نظام ہدایت معین کر کے یہ واضح کر دیا کہ جو میرے نظام پر ایمان نہ لائے وہ میرا بندہ نہیں ہے۔ میں صرف اس بات پر راضی نہیں کہ انسان میرا کلمہ پڑھ کر میرے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ میرا منشا یہ ہے کہ جسے جسے میں نے ہادی اور راہنما بنایا ہے اس کی بارگاہ میں بھی سر نیاز جھکایا جائے اور اپنے عمل سے واضح کر دیا جائے کہ میں واقعاً بندہ پروردگار ہوں۔ اور اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہوں۔ مجھے صرف اپنا سجدہ پسند ہوتا تو میں ابلیس کو مردود بارگاہ کیوں نہ بنا۔

اس نے میرا کیا قصور کیا تھا۔ میرا سجدہ تو کمری رہا تھا۔ مجھے تو خدا مان  
 ہی رہا تھا۔ میرے سامنے تو سر تسلیم خم ہی کئے ہوئے تھا۔ مجھ سے آخر تک  
 خالق و مالک کہہ کر گفتگو کی تھی۔ میں نے اسے اسی لئے مردود بارگاہ بنایا  
 کہ اس نے مجھے اپنا میرے ہادی کو نہیں مانا۔ میرے اوپر ایمان لایا میرے  
 راہنما پر ایمان نہیں لایا اور میں کسی ایسے انسان کو انسان ماننے کے  
 لئے تیار نہیں جو مجھ پر ایمان لائے اور میرے ہادی پر ایمان نہ لائے  
 میں نے کل بھی ایک کو شیطان بنا دیا تھا۔ اور آج بھی جو بغاوت کرے  
 گا اسے "اُوْلَئِکَ حِزْبُ الشَّیْطَانِ" کا خطاب دیدوں گا۔  
 صلوات۔

عزیزانِ گرامی! یہ شکندگانِ پروردگار کا ایک امتیاز ہے  
 کہ انھیں مالکِ کائنات نے اتنا کامل و اکمل بنایا ہے کہ دنیا نے  
 چار دنا چار دان کی بارگاہ میں سر جھکایا ہے اور جب کچھ بن نہ پڑا تو  
 مجبور ہو کر انھیں کی بارگاہ میں سر جھکایا ہے۔ کیا تاریخ اس حقیقت سے  
 ابھار کر دے گی کہ مرسلِ اعظم کے بعد کس نظر انداز ہو جانے والے علیؑ  
 کی بارگاہ میں ۲۵ سال کے بعد مسلمان آئے اور یہ گزارش کرنے آئے  
 کہ یا علیؑ بیعت لے لیجئے۔ اب ہمارے پاس کوئی قائد یا راہنما نہیں ہے۔  
 مشکلیں بہت ہیں مشکل کشا کوئی نہیں ہے۔ مولائے کائنات نے بیعت  
 تو لے لی لیکن ایک سوال رہتی دنیا تک کے لئے چھوڑ دیا۔ "تم اتنا تو بتا  
 دو کہ کل مجھ میں کیا عیب تھا جو آج نہیں رہ گیا یا کل مجھ کی کمی تھی جو آج پوری  
 ہو گئی ہے کل تم نے میری بیعت نہیں کی تھی اور بیعت کے لئے کیوں حاضر ہوئے ہو؟"  
 مولائے کائنات کے سوال نے واضح کر دیا کہ دنیا اللہ والوں سے رد گردانی

موتی ہے لیکن اللہ والے مڑ کر نہیں دیکھتے تو پھر سر جھکا کر جو کھٹ پر آ جاتی ہے۔  
 یہی منظر مولائے کائنات کی زندگی میں دیکھا اور یہی منظر امام علیؑ رضا  
 کی زندگی میں دیکھا۔ اسی لئے تو کہنا پڑا کہ جب مرفعی خدا کے سامنے بندے  
 سر جھکا دیتے ہیں تو شانِ امامت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ پہلے علیؑ کے  
 سامنے سر جھکایا تو اسے علیؑ مرفعی کہا گیا اور تیسرے علیؑ کے سامنے  
 سر جھکایا تو اسے علیؑ رضا کہا گیا۔ صلوات

امام علیؑ رضا کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو مولائے  
 کائنات کی طرف پوری حیاتِ خدمتِ دین و مذہب اور حفاظتِ قوم و ملت  
 میں مصروف نظر آئے گی۔ یہ امتیاز ہر امامؑ کی زندگی کا رہا ہے۔ لیکن  
 امام رضا کو ایک خصوصیت یہ حاصل ہوئی ہے کہ انھیں چند روز کے لئے  
 تخت و تاج پر بھی قبضہ ملا ہے۔ اور امت نے ولی عہدی کا کلمہ بھی پڑھا  
 ہے۔ ولی عہد کا کلا داستان پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ صرف اتنا  
 عرض کرنا ہے کہ گھر میں رہے تو علیؑ کی زندگی اور تختِ حکومت کے قریب  
 پہنچ گئے تو علیؑ کی زندگی نہ کل سادگی میں فرق آیا تھا نہ آج سادگی میں  
 فرق آیا بکتی پاکیزہ زندگی کہ "ذی قعدہ سترہ صحر کو مدینہ کی سرزمین پر قدم  
 رکھا تو پہلا کام یہ کیا کہ دونوں کہنیاں ٹیک کر سر سجدہ معبود میں رکھ دیا۔  
 اور آواز دی اہل دنیا پہچان لو۔ اللہ والوں کا مقصد حیاتِ بندگی پر درگاہ  
 ہوتا ہے اور وہ زندہ بھی رہتے ہیں تو صرف عبادت پر در دگار کے لئے  
 میرا آغاز عبادت پر در دگار سے ہے۔ میرا انجام عبادت پر در دگار پر  
 ہوتا ہے۔ میری حیات کا مقصد ہی عبادت پر در دگار ہے۔ میں آیا تو سجدہ کرتا  
 ہوا۔ جاؤں گا تو سجدہ کرتا ہوا۔ کیا تم نے پہلے علیؑ کی زندگی نہیں دیکھی کہ

خاک کعبہ پر قدم رکھا تو سجدہ اور مسجد کو فہ میں مصلیٰ پر آئے تو سجدہ —

— صلوات

زندگی اس شان سے گذری کہ محاضرات امام راعب میں یہ اعتراف نظر آیا کہ کسی خاندان میں فضائل و کمالات یوں سات پشت تک نہیں چلے۔ جس شان سے خاندان علی بن ابیطالب میں یہ کمالات زندہ و تابندہ رہے۔ علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز، حسن مجتبیٰؑ کو دیکھا تو وہی انداز حسین بن علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز۔ علیؑ ابن حسینؑ کو دیکھا تو وہی انداز محمد بن علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز۔ جعفر بن محمدؑ کو دیکھا تو وہی انداز موسیٰ بن جعفرؑ کو دیکھا تو وہی انداز اور علی بن موسیٰؑ الرضا کو دیکھا تو وہی انداز اور میں تو کہوں گا کہ دنیا کی نکالیں یہیں پر ٹھہر گئیں، ورنہ یہ نظر آگے بڑھ جاتی تو انکی پشتوں میں بھی یہی انداز نظر آتا اور آخری منزل پر تو سارے کمالات یوں یکجا نظر آتے کہ نام بھی محمد اور کنیت بھی ابوالقاسم۔ ایضاً پڑھنے والا چاہے ادل پر درود پڑھے چاہے آخر پر۔ یہاں ادل و آخر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ سب محمد ہیں اور سب علیؑ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سب کے یہاں ”برائے نام“ فرق رہا ہے۔ یہاں تو برائے نام بھی فسق نہیں ہے۔ — صلوات

امام احمد بن حنبل نے اس زریں سلسلہ کو دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ امام علیؑ رضائے نیشاپور میں وہ زریں سلسلہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ کسی دیوانے پر دم کر دیا جائے تو وہ عاقل ہو جائے گا۔

ارباب نظر دیکھا آپ نے دنیا اہلیت کے کمالات کو پہچانے یا نہ پہچانے امام حنبل پہچانتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ دیوانوں کو عاقل بنا سکتا ہے

اب آپ سوچیں کہ جس کے نام میں یہ اثر ہو اس کے کمالات میں کیا اثر ہو گا۔ اور پھر یہ سوچیں کہ جو ایسے باکمال سلسلہ کے مورث اعلیٰ ہی پر دماغ کے ہلکنے کا الزام لگائے وہ کتنا بڑا دیوانہ ہو گا کہ جب اسے ذات رسولؐ ہو شند نہ بنائے تو نام رسولؐ کیا بنائے گا۔ اور جس پر نام رسولؐ کا اثر نہ ہو گا اس پر آل رسولؐ کا کیا اثر ہو گا۔ — صلوات

امام رضاؑ کی زندگی کے چند چھوٹے چھوٹے واقعات کا نقل کرنا ضروری ہے تاکہ امین و دامون کے علم و فضل اور علم و اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مورخین بھی دیکھیں کہ حکومت کے اخلاق کو امامت کے اخلاق سے کیا نسبت ہے اور دونوں کے کردار میں کتنا نمایاں فرق ہے۔

تہمدی طور پر یہ بات ذہن میں محفوظ رکھیں کہ کبھی کبھی عوام کے اعتراضات بھی حالات زمانہ کی ترجمانی کر دیا کرتے ہیں۔ سلاطین کو کیش و عشرت کی زندگی میں دیکھنے والا انسان اگر کسی کو فقر و فاقہ میں دیکھے گا تو ضرور اعتراض کرے گا کہ یہ کیسا سلطان اور کیسا بادشاہ ہے اور نبوت کو پوریہ نشین دیکھنے کے بعد تخت و تاج پر نظر ڈالنے والا انسان ضرور یہ سوال کرے گا کہ یہ کیسا وارث رسولؐ ہے جس کے کردار کا رسولؐ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تاریخ کے بے شمار مسائل اسی پس منظر میں حل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اعتراضات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زمانہ کتنا متقلب ہو گیا تھا اور لوگ کس طرح کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا گیا کہ امام رضا علیہ السلام سے حدیث کا مطالبہ بنا رہا ہے کہ قوم ہجو رسولؐ سے کس قدر دور ہو گئی ہے اور ان کی لٹکار بتا رہی ہے کہ رسولؐ اکرم کے بعد نماز کی شکل کس قدر بدل گئی تھی۔

اسی روشنی میں امام رضاؑ کی زندگی کے چند واقعات کا تجزیہ کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ سلاطین دنیائے امت کا مزاج کس قدر بگاڑ دیا تھا اور امامت نے اس مزاج کی اصلاح میں کس قدر زحمات برداشت کی ہیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ امام علیہ السلام اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔ ایک مرد بھنی یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ کہاں امام اور کہاں غلام۔ یہ کون سی زندگی ہے اور یہ کون سا طریقہ ہے بھلا اس طرح کہیں امامت چل سکتی ہے۔ آگے بڑھایا عرض کرتا ہے فرزند رسول! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے کھانے کا انتظام الگ کر دیا کریں؟ آپ نے فرمایا بھائی تو نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ ہم سب کا خدا ایک ہے۔ سب کے باپ آدم ہیں اور سب کی ماں حوا ہیں۔ فضیلت تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے۔ غلامی اور آزادی سے نہیں ہے۔ تجھے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ کون غلام ہے اور کون آزاد۔ دیکھنا چاہئے کہ کس کا عمل کیسا ہے اور کس کا تقویٰ کس منزل پر ہے۔

میں کہوں گا قربان جائے اس بندہ نوازی کے۔ یہی تو راز تھا کہ جس کو اس گھر کی غلامی مل گئی اس نے کبھی آزادی پسند نہیں کی۔

اسلام کے نظام غلامی پر اعتراض کرنے والے دیکھیں کیا دنیا میں کہیں آزاد افراد کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کیا کسی قوم کا رہنا یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ اپنے سے کمتر طبقہ کے آزاد لوگوں کو اپنے دستر خوان کا شریک بنا سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اور جب کسی میں یہ حوصلہ نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ خدائی ناسندہ اور ہوتا ہے اور دنیا کا سلطان اور۔۔۔ اسلام کی بدنامی دنیا کے سلاطین کی طرف سے آئی ہے۔ الہی مساندوں کی طرف

سے نہیں۔

ایک موقع پر ایک شخص نے کہہ دیا کہ آپ کا کیا کہنا آپ تو آباد و اجداد کے اعتبار سے ساری کائنات سے افضل ہیں۔ آپ کی تیوریوں پر بل آگئے۔ فرمایا بیشک ہم آباد و اجداد کے اعتبار سے ساری دنیا سے افضل ہیں لیکن یاد رکھ کہ ہمارے آباد و اجداد کی فضیلت اپنے آباد و اجداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی ساری فضیلت ان کے تقویٰ اور عمل سے ہے۔ اور نسل و نسب کے اعتبار سے تو میں اس حبشی غلام پر بھی فخر نہیں کرتا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

امام نے واضح کر دیا کہ ہماری آبائی شرافت بزرگوں کے اعمال و کردار کی بنا پر ہے۔ خبردار انھیں کردار سے عاری صرف بنی ہاشم نہ سمجھ لینا ہم اسی امتیاز کو مٹانے کے لئے آئے ہیں کہ نسلی تفریق کو شرافت کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ اور ان تمام افراد کو اسلام کی قیادت سے الگ کر دیا جائے جو صرف اس لئے حکومت و ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے تھے کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ اسلام میں بڑے باپ یا بڑے بیٹے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسلام کو دار چاہتا ہے اور مجھے کو دار کے اعتبار سے یہ فخر حاصل ہے کہ جو کردار میرے آباد و اجداد کا تھا وہ تاریخ میں کسی خاندان کا نہیں رہا ہے۔ ہمیں کو دار ہی نے سر بلند بنایا ہے اور ہمارا کو دار ہی ہے جس نے دنیا کی پیشانی کو ہماری بادگاہ میں جھکا دیا ہے۔ آج اگر یہ کو دار نہ ہوتا تو سلاطین دنیا ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے۔ یہ ہمارے کو داری کا اثر ہے کہ خون کے پیاسے بھی ہیں اور چوٹ پر حاضری بھی دیتے ہیں۔ قتل کے منصوبے بھی بناتے ہیں اور دامادی کے لئے انتخاب بھی کرتے ہیں۔ صلوات

امامت کے کردار کی روشنی میں ریاست کا مزاج بھی دیکھتے چلیں۔

۹ ویں الحج کی تاریخ تھی امامؑ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ راہ خدا میں قربان کر دیا تاکہ آنے والے دن میں عزاء و فقراء کے گھر میں بھی عید ہو سکے اور انھیں بھی غذا و لباس نصیب ہو سکے۔ فضل بن سہل جو مامون کا وزیر مملکت تھا اور مدقوں سے ریاست کا مزاج دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اسی مزاج میں رنگ کیا تھا ایک مرتبہ گھر آکر کہتا ہے کہ یہ تو کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ انسان سارا سامان لٹا دے اور خود خسارہ میں رہے۔ آپؑ نے فرمایا بھائی تجھے خسارہ اور فائدہ کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ تیرا خیال ہے کہ جو ہاتھ سے نکل جاتا ہے وہ خسارہ ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو خزانہ پروردگار میں جمع ہو جاتا ہے وہی فائدہ ہے۔ خسارہ نقصان کو کہتے ہیں اور خزانہ میں محفوظ ہو جانے والے کو خسارہ نہیں کہتے۔ صلوات

آپؑ نے دیکھا کہ ریاست کے مزاج نے فضل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اور امامت کے کردار نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ریاست سے بیزاری کا یہ انداز ہے کہ وضو کرنے کے لئے تشریف فرما ہوئے ایک شخص نے ہوتا اٹھایا اور چاہا کہ پانی ڈال دے۔ فرمایا یہ کیا ہے عرض کی آپ وضو فرماتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے ثواب میں شریک ہو جاؤں۔ آپؑ نے فرمایا خبردار۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وضو کوئی کار دنیا نہیں ہے یہ عبادت پروردگار ہے اور عبادت میں کسی کو شریک نہیں بنایا جاسکتا۔ یہاں اخلاص عمل شرط ہے۔ اور خلوص کے بغیر کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے امامت اور ریاست کا فرق۔ ریاست عبادت میں بھی ریاست کی شان دکھانا چاہتی ہے اور امامت حکومت کو سمجھتی ہے اور عبادت

کو عبادت۔ اب مجھے عبادت اور حکومت کا فرق ہی معلوم نہ ہو وہ اسلام کی نمائندگی کیا کرے گا۔ صلوات

حالات سے اندازہ کریں کہ ریاستوں نے قوم کے مزاج کو دراصل اسلام سے کس قدر دور کر دیا تھا۔ اور زندگی سے بندگی تک ہر مرحلہ پر کس طرح شان ریاست کا اظہار ہو رہا تھا اور یہاں غلاموں کو بھی تاکید تھی کہ اگر میں

مزدوری ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا حکومت کا مزاج یہ ہے کہ ہر حال میں ہمارا احترام کیا جائے اور امامت کا مزاج جو جس احترام کے لائق ہے اس کا اتنا ہی احترام کیا جائے۔ صلوات

مرتبہ ایک شخص ایک مزدور کو طے کے بغیر لے آیا۔ آپؑ نے پوچھا اس کی اجرت کیا ہے؟ اس نے کہا کچھ طے نہیں کیا۔ یہ بھی ریاست کا ایک مزاج تھا کہ مزدوروں سے کام لے لیا جائے اور اس کے بعد جو چاہے دیدیا جائے۔ کس کی مجال ہے کہ حکومت کی صوابدید پر اعتراض کر سکے۔ امامؑ نے اپنے غلام کو ڈانٹ کر واضح کر دیا کہ حکومت کا مطلب کسی کی قوت و طاقت پر بلا سبب قبضہ کر کر لینا اور ساری ملت کو اپنا بندہ بنے دام سمجھ لینا نہیں ہے۔ حکومت الہیہ وہ ہے جو قوم کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔ حقوق کو پامال کرنے والی حکومت الہی حکومت نہیں ہو سکتی۔

آپؑ نے فرمایا کہ مزدوری طے کے بغیر مزدور سے کوئی کام نہیں لینا چاہیے۔ اس کا ایک دنیاوی فائدہ بھی ہے کہ اگر تم نے اجرت طے نہیں کی تو جس قدر بھی دیدو گے مزدور یہی سمجھے گا کہ کم دیا ہے اور اگر مزدوری طے کر لی ہے تو ایک درہم بھی اضافہ کر دو گے تو وہ خوش ہو جائے گا اور

دعائیں دے گا۔

دنیاۓ معاشیات اس نکتہ پر غور کرے کہ امام مٹانک و مزدور کے مسائل کو کس طرح حل فرمایا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ صاحب اقتدار و ثروت کو اپنے اقتدار و ثروت سے غلط فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ آج دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ مزدور کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور صاحبانِ دولت جس طرح چاہتے ہیں ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ امامت کے کردار نے واضح کر دیا کہ مزدور بھی دوسرے افراد کی طرح رائے رکھتا ہے۔ اور جب تک اس کی رائے نہ معلوم کر لی جائے اس سے کام لینے کا حق نہیں ہے۔ اور میں تو یہ عرض کر دوں گا کہ یہ امامت ہی کا کام ہے ورنہ وہ امت مزدور کی کیا قدر کرے گی جس نے رسولؐ سے کام لے کر ان کو اجرت نہیں دی ہے۔ مزدور کی قدر تو دی جانتا ہے جو اجرت دینے کا مزاج رکھتا ہے۔ اور جو اجرت ہی نہیں دینا جانتا وہ کیا جانے کہ مزدور کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو محبت اہلبیتؑ کی قدر و قیمت جانتا ہے وہی اجرت کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ اور جو محبت اہلبیتؑ کی قدر و قیمت نہیں جانتا وہ اجرت کی اہمیت بھی نہیں جانتا۔ صلوات

ظاہر ہے کہ جو امام علیہ السلام دنیا کی حالات و مسائل پر اتنی گہری نگاہ رکھتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ روئے زمین کے کسی باشندہ کا حق مارا جائے وہ اپنے چاہنے والوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ چنانچہ قدم قدم پر یہی بھی ہدایت دی اور سمجھا یا کہ دیکھو اس دنیا میں اس طرح زندگی گذاری جاتی ہے اور یہ کردار اختیار کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ فرمے خوش فرما رہے تھے۔ کسی نے کہا فرزند رسولؐ! آپ فرمے کہ بہت دوست رکھتے ہیں۔ فرمایا کیسے دوست نہ رکھوں اسے رسولؐ مولاۓ کائنات! اور ان کے ظاہر میں نے پسند فرمایا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حضرات محبت کریں اور میں نہ کروں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہم شراب کو دوست نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ وہ آگ کی مخلوق ہے۔ ایسی مخلوق کی محبت ہمارے دشمنوں کو زیب دیتی ہے۔ خرم پسند کرنا ہمارے شیعوں کا کام ہے اور شراب کو دوست رکھنا ہمارے دشمنوں کا کردار۔

کتنے حسین انداز سے دونوں مسائل کی طرف اشارہ کر دیا کہ خرم کی فضیلت بھی بیان ہو گئی اور شراب کی خہانت اور رذالت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا۔ خرم کا ذکر آگیا ہے تو آپ ہی کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ کر دیا ایک شخص نے مرسل اعظمؑ کو خواب میں دیکھا کہ مسجد میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے خرم کا ایک طبق رکھا ہے۔ اس نے بڑھ کر عرض کی یا رسول اللہؐ کچھ مجھے بھی عنایت فرمائیے۔ آپ نے ایک مٹھی خرم دے دی ہے۔ اس نے شمار کیا تو اٹھارہ تھے۔ آنکھ کھل گئی تو کافی دیر تک غور کرتا رہا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ مرسل اعظمؑ کے بدلے خواب میں کوئی نہیں آ سکتا اور حضورؐ آئے تو ۱۸ ہی خرم کیوں عنایت فرمائے۔ شاید میری زندگی میں ۱۸ دن اور باقی ہیں یہ کہہ کر یاد موت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ان کل ایسے مسلمان پیدا ہوتے تھے کہ انہیں مبارک مواقع پر بھی موت یاد آتی تھی۔ آج تو اللہ کا فضل ہے۔ آج کوئی مسلمان ایسا خواب دیکھے تو انشاء اللہ یہی تعبیر دے گا کہ حضورؐ تشریف لائے ہیں تو ۱۸ لاکھ۔ ۱۸ کروڑ مزدور دے جائیں گے۔ اس سے کم پر معاملہ نہیں ہو سکتا۔ مبالغہ سزا کے قدم

آئیں اور اس سے کم برکت ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

بہر حال وقت گزرتا رہا۔ چند دنوں کے بعد یہ خبر مشہور ہوئی کہ فرزند رسولؐ امام علی رضی اللہ عنہ سے مرد تشریف لے جا رہے ہیں اور اپنے شہر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ یہ دور کہ حضرت کی خدمت میں گیا۔ اس سے بہتر موقع تیر خواب کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے جد کے خواب کو فرزند سے بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔ اب جو مسجد میں آیا تو لیکھ کیا کہ حضرت محراب میں تشریف فرما ہیں اور بالکل اسی طرح تشریف فرما ہیں جس طرح رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔ سامنے ایک خمر کا طبق بھی رکھا ہے۔ آگے بڑھا اور عرض کی فرزند رسولؐ! کچھ بچے بھی عنایت فرمائیں۔ آپ نے ایک مٹھی خمر سے عنایت کر دیے۔ اب جو اس نے شمار کئے تو اٹھارہ تھے۔ سخت حیرت ہوئی کہ جیسا خواب دیکھا تھا ویسی ہی تعبیر ملی۔ عرض کرتا ہے۔ فرزند رسولؐ! کچھ اور عنایت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا اگر رسول اللہؐ نے خواب میں زیادہ دیئے ہوتے تو میں بھی زیادہ دے دیتا۔ لیکن جب رسول اللہؐ نے اتنے ہی دیئے ہیں تو میں زیادہ کیسے دے سکتا ہوں۔ صلوات

یہ ہے امامت کا کردار نبوت کے کردار سے کتنا ملتا جلتا کردار ہے۔ دنیا بیداری میں مشابہت کی کوشش کرتی ہے اور نہیں کر پاتی۔ انداز میں فرق ہو جاتا ہے۔ اور یہاں خواب میں یہ عالم ہے کہ جو رسول اللہؐ نے کیا وہی فرزند نے کیا۔

واقعہ پر غور کریں تو اور بہت سے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک پریشان انسان کو خواب کی تعبیر مل گئی۔ ایک دائر امام کو بہترین خمر مل گئے اور میں تو کہوں گا کہ دائر امامؐ تجھے اپنے خواب پر ناز کرنا چاہئے کہ اب جو تعبیر

خواب ملی تو ہم خرم اور ہم ثواب۔ اور شاید اس مثل کا اس سے بہتر کوئی مصداق بھی نہ ہو سکے گا۔ صلوات

دوسری طرف امامؐ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارا علم اتنا وسیع ہے کہ تم جو کچھ خواب میں دیکھتے ہو وہ بھی ہمارے علم میں رہتا ہے۔ ایک طرف وہ دنیا کے نمائندے ہیں جنہیں بیداری کی بھی خبر نہیں ہے۔ اور ایک طرف وہ الہی نمائندے ہیں جو خواب تک کی اطلاع رکھتے ہیں۔ انصاف سے بتائیں کہ رب العالمین اپنا نمائندہ بنانا چاہے تو کسے بنائے گا۔ اور امت کو صحیح ہدایت دے گا تو کون دے گا۔ صلوات

فرزند رسولؐ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارے اور مرسل انظم کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو انھوں نے کیا وہ ہم نے کیا اور جو انہوں نے نہیں کیا وہ ہم نے بھی نہیں کیا اور یاد رکھو عمل و کردار کی منزل تو بہت بند ہے۔ ہمارے یہاں تو ہاتھوں میں بھی اتنی یکسانیت ہے کہ جتنے خمرے انھی مٹھی میں آئے تھے اتنے ہی خمرے میری مٹھی میں آئے۔ دیکھا تم نے اتحاد عمل و کردار۔ اتحاد حیات و صفات اور کیوں نہ ہو تائشری ہاتھ ہوتا تو سانچہ میں فرق آجاتا۔ جب وہ دنوں اتھو یہ اللہ میں تو جو ایک کا انداز ہو گا وہی دوسرے کا انداز ہو گا۔ اور اباب کرم یاد رکھیں جب امامت اور رسالت کے ہاتھوں میں اتنا اتحاد ہے تو انھیں ہے کہ جس کی بیعت رسول اللہؐ کریں اس کی بیعت کوئی امام کر لے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ امامت سے بیعت کا مطالبہ درحقیقت رسالت سے بیعت کا مطالبہ ہے اور یہ کسی طرح اسلام کی دلیل نہیں بن سکتا۔

صلوات

واقعہ سے ایک بات یہ بھی واضح ہو گئی کہ خواب دیکھنے والے نے

تیسری تو امام وقت سے یعنی اسے رسول کا عہد ملا تو امام وقت کے ہاتھوں سے اور امام وقت نے بھی اس سے زیادہ نہیں دیا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے عنایت فرمایا تھا گویا امام نے واضح کر دیا کہ ہم میں اور ہمارے بعد میں اتنا اتحاد ہے کہ جو ان سے ملے گا وہ ہم سے ملے گا اور جو ان سے نہ ملے گا وہ ہم سے بھی نہ ملے گا۔ اب نہ کوئی انہیں چھوڑ کر ہم سے کچھ پاسکتا ہے اور نہ ہمیں چھوڑ کر ان سے کچھ پاسکتا ہے۔ صلوات

تاریخ کائنات میں ایسا اتحاد دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے امام راغب نے صحیح کہا ہے کہ اس طرح سات پشتوں تک کمال و کردار میں یکسانیت برقرار رہ جائے۔ یہ سوائے خاندان علی بن ابیطالب کے کہیں نہیں دیکھا گیا ہے۔

اتحاد کردار کی گفتگو آگئی ہے تو خاتمہ کلام میں ایک نکتہ کی طرف اور اشارہ کر دیا جائے۔ ماہ رمضان میں امام رضاؑ علیہ السلام کے دست مبارک پر میت ہوئی اور مامون رشید نے آپ کو اپنا ولی عہد ملک بنایا۔ سارے ملک میں شہرہ تھا کہ فرزند رسولؐ ولی عہد ہو گئے ہیں۔ بنی عباس جلتعہ جاسے تھے کہ مدتوں کی ریاضت خاک میں ملی جا رہی ہے۔ مومنین غلصین خوشی سے بھولے نہیں سماتے تھے کہ اب امام کو منظر عام پر آنے کا موقع ملے گا۔ اور ان سے کچھ دین و خیریت کے مسائل معلوم کریں گے یوں ہی وقت گزرتا رہا کہ عید کا دن آگیا۔ بادشاہ وقت نے پیغام بھیجا کہ آج عید کی نماز آپ پڑھائیں گے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ ہم نے آپ کو ولی عہد بنا دیا ہے۔ آپ نے بادشاہ کی درخواست کو منظور کر لیا اور اب جو نماز کا وقت آیا تو آپ پورے اہتمام و انتظام کے ساتھ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ علامہ رسولؐ سر پر جلالت

علوی چہرہ سے نمایاں۔ حسنی اخلاق۔ حسینی صبر۔ عابدی انداز، باقری دجاہت، صادقی عظمت، موسوی ہیبت لئے ہوئے۔ اور حکومت نے بھی فرمان جاری کر دیا ہے کہ عمائد مملکت پورے اہتمام کے ساتھ امام کو عید گاہ کی طرف لے جائیں۔ دولت سر کے دروازہ پر حکومت کے نمائندوں کا ہجوم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شش ماہ کا زمانہ پٹ آیا ہے۔ اور مسلمان علیؑ کی دیوبستی پر معیت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ رسول اکرمؐ کا انداز، مولائے کائنات کے تیور، مسلمانوں کا مجمع۔ اراکین سلطنت کا انتظام۔ نعرہ تکبیر کی آوازیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر امام کی تکبیر۔ مجمع کی تکرار مسلمانوں کا اشتیاق۔ انداز رسالت دیکھ کر بے ساختہ گریہ۔ فضل بن ہشل نے یحیٰ عالم دیکھا تو فوراً اطلاع دی کہ بادشاہ سلامت! آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ علی بن ابی الرضاؑ نے نماز پڑھا دی تو حکومت کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ ذرا مسلمانوں کا ایجان تو دیکھئے۔ ایک قیامت کبریٰ برپا ہے۔ گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہیں تکبیر کے نعرے گونج رہے ہیں۔ مامون نے فوراً پیغام بھیجا کہ حضور زحمت نہ کریں میں خود ہی نماز پڑھا دوں گا۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ امام علیہ السلام واپس چلے آئے۔

کوئی دوسرا انسان ہوتا تو حالات کو سازگار دیکھ کر انقلاب کا نعرہ لگا دیتا لیکن یہ امامؑ کا کردار تھا کہ اپنے علیؑ کی اہمیت ظاہر کر دی اور واپس چلے آئے اور واضح کر دیا کہ مامون دیکھ لے سروں پر حکومت کرنا آسان ہے۔ دلوں پر چھ حکومت کرنا مشکل ہے۔ یہ صرف آلِ محمدؑ کا حصہ ہے۔ قید خانہ میں بھی ہیں تو دلوں پر قبضہ رہے گا دنیا نے بھی اندازہ کر لیا کہ رسولؐ کا انداز آلِ رسولؐ کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ علیؑ کی تاریخ

دہرا دی گئی۔ رسولؐ کے بعد علیؑ نے نماز پڑھائی تھی تو امت نے آواز دی تھی کہ رسولؐ کا انداز یاد آگیا۔ اور دوسو برس کے بعد فرزند رسولؐ علیؑ بن موسیٰ الرضا بیت الشرف سے برآمد ہوئے تو دنیا نے پکار کر کہا رسولؐ کے ورثہ داریہ ہیں۔ حکومت لینا آسان ہے رسالت کا کردار لینا مشکل ہے اور یہ کام صرف علیؑ کا ہے وہ علی الرضا ہوں یا علی مرتضیٰ ہوں — صلوات

— ❦ —

# امام محمد تقی علیہ السلام

|             |                                       |
|-------------|---------------------------------------|
| اسم مبارک   | محمد                                  |
| لقب         | تقی۔ جواد                             |
| کنیت        | ابو جعفر                              |
| والد ماجد   | امام علی الرضا                        |
| والدہ ماجدہ | جناب سبیکہ                            |
| ولادت       | ۱۰ رجب المرجب ۱۹۵ھ (جمعہ) مدینہ منورہ |
| شہادت       | ۲۹ ذیقعدہ ۲۲۰ھ سہ شنبہ                |
| عمر مبارک   | ۲۵ سال                                |
| قبر مطہر    | کافین                                 |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين وخاتم النبيين سيدنا و مولانا ابى القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين رضى الله عنى اعدائهم اجمعين -

اما بعد فقد قال الله الحكيم فى كتابه الكريم - **يسمى الله الرحمن الرحيم** **اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَرَاتٍ لَّنَا الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰٓئِ**

یشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالک کائنات کا یہ ارشاد گرامی اشارہ کر رہا ہے کہ اس نے ہر دور ہر زمانہ میں انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انتظامات کئے ہیں۔ اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا کہ جب ہدایت لینے والے رہے ہوں اور ہدایت دینے والا نہ رہا ہو۔ اس کا انتظام ہدایت اتنا پیچیدہ اور مکمل رہا ہے کہ جس طرح بھی انسان راہ راست پر آنے کے لئے تیار ہوا ہے۔ اس نے اسی طرح کا انتظام کیا ہے۔ اگر کمالات و فضائل دیکھ کر ایمان لانے والا ہوا تو انبیاء و مرسلین کو کمالات و فضائل کا مرکز بنا دیا۔ اور اگر معجزات و آیات کے ذریعہ ایمان لانے والا ہوا تو اوہیاء الہی کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کر دیئے اس کا منشاء یہ تھا کہ انسان صراطِ مستقیم سے ہٹنے نہ پائے اور کسی نہ کسی طرح راہ ہدایت پر آجائے۔ اب یہ انسان کی بد نصیبی ہے کہ وہ خدائی انتظام سے فائدہ نہ اٹھائے ورنہ قدرت نے اپنے انتظام میں کوئی نقص اور کوئی کوتاہی نہیں رکھی ہے۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایسے بد نصیب افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے خدائی انتظام سے کوئی

فائدہ نہیں اٹھایا اور بد بختی کی زندگی گزارتے رہے۔ قابل کون تھا؟ جناب آدم ہی کا بیٹا تھا۔ لیکن ایسا بد نصیب کہ باپ کی ہدایت سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور بالآخر قاتل بن کر ملعون ہو گیا۔

کنعان کون تھا؟ جناب نوح کا فرزند ہی تو تھا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا۔ باپ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور بالآخر غرق ہو گیا۔ ————— نالائقی بھی کیسا کہ باپ آواز دے رہا ہے کہ سفینہ پر آجا۔ سفینہ کے علاوہ کوئی نجات لینے والا نہیں ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے پہاڑ بچائے گا۔ سفینہ کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ جانے کیا بد بختی تھی کہ سفینہ کو چھوڑ کر یاد بھی آیا تو پہاڑ کی یاد آیا اور نبی خدا نے واضح کر دیا کہ جس نے سفینہ کو چھوڑا اسے پہاڑ بھی نہیں بچا سکا۔ اور ایسا ڈوبے گا کہ پہاڑ کو بھی لے ڈوبے گا۔

بات فقط نوح کے بیٹے اور پہاڑ کی نہیں ہے۔ یہ قدرت کا اشارہ ہے کہ ہمارے وسیلہ نجات کو چھوڑا اور تباہی آئی۔ ہلاکت سے بچنا ہے تو اس وسیلہ کو اختیار کرو جو ہم نے معین کیا ہے۔ ورنہ ہمارے دالے کو چھوڑ کر نبی کا بیٹا بھی نہیں بچ سکا تو نبی کا کلمہ گو کیا بچ سکے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان نے ہر دور میں الہی ہدایت کا انکار کیا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔

جناب نوح اور جناب لوط کی زوجہ کون تھیں۔ دونہوں کی بیویاں ان سے زیادہ حسین ماحول ہدایت کا کس کے لئے ہو سکتی تھیں لیکن شوہر پر اعتماد نہ کیا۔ خیانت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تباہ ہو گئیں۔ اور ایسی تباہ ہوئیں کہ قرآن مجید نے بھی اعلان کر دیا کہ انہیں زوجیت سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ ————— نبی کی زوجہ ہیں لیکن خدائی انتظام سے انکار کر دیا تو ہلاکت کے

سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ مسئلہ نبی کے بیٹے یا نبی کی زوجہ ہونے کا نہیں ہے۔  
مسئلہ انتظام ہدایت کا ہے۔ ہدایت الہی پر ایمان لے آئے تو غیر بھی نجات کے  
مقدار ہو گئے۔ اور ہدایت الہی سے الگ ہو گئے تو اپنے بھی غرق کر دینے  
کے قابل ہو گئے۔

جناب نوح و جناب لوط کے بعد بھی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ جہاں  
اہل دنیا نے خدائی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

قارون کو تو تھا، جناب موسیٰ کا عزیز ہی تو تھا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا بالآخر زمین میں  
دھنس گیا۔

برادران یوسف کو تو تھا، جناب یعقوب کے فرزند ہی تو تھے لیکن نتیجہ  
کیا ہوا؟ نمائندہ پروردگار سے انحراف کیا اور تباہی کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ  
تو نبی خدا کا کرم تھا کہ انھوں نے خطا معاف کر دی ورنہ تباہ ہونے میں کوئی  
کسر نہ تھی۔ اور یہ قدرت کا اعلان آج بھی ہے کہ ہمارے نظام سے انکار کر دیا  
ہے تو یایوس نہ ہونا تو بہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اب بھی ہمارے اادیوں کے  
قدموں میں آجاؤ۔ ہم معاف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ پیغمبر اکرم سے خطاب  
کر کے یہی تو کہا گیا تھا کہ اگر خطا کار انسان ہم نے توبہ کرنا چاہے اور آپ کو  
ذریعہ بنائے تو ہم بھی توبہ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

نظریہ دیکھنا ہو تو نبی کے دربار میں آؤ اور عمل دیکھنا ہو تو حسینؑ کی بارگاہ  
میں آؤ۔ مرنے واضح کر دیا کہ کسی کو توبہ کرنا آتا ہو یا نہ آتا ہو حسینؑ والوں کو  
آتا ہے۔ اور امام حسینؑ نے واضح کر دیا کہ کسی کو وسیلہ کی قدر ہو یا نہ ہو حر کو وسیلہ  
کی قدر ہے۔ اسی لئے تو میں نے جہنم کے واسطے پر جانے والے کو جنت کی طرف  
کھینچ لیا۔ اور لعنت و طامت کی راہ میں چلنے والے کو عصمت کے سلام کا

مقدار بنا دیا۔

عزیزانِ محترم! گذارش یہ ہے کہ ہر دور میں ہدایت الہی سے انحراف  
کرنے والے پیدا ہوتے رہے اور طرح طرح سے انحراف کرتے رہے۔ آیات  
و معجزات فضائل و کمالات میں کوئی نقص نہیں پایا تو معجزہ ہی کو نقص قرار  
دیدیا۔ معجزہ پر جادو کے الزام کے کیا معنی ہیں۔ انسان ہی تو بتانا چاہتا  
ہے کہ ہیں ان کے کردار میں نقص نہیں ملا۔ ان کے کمالات ہماری دسترس  
سے بالاتر تھے۔ ان کے فضائل ہماری سمجھ سے اونچے تھے۔ ہمارے لئے  
ایک ہی راستہ تھا کہ ہم فضیلت ہی کو نقص قرار دیدیں۔ اور معجزہ ہی کو جادو  
کا نام دیدیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس کی مثال خود آپ کو تاریخ اسلام  
میں بھی مل جائے گی۔ سرکارِ دو عالمؐ کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ اور کفار  
جادو کہہ رہے ہیں۔ آپؐ تھوڑے سے کھانے سے ساری قوم کو سیر و سیراب  
کر رہے ہیں۔ اور قوم جادو گر بنا رہی ہے۔ اور اب جو یہ سلسلہ کفر سے اسلام  
تک آیا تو فوت یہ انگلی کہ قرآن حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے کی مدح کر رہا  
ہے۔ اور مسلمان رکوع کے صحیح ہونے کی بحث کر رہے ہیں۔ اللہ سورہ دہر  
نازل کر رہا ہے۔ اور یہاں یہ بحث ہو رہی ہے کہ فاسقے کر کے راہ خدا میں  
روٹیاں دنیا صحیح ہے یا نہیں۔ اور مرنے نبویؐ کی آیت نازل ہو کر  
خیرات کی مدح کر رہی ہے۔ اور یہ بحث ہو رہی ہے کہ علیؑ نے جلدی کر کے  
دوسروں کو مل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور حکم آیت کو منسوخ کر دیا۔  
پوچھئے کس نے جناب کو منع کیا تھا۔ آپؐ ہی نے پہلے عمل کر لیا ہوتا اور علیؑ  
محسوس رہ جاتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں علیؑ کس کو کرنا ہے۔ یہاں  
تو صرف اعتراض سے غرض ہے اور اس کا سلسلہ جاری رکھنا ہے۔ قدرت

نے بھی کہہ دیا کہ تم اعتراض کرتے جاؤ ہم فضیلتیں دیتے جائیں گے۔ تم نقص  
بھالتے جاؤ ہم آیتیں نازل کرتے جائیں گے۔ ہم نے بھی کہا کہ خدا کا  
شکر ہے کہ اہل دنیا نے اعتراض تو کئے کم از کم متواتر فائدہ ہوا کہ آیتوں نے  
نازل ہو کر دنیا والوں کی حیثیت بھی واضح کر دی اور آل محمد کے کمال پر روشنی  
بھی ڈال دی ورنہ یہ فضائل پردہ راز ہی میں رہ جاتے۔

یاد رکھو جو صرف عیب بھلنے والے ہوتے ہیں وہ دنیا دار ہوتے ہیں اور  
جن کی شان میں آیتیں نازل ہوتی ہیں وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔

ہنر کو عیب اور کمال کو نقص بنانے کا سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ جب  
جناب عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو قوم نے ان کے نسب ہی پر اعتراض کر دیا۔  
قدرت نے اپنے کرم خاص سے انھیں بغیر باپ سے پیدا کر کے روح اللہ اور  
کلمہ اللہ بنایا تھا اور یہاں روح اللہ ہونا ہی غضب ہو گیا۔ اور  
طرح طرح کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ مریم تمہارے ماں باپ میں کسی کا  
کردار خراب نہیں تھا۔ آخر یہ بغیر شوہر کا بچہ کیسا؟ مریم نے بھی طے کر لیا کہ  
جواب جا ہلاں باشد خوشی۔ فرمادیا میں نے روزہ کی نذر کر لی ہے میں بات  
نہیں کر سکتی۔ جو کچھ پوچھنا ہو اس گہوارے کے بچے سے پوچھو۔ قوم حیرت  
میں پڑ گئی۔ بھلا گہوارے کے بچے سے کیسے گفتگو کی جائے۔ ایک مرتبہ  
گہوارے سے آواز آئی میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے کتاب دی گئی  
ہے اور نبی بنایا گیا ہے۔ مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی گئی ہے  
مجھ سے ماں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ میں کوئی ظالم  
وجابر اور بر نصیب نہیں ہوں۔

عیسیٰؑ نے کلام کر کے بتا دیا کہ اللہ والے بچپن ہی سے صاحب کمالات

ہوتے ہیں۔ ان کے کمالات سن و سال کے پابند نہیں ہوتے اور ساتھ  
ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ دنیا والوں کا مزاج یہ ہے کہ جب پروردگار  
کسی کو کوئی ایسا کمال دیتا ہے جو ان کے بس میں نہیں ہوتا تو یہ کمال کا  
اعتراف کرنے کے بجائے کمال ہی کو نقص سمجھنے لگتے ہیں۔

ساری اسلام کا عظیم ترین واقعہ جس کی کائنات میں کوئی نظیر نہیں ہے  
اور نہ دوسری امتوں میں اس کی مثال پیدا ہوئی ہے۔ مولائے کائنات کی  
خانہ کعبہ میں ولادت ہے مگر خدا بڑے کسے عداوت اور تعصب کا کراسے  
بھی فضیلت کے بجائے منقصت اور عیب کا رخ دینے کی کوشش کی گئی۔  
کس قدر شرم کی بات ہے کہ مالک کائنات اپنے گھر میں جگہ دے اور اس  
کے بندے اس فضیلت کو عیب شمار کریں۔ کہا یہ کیا کہ فاطمہؑ بنو اسد رحم  
عرب کے مطابق بتوں سے دعا کرنے آئی تھیں۔ اتفاق سے حضرت علیؑ کی  
ولادت ہو گئی۔ یہ کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔ یہ تو انتہائی عیب کی  
بات ہے کہ وحده لا شریک کے ہوتے ہوئے انسان بتوں سے دعا مانگے۔

— میں کہوں گا کہ ان بحثوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو بعد کا مسئلہ ہے  
کہ دعا کس سے کی گئی اور دعا کے الفاظ کیا ہیں۔ اس کا فیصلہ تو وہ کریں گے  
جو تاریخ و حدیث پر نظر رکھتے ہیں۔ اور حقائق سے باخبر ہیں۔ ایسے جاہل  
ان باتوں کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ان سے تو صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر دعا  
بتوں سے کی گئی تھی تو دیوار کعبہ میں در کس نے بنایا تھا؟ در کو دوبارہ بند  
کس نے کیا تھا؟ قفل در کو کھلنے سے روک کس نے دیا تھا؟ تین دن کے  
بعد دوبارہ دیوار کو شق کس نے کیا تھا؟ تین دن تک جناب فاطمہؑ زینت  
اسد کے لئے رزق کس نے فراہم کیا تھا؟ ولادت کے سارے انتظامات



کو اس قرآن سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری منزل پر اعلان ہوتا ہے ”هٰذِي لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“۔ یہ قرآن ہدایت ہے ان صاحبانِ تقویٰ کے لئے جو غیب پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یعنی قرآن ہدایت درہنہ لائے ہے۔ مگر صرف ان لوگوں کے لئے جو صاحبانِ تقویٰ ہیں اور غیب پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

قدرت نے واضح کر دیا کہ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے لیکن ہماری ہدایت سے وہی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں جو صاحبانِ ایمان ہوتے ہیں۔ صاحبانِ تقویٰ ہوتے ہیں۔ صاحبانِ کردار ہوتے ہیں۔ غیب پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ظاہر کے جلوں میں گم نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ ظاہر کے پردے ہٹا کر غیب کے جلوے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ ان کا اعتماد دھڑکنا ظاہری نگاہوں پر نہیں ہوتا بلکہ دل کی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ظاہری نگاہوں سے نابینا بھی ہوتے ہیں تو دل کی نگاہ سے ”ابولہبیر“ ہوتے ہیں۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب ذغیب بیانی نے پوچھا یا علیؑ! آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے جس کی بندگی کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کیسے ممکن ہے کہ میں اس خدا کی بندگی کروں جس کو دیکھا نہ ہو لیکن یاد رکھو کہ وہ نگاہوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ ایمان کے حقائق سے دیکھا جاتا ہے۔ اب جس کے پاس حقیقت ایمان ہے وہ اسے دیکھ سکتا ہے اور جس کے پاس یہ حقیقت نہیں ہے اسے اس کا جلوہ میسر نہیں ہو سکتا۔ اور کہئے تو عرض کروں کہ جب حقیقت ایمان کا حال اس کے جلووں کو دیکھ سکتا؟

تو جو بقول پیغمبر مکمل ایمان ہو گا اس کے دیدار کا کیا عالم ہو گا۔ اور اس کی نگاہوں میں جلوہ ربوبیت کس حد تک سایا ہو گا۔ اسی جلوہ گری کا نتیجہ تھا کہ بیرون سے تیز نکل گیا۔ اور خبر نہ ہوئی۔ انسان جلوہ ربوبیت میں گم ہو جاتا ہے تو اپنی خبر کہاں ہوتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! یہ قرآن ہدایت الہیہ ہے لیکن صرف صاحبانِ ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لئے پیغمبر بھی ہدایت مجسم ہیں لیکن صرف صاحبانِ ایمان اور صاحبانِ کردار کے لئے۔ راستہ سب کو بتائیں گے۔ دعوت سب کو دیں گے لیکن راستہ پر وہی آئیں گے جن کا ایمان سلامت ہو گا۔ جن کا کردار پاکیزہ ہو گا کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ روز اول دعوت ذوالغیرہ میں دعوت پورے فائدہ کو دی گئی تھی لیکن ایمان لانے والا اور تصدیق کرنے والا صرف ایک ہی تھا اور اسی ایک نے واضح کر دیا تھا کہ میں وہاں ہوں جہاں کوئی نہیں ہے۔ میرا بچپنا وہاں ہے جہاں کوئی بڑھا پائ نہیں ہے۔ میں نے اتنا پہچان لیا ہے جتنا کسی اور نے نہیں پہچانا۔ اور میں وہ معرفت لے کر آیا ہوں جو دنیا میں کسی کو تیسر نہیں یہ سب یہاں والے ہیں اور میں وہاں والا ہوں۔

اور جب ہدایت الہی سے فائدہ اٹھانا اور اس کے سہارے منزل مقصود تک پہنچ جانا تقویٰ اور ایمان پر موقوف ہے تو جسے اللہ ہدایت کا ذریعہ بنائے گا۔ جس کے حوالے اپنے نظامِ ہدایت درہیری کا کام کرے گا خود اس کا ایمان و تقویٰ کس منزل پر ہو گا۔ اور اس کے کردار کا کیا عالم ہو گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے۔ روایات نے ایک ہکا ساختہ بیان کیا ہے کہ بیسے امتِ اسلامیہ میں نظامِ ہدایت کی پہلی کڑی قرار دی گئی تھا اس کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ نے اعلان کیا تھا۔ یا علیؑ تیری محبت ایمان و تقویٰ ہے۔ اور

تیری عداوت کفر و نفاق ہے۔ گویا یہ واضح کر دیا کہ ہدایت لینے والا صاحب ایمان  
و تقویٰ ہوتا ہے۔ اور ہدایت دینے والا اس کردار کا حامل ہوتا ہے جس میں اس  
کی محبت ہی ایمان اور تقویٰ بن جاتی ہے۔ اور دوسری نظروں میں یوں کہا جائے  
کہ ہدایت لینے والا صاحب ایمان ہوتا ہے اور ہدایت دینے والا کل ایمان  
ہوتا ہے۔ ہدایت لینے والا صاحب تقویٰ اور متقی ہوتا ہے اور ہدایت دینے والا  
امام المتقین ہوتا ہے۔ صلوات

یہی اہتمام قدرت تھا کہ اس نے جب بھی کوئی بادی و راہنما بنایا تو اسے  
زیور تقویٰ سے آراستہ کر کے بھیجا اور اتنا بلند کردار بنا دیا کہ دنیا کو اس کے  
سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تقویٰ کیا ہے اور تقویٰ کے معنی کیا ہوتے ہیں یہ خود  
ایک تفصیلی بحث ہے۔ جس کا اس وقت محل نہیں ہے۔ صرف ایک لفظ میں سن  
لیجئے۔ تقویٰ کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ و تحفظ۔ اب جو انسان اپنے کو معصیت  
پروردگار اور آتش جہنم سے بچائے گا وہی متقی اور پرہیزگار کہا جائے گا۔  
اور جو اپنے کو ان باتوں سے نہ بچائے گا وہ غیر متقی اور غیر پرہیزگار کہا جائے  
گا اور اس منزل میں انسانوں کی منزلیں الگ الگ ہوں گی۔ ایسے افراد  
بھی ہوں گے جو اپنے کو مذاہب الہی سے بچالیں گے لیکن دوسروں کو نہ بچاسکیں  
گے۔ اور ایسے بھی ہوں گے جو ایک عالم کو بچانے والے ہوں گے۔ جو اپنی ذات  
کو بچائے گا وہ متقی کہا جائے گا۔ اور جو سارے چاہنے والوں کو بچائے گا  
وہ امام المتقین کہا جائے گا۔ جو کسی کے نقش قدم پر چل کر معصیت الہی  
سے بچ جائے گا وہ متقی کہا جائے گا اور جس کے نقش قدم معصیت  
سے بچانے کی ضمانت ہوں گے وہ امام المتقین ہوگا۔  
اب وہ کون ہوگا یہ آپ تلاش کیجئے۔ میں ایک معیار بتائے دیتا

ہوں۔ نقش قدم پر چلنے والا وہی ہوگا جس کے قدم میں لغزش کی  
گنجائش ہوگی اور نقش قدم اسی کے ضمانت کردار ہوں گے جس کے  
قدم میں لغزش کی گنجائش نہ ہوگی۔ فرق پہچاننا ہو تو یوں پہچان لیجئے کہ  
جو غیر معصوم ہوگا وہ متقی ہوگا اور جو معصوم ہوگا وہ امام المتقین ہوگا۔ اسی  
لئے تو اللہ والوں نے ہمیشہ دعا کی ہے **وَلَجَعَلْنَا الْمُتَّقِينَ إِمَامًا** پروردگار  
ہمیں متقین کا امام بنادے۔ متقی بننا دوسروں کا کام ہے۔ امام المتقین بننا  
عباد الرحمن کا کام ہے۔

تاریخ امامت میں بے شمار واقعات ملتے ہیں جن سے امام المتقین  
کے کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں آپ کے سامنے صرف ایک  
ہی واقعہ پیش کرتا ہوں اور واقعہ بھی اس سستی کا ہے جس کے تقویٰ کو  
ساری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ اور اس حد تک تسلیم کیا ہے کہ امام ہی محمد تقی  
پر لگیا ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے ولی عہدی کا دور  
ختم ہو چکا ہے۔ حاکم وقت مامون نے مدینہ سے طلب کیا ہے۔ بعد اذینک تشریف  
لے آئے ہیں۔ تقریباً سات برس کی عمر ہے۔ ایک دن راستہ میں کھڑے ہوئے  
ہیں۔ لڑکے کھیل رہے ہیں۔ آپ بھی اہل دنیا کے مشاغل کا تماشا کر رہے ہیں  
ایک مرتبہ مامون کی سواری کی خبر ہوئی سارے بچے راستہ چھوڑ کر بھاگ گئے  
آپ اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور کیوں نہ کھڑے رہتے۔ کسی فرار کے فرزند  
ہوتے تو فرار کر جاتے۔ یہ حیدر کرار کے لال ہیں۔ یہاں فرار کا کیا سوال  
پیدا ہوتا ہے۔ صلوات

مامون گھوڑے سے اتر پڑا۔ یہ کون بچہ ہے۔ سارے بچے راستہ چھوڑ  
کر ہٹ گئے یہ کیوں نہیں بٹا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا کہ

میرے بھاگنے کی تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ میری سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آئی  
اب تو ہی بتا دے کہ مجھے کس وجہ سے بھاگ جانا چاہئے تھا۔ مامون  
نے کہا یہ کیا۔ یہ تین وجہیں کسی؟ آپ نے فرمایا کہ یا میں گنہگار ہوتا تو میرے  
خوف سے بھاگ جاتا۔ یا تجھے ظالم سمجھتا تو ظلم کے اندیشہ سے فرار کر جاتا۔  
یا راستہ اتنا تنگ ہوتا کہ تجھے زحمت ہوتی تو میں راستہ چھوڑ دیتا  
لیکن نہ راستہ تنگ ہے نہ میں خطا دار ہوں۔ اب اگر تو اپنے کو ظالم  
سمجھتا ہے تو راستہ چھوڑ دیتا ہوں۔ مامون خاموش ہو گیا۔ اور سواری کو  
آگے بڑھا دیا۔ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ یہ کسی خاص گھرانے  
کا بچہ ہے اور بہت عکس ہے کہ پہچان بھی لیا ہو۔ جیسا کہ بعض روایات  
میں ہے کہ حضرت نے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ لیکن کمال کی منزل میں اس  
کا اظہار مناسب نہیں تھا۔ آگے بڑھا۔ ایک منزل پر پہنچ کر اپنے باز کو  
شکار کے لئے چھوڑا۔ باز اڑا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پھلی اپنے منہ میں  
دبا کر لے آیا اور مامون کے حوالے کر دی۔ مامون نے پھلی کو مٹھی میں چھپایا  
اور پلٹ کر آیا۔ دیکھا پھر بچہ اپنے مقام پر کھڑا ہے۔ مامون نے کہا تم پھر  
کھڑے ہو اور تم نے راستہ نہیں چھوڑا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ نے میرے سوالات  
کا جواب کہاں دیا کہ میں راستہ چھوڑ دیتا۔ مامون نے کہا کہ اچھا اگر ایسی باتیں  
کرتے ہو تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میرے  
آباؤ اجداد نے جبریل کے حوالے سے پروردگار کی طرف سے نقل کیا ہے کہ اللہ  
نے زمین و آسمان کے درمیان دریا پیدا کئے ہیں۔ دریاؤں میں پھلیاں پیدا  
کی ہیں۔ روئے زمین پر کچھ لوگوں کو اقتدار دیا ہے وہ شکار کا شوق کرتے  
ہیں اور جب ان کا باز شکاری پھلیاں شکار کر کے لے آتا ہے تو اپنی مٹھی میں

چھپا کر خاندان رسالت کا امتحان لیتے ہیں۔ (مناقب)  
یہ سننا تھا کہ مامون نے گود میں اٹھا لیا۔ شاہش۔ شاہش۔ ایسا  
جواب خاندان رسالت کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ عرض  
کروں مولا! یہ طول و تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ مامون نے تو صرف اتنا ہی پوچھا  
تھا کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ آپ نے فرما دیا ہوتا کہ پھلی ہے! اب اس کی کیا  
ضرورت ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان دریا ہیں۔ دریاؤں میں پھلیاں  
ہیں۔ زمین پر بادشاہ ہیں۔ بادشاہوں میں شکار کا شوق ہے۔ ان کے پاس  
باز ہیں۔ وہ بازوں کو چھوڑتے ہیں۔ وہ پھلیوں کو شکار کرتے ہیں اور  
بادشاہ خاندان رسالت کا امتحان لیتے ہیں۔ عجیب نہیں حضرت فرمائیں۔  
تجھے نہیں معلوم کہ کبھی کبھی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ جواب میں طول دیا جائے۔  
کیا تجھے نہیں معلوم کہ کوہ طور پر جناب موسیٰؑ سے اتنا ہی سوال ہوا تھا کہ موسیٰ  
تھھارے ہاتھ میں کیا ہے اور موسیٰؑ نے عصا کی پوری تاریخ بیان کر دی۔  
یہ تو اللہ والے ہی جانتے ہیں کہ کہاں جواب مختصر ہوتا ہے اور کہاں طول دیا  
جاتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ مولا یہاں کیا مصلحت ہے کہ آپ نے اس قدر  
طول دے دیا۔ فرمائیں گے۔ تجھے نہیں معلوم۔ میں نے صرف اتنا کہہ دیا ہوتا کہ  
پھلی ہے تو میرے علم کا تو اندازہ ہو جاتا لیکن وسعت علم کا اندازہ نہ ہوتا  
میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہم آل محمدؑ بیچنے ہی سے زمین و آسمان کا علم رکھتے ہیں  
اور یہ بھی بتا دینا چاہتا تھا کہ بات کا معلوم ہونا اور ہے اور بات کی اصل  
کا معلوم ہونا اور ہے۔ ہم بات بھی جانتے ہیں اور بات کی اصل بھی جانتے ہیں۔ اب

جسے شوقِ بزودہ ہم سے اپنی اصل کے بارے میں سوال کر کے دیکھے۔ جب ہم حیوانات کی اصل بتا دیتے ہیں تو انسانوں کی اصل کو ہم سے بہتر کون سمجھے گا۔ صلوات

امام نے درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ سلاطینِ وقت کا شوق کیا ہوتا ہے۔ اور امامِ وقت کا کردار کیا ہوتا ہے۔ شکار کھیلنا سلاطین کا کام ہے اور زمین و آسمان کے رموز بتانا امام کا کام ہے۔ اب یہ تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ دین کا ذوق دار شکاریوں کو مانوسے یا کائنات کا علم رکھنے والوں کو تسلیم کرو گے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! جواب میں حضرت مولیٰ کا انداز تو دیکھ لیا۔ اب کمال یہ حضرت عیسیٰ کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ امام رضا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دشمنوں نے طعنہ دینا شروع کر دیا کہ یہ اتر ہیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ امام فرماتے رہے کہ عنقریب پروردگار کا ہیں فرزند عنایت کرے گا لیکن حامدوں کو نہ ماننا تھا نہیں مانا۔ اور اس سازش میں فقط اغیار ہی نہیں اہل خاندان بھی شریک ہو گئے۔ اور مقصد یہ تھا کہ یہ دنیا سے اٹھ جائیگا تو ساری اہلک و جاگیر ہمیں مل جائے۔ اور ہر رجب ۱۱۵۰ء کو جنابِ سبیکہ کے بطنِ اقدس سے امام محمد تقیؑ کی ولادت ہوئی۔ ولادت کی شان بھی عجیب و غریب تھی کہ امام رضاؑ نے جنابِ سبیکہ کو روک لیا کہ آج میرے گھر ایک فرزند آنے والا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آثار تو ایسے نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ توقف فرمائیے۔ وہ ٹھہر گئیں۔ تھوڑی رات گزری تھی کہ جنابِ سبیکہ جنھیں خیرزان بھی کہتے ہیں، ان کو حجرہ میں لے گئیں۔ آثار نمودار ہوئے چراغ گل ہو گیا۔ فرزند کی ولادت ہوئی سارا حجرہ منور ہو گیا۔ میں نے غسل مولود دے کر فرزند

کو امام رضاؑ کے حوالے کر دیا۔ حضرت نے سر و سینہ کو بوسہ دیا وودن آنکھیں بند رہیں۔ تیسرے دن آنکھ کھولی تو زبان پر فقرہ تھا "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ" میں نے سخت تعجب کیا۔ فرمایا کبیر تعجب نہ کرو۔ یہ حجتِ خدا ہے اور حجتِ خدا کا یہی انداز ہوتا ہے۔

اللہ اکبر! کیا عظمت و جلالت ہے۔ آئے تو سارے عالم کو منور کر دیا اور آنکھ کھولی تو زبان پر کلمہ شہادتین جاری کیا۔

ذاتِ امارت علامتِ لیکن اہتمام پروردگار تھا۔ اور قدرتِ آواز سے رہی تھی کہ یاد رکھو ہم جب اپنے نمائندہ کو بھیجتے ہیں تو اس کا انتظام بھی جداگانہ ہی کرتے ہیں۔ آثار سے پتہ نہ چلا۔ حجرہ منور اور روشن ہو گیا چراغ خود بخود گل ہو گیا۔ دو دن آنکھیں نہ کھولیں۔ تیسرے دن آنکھ کھولی تو کلمہ پڑھتے ہوئے اب اندازہ کیجئے کہ آنکھ پختی گذر چکی ہیں۔ لیکن ابھی اول کا انداز بدلا نہیں ہے۔ جو انداز پہلے کا تھا وہی انداز تو فریں کا ہے۔ جو اہتمام روزِ ازل تھا وہی اہتمام آج بھی ہے۔ صلوات

قلبِ امامت مطمئن ہے کہ وارث آگیا ذہنِ سبیکہ مطمئن ہے کہ نورِ نظر آگیا۔ حکیمِ مسرور ہیں کہ راحتِ جان آگیا۔ لیکن حریفوں میں کھلبلی ہے کہ قیامت آگئی۔ جو انداز کل علیؑ کی آمد پر بتوں کا ہوا تھا وہی آج انسانوں کا ہے۔ ہم تو انھیں اتر کہتے تھے۔ یہ بیٹا کہاں سے آگیا۔ ہم تو انھیں اولاد سمجھتے تھے یہ وارث کہاں سے آگیا۔ قدرت نے آواز دی کہ تم نے تو میرے پیغمبر کو بھی اتر ہی کہا تھا۔ پھر کیا ہوا ہم نے بیٹی دی یا نہیں۔ اور بیٹی دی تو ایسی بیٹی دی کہ ساری کائنات پر اس کی نسل چھا گئی۔ اور "مصدقِ ابر" حامل کو ثمر ہو گیا۔

میرا فرزند محمد تقیؑ بچنے والے نے کہا حضور ان کی عمر تو فقط تین برس کی ہے تین برس کا بچہ امت کی ذمہ داری کیسے سنبھالے گا۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم لوگوں کو قرآن کی خبر بھی نہیں ہے۔ تین دن کے عیسیٰ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے اور تین سال کا امام یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے امام بنایا گیا ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے یہ حجت خدا ہے اور حجت خدا اپنے کمالات میں سن و سال کا محتاج نہیں ہوتا۔ — صلوات

غرض زندگی یوں ہی چلتی رہی اور جب آپ کی عمر شریف ۷ برس کی ہوئی تو امام رضاؑ کا انتقال ہو گیا۔ اب تو لوگوں کو اور بھی موقع مل گیا کہ آپ کی امامت پر طرح طرح کے اعتراضات کریں۔ کل فقط ایک اعتراض تھا کہ بچہ کیسے امامت سنبھالے گا۔ آج یہ واقعہ پیش آچکا ہے کہ سات برس کی عمر ہے اور ساری امامت کی ذمہ داریاں ہیں۔ کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اور مانیں تو کیسے مانیں ایک پورا فرقہ وجود میں آچکا ہے جو خود امام رضاؑ کو امام نہیں مانتا تھا اور امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد سلسلہ کو موقوف کر دینا چاہتا تھا۔ تو اب یہ فرقہ امام محمد تقیؑ کو کیسے تسلیم کرے گا۔ سیاسی اعتبار سے بھی حالات ناسازگار تھے۔ اور سیاست وقت نے یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ سادات میں آپس میں بھٹ پڑ جائے اور ان میں اتحاد و یکجہتی قائم نہ رہنے پائے۔ اسی سیاست کی پیداواریہ فرقہ تھا جس کی قیادت بعض "سادات کرام" ہی کر رہے تھے اور انہیں کامنتا تھا کہ امام رضاؑ کی شخصیت مسلم نہ ہونے پائے۔ اُدھر یہ شخصیت اسلام ہو گئی کہ حکومت میں ولی عہدی کا منصب مل گیا۔ خاندان کا جو عالم ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ لیکن آپ نے اپنے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

اب اس مقام پر ایک لفظ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کل کفار نے نبی کو ابتر کہا تھا اور آج مسلمانوں نے امام علی رضاؑ کو ابتر کہا۔ قدرت نے دونوں جگہوں پر یہ اہتمام کیا کہ نبی کی نسل کو عالمگیر بنادیا۔ اور امام رضاؑ کی نسل کو سادات میں سب سے زیادہ قرار دے دیا کہ آج روئے زمین پر جتنے رضوی سادات پائے جاتے ہیں شائد اتنے سادات کسی اور امام کی نسل سے نہ ہوں گے اور یہ بھی قدرت کا ایک اہتمام تھا کہ تم جتنا مٹا چاہو گے ہم اتنا ہی زندہ و پائندہ رکھیں گے اور ایک مناسبت اور سامنے آگئی کہ نبی کو ابتر کہا گیا تو اللہ نے نسل زہراؑ کو نسل پیغمبرؐ بنادیا اور امام رضاؑ کو ابتر کہا گیا تو مالک نے اولاد امام محمد تقیؑ کو "ابن الرضا" بنادیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک مدت تک امام محمد تقیؑ اور امام علی تقیؑ کی نسل کو ابن الرضا کہہ کر یاد کیا جاتا تھا اور یہ قدرت کا انتظام تھا کہ تو یہی دنیا کو اولاد رضاؑ سے بھر دیا جائے اور دشمن کو اندازہ ہو جائے کہ ہمارے سامنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جسے باقی رکھنا چاہے کالے بہر حال باقی رکھے گا۔ — صلوات

قدرت نے اپنا انتظام کر دیا لیکن حاسدوں کا سلسلہ تمام نہیں ہوا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم انہیں وارث رضا نہیں سمجھتے حضرت نے موقع پر جمع اصحاب میں محمد بن علیؑ سے کہا کہ ذرا پیچھے کی قمیص کو اتار دو انہوں نے بڑھ کر قمیص اتار دی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ پشت پر ہر امامت کا نشان موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے آباد و اجداد کی سبھی یہی نشان رہی ہے۔ رسولؐ کی پشت پر ہر رسالت تھی اور امام کی پشت ہر امامت ہوتی ہے۔ ایک شخص نے موقع پا کر ایک مرتبہ امام رضاؑ سے کہا کہ اگر خدا نخواستہ آپ دنیا سے اٹھ جائیں تو آپ کے بعد دین کا ذمہ دار کون ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ

اور برابر نیک برتاؤ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب سادات کی کوئی "بنادت" نام کام پولا اور مامون نے قیدی سوا کو امام رضاؑ کے حوالے کر دیا تو آپ نے سفارش کر کے چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ فرزند رسولؐ! ان لوگوں کا برتاؤ یہ ہے اور آپ حضرات کا طرز عمل یہ ہے؟ فرمایا کہ ان کا کردار ہے یہ ہمارا کردار ہے۔ وہ اپنے فریضے سے غافل ہو جائیں تو میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اسی کشمکش میں زندگی چلتی رہی لیکن جب حضرت کا انتقال ہو گیا تو حریفوں کو کھل کر مخالفت کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک مرتبہ حضرت کی زندگی میں امام محمد تقیؑ کی ولایت پر اسے انکار کر دیا اور بالکل دیہات حالات سامنے آ گئے جو جناب میری کے لئے پیش آئے تھے۔ وہاں باپ نہیں تھا تو وہاں باپ نہیں تھا تو یہ مصیبت سامنے آئی تھی۔ یہاں باپ موجود ہے لیکن یہ تہمت لگائی جا رہی ہے۔ قدرت نے کہا کہ تو بھی تمہیں اسی طرح ذلیل کروں جس طرح عیسیٰ پر تہمت لگانے والے پو دی ذلیل ہوئے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے یہ درخواست کی کہ قیافہ شناسوں سے دریافت کیا جائے۔ تمنا میں بھی کو رکھا گیا۔ قیافہ شناسوں کو طلب کیا گیا۔ امام رضاؑ ایک مصوبی لکھا جس میں آئے کہ شخصیت معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن میرے ہی قیافہ شناسوں نے دیکھا کہ اگر آواز دی یہ اسی آئے والے کا فرزند ہے۔ دونوں کا انداز ایک ہے رفتار ایک ہے۔ کردار ایک ہے۔ میں کہوں گا کہ فوس قیافہ شناسوں نے پہچان لیا۔ خاندان والوں نے پہچان لیا۔ حکم ہے صرف کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ وہ مسلمان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ابوبہب کو حاصل نہیں ہوتی اور غیر کو اپنا بنا لیتی ہے۔ اور اپنے کو بزم سے اٹھا دیتی ہے۔ صلوات

دنیا نے پہچاننے سے انکار کر کے یہ چاہا تھا کہ امامت کا مرتبہ کشادیں۔ امامت نے آواز دی۔ تمہارے نہ پہچانے سے میرا نقصان نہیں ہے۔ تمہارا ہی

نقصان ہے۔ میرے جد نے تو پہلے ہی فرمادیا تھا کہ جو اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ یاد رکھو کہ علیؑ کو دیکھنا نہ پہچانا تو علیؑ کا کیا نقصان ہوا حسن مجتبیٰؑ کو شام کی حکومت نے نہیں پہچانا تو حسن مجتبیٰؑ کا کیا نقصان ہوا۔ امام حسینؑ کو یزید نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام زین العابدینؑ کو ہشام نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام محمد باقرؑ کو عبداللہؑ نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام جعفر صادقؑ کو وقت کے اماموں نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کو ارورن نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ اویچھے بھی تم لوگوں نے نہیں پہچانا تو میرا کیا نقصان ہوا؟ بس یہ یاد رکھنا کہ رد سلسلے الگ الگ ہیں۔ اب تم فیصلہ کر دو کہ تمہارا رشتہ کس سلسلے سے ہے اور میرا رشتہ کس سلسلے سے ہے میں تو اپنے جد کا ایک ہی اعلان جانتا ہوں کہ جو وقت کے امام کو نہ پہچانے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ میری فضیلت کے بارے میں نہ سوچو اپنی موت کے بارے میں سوچو۔ مہلوات

وقت گزرتا رہا اور شک کرنے والے شک کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہ طے ہو گیا کہ حضرت کا امتحان لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان میں امامت کی صلاحیت ہے یا نہیں۔

یہ بھی قدرت کا ایک اختتام تھا کہ حریفوں پر حجت تمام ہو جائے اور کوئی یہ جھگڑنے پانے کے ان میں امامت کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور میں تو اس تحریک سے خوش ہوں کہ انسان آزمائے۔ امتحان کر کے ایمان لے آئے۔ بس اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ یہ طریقہ ہر مدئی کے ساتھ برتا جائے اور جو سوالات کا جواب نہ دے سکے اسے تحت حکومت سے اتار دیا جائے لیکن افسوس کہ تاریخ اسلام میں ایسا نہیں ہوا اور مسلمان ماننے پر آیا تو ہر جاہل کو راہنما بنایا۔ اور نہ ماننے پر آیا تو باب مذہب

کو بھی امام نہیں مانا۔ تاریخ اسلام کے لئے کس قدر شرم کی بات ہے کہ اعتراضات جہالت کرنے والے امام ہو جائیں اور سلونی قبل ان تفقدونی کا دعویٰ کرنے والا امام نہ ہو سکے۔ صلوات

خیر۔ اس وقت یہ بحث نہیں ہے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ لوگوں نے امت کا ارادہ کیا۔ مجلس امتحان آراستہ ہوئی۔ بے شمار افراد اکٹھا ہوئے اور چاروں طرف سے سوالات کی بوجھا مشروع ہو گئی۔ امام کی کمسنی۔ مجمع کی کثرت سوالات کا ہنگامہ۔ مگر اللہ سے علم امامت کہ کوئی سوال تشنہ جواب نہ رہ گیا۔ اور کسی ایک کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ میرے سوال کا جواب نہیں ہو سکا۔ بلکہ روایت سے تو یہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو سوال کرنا نہ آیا تو خود ہی سوال بتایا اور خود ہی جواب دیا۔ اور اگر کوئی اپنے سوال کو قبول کیا تو سوال بھی بتا دیا اور جواب بھی بتا دیا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ عمل کتنی دیر گرم رہی اور یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ کتنے سوالات کئے گئے اور امام نے کس طرح جوابات دیئے۔ روایت کہتی ہے کہ تقریباً تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہا لوگ سوال تماشے رہے پوچھتے رہے اور فرزند رسول جواب دیتے رہے۔ سوالات تو تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکے لیکن اتنا ضرور ملتا ہے کہ تقریباً ہزار سوالات کئے گئے اور آپ نے سب کے جوابات دیئے۔

اے کاش یہ سوالات اور جوابات محفوظ رہ جاتے تو آج امت کے پاس علم کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور کس طرح ہوتا استفادہ کی غرض سے پوچھا گیا ہوتا تو اسے محفوظ بھی کیا جاتا۔ وہاں تو خال مذاق کرنا تھا۔ غا جز کرنا تھا۔ امتحان لینا تھا۔ کسی طرح غلط ثابت کر دینا تھا مگر کیا کہنا جملات امامت کا کہ کسی منزل پر خاموش نہیں ہوئے۔ اور جوابات

رہے اور یہ واضح کر دیا کہ محمد محمد ہی ہوتا ہے وہ پہلا ہو یا تیسرا۔ یہاں اول و اولیں کوئی فرق نہیں ہے۔ صلوات

واقعہ تمام ہو گیا۔ اب خاتمہ کلام میں امام محمد تقیؑ کا ہی ایک بیان سن لیجئے جس سے اندازہ ہو گا کہ جس کے نظریات اتنے بلند ہوتے ہیں اس کا کردار کتنا بلند ہوتا ہے۔ اہل دنیا آرائش دنیا پر جان دینے والے۔ زیبائش دنیا پر مرنے والے کیا جانیں کہ تقویٰ کیا ہے اور کردار کی شان کیا ہوتی ہے۔ انسانیت کا وقار کیا ہے۔ اور آدمیت کو زینت کن چیزوں سے ملا کرتی ہے فرزند رسولؐ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو اگر زندگی کو زینت دینا ہے تو مجھ سے پوچھو میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس چیز کی زینت کس چیز سے ہوتی ہے۔ اور انسانیت کا کمال کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ یاد رکھو فقری کی زینت ہے عفت۔ اللہ کی زینت ہے شکر۔ بلا کی زینت ہے صبر۔ صبر کی زینت ہے انحصاری کلام کی زینت ہے فصاحت۔ ایمان کی زینت ہے عدالت۔ عبادت کی زینت ہے سکون قلب۔ روایت کی زینت ہے حافظہ۔ علم کی زینت ہے تواضع۔ عقل کی زینت ہے ادب۔ حلم کی زینت ہے کشادہ دلی۔ زہد کی زینت ہے ایثار۔ نفس کی زینت ہے ریاضت۔ خوف خدا کی زینت ہے گریہ و طویل قناعت کی زینت ہے غذائے قلیل۔ نیکی کی زینت ہے ترک احسان۔ نماز کی زینت ہے توبہ نفس اور ان کو سمیٹ لیا جائے تو یوں کہا جائے کہ انسانیت کی زینت ہے اسلام۔ اسلام کی زینت ہے ایمان ایمان کی زینت ہے تقویٰ۔ تقویٰ کی زینت ہے عصمت اور عصمت کی زینت ہے کردار معصوم۔ عصمت بے رونق ہے۔ اگر معصوم کا کردار نہ ہو اور تقویٰ بے رونق ہے نا کہ کوئی محدثی نہ ہو۔ عبادت کی زینت علی بن الحسینؑ سے ہے اور تقویٰ کی زینت محمد بن علیؑ سے ہے۔ صلوات

# امام علی نقی علیہ السلام

اسم مبارک

علیؑ

لقب

نقی، ہادی

کنیت

ابو الحسن ثالث

والد ماجد

امام محمد تقیؑ

والدۃ ماجدہ

جناب سمانہ

ولادت

۵ رجب ۲۱۴ھ جمعہ مدینہ منورہ

شہادت

۳ رجب ۲۵۴ھ شنبہ سامره

عمر مبارک

۴۰ سال

قبر مطہر

سامره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين  
خاتم النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين  
ولعنة الله على اعدائهم اجمعين -

اما بعد فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم - بسم الله الرحمن الرحيم  
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَاِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے کہ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے  
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے -

اس ارشاد نے صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے تاریخ کے  
ہر موڑ پر انسانی ہدایت کا انتظام کیا ہے اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا جب  
ہدایت لینے والے موجود ہوں اور کوئی ہدایت دینے والا نہ ہو بلکہ ایسا دور  
آیا ہے جب صرف ہدایت دینے والا تھا اور ہدایت لینے والا کوئی نہ تھا۔  
حضرت آدمؑ ہادی و رہنما بن کر آئے اور عالم انسانیت میں کوئی نہ تھا۔ قدرت  
اعلان کر رہی تھی کہ دیکھو ہمارا نظام ہدایت اس قدر پختہ ہے کہ ہم نے ایک  
لحظہ تاریخ بھی بغیر ہادی و رہنما کے نہیں چھوڑا۔ ابھی ہدایت لینے والے  
نہیں لیکن میں نے ہادی و رہنما بنا دیا ہے تاکہ انسان کو یہ شکایت نہ ہو کہ ہم تھے  
اور رہنمائی ہدایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ انسان کی فطرت شکایت کرنا ہے  
انسان کا مزاج فریاد کرنا ہے۔ اسے کام کرنا کچھ نہیں ہے۔ فریاد کرنا زیادہ  
ہے۔ کیسی عجیب مخلوق ہے یہ انسان کہ جب ہم نے آدمؑ کو خلیفۃ اللہ بن کر  
پیدا کر دیا تو اسے یہ اعتراض ہے کہ جب کائنات بشریت میں کوئی نہ تھا  
تو خلیفہ و ہادی کی ضرورت کیا تھی۔ اور جب اسے پیدا کر کے رہنماؤں کا

سلسلہ جاری رکھا تو اسے یہ شکایت ہے کہ ہمارے اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے ہمارے لئے کسی ادا دی درہنہ کی کیا ضرورت ہے آخر رہنما بھی تو ہمارا جیسا ہی ایک بشر ہوتا ہے۔ اگر وہ راہنمائی کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے اگر وہ کسی راہنما کا محتاج نہیں ہے تو ہم کیوں ہیں۔ بشر بشر کو ایک جیسا ہونا چاہئے۔ انسان انسان کو ایک انداز کا ہونا چاہئے۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ ایک راہنما ہو جائے اور دوسرا راہ رو۔ ایک ادا دی ہو جائے اور دوسرا راہ گیر قدرت نے آواز دی انسان! تو نے ہمارے نظام کو نہیں پہچانا۔ ہم نے یہ سارا کام تیرے ہی فائدے کے لئے کیا ہے۔ اور تجھے بجا زمتموں سے بچانے کے لئے اپنے ادا دیاء کو زمتموں میں مبتلا کیا ہے۔ ورنہ انھیں کیا غرض تھی۔ وہ عرش کی مخلوق تھے عرش پر رہتے۔ عالم انوار کے رہنے والے تھے عالم انوار میں رہتے۔ یہ تیری ہدایت کا خیال تھا کہ انھوں نے عرش العظمیٰ کی منزل کو چھوڑ دیا۔ اور فرشتہ خاکی پر آگئے۔ اور یہ تیری ناقدری ہے کہ تو نے ان کے وجود ہی کو محل اعتراض بنا دیا اور ان کے مقابلہ میں پورا نظام ریاست قائم کر لیا۔ کاش تو نے یہ سوچا ہوتا کہ نظام ہدایت اور ہے نظام ریاست اور۔ قانون شریعت ہدایت کے زیر سایہ چل سکتا ہے ریاست کے زیر سایہ نہیں۔ مگر تو نے یہ سب کہاں سوچا۔ تیرا کام تو فقط اعتراض کرنا اور رکاوٹیں پیدا کرنا تھا لیکن یاد رکھ کہ جس طرح ہم نے راہنماؤں کو پیدائشی طور پر یہ کمال دیا ہے کہ ان کی ولادت کا انداز دوسرے انسانوں سے الگ رکھا ہے اور ان سے وقت ولادت ہی سجدہ کرا دیا ہے۔ انھیں عصمت کے لباس سے آراستہ کیا ہے۔ ان کی فطرت میں علم و فضل کے جوہر بھر دیئے ہیں۔ ان کے کردار کو طہارت و تقویٰ کے غیر سے تیار کیا ہے۔ اسی طرح ان کے دل و دماغ اور ذہن

و نظر میں اتنا حوصلہ دے دیا ہے کہ وہ کسی منزل پر اپنے فریضہ سے غافل نہیں رہ سکتے۔ دنیا لاکھ ناشکری کرے۔ ہزار و کاویں پیدا کرے لیکن وہ اپنے فریضہ سے غافل نہ ہوں گے۔ اور جس حالی میں رہیں گے تبلیغ دین کرتے رہیں گے۔ اور اپنے فریضہ تبلیغ پر عمل کرتے رہیں گے نہ رخبرہاں یا بالائے دار — قید خانہ میں رہیں یا نظربند - فرض ہدایت جاری رہے گا۔ اور اس شان سے جاری رہے گا کہ حکومتیں ان کی زندگی کو بھی برداشت نہ کر سکیں گی اور انہیں یہ احساس ہوگا کہ اگر یہ زندہ رہ گئے تو ہماری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تخت و تاج کو سمجھانا تو بہت آسان ہے لیکن اسلام کے نام پر چلنے والی حکومت کا شریعت و احکام کے بغیر چلنا مشکل ہے۔ یہ ایک کش مکش مٹی جس میں حکومتیں مبتلا رہیں۔ ایک آزمائش مٹی جس سے ریاستوں کو گذرنا پڑا اور بالآخر زبردستی کے علاوہ کسی کو کچھ بچائی نہ دیا۔ قدرت نے بھی آواز دی کہ اگر تیرا ہی کردار ہے تو تو زہر دیتا جا ہم راہنما بھیجے جائیں گے۔ اگر تو پوری زندگی بھی قید خانہ میں رکھے گا تو ہمارا راہنما تبلیغ ہی کرے گا۔ یوسف نے قید خانہ میں توحید کا سبق سکھایا۔ امام موسیٰ بن جعفر نے قید خانہ بغداد میں حکومت کی نمائندہ عورت کو مسجد کرایا۔ اللہ دانوں کی زندگی اسی طرح گذرتی رہی کہ اپنے کردار کی پاکیزگی بھی سلامت رہی اور قوم کی ہدایت کا فریضہ بھی جاری رہا۔ نہ حالات نے ان کے کردار پر اثر ڈالا کہ وہ راہ سے بے راہ ہو جائیں اور نہ زمانہ ان کی راہ روک سکا کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہو جائیں۔ وہ جس دور میں رہے کہ دار کے اعتبار سے قابل تعریف اور محمد رہے اور جس زمانہ میں رہے عظمت و رفعت کے اعتبار سے بلند اور علیؑ رہے۔ ان کے وقار و اعتبار کا یہ عالم تھا کہ زمانہ نے ان کے کردار کی پاکیزگی کو دیکھا تو نفی کہہ دیا اور ان کے

فرض ہدایت کو دیکھا تو پادہ کی کہہ دیا۔ ہمارے دسویں امام کے یہی مشہور رد و لقب ہیں۔ جن میں ایک شخصیت کا پتہ دیتا ہے اور ایک کردار کا اور کیوں نہ ہو اللہ دے شخصیت میں بھی علی ہوتے ہیں اور کردار میں بھی علی ہوتے ہیں۔

آپ کی ولادت مامون عباسی کے دور میں ۵ رجب ۲۱۴ھ کو ہوئی والدہ گرامی کا نام سمانہ خاتون تھا جو اپنے دور کی نہایت درجہ پاکیزہ صفا اور بلند کردار خاتون تھیں۔ اور قدرت نے انھیں ایک امام کی زوجیت کا شرف دے کر دوسرے امام کی والدہ بنا دیا۔ چنانچہ کہ اللہ کسی کے عمل کو منافع نہیں کرتا۔ اور ہر ایک کو اس کے کردار کی جزا ملتی ہے۔ یہ جناب سمانہ کے کردار کی جزا تھی کہ قدرت نے انھیں امام علی نقی کی والدہ گرامی ہونے کا شرف دے دیا اور نہ کہاں علم کی خاتون اور کہاں ہاشمی شہزادہ۔ یہ مالک کائنات کا کم تھا کہ اس نے انھیں اتنا بڑا مرتبہ دے دیا کہ اور دنیا کو مستوجب کر دیا کہ دیکھو عرب و عجم کی تفریق کو کٹے نہیں ہے۔ ہم عظمت دینا چاہتے ہیں تو ایک عجم خاتون کو بھی فوراً امت کا حامل بنا دیتے ہیں اور نا اہل پاتے ہیں تو عرب کو بھی اس شرف سے محروم رکھتے ہیں تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے نمائندوں کے گھر عجمی خواتین بھی آئیں اور عرب خواتین بھی لیکن یہ ہمارا نظام تھا کہ عجم خواتین کو ہم نے مادر عصمت بنا دیا اور عرب خواتین تربیتی رہیں اور ساری زندگی میں ایک فرزند کی ماں نہ ہو سکیں۔

شاید اسی نکتہ کی طرف مہرسل اعظم نے اشارہ فرمایا تھا جب آپ جناب خدیجہ کے انتقال کے بعد سلسل ان کا تذکرہ کر رہے تھے اور برابر انھیں یاد کر رہے تھے اور ایک خاتون نے ٹوک دیا تھا کہ اب مرنے کے بعد تذکرہ سے کیا فائدہ۔ مردہ

بیوی کا تذکرہ وہ کرتا ہے جسے دوسری بیوی نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن جسے بہتر سے بہتر زوجہ میسر ہو گئی ہو وہ مرنے والی زوجہ کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا سچ ہے لیکن تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ خدیجہ اور تم سب میں بڑا فرق ہے۔ خدیجہ اس وقت ایمان لے آئیں جب کوئی ایمان لانے والا نہ تھا۔ خدیجہ نے اس وقت میری تصدیق کی جب کوئی تصدیق گزار نہ تھا۔ خدیجہ نے اس وقت مالی بہرہ ریزی کی جب میں غربت کے دور سے گذر رہا تھا۔ اور خدیجہ نے اس وقت مجھے مہربان اور لاد بنا یا جب لوگ ابتر کے طعنے دے رہے تھے یعنی خدیجہ کی آغوش نے مجھے ابتر کے طعنے سے بچایا اور کوئی تو اتنا بھی نہیں کر سکا۔ یہ قدرت کا کرم ہے کہ کس کو کیا عطا کرے۔ عرب کی عورتوں نے بائیکاٹ کر دیا تو اللہ نے خدیجہ کو ذہرا جیسی دختر دے کر ان کی نسل کو قیامت تک کے لئے قائم کر دیا اور دینا نے عجم کو لگا ہوں سے گرا دیا تو قدرت اکی آغوش کو مرکز امامت بنا دیا۔

امامت و ہدایت ایک ایسا منصب ہے جو سن و سال۔ عمر و قد و حالات و کیفیات کا تابع نہیں ہے۔ امام اپنی صلاحیتیں اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے۔ اور جس وقت ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے۔ اپنے فرائض پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ امام علی نقیؑ کی عمر شریف تقریباً ۷۰ برس کی تھی۔ جب امام محمد تقیؑ کا انتقال ہوا۔ لیکن امامت و مشرعت کی ذمہ داریوں کو اس کمال کے ساتھ سنبھالا کہ دنیا کو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کیوں نہ ہوتا باب تھا تو وہ بھی کسی میں علم کے جوہر دکھا چکا تھا۔ اور دادا تھا تو وہ بھی باب مدینہ العلم تھا اور جب ساری نسل مرکز کمال تھی تو عمر و سن کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حکومتوں کا دباؤ قیامت کا تھا۔ اذیتوں کا سلسلہ برابر قائم تھا۔ لیکن

امام کا فرض ہدایت ادا ہو رہا تھا۔ مدینہ کا ماحول۔ علماء کا مرکز۔ مسجد نبویہ  
جیسی جگہ اور امام علی نقیؑ کے مواعظ۔ دیکھنے کا منظر تھا۔ اور سننے کے سائل ہزاروں  
کہ زمانہ نے قدر نہ کی اور جو کچھ سنا اسے ہوا میں اڑا دیا۔ بیانات کا ایک بڑا مختصر  
حصہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں دبا رہ گیا۔ ورنہ شاید اسی محو کر دیا جاتا۔  
ایسے ایسے اہم سوالات جن کے جوابات کی آج کے دور کو ضرورت ہے لیکن  
ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

ابو ہاشم جعفری کہتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص  
نے اکر آپ سے ہندوستانی زبان میں گفتگو شروع کی۔ آپ برابر باتیں سنتے  
جاتے تھے اور جواب دیتے جاتے تھے۔ مجھے سخت ہوئی کہ حضرت اس کا زبانا  
میں کیسے گفتگو فرما رہے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کی فرزند رسولؐ! میں نے  
عجب منظر دیکھا ہے آپ اس سے اسی کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔  
حالانکہ آپ کا اس زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فرمایا۔ ابو ہاشم میں امام ہوں اور امام ہر زبان سے واقف ہوتا ہے۔  
ہر زبان سے واقف نہ ہو گا تو ہر قوم کی ہدایت کیسے کرے گا۔ وہ اور ہیں جو  
جہالت کے زور پر امام ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی امامت آدمؑ کے دور ہی سے  
علم و کمالات کے ساتھ چلی رہی ہے۔

یہ کہہ کر فرمایا ابو ہاشم! فرمایا گفتگو تو اٹھاؤ۔ ابو ہاشم نے کنکری اٹھا  
کہ حضرت کے دست اقدس پر رکھی۔ آپ نے اسے دہن اقدس میں رکھا  
اور جب لعاب دہن سے تر ہو گئی تو فرمایا۔ ابو ہاشم! اسے اب اپنے دہن میں رکھ لو  
ابو ہاشم کہتے ہیں کہ میں نے تعمیل ارشاد کی اور اب جو کنکری کو اپنے دہن میں  
رکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں ستر زبانوں کا ماہر ہو گیا ہوں اور ہندوستانی

ایسی کہ نہ پوچھے۔ (مفتی الامال)۔ کہنے تو عرض کروں کہ جس کے لعاب دہن  
میں یہ تاثیر ہو اس کے علم کا کیا عالم ہو گا۔ اور لعاب دہن تقریباً جسم کا فاضل  
حصہ ہوتا ہے جو اکثر جدا کر دیا جاتا ہے۔ جب اس میں یہ اثر ہے تو خون میں کیا  
اثر ہو گا جسے رسول اللہؐ نے خود اپنا خون قرار دیا ہے۔ اور دوسری لفظوں میں  
یہ کہا جائے کہ دنیا لعاب دہن کے ذریعہ قرآن کے درق کھولتی ہے۔ امام  
نے لعاب دہن کے ذریعہ علوم کے دروازے کھول دیئے اور دنیا پر واضح  
کر دیا کہ ہم جب اس قدر عنایت کر سکتے ہیں تو ہمارے پاس کس قدر ذخیرہ  
ہو گا۔ ہمارے در پر آؤ تو سہی پھر دیکھو کیا کیا ملتا ہے۔ زندہ آدمی تو علوم  
و کمالات دیدہ ہیں گے اور مر جاؤ گے تو موت کو شہادت بنا دیں گے۔

فتح بن خاقان جو وزیر ملکیت کے عہدہ پر فائز تھا۔ امام علی نقیؑ کی  
خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ عرض کرتا ہے فرزند رسولؐ! ذرا تو حید کے بھتی  
تو بیان فرمائیے۔ آپ نے فرمایا وہ خدا ایسا ہے کہ نہ اس کا کوئی جزو ہے  
نہ شریک۔ نہ مخلوقات سے قریب ہے نہ بعید۔ سب کو اس نے پیدا کیا ہے۔  
اس کو کسی نے نہیں پیدا کیا۔ ہر شے کا جاننے والا ہے اور ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔  
اس کا کوئی مثل و نظیر ممکن نہیں ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے۔

فتح کہتا ہے سرکار یہ شان تو بندہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بندے بھی  
یکتا ہوتے ہیں۔ بندے بھی بے مثل و بے نظیر ہوتے ہیں تو خدا میں کیا خاص  
بات ہے؟

فرمایا فتح یاد رکھو بندوں کا ایک ہونا اور ہے اور خدا کی وحدانیت  
اور ہے۔ بندہ ایک ہو کے بھی ہزار اجزاء سے مرکب ہوتا ہے۔ اس میں خون بھی  
ہے اور گوشت بھی۔ ہڈی بھی ہے اور چمڑا بھی۔ یہ سب کا ایک ہے۔ اس

کی وحدت ہی ہزاروں کثرتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا بے مثل ہونا بھی اسی طرح کا ہے کہ ہزار امثال کے ہوتے ہوئے بھی بے مثل کہا جاتا ہے۔ لیکن خدا کی وحدت دیکھائی اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا نہ کوئی جزو ہے نہ شریک۔ وہ نہ مرکب ہے نہ جزو مرکب۔ اس کی شان ہی اودھ اور اس کا انداز ہی نرالا ہے۔

فتح عرض کرتے ہیں۔ فرزند رسولؐ! یہ لطیف کے کیا معنی ہیں اور خدا کے لطیف و خیر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

فرماتے ہیں فتح یاد رکھو اس نے لطیف ترین اور نازک ترین مخلوقات کو بھی پیدا کیا ہے تو اس سے زیادہ لطیف کون ہو گا۔ ذرا اس کی مخلوقات پر تو نظر ڈالو۔ کیسی نازک گھاس، کیسے نازک پھول، کیسی نازک پتیاں۔ کیسی نازک پتیوں میں رگیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزئیاں۔ چوڑٹیوں کے واسطے روری۔ ہر مخلوق کا ایک مقصد۔ ہر مخلوق کی ایک ذمہ داری۔ سب میں بچے جوان، نر کا وہ ماں باپ، جوڑے اور جفت۔ سب کے لئے حفاظت کا الگ انتظام۔ سب کے لئے غذا کا الگ نظام۔ سب کے الگ الگ حرکات۔ سب کی الگ الگ بویاں۔ دریاؤں میں پھلیاں۔ پھلیوں کے اقسام۔ ہر ایک کی الگ بناوٹ ہر ایک کی جداگانہ صنعت۔ کیا یہ سب اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ بنانے والا لطیف و خیر ہے۔ ایسا لطیف کہ نرا کتوں کا انبار لگا دیا ہے۔ اور ایسا خیر کہ کوئی چیز نگاہوں سے غائب نہیں ہے۔

بات تمام ہو گئی لیکن جی چاہتا ہے کہ عرض کروں فرزند رسولؐ! اس خالق کی یمتائی اور بے نیازی میں شک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لطیف و خیر ہونے میں شبہ نہ کرنا کفر ہے۔ لیکن فرزند رسولؐ! آپ کتنے لطیف و خیر ہیں کہ ان تمام نراکتوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور ان تمام بارکیوں کی مکمل اطلاع

رکھتے ہیں۔ چنانچہ یوں سال میں علم دنیا نہیں پہنچتا و ہاں آپ کی نگاہ لمحوں میں کام کرتی ہے۔ عجب نہیں آپ فرمائیں کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نمائندہ پروردگار ہوں اور خدائے لطیف و خیر کسی جاہلی کو اپنا نمائندہ نہیں بنا سکتا وہ جب کسی کو اپنا نمائندہ اور جانشین بناتا ہے تو اسی قسم کے کمالات دے کر بھیجتا ہے جس قسم کے کمالات کا خود عامل ہے وہ ایسا اکمال بنا دیتا ہے کہ بندہ بندگی کرنے کے بعد بھی "خدا نما" نظر آتا ہے۔ اور کبھی کبھی خدائی کے طبع اس قدر نمایاں ہو جاتے ہیں کہ بندہ پر خدا کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔

فتح بن خاقان نے سوال کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ اہل دنیا دیکھ لودھوکہ میں نہ رہنا میں دوزیر ملکیت ہوں۔ متوکل کے جملہ امور کا مالک ہوں۔ صبح و شام کا قسمت دبر خواست ہے۔ لیکن یہ مسائل حضرت علی نقیؑ سے دریافت کرتا ہوں۔ متوکل سے نہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ تخت و تاج کا مالک متوکل ضرور ہے۔ لیکن علم و کمال کی دراشت فرزند رسولؐ کے پاس ہے۔ اور یاد رکھو جو متوکل تو حید کے معنی نہیں بتا سکتا اسے خدائے وحدہ لا شریک کا نمائندہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فتح بن خاقان رہے متوکل کے دربار میں۔ لیکن عقیدت فرزند رسولؐ سے وابستہ کئے رہے۔ اور یہ جانتے رہے کہ علم ان کے پاس ہے۔ دین ان کے پاس ہے شریعت ان کے پاس ہے۔ نجات ان کے قبضہ میں ہے۔ متوکل کے پاس تخت حکومت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور وہ بھی جتنے دن ہے اتنے دن ہے۔ ظلم کا سلسلہ دائمی نہیں ہوتا۔ وہ ایک دن بہر حال فنا ہو جاتا ہے۔ بقا مطلقیت کے لئے ہے۔ کمال کے لئے ہے۔ جو ہر کے لئے ہے اور اس کا خزن و مرکز اہلبیتؑ کے لئے ہے۔

فتح بن خاقان کا ذکر ہے۔ یہ تو امام کا ایک عقیدہ تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ حکومت نے بڑے بڑے صاحبان علم تلاش کئے ہیں اور انہیں حضرت کے منہ پیش کیا ہے تاکہ وہ امام سے سوال کریں۔ اور جب امام جواب نہ دے سکیں تو انہی کو سوالی ہو۔ نہ جانے کس قدر ڈیپٹی ہے اہل دنیا کو آل رسول کی ذلت و رسوائی سے اور کس قدر جاہل ہے یہ دنیا کہ ہزاروں بار کے تجربوں کے بعد بھی ہوش نہیں آتا کہ ان کے پاس کمالات کے خزانے ہیں۔ انہیں کوئی رسوا نہیں کر سکتا۔ ان کے رسوا کرنے والے ہمیشہ ذلیل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ایک طرف نشہ حکومت اور دوسری طرف نشہ شراب۔ جب بھائی کو بھائی اور بیٹے کو باپ پر دم نہیں آتا اور قتل و خون کا سلسلہ جاری ہے تو امام کی عزت و آبرو سے کسے ہمدردی ہو سکتی ہے۔

قدرت نے بھی کہا کہ ہاں ہاں تم سوال کرو۔ تم دربار میں بلاؤ۔ تم امتحان دو تو یہی کہ ہم تمہارے ہی ذریعہ ان کے کمالات کا اعلان کریں اور تمہارے ہی دربار میں ان کے فضائل کا کلمہ پڑھوائیں۔ چنانچہ ایک علی کو آڑا چکے ہو اور سردار اعتراف کر چکے ہو کہ علی نہ ہوتے تو ہلاکت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب ایک علی کو آڑا کر آنا تو یہی دوبارہ وہی کلمہ پڑھنا پڑے اور افراد کو باپ سے کہیے نہ ہوتے تو حکومت غرق فنا ہو چکی ہوتی۔

متوکل کے دور میں ابن سکیت ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسے اپنے علم پر ناز تھا اور متوکل کو بھی اس پر اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ ابن سکیت سے کہنے لگا کہ ذرا علی نقی کا امتحان لو اور ان سے ایسے سوال کرو کہ یہ جواب نہ دے سکیں۔ ابن سکیت نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اور اپنی دانست میں بہا یا یا سوالات سے کہ حضرت کے سامنے آگیا۔ ذرا یہ تو فرمایا کہ اللہ نے ہر نبی کو الگ الگ ہجو

کیوں دیا۔ جناب موسیٰ کو عصا دیا۔ جناب عیسیٰ کو مردوں کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفا یاب بنانے کی طاقت دی۔ پیغمبر اسلام کو قرآن اور تلوار دی ایسا کیوں ہوا جب سب اسی ایک خدا کے نمائندے تھے اور سب کو خدا ہی نے بھیجا تھا تو معجزات میں اختلاف کیوں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تین ہجروہ کی حقیقت ہی نہیں معلوم ہے۔ معجزہ حالات کے تحت دیا جاتا ہے تاکہ اس دور کے لوگ اس کی قدر کو پہچانیں اور یہ سمجھیں کہ صاحب اعجاز مافوق بشر طاقت رکھتا ہے۔ جناب موسیٰ کے دور میں جادو کا زور تھا۔ اللہ نے انہیں عصا دیدیا۔ جناب عیسیٰ کے دور میں طب کا زور تھا اللہ نے انہیں میسائی دیدی۔ حضور سرور کائنات کے دور میں فصاحت و بلاغت اور شجاعت کا زور تھا اللہ نے انہیں قرآن اور تلوار دیدی۔

ابن سکیت نے کہا کہ اچھا آج جب کوئی صاحب اعجاز نہیں ہے تو لوگوں پر خدا کی محنت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا عقل۔ اس نے کہا عقل تو کل بھی موجود تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جیسا لیکن کل سچ اور جھوٹ میں امتیاز نہیں قائم ہوا تھا اب امتیاز قائم ہو چکا ہے اور معیار مقرر ہو چکے ہیں۔ اب حق و باطل کی تفریق میں کوئی زحمت نہیں ہے اور عقل آسانی یہ سام کر سکتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ سکیت نے سکوت اختیار کر لیا اور ابن اکثم بول پڑا کہ مناظرہ ابن سکیت کے پس کا کام نہیں ہے۔ اب میں سوالات کروں گا چنانچہ سوالات کی ایک فہرست پیش کر دی۔ حضرت نے ابن سکیت کو جوابات لکھوانا شروع کر دیے۔

سوالات کا سلسلہ یہ تھا کہ ابن اکثم نے کہا اچھا یہ تو بتائیے کہ جناب سلیمان کے دربار میں ”الذی عندہ علم من الکتاب“ کون تھا؟ آپ نے فرمایا کہ

آصف بن برخیا۔ اس نے کہا کہ جب حضرت سلیمان کو معلوم تھا کہ یہ کام آصف کر سکتے ہیں اور تخت بلقیس کو وہی لاسکتے ہیں تو یہ کیوں کہا کہ تم میں کون ہے جو چشم زدن میں تخت بلقیس کو لے آئے اور کیا حضرت سلیمان کو خود وہ علم نہیں تھا جو آصف کے پاس تھا کہ ان سے مدد لی جا آپ نے فرمایا کہ یہ انداز اختیار نہ کیا ہوتا تو آصف کا کمال اور ان کی انفرادیت کا اندازہ نہ ہوتا اور ان کے وحی رسول ہونے کا اعلان نہ ہو سکتا۔ قدرت نے چاہا کہ دنیا پر واضح کر دے کہ نبی کا وحی ایسا با کمال ہوتا ہے۔

ابن اکثم نے کہا اچھا یہ تو فرمائیے کہ حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو سجدہ کیوں کیا تھا۔ کیا کسی باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو سجدہ کرے۔ اور کیا خدا کے علاوہ کوئی اور بھی قابل سجدہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یوسف کا سجدہ اسی طرح تھا جس طرح ملائکہ نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا کہ اصل سجدہ حکم خدا کا تھا۔ آدم کو صرف ذریعہ بنایا گیا تھا۔ جناب یعقوب نے بھی یوسف کے زندہ مل جانے پر سجدہ شکر کیا تھا۔ اور سجدہ شکر خدا کے لئے ہوتا ہے۔ بندے کے لئے نہیں۔

ابن اکثم سوال کرتے کرتے آخر اس منزل پر آیا کہ جس درخت سے جناب آدم کو روکا گیا تھا وہ کون سا درخت تھا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شجرہ خد تھا۔ اللہ اولاد آدم کو حسد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے آدم کو منع کیا تھا۔ (مناقب)

امام نے جواب کے ساتھ بے شمار مسائل حل فرمادیئے اور ابن اکثم یا سنوکل کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ آپ نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ جب تک صاحب منصب صاحب عبادہ نہ ہوگا۔ منصب ثابت نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ صاحب عبادہ کو

اپنے دور کے تمام افراد سے بالاتر ہونا چاہئے۔ جو دور کے کسی ایک آدمی سے کمتر ہو وہ صاحب منصب نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عقل کے ہوتے ہوئے حق و باطل میں امتیاز نہ کرنا انسانیت کے خلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی واضح کر دیا کہ اگر سلیمان کا وحی اتنا صاحب علم و کمال ہو سکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وحی کو کیسا ہونا چاہئے۔ اور گفتگو تمام کرنے کرتے یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ اولاد آدم کو حسد سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اولاد آدم نے اپنی آدمیت کھو دی اور بالآخر حسد میں مبتلا ہو گئی۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ تجھ جیسا جابل اور متوکل جیسا بدکردار بھی میرے مقابلہ میں آتا ہے اور آل محمد کے کمالات کو سلب کرنا چاہتا ہے۔ قدرت نے روز اولی اعلان کر دیا تھا کہ حسد کرنے والو! تمہیں جلا ہے تو خوب جلاؤ ہم نے آل ابراہیم کو کچا بھی دی ہے۔ اور حکمت بھی اور انہیں ملک عظیم بھی عنایت کر دیا ہے۔

ابن اکثم کا ذکر نہیں ہے۔ کبھی کبھی حکومت وقت کو بھی شوق ہوا ہے کہ امامت کا امتحان لے اور امتحان کیا بھی ہے۔ لیکن نتیجہ میں ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوا اور قدرت نے ثابت کر دیا کہ جسے ہم عزت دینا چاہتے ہیں اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تم مسائل دریافت کرو تا کہ ہمارے غائبانہ کمالات سامنے آئیں اور ہم تمہیں ایسے مشکلات میں گرفتار کریں کہ تم مسائل دریافت کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ پناہ بخیر تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ متوکل کو زہر دیا گیا۔ اور وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے نذر کی کہ اگر میں صحتیاب ہو گیا تو راہ خدا میں مالی کثیر خیرات کروں گا۔ اتفاق سے اس کی موت مختار نہیں تھی اور وہ بچ گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ مال کثیر سے مراد کیا ہے۔ علماء کو جمع کیا گیا۔ مسئلہ دریافت کیا گیا۔ ہر ایک

نے اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرنا شروع کر دی۔ کسی کے یہاں ہزار کثیر ہے۔ کسی کے یہاں لاکھ کثیر ہے۔ کسی کے یہاں پورا خزانہ کثیر ہے۔ کوئی اپنی حیثیت کے مطابق سوچ رہا ہے۔ کوئی متوکل کے حیثیت کے مطابق غور کر رہا ہے مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ سب پریشان ہیں۔ بالآخر متوکل نے امام علی نقیؑ سے دریافت کرایا۔ آپ نے فرمایا کہ ۸۰ درہم راہِ خدا میں خرچ کر دے۔ متوکل نے پوچھا کہ دلیل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے قرآن مجید میں کثیر مقامات پر بغیر مکلفیت کا تذکرہ کیا ہے اور وہ کثیر مقامات ۸۰ مقابلے تھے جہاں پروردگار نے اپنے حبیب کی نصرت کی ہے۔ لہذا قرآن کربان میں کثیر کا اطلاق نہ پرہزتا ہے۔ (منائب) متوکل بھڑک اٹھا اور علماء مبرک اٹھے کہ انہوں نے مسئلہ کو حل کر دیا اور ہم حل نہ کر سکے۔ میں کہوں گا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تاریخ کا پرانا دستور رہا ہے کہ جب اربابِ دولت مسئلہ کو حل نہ کر سکے تو کسی علیٰ ہی نے مسئلہ کو حل کیا۔ مشکل کشا علی کا نام ہے امت کا نہیں۔

دوسری منزل پر ایسا ہی واقعہ پھر پیش آیا کہ ایک عیسائی مرد نے ایک مسلمان عورت سے زنا کیا اور جب گرفتار کر کے عدجاری کرنے کے لئے لایا گیا تو فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ متوکل حیران ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ عیسیٰ بن اکثم نے فتویٰ دے دیا کہ اسلام کے بعد عدجاری نہیں ہو سکتی۔ متوکل نے امام علی نقیؑ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ عدجاری کر دی جائے۔ علماء نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواز کی دلیل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پروردگار عالم نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ جب مشرکین نے ہمارے مذہب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور ہم مشرک نہیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا ان کے حق میں عیند نہیں ہوا اور عذاب کے آنے کے بعد تو بے کار ہے۔ جب حد کا فیصلہ ہو چکا تو

اسلام لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگ مہیوت ہو گئے اور امام کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ (منائب)

تاریخ میں ایک دو مواقع نہیں ہیں۔ بیشمار مواقع ہیں جہاں امامت کے علم و کمال نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اہل دنیا اور ہوتے ہیں اور اہل اللہ اور — دنیا والے جہالت کے تحت و تاج پر قبضہ کرتے ہیں اور اللہ والے تخت و تاج کو ٹٹو کر اگر علم و کمال کو اپنی میراث بناتے ہیں۔

آخری منزل پر دو ایک اور واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔ واقعہ بالمشہور اپنے دور کے علماء کو جمع کیا اور ایک عجیب و غریب سوالیہ کیا۔ بتاؤ کہ جب حضرت آدمؑ نے پہلا جی کیا تھا تو ان کا سر کس نے مونڈا تھا۔ علماء حیران رہ گئے۔ ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ حضرت آدمؑ نے ج کیا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر کیا تھا تو سر منڈایا تھا یا نہیں۔ اور اگر منڈایا تھا تو دوسرے سے مدد لی تھی یا خود ہی منڈایا تھا۔ کون بتائے۔ سب تو آدمؑ کی اولاد ہیں۔

کے خبر کہ حضرت آدمؑ نے کیا کیا تھا۔ کوئی ہوتا تو بتاتا۔ اور ہوتا کیسے کیا مٹا باپ سے پہلے ہو سکتا تھا۔ لیکن جب فرزند رسولؐ امام علی نقیؑ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ جبریل امین نے جنت سے سامان لاکر بال کائے تھے اور علماء ششدر رہ گئے۔ (میں کہوں گا فرزند رسولؐ! آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔ آپ بھی تو اولاد آدمؑ ہیں۔ آپ نے کہاں سے دیکھ لیا کہ جبریل امین جنت سے سامان لے کر آ رہے ہیں اور حضرت آدمؑ کے بال کاٹ رہے ہیں؟ آپ فرمائیں گے تم نے غور نہیں کیا۔ مجھ میں اور باقی امت میں یہی فرق ہے کہ امت آدمؑ کے بعد پیدا ہوئی ہے اسے آدمؑ کے حالات کی اطلاع نہیں ہے اور میری خلقت آدمؑ سے ہزاروں سال پہلے ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آدمؑ پر کیا گذری۔ ہم نے عالم انوار

سے سارے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم شریک نور رسالت ہیں۔ ہیں حالات کی خبر نہ ہوگی تو کسے ہوگی؟  
کتنا فرق ہے ان لوگوں میں جو آدم سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوئے ہیں اور ان لوگوں میں  
جن سے آدم ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا اور کیا قیامت ہے کہ پہلے خلق ہونے والے عصمت  
ن داغیوں اور بعد پیدا ہونے والے گناہ ثابت کریں۔ کیسی سعادتمند یہ اولاد  
آدم ہے جو اس بات پر تکی ہوئی ہے کہ جنت میں آدم کا گناہ ثابت کر دیا جائے اور اپنے  
باپ آدم کو جنت سے نکلوا دیا جائے۔

میں کہوں گا۔ سنو! آدم کو جنت سے نکلوانے سے پہلے یہ سوچ لو کہ جب جنت  
میں رہنے والے آدم ہی جنت میں نہ رہ سکے تو تم باہر وہ کس طرح جاؤ گے۔ کیا  
تمہارا کردار آدم سے کچھ زیادہ پاکیزہ ہے اور کیا تم بھی کوئی خلیفہ اللہ ہو اور اگر  
نہیں ہو تو سوچو کہ جب باپ ہی کا قبضہ نہ رہ سکا تو بیٹے کا قبضہ کہاں سے آجائے گا۔  
اور ہم سے یہ تقاضا نہ کرنا اس لئے کہ ہم آدم کے رشتے سے جنت میں جانے والے  
نہیں ہیں۔ ہمارا رشتہ معنوی ہے۔ اسی رشتہ پر ناز کر کے کیا کریں جس پر سکونت  
سے زیادہ کوئی حق نہیں مل سکتا۔ کیوں نہ وہ رشتہ قائم کریں جہاں جنت کا سارا  
اختیار دیدیا جاتا ہے۔ اور راہ خدا میں روٹیاں دیکر جنت خرید لی جاتی ہے۔ یا نڈلوں  
کو دوسروں کو بے جاے کا حق نہیں ہوتا۔ خریدار کو مال کا پورا اختیار ہوتا ہے۔  
شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے اہلبیتؑ اور جنت کا رشتہ بیان کیا تو بالکل جدا گانہ  
انداز سے بیان کیا۔ علیؑ کو دیکھا تو قسم جنت دنا رکھ دیا۔ زہراؑ کو دیکھا تو خاتون جنت کہلا  
خیزادوں کو دیکھا تو "یدر شباب اہل الجنۃ" کہہ دیا۔ غرض پوری جنت پر انھیں  
کا قبضہ ہے۔ اب جے جنت میں جانا ہو وہ ان کی دیوڑھی پر آئے۔ ان سے الگ  
ہو گیا تو جنت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اور غیر کا کیا ذکر ہے خود آدم بھی دوبارہ  
نہ جا سکے اگر انھیں کو وسیلہ نہ بناتے۔ اب کتنی بد بخت ہے وہ اولاد آدم جو باپ کے

جادو سے منحرف ہو جائے اور وسیلہ ہی کا انکار کر دے۔ کاش اس دنیا کو اتنا  
ہوش آجائے تاکہ جب بغیر وسیلہ کے آدم جنت میں نہ جانے کے تو تم کیا جاؤ گے۔  
اب ایک بات ضرور ہے کہ جہنم کے لئے وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے  
لئے اپنے اعمال ہی کافی ہیں۔ اب ٹھن ہے کہ بعض افراد نے اسی لئے وسیلہ کا انکار  
کیا ہو کہ ہم وہاں جائیں گے جہاں دوسرے کا احسان ہی نہ لینا پڑے۔ بیسی  
جہنم میں جانا گوارا ہے اہلبیتؑ کا واسطہ دینا گوارا نہیں ہے۔

اور کہئے تو اس مقام پر ایک اور بات عرض کروں کہ جب ساری امت  
علیؑ اور اولاد علیؑ کے وسیلہ سے جنت میں جائے گی تو میں اس کے اختیار و  
اقتدار کے بارے میں کیا کروں جو خود علیؑ کے وجود کا ظاہری وسیلہ ہے۔  
میرا دل تو کہتا ہے کہ ابوطالبؑ کو یہ ناز کرنے کا حق ہے کہ ساری دنیا کے لئے  
وسیلہ علیؑ ہے اور علیؑ کے وجود کے لئے وسیلہ میں ہوں۔

اب امت کو اختیار ہے چاہے مجھے مسلمان کہے یا کافر۔ جنتی ہے یا جہنمی  
لیکن یہ سوچ لے کہ اگر میں جنت میں نہ گیا تو پھر کسی کے جانے کا امکان نہیں ہے  
جو میرا اپنے باپ کو جنت میں نہ لے جائے وہ کسی اور کو کیا لے جائے گا۔ دنیا  
والو! آدم سے رشتہ پہلے توڑ لیا ہے اب علیؑ سے بھی رشتہ توڑ لو پھر دیکھو جنت  
میں کس طرح جانا ہوتا ہے اور جنت کو چھوڑ کر کہا جانا ہوتا ہے۔

امام علیؑ فقیہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے  
کہ جب امت نے یہ دیکھا کہ جنت کو علیؑ کے قبضہ میں ہے۔ اور آخرت پر  
انھیں کا اختیار ہے تو مولائے کائنات سے صلہ رشتے جوڑنے لگے۔ یہ دنیا کا قدیم  
مزان ہے کہ جب کوئی فائدہ نظر آتا ہے تو فوراً رشتہ شروع ہو جاتے ہیں۔  
اور سیاسی دنیا میں یہ بار بار آپ دیکھ چکے ہیں کبھی نئی سے رشتہ جوڑا گیا۔ کبھی

امام سے رشتہ جوڑا گیا اور جب غرض کل گئی تو انجام بھی سامنے آگیا۔ انھیں مصنوعی رشتوں کا زور اس حد تک بڑھا کہ ایک عورت نے زینب بنت علیؑ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اب اس سے بڑا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ مستحکم وسیلہ نجات کیا ہو سکتا ہے۔ لوگ برابر سمجھا رہے ہیں۔ لیکن وہ ماتے کے لئے تیار نہیں ہے اور اپنے کو زینب بنت علیؑ سمجھ رہی ہے۔ متوکل نے عاجز اگر امام علیؑ نقیؑ کو بلایا اور کہا کہ یہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔ اے آپ ہی حل کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ نے ہی ختم کا گوشت جانوروں پر حرام قرار دیا ہے۔ اے درندوں کے درمیان والے اگر اپنے دعویٰ میں سچی ہوگی تو زندہ بچ جائے گی ورنہ مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ عورت نے یہ فیصلہ سنا تو فوراً توبہ کر لی کہ میں نے غلط دعویٰ کیا تھا اور میں بنی ہاشم میں نہیں ہوں۔

امام عالی مقام نے مقدمہ کا فیصلہ کر دیا اور بنی ہاشم کے شرف کا سبھی اعلان کر دیا۔ گویا آواز دے رہے تھے کہ متوکل تیری اور میری خلقت میں فرق ہے تیرے اور میرے وجود میں فرق ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ توجہ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ مالک کائنات نے میرے گوشت اور پوست کو درندوں پر حرام کیا ہے۔ تیرے گوشت و پوست کو حرام نہیں کیا ہے۔ یہاں ہمارے جسم جانوروں پر حرام ہیں۔ وہاں آتش و دوزخ پر حرام ہیں۔ تیرا نہ یہاں کوئی بچانے والا ہے نہ وہاں کوئی ٹھکانا ہے۔

اور اے متوکل یاد رکھ غلط دعویٰ کو غلط ثابت کرنے والے بھی نہیں ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں تو ایک لمحہ میں ساری حقیقت کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہمارا کرم ہے کہ ہم دشمن کی بھی عزت بچا لیتے ہیں ورنہ ایک لمحہ میں ساری حقیقت کھل

جائے۔ یہ سب کچھ ہو گیا۔ لیکن حاسدوں سے یہ کمال بھی نہ دیکھا جاسکا اور کمانے بڑھ کر کہا امیر یہ بہترین موقع ہے علیؑ کو ختم کر دینے کا۔ یہ خود بھی تو اپنے کو بنی ہاشم میں کہتے ہیں۔ انھیں کو جانوروں کے درمیان بھیج دے۔ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ متوکل نے کہا بات تو مناسب ہے۔ اور کہنے لگا فرزند کرل آپ بھی تو بنی ہاشم میں ہیں۔ ذرا ان جانوروں کے درمیان چلے جائے تاکہ لوگوں کو آپ کے فیصلہ کا یقین آجائے۔ آپ نے فرمایا۔ بیشک۔ یہ کہہ کر درندوں کی طرف بڑھے۔ متوکل اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر سے منظر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی آپ جانوروں کے درمیان پہنچے کیا دیکھا کہ ایک ایک جانور اگر سر قدموں پر رکھ دیتا ہے اور حضرت سر پر دست شفقت پھیر رہے ہیں۔ (مناقب) متوکل یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ اور سارے ارکان دولت کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ یہ کیا انقلاب آگیا۔ یہ جانور کس طرح اطاعت کر رہے ہیں۔ اور جانور آواز دے رہے ہیں کہ انسانو! ہم سے درس معرفت لو۔ ہم جانور ہو کر امام وقت کو پہچانتے ہیں اور تم انسان ہو کر نہیں پہچانتے۔ شرم کی بات ہے تمہارے پاس جانوروں جی عقل بھی نہیں ہے۔ کاش تم نے بھی اس کے قدموں میں سر جھکا دیا ہوتا۔ کاش تم بھی اس کی اطاعت قبول کر لیتے۔ اور یاد رکھو تم اے اذیت نہیں پہنچا سکتے یہ وارث موسیٰؑ ہے اے دریاؤں کو نہیں سکتا۔ یہ وارث ابراہیمؑ ہے اے آگ بلا نہیں سکتی۔ یہ وارث عیسیٰؑ ہے اے سول پر چڑھایا نہیں جاسکتا۔ یہ وارث محمدؐ ہے اس پر کوئی آباد و بیل نہیں سکتا۔ یہ وارث علیؑ ہے اے کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ یہ خلیفہ اللہ ہے اے کوئی فتنا نہیں کر سکتا۔ مٹانے والے مٹ جائیں گے اور خلیفہ اللہ زندہ اور قائم رہے گا۔

سلسلہ بیان تمام ہو رہا ہے تو ایک فقرہ اور سن لیجئے تاکہ امام کا ایک

کمال اور نظر عام پر آجائے۔ جلا کمالات کے بیان کے لئے ایک عمرو کا ہے۔ امام کے دور میں ایک شخص تعالیٰ نے فحاشی میں کاسم تھگینوں پر نام کندہ کرنا وہ حضرت کے عقیدہ مندوں میں تھا ایک مرتبہ ماکرم وقت ہوئے ایک نگینہ دیا اس پر ایک نقش کر دیا جائے۔ اتفاق سے نقش کرنے میں نگینہ ٹوٹ گیا۔ یونس نے طے کر لیا کہ اب زندگی کی خیر نہیں ہے۔ دو روز حضرت کی خدمت میں آیا اور عرض کی فرزند رسول! میری موت سن لیجئے۔ آپ نے فرمایا خیر تو ہے۔ اس نے کہا مجھے غلطی ہو گئی ہے اور اب میرا قتل ضروری ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے بچوں کے بارے میں کچھ وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا گھر لے کر کوئی بات نہیں ہے۔ کل جب طلب کیا جائے تو میرا نام بتا دینا۔ اس نے عرض کی مولا حاکم بہت جلد ہے۔ آپ نے فرمایا تو میرا نام بتا دینا۔ امام حاکم تھا خاموش ہو گیا۔ لیکن دل دھڑکتا رہا۔ دیکھئے اب کیا خیر ہوتا ہے کیسے قتل کیا جاتا ہوں کیسے سولی پر چڑھا یا جاتا ہوں کیا انجام ہوتا ہے کہ پانچ حکم کا مانندہ آگیا یونس نے دیکھا اور دم نہ ٹھک گیا۔ دو روز حضرت کے پاس آیا۔ حضور ﷺ نے والا آگیا ہے۔ فرمایا کوئی بات نہیں ہے دربار تک چلے جاؤ۔ امام حاکم تھا خاموش واپس چلا گیا اور دربار میں حاضر ہو گیا حاکم نے دیکھتے ہی کہا کہ اگر تم نے اب تک نقش نہ کیا ہو تو نہ کرنا۔ میرے بچوں میں اختلاف ہو گیا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ سے دو حصے کر کے دونوں کے نام نقش کروادوں۔ یہ سنا تھا کہ یونس کا دل بیوں اچھلنے لگا۔ دار سے میرے امام۔ تیرے قرآن۔ کیا سکون و اطمینان کا نسخہ بتا رہا ہے۔ فوراً عرض کیا میں آپ کو جانے لگا۔ لیکن ہیئتہ دونوں نقش آپ کو مل جائیں گے۔ یہ کہہ کر دربار سے واپس آئے۔ اور شکر و حمد کا بجلائے (مفتی الکمال) دل نہ آواز دی امام امام ہوتا ہے اور حاکم حاکم ہوتا ہے۔ حکومت لاکھ فرد غصیب کا مظاہرہ کرے اگر امامت بچانا چاہے تو کوئی دھوکہ نہیں سکسا اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ تو دنیا کا دربار ہے جو رب العالمین کے دربار میں عذاب آخرت سے بچا سکتا ہے اس کی نظر میں عذاب شاہی کی کیا قیمت ہے۔ قرآن جائیے اس امام پر جو شدت مصائب میں بھی چاہنے والوں پر نگاہ رکھتا ہے اور ان کو بچانے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہاں مصائب دنیا سے بچا تا ہے وہاں ہول شر اور عذاب جہنم سے بچائے گا۔ صلوات



## امام حسن عسکری علیہ السلام

|             |                                       |
|-------------|---------------------------------------|
| اسم مبارک   | حسن                                   |
| لقب         | عسکری۔ زکی                            |
| کنیت        | ابو محمد                              |
| والد ماجد   | امام علی نقیؑ                         |
| والدہ ماجدہ | جناب سوسن                             |
| ولادت       | ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ مجمعہ مدینہ منورہ |
| شہادت       | ۸ ربیع الاول ۳۲۰ھ                     |
| عمر مبارک   | ۲۸ سال                                |
| قبر مطہر    | سامرہ                                 |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين  
خاتمة النبيين سيدنا و مولانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين  
دفعه الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله الحكيم في  
كتابه الكريم -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَ اِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَ الْاُولٰى

الْك اَمْرًا ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ اَنْتَ بِالْحَقِّ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ اَنْتَ بِالْحَقِّ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ اَنْتَ بِالْحَقِّ ۚ

ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔  
ہمارے اختیارات کے جوتے ہوئے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ہدایت کا  
کوئی انتظام کرے۔ ہم نے اپنے نظام میں اور کوئی نقص و عیب نہیں  
چھوڑا اور جب ہمارے نظام میں کوئی نقص نہیں ہے تو بندوں کو کیا حق پہنچتا  
ہے کہ وہ اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی ناقص نظام کا بندوبست کریں اور  
اور نظام ہدایت ایسے افراد کے ہاتھوں میں دیدیں جو خود ہی گمراہ ہوں اور دین  
و مذہب کو تباہ و برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ دنیا والوں نے جب بھی ہادی اور راہنما بنایا تو  
اس سے فساد کے علاوہ کوئی خیر دیکھنے میں نہیں آیا ظاہری طور سے چند روزہ  
رونتی ضرور دکھائی دی لیکن اندرونی طور پر مذہب اتنا کھوکھلا ہو گیا کہ  
اس میں خواہشات نفس کے علاوہ کچھ نہ رہ گیا۔ انتہا یہ ہے کہ بندگی بھی  
خواہشات نفس کی ممنون کرم ہو گئی اور کسی نے شوق بندگی میں صبح کی  
چار رکعت نماز پڑھا دی۔ کسی نے جوش عبادت میں بدھ ہی کے دن جمعہ  
کی نماز پڑھا دی۔ کسی نے رات رات بھر کے لئے مستقل نماز ایجا و کردی

کسی نے نئے قسم کا روزہ نکال دیا۔ کسی نے جدید انداز کاج ایجا و کر دیا اور  
اس میں سے طواف فساد فاب کر دیا۔ غرض جسے جتنا موقع ملا اس نے مذہب  
کے نام پر اتنا ہی مذہب کو تباہ کیا۔ اور بندگی کے بھر دوسرے پر نظام بندگی کو  
اتنا ہی غارت کیا۔

علمائے اسلام کے جو صلے اس قدر بلند ہو گئے کہ فتوؤں میں ایک نیا رخ  
پیدا ہو گیا۔ "یہ رسول اللہ نے کہا ہے اور یہ میں کہہ رہا ہوں"۔ یہ رسول اللہ کی  
سنت دسیرت ہے اور یہ میرا فرمان و ارشاد ہے۔ "یہ قرآن مجید کا بیان ہے  
اور یہ میری مصلحت ہے"۔ یہ رب العالمین کا حکم ہے اور یہ میرا خیال ہے۔  
خیال و وہم و جنوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا کہ سارا دین نیا دین بن گیا  
اور سارا اسلام بدلت طرازیوں کی نذر ہو گیا۔ اور جب روٹی توڑنے والے  
علماء کا یہ حال تھا تو صاحبان دربار و بارگاہ سلاطین کا کیا عالم ہو سکا۔ ان  
اتو ہر عمل دین و مذہب بنے گا۔ اور ان کے تو ہر اشارے پر دین و دامن  
میں نئی نئی تبدیلیاں ہوں گی۔

آپ اسلام کی تاریخ پر مہیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ خدائی نظام  
کے مقابلہ میں اپنا نظام چلانے والوں نے دین خدا کو کس کس طرح  
تباہ و برباد کیا ہے۔ اور علماء و سلاطین نے مل کر آئین مذہب کو کس کس  
طرح غارت کیا ہے۔ کوئی حرام حرام نہ رہ گیا۔ اور کوئی حلال حلال نہ رہ  
گیا۔ کسی نے شراب کو حلال کہا۔ کسی نے سود کو جائز کیا۔ کسی نے سوتیلی ماں  
سے نکاح کو مباح کیا۔ کسی نے اپنی بیٹی کی عفت پر ہاتھ صاف کیا۔ کسی نے  
جوسے کی حلیت کی فتویٰ دیا۔ کسی نے بندہ نچانے کو عبادت بنایا۔ کسی نے  
توہیں علماء کو شعاع بنایا اور مشرک طوط پر سب نے اللہ والوں کے متانے

کو عظیم عبادت کا درجہ دیدیا۔ بادشاہ وقت اور قاضی دربار ہر فریقہ سے غافل ہو سکتا ہے لیکن اس فریقہ سے غافل نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے بھی طے کر لیا کہ تم ستائے جاؤ ہم بناتے جائیں گے۔ اور ایک دن آئے گا جب تم بھی اس کی جو کھٹ پر سجدہ کرتے ہوئے نظر آؤ گے۔ ہم نے اپنے نمائندوں کو تخت و تاج نہیں دیا لیکن وہ جو ہر علم و صداقت دیا ہے کہ جب مذہب پر کوئی وقت پڑے گا اور اقتدار کی چوئیں ملتی ہوئی نظر آئیں گی تو تم کی کی جو کھٹ پر سجدہ کرتے ہوئے دکھائی دو گے۔ تاریخ میں ایک دو واقعات نہیں ہیں۔ بیشتر واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین و بانی مذہب کے نام پر اپنا نظا قائم تو کر لیا لیکن جب کوئی مشکل آن بڑی تو سوائے اللہ والوں کی جو کھٹ پر ہمیں سائی کے کچھ بن نہ پڑی۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو بھلا دے گی کہ اسحاق کندی نے اسی اسلامی ذوق کا سہارا لے کر انصاف قرآن کے نئے نئے معانی تراش کر ایک پوری کتاب تیار کر دی اور اس کا موضوع یہ قرار دیا کہ قرآن مجید کے بیانات میں بے حد تضاد ہے۔ وہ ایک مقام پر کچھ کہتا ہے اور دوسرے مقام پر کچھ کہتا ہے۔ کہیں دو مقامات پر بیانات میں اتحاد اور یک رنگی نہیں ہے اور ہوا بھی نہیں چاہئے۔ جب ۲۰ برس میں مسلسل نازل ہوا ہے تو کسے یاد رہتا ہے کہ ۲۳ برس پہلے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں۔ جو جس وقت سمجھ میں آیا بیان کر دیا۔ اور جس آیت کی جس وقت مصلحت دکھائی دی نازل کر دی۔ کون دیکھتا ہے کہ صحیح سیماء غلط کیا ہے۔ سب تو ماننے والے اور ایمان لانے والے ہیں۔ انہیں کہاں ہوش ہے کہ صحیح اور غلط پر نگاہ کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے۔

جس قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلاف کثیر ہوتا۔ اسی قرآن میں اختلاف نکال لیا گیا اور حکومت وقت تماشا دیکھتی رہی۔ علماء حیران رہے۔ عوام گمراہ ہوتے رہے۔ عزت قرآن خطرہ میں پڑی ہے۔ آبروئے اسلام باقی رہی۔ صداقت الہی پر حرف آتا رہا۔ لیکن حکومت تماشائی بنی رہی کہ وہ بھی تو کیا کرے۔ کس کے پاس اتنا علم ہے کہ اسحاق کا جواب دے سکے اور کس میں اتنا حوصلہ ہے کہ اس کے مقابلے میں آسکے۔ اب وہ دور بھی نہیں رہا جب تازیانوں سے لوگ چپ کر دیئے جاتے تھے۔ اب بھی یہ کام ہوتا اگر اسحاق فضائل اہلبیت میں کوئی آیت یا حدیث بیان کرتا۔ لیکن اس نے تو غفلت قرآن پر حملہ کیا ہے۔ اسے سزا دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ولید قرآن کو پارہ پارہ کر کے اور اس پر شش تیز لڑائی کر کے "غلیفۃ المسلمین" ہو سکتا ہے تو کسی دوسرے غلیفہ کو کیا غرض ہے کہ وہ عزت قرآن کا تحفظ کرے۔ یہ جسنا کتاب اللہ والے ہیں "إِنِّي نَارُكَ ذِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ" والے نہیں ہیں۔

بالآخر جب فرزند رسول امام حسن عسکریؑ نے دیکھا کہ اب اسلام کی آبرو مٹنا چاہتی ہے تو کندی کے ایک شاگرد سے فرمایا کہ تم اپنے اتاد کو اس حماقت سے کیوں نہیں روکتے۔ اس نے کہا فرزند رسول! وہ ہم سے کہیں زیادہ قابل و فاضل ہیں۔ ہم ان سے کیا منہ لگ سکتے ہیں اور ہماری کیا مجال ہے کہ ہم سے بحث کریں۔ کبھی کبھی یہ قابلیت بھی وبال جان بن جاتی ہے اور زیادہ قابل ہونے کا خیال بھی انسان کو گمراہ کر دیتا ہے اور سچ بھی ہے۔ زیادہ کھانے والا اگر معتمد نہ کر سکے تو کالا ہوا جاتا ہے۔ زیادہ کھالینا کوئی ہنر نہیں ہے اس کو ہم کر لینا ہنر ہے۔ اور دور حاضر میں معتمد کر لینا کوئی کام نہیں ہے۔ اصل کھانا

ہی قابلیت کی دلیل ہے۔

غیر۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا تم اس سے ایک سوال کر سکتے ہو۔ اس نے کہا بیشک یہ تو ہمارا کام ہی ہے۔ ہم برابر سوال کرتے رہتے ہیں اور وہ جواب دیتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب اس کتاب کا ذکر آئے تو اتنا پوچھ لینا کہ آپ نے آیات کے جو معنی نکال کر تضاد و اختلاف ثابت کیا ہے۔ وہ معنی آپ کے ذہن کی ایجاد ہیں یا خدا نے آپ سے بتائے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن کی ایجاد ہیں تو خدا کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میرے کلام کے معنی نکالنے کا حق آپ کو کہاں سے ملا ہے اور آپ کو کس نے مجاز کیا ہے کہ جس آیت کے جو معنی چاہا نکال میں اور اگر یہ معانی خدا نے بتائے ہیں تو اس سے آپ سے کب ملاقات ہوئی ہے۔ آپ پر کون سا فرشتہ نازل ہوا ہے۔ جس نے آپ سے یہ معانی بیان کئے ہیں۔

شاگرد تیار ہو کر اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا استاد ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ یہ جو آپ نے قرآن حکیم میں تضاد ثابت کیا ہے وہ آپ کے اپنے نکالے ہوئے معانی میں ہے۔ تو اس کی ذمہ داری خدا پر کیا ہے۔ اور اگر خدا کے بیان کئے ہوئے معانی میں ہے تو اس نے آپ سے کب بیان کیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کندی کے ہوش اڑ گئے۔ کہا یہ بتاؤ کہ یہ خیال تمہارے ذہن میں کہاں سے آیا۔ شاگرد نے کہا کہ سوچتے سوچتے ایک بات ذہن میں آگئی۔ سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں۔ اس نے کہا نا ممکن ہے۔ جو بات تمہارے استاد کے ذہن میں نہیں آئی وہ تمہارے ذہن میں کہاں سے آ سکتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ بات کس نے سکھائی ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ سے حضرت حسن عسکریؑ نے بیان کیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کندی اچیل بڑا کہنے لگا بیشک مسائل الہیہ بولی

کے علاوہ کوئی نہیں بیان کر سکتا۔

کندی نے اوراقِ جلا دیئے۔ کتاب فنا ہو گئی۔ عزتِ قرآن رہ گئی صدقات الہی پر حرف نہیں آ سکا۔ لیکن ضمناً امام حسن عسکریؑ نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا کہ قرآن کے دو طرح کے معانی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ معانی ہیں جو لوگ الفاظ سے نکال لیا کرتے ہیں اور ایک وہ معانی ہیں جنہیں خدا نے بیان کرنا چاہا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اپنے معانی بیان کرنے کا حق ہے۔ خدا کے معانی بیان کرنے کا حق نہیں ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔ انسان کا کلام نہیں ہے۔ ایسا حالت میں کسی شخص کو اس وقت تک قرآن کے بارے میں بولنے کا حق نہیں ہے جب تک خدا کے معانی و مطالب نہ بتائے اور ایسا امت اسلامیہ میں کوئی نہیں ہے۔ لہذا اگر قرآن کے واقعی معانی و مطالب بیان ہیں تو اس دروازہ پر آنا پڑے گا جہاں حقائق کا خزانہ ہے۔ مطالب کا مرکز ہے عقائد کا مصدر ہے۔ اقدار کا منبع ہے اور جہاں کا بچہ بچہ آواز دے رہا ہے آؤ ہم مراد خدا بیان کریں گے۔ ہم وہ ہیں جن کے سینوں میں آیاتِ بینات کو ذخیرہ کیا گیا ہے۔ ہم وہ ہیں جنہیں پیغمبر اسلامؐ نے ہر قرآن بنا کر چھوڑا ہے ہم وہ ہیں جن کے گھر میں قرآن نازل ہوا ہے ہم وہ ہیں جن کی چوکھٹ پر جبریلؑ نے درباری کھسے۔ قرآن ہمارے پاس ہے گا۔ حسبِ اتفاق اللہ والوں کے پاس نہیں ہے گا۔

عزیزانِ گرامی! آپ نے محسوس کیا کہ علماء اسلام اتنی سائنس کی بات کیوں نہ بتا سکے۔ اور دینِ خدا کی نمائندگی کے دعویدار اس بات کا جواب کیوں نہیں دے سکے؛ بات یہ ہے کہ وہاں یہ امتیاز ہی نہیں ہے کہ خدائی مفہوم کیا ہے اور امت کے معانی کیا ہیں۔ جواب ممکن ہوتا اگر امت کو احساس ہوتا اور

الہی معایم کو امت کے معانی سے الگ کیا جاتا لیکن وہاں اس امر کی گنجائش کہاں۔  
 اس امر کی گنجائش ہوتی تو روز اول مولائے کائنات کا قرآن واپس کیوں کر دیا جاتا  
 کیا علیؑ الگ سے کوئی قرآن بنا کر لائے تھے۔ کیا اس کی آیتیں یہ آیتیں نہیں  
 تھیں۔ کیا اس کے سورے یہ سورے نہیں تھے۔ کیا اس کے بیانات یہ بیانات  
 نہیں تھے۔ کیا معاذ اللہ وہ ان کا کوئی خانہ ساز کلام تھا۔ نہیں۔ کچھ نہیں  
 تھا۔ فقط قرآن تھا اور یہی قرآن تھا۔ یہی سورے تھے یہی آیتیں تھیں  
 فرق صرف یہ تھا کہ علیؑ نے نسخ و منسوخ، مام و خاس، حکم و مشابہ، تفسیر و ادیل  
 سب مقرر کر دیا تھا۔ اور حکومت کو یہی خطرہ تھا کہ اگر ان کا قرآن سے یا گیا تو اپنی  
 تفسیر کا راستہ بند ہو جائے گا۔ اور ہمیں اپنی تفسیر کے بھرے ہی زندگی چلانا ہے  
 بہتر یہ ہے کہ روز اول ہی اس سلسلہ کو روک دیا جائے۔ اور قیامت تک کے  
 لئے اِحت حاصل کر لی جائے۔ مولائے کائنات نے بھی قرآن کو یہ نہ کہ واپس  
 لے لیا کہ پیغمبرؐ نے مجھے تقیین کی فرمایا ہے۔ یہی ذمہ داری ہے کہ میں قرآن  
 کے معانی سمجھا دوں۔ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اب اگر تمہیں گمراہی ہو جائے  
 ہے اور امت کو تباہی کرنا ہے تو مجھے کوئی جھگڑا ابھی نہیں کرنا ہے۔ میری خانو کا  
 سے کم سے کم اتنا فائدہ تو ہو گا کہ الفاظ قرآن تمہارے پاس رہ جائیں گے۔  
 ورنہ تمہارا کیا میر دسہ تم الفاظ بھی بدل ڈالو اور ان میں بھی ترمیم کر دو  
 یاد رکھو اگر یہ الفاظ بھی تمہارے پاس رہ گئے تو میرا کام چلتا رہے گا۔ بلکہ بہتر  
 طور پر چلے گا۔ کل میرے فضائل بیان ہوتے تو تم کہہ دیتے کہ علیؑ کا قرآن تھا  
 علیؑ کے فضائل آگئے۔ اب تو یہ کہے گا موت نہیں ہے۔ اب تو قرآن  
 تمہارا ہو گیا۔ تمہارے نام کا مصنف ہے۔ تمہارے گھر کی کتاب ہے تمہارا  
 اپنا بوجہ مال ہے۔ لیکن اب میری حکومت دیکھو کہ تمہارا لیکن آیت تفسیر

میری ہی ہے۔ آیت مباہلہ میری ہی ہے۔ سورہ دہر میرا ہی ہے۔ آیت ولایت میری ہی ہے۔  
 آیت بدت میری ہی ہے اور یاد رکھو کہ تم نے مجھے جو تھا مانا ہے تو ایک چوتھا ہی قرآن  
 میرے ہی فضائل میں ہے اور نہیں جو تھا میرے دشمنوں کے نقائص و عیوب کے بلیاں ہے  
 ارباب نظر! یہ ہیں وہ صاحبان علم و کمال جنہیں اللہ نے اپنی طرف سے ہادی و  
 رہنما بنایا ہے۔ اور ان کے علم و کمال کی ذمہ داری بھی خود ہی لی ہے۔ ان کے کمالات  
 میں کوئی نقص نکل آئے تو اس کی ذمہ داری ان پر نہ ہوگی بلکہ اس مالک پر ہوگی  
 جس نے انہیں عالم انسانیت کے لئے ہادی اور رہنما بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ  
 ان کی ہر فضیلت کامل اور ان کا ہر کمال مکمل ہوتا ہے۔ یہی امام حسن عسکریؑ بن  
 کا ذکر کر رہا تھا اگر آپ ان کے کمالات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ  
 ہو گا کہ اس دور کا کیا ذکر ہے کسی دور میں ایسا صاحب علم و کمال نہیں پیدا ہوا۔  
 دین کے مسائل ہوں یا قرآن کے آیات۔ اس شان سے حل کیا ہے کہ اول و آخر میں  
 کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوتا۔ جو انداز کل پہلے محمدؐ کا تھا وہی انداز آج اس  
 محمدؐ کا بھی ہے۔ قوم کی مشکل کشائی، دین کی رہبری، اسلام کی حفاظت، قرآن  
 کی تفسیر اور اس پر شدت مصائب، ۱۰ ربیع الثانی ۳۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں  
 پیدا ہوئے۔ باپ امام علی نقیؑ اور مادر گرامی جناب سوسن جیسی پاک بیروت اور  
 پاک طینت خاتون۔ چھ برس وطن میں رہے۔ اس کے بعد پیدر پیدر گوار کے ہمراہ  
 سامرہ آگئے۔ سامری زندگی سامرہ میں گذر گئی۔ سامرہ کا آنا بھی اپنے اختیار میں  
 نہیں تھا۔ اس کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت  
 مدینہ منورہ میں اور متوکل عباسی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ متوکل سے جس قدر  
 مصائب کی توقع کی جاسکتی ہے اسے ذہن میں رکھنے کے بعد سوچیں کہ امام کا  
 آغاز حیات ہی کس قدر مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔

متوکل کی فکر تو یہ تھی کہ حضرت زندہ ہی نہ رہے پائیں۔ لیکن بے خدا زندہ رکھنا چاہیے اسے کوئی فتنہ انہیں کر سکتا اور بے وہ عزت دینا چاہیے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تفصیلی حالات کا محل نہیں ہے۔ صرف علم قرآن و تفسیر اور عمل مشکلات کے بارے میں چند واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اللہ دالے شدت مصائب میں بھی اپنے فریضہ کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔ متوکل اور متوکل کے بعد جتنے عباسی سلاطین گزرے ہیں سب کو امام حسن عسکریؑ نے خصوصی عداوت تھی اور کسی نے آپ کو اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آپ کے ساتھ ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ پیغمبر اسلام کے گیارہویں وارث تھے۔ اور ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ بارہوان وارث آپ ہی کے مصلب سے پیدا ہونے والا ہے۔ لہذا ہر شخص کو فکر تھی کہ کسی طرح آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ وہ آخری وارث عالم وجود میں نہ آئے۔ یہ فکر کیوں تھی۔ اس کا اندازہ تاریخ کے واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔

فرعون کو ساری فکر تھی کہ موسیٰ دنیا میں نہ آنے پائیں اور کسی طرح وجود سے پہلے ہی فنا ہو جائیں۔ ستر ہزار بچے قتل کر دیے گئے۔ یہ ماؤں پر ہرے بھادیے گئے۔ بچے حکم باد میں قتل کر دیے گئے کہ موسیٰ دنیا میں نہ آنے پائیں۔ لیکن جب قدرت نے چاہا تو نہ فقط یہ کہ دنیا میں آئے بلکہ قصر فرعون میں آئے اور وہیں رہے۔ وہیں پئے۔ وہیں بڑھے تاکہ دنیا پہچان لے کہ جب ہم پہچانا چاہتے ہیں تو کوئی فرعون بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

موسیٰ سے اتنی شدید عداوت کیوں تھی۔ وہ تو عالم وجود میں بھی نہیں آئے تھے انہوں نے تو کسی کا کچھ بگاڑا بھی نہیں تھا پھر اتنی شدید دشمنی کیوں؟ بات یہ ہے کہ فرعون کو معلوم ہو گیا تھا کہ تیری حکومت میں ایک بچہ

پیدا ہونے والا ہے جو تیرے تخت و تاج کو تباہ و برباد کر دے گا۔ فرعون کو اس خبر نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا تھا کہ راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی اور اسے صرف یہی فکر تھی کہ مملکت میں کوئی بچہ پیدا نہ ہونے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وہی بچہ نکل آئے جو تخت و تاج کو تباہ کرے والا ہے۔ فرعون پر کوئی دھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ کسی فرشتے نے اس سے یہ نہیں کہا تھا۔ صرف ایک سامن کی اطلاع تھی جس پر اس قدر پریشان تھا۔ تو سلاطین اسلام کے پاس تو پیغمبر اسلام کی خبر تھی کہ میرا برہمن وارث دینا سے ظلم و جور کو مٹا دے گا۔ اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ انہیں کیسے نیند آ سکتی تھی۔ انہیں تو ہر آن یہی فکر تھی کہ اگر وہ آئیں تو تخت و تاج کی خیر نہیں ہے۔ وہ آجیگا تو یہ ظالمانہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن قدرت کا انتظام تھا کہ اس نے امام حسن عسکریؑ کو محفوظ رکھا اور یہاں تک محفوظ رکھا کہ نبیؑ کا آخری وارث آجیگا اور اگر آواز دی کہ دنیا والو تاریخ کو تاریخ سے ملاؤ۔ فرعون نے موسیٰ کے لئے تباہی و بربادی کا مقدمہ بنایا تھا اور تم نے میرے لئے تباہی و بربادی کا انتظام کیا ہے۔ جدنے سچا اعلان کیا تھا کہ میں اپنے دور کا موسیٰ ہوں اور علیؑ اپنے وقت کے بارون۔ پھر میرے بزرگوں کا یہ اعلان بھی ہے کہ میرا اول بھی محمدؐ ہے اور آخر بھی محمدؐ ہے۔ اور ہمارے کل کے کل محمدؐ ہیں۔ اب تم نے پہچانا۔ ہم سب محمدؐ ہیں اور محمدؐ اپنے وقت کے موسیٰ تھے۔ یعنی میں اپنے دور کا موسیٰ ہوں اور تم اپنے دور کے فرعون ہو۔ اب تم اندازہ کر لو کہ تمہارا مذہب کیا ہے اور میرا مذہب کیا ہے۔

امام حسن عسکریؑ کے دینی خدمات میں بے شمار باتوں سے علاوہ خود ایک تفسیر بھی ہے جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفسیر

آپ کے دست مبارک کی تصنیف نہیں ہے۔ اے آپ کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے اور غیر معصوم کی ترتیب و تدوین میں غلطی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ لیکن اتفاقاً تو بہر حال معلوم ہے کہ آپ نے تفسیر کے بارے میں اتنے کچھ بیانات ارشاد فرمائے ہیں کہ ایک کتب مرتب ہو گئی۔ اب یہ کتاب وہی ہے یا دوسری۔ اس کی ساری روایتیں امام ہی کی ہیں یا اس میں کچھ کمی اور زیادتی بھی ہے۔ الگ ایک مسئلہ ہے۔ اس کے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے بقدر کتاب آیات قرآن کی تفسیر بیان فرمائی تھی۔ اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہر امام نے بے شمار آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔ اب یہ حالات کا فرق ہے کہ کسی کے نام سے مکمل تفسیر مرتب نہ ہو سکی اور امام مسکری کے نام سے کتاب مرتب ہو گئی۔ شاید اس کی ایک صحت یہ بھی رہی ہو کہ اب تک ائمہ کا سلسلہ جاری تھا۔ برابر بیانات سامنے آ رہے تھے۔ اس لئے ترتیب و تدوین کی اتنی شدید ضرورت محسوس نہیں کی گئی لیکن اب غیبت کا دور آنے والا تھا۔ اس لئے چاہئے والوں نے ایک کتاب مرتب کر لی تاکہ دنیا کو معلوم رہے کہ علیٰ منظر عام پر آئے تو تفسیر قرآن کا کام کیا اور حسن مسکری کا خانہ نشین رہے تو تفسیر قرآن ہی کا کام کرتے رہے۔

ایک شخص امام کی خدمت میں آکر عرض کرتا ہے کہ فرزند رسول! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے لڑکے کا دہرا حصہ رکھا ہے اور لڑکی کا اکہرا جبکہ لڑکی نصف نازک ہے اور نصف نازک کو زیادہ حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ طاقتور مرد کو دہرا حصہ دے دیا جائے اور کمزور عورت کو صرف ایک ہی حصہ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ انصاف تو نے میراث کی تقسیم کو دیکھا۔ دونوں کے حالات کو نہیں دیکھا۔ یاد رکھ اسلام نے حقوق کو فرائض سے الگ نہیں رکھا

اس کا نظام حقوق فرائض کے تحت چلتا ہے۔ وہ جب کسی کو حق دیتا ہے تو اس کے ذمہ فرض بھی رکھتا ہے اور جب کسی کے ذمہ فریضہ مانگتا ہے تو اسے حق بھی دیتا ہے۔ اسلام میں مردوں کے فرائض عورتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ مردوں پر جہاد واجب ہے عورتوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔ مردوں کیلئے نفقہ فراہم کرنا واجب ہے۔ عورتوں کے لئے کسب معاش واجب نہیں ہے۔ ہذا مردوں پر پورے ایک گھر کی ذمہ داری ہے عورتوں پر بالکل نہیں ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ جس کے فرائض زیادہ ہوں گے اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔

دوسری لفظوں میں یوں عرض کیا جائے کہ راوی نے دونوں کے حالات دیکھے ہیں۔ دونوں کا مستقبل نہیں دیکھا۔ مستقبل میں یہ لڑکی کسی کی زوجہ اور اس بننے والی ہے جس کی تمام تر ذمہ داری شوہر اور اولاد پر ہوگی۔ اور یہ لڑکا کسی کا شوہر اور باپ بننے والا ہے جس پر زوجہ کی بھائی ذمہ داری ہوگی۔ اور اولاد کی بھی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس پر دو مردوں کی ذمہ داری ہوگی اس کا خرچ زیادہ ہوگا۔ اور جس کی اپنی بھی ذمہ داری ہوگی اس کے مرد ہوگی اس کا بار کچھ نہ ہوگا اور اسلام بار دیکھ کر ہمدردی کرتا ہے۔ جسے زیادہ ذمہ داری ملتا ہے اسے زیادہ حقوق دیتا ہے اور جسے کم ذمہ دار بناتا ہے اسے کم حق بھی دیتا ہے۔

ایک شخص حضرت کو خط لکھتا ہے کہ جب آپ کا فرزند ظہور کرے گا تو کس طرح حکومت کرے گا اور نظام حکومت کیا ہوگا۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ اس کے دور میں علم امامت سے فیصلہ ہوگا اور شہادت دگواہی کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ دونوں کے حالات سے باخبر ہوگا اور اسی اطلاع پر فیصلہ بھی کرے گا۔ اور حسن بن عریف تم نے ایک مسئلہ فراموش کر دیا۔ تمہیں

یہ بھی پوچھنا چاہئے تھا کہ بخار کا علاج کیا ہے تو یاد رکھو کہ "یانا رکونی بزود" ا  
 دَسَلَامًا عَلٰی اَبْنِ اَهِیْم" کی آیت لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دو۔ بخار خود بخود  
 اتر جائیگا۔ حسن کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کے نسخہ پر عمل کیا۔ اور شفا ہوئی اور ایمان  
 پر بھی جلا ہو گئی کہ میں سوال لکھنا بھول گیا تھا لیکن حضرت نے جواب دے دیا۔

کیوں نہ ہو دنیا والے سوال کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اللہ والے بے  
 مانگے عطا کر دیا کرتے ہیں۔ سوال کا محتاج وہ ہوتا ہے جو مال دل سے باخبر نہیں  
 ہوتا اور جو دل کے رازوں سے باخبر ہوتا ہے اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

روایت سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا کہ حضرت امام عصرؑ اپنے ذاتی علم پر فیصلہ  
 کریں گے اور شہادت دگر اہی کی ضرورت نہ ہو گی۔ گویا امام اشارہ فرما رہے ہیں  
 کہ کل اسی نظام شہادت کا سہارا لے کر میری جگہ ماجدہ کے دعویٰ کو رد کر دیا گیا  
 تھا اور یہ بہانہ تراش لیا تھا کہ نظام شہادت مکمل نہیں ہے تو اب وارث زہراؑ آ رہے  
 ہیں۔ کل تم نے اپنے علم پر فیصلہ کیا تھا۔ آج وہ اپنے علم پر فیصلہ کرے گا۔ کل تم نے  
 باغ دینا سے محروم کر دیا تھا۔ آج وہ تمہیں باغ بہشت سے محروم کر دے گا۔

محمد عیاش کہتے ہیں کہ ایک دن کچھ لوگ بیٹھے ہوئے امام حسن عسکریؑ کے  
 فضائل بیان کر رہے تھے۔ محفل میں ایک دشمن اہلبیتؑ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا  
 کہ آپ لوگ اس قدر فضائل بیان کر رہے ہیں میں تو جب جانوں کہ میں ایک سادے  
 سا غز پر خالی قلم سے بغیر دشمنی کے مسئلہ لکھ دوں اور وہ جواب دیدیں۔ لوگوں نے  
 کہا ضرور۔ ابھی میاں اپنے دام میں آیا ہے۔ اس نے مسئلہ لکھ کر لغافین بند کر دیا اور  
 حضرت کے پاس بھیج دیا۔ اب جو جواب آیا تو مسئلہ کا اصل بھی لکھا ہوا تھا اور پوچھنے  
 والے کا نام مع ولایت بھی لکھا ہوا تھا۔ وہ شخص دم بخود رہ گیا اور فوراً اندر  
 حق قبول کر لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا سوال کیا تھا اور امامؑ نے کیا جواب دیا تھا۔  
 لیکن یہ یقین کہتا ہے کہ امامؑ نے ولایت صحیح لکھی تھی ورنہ ولایت میں فرق ہوتا  
 تو کبھی ایمان نہ لاتا۔ پیغمبر اسلامؐ نے حب اہلبیتؑ کی ایک یہ علامت بھی بتائی ہے۔  
 کہ اگر نسب سلامت نہ ہو تا تو کبھی راہ محبت پر نہ آتا۔ اور جہاں تھا وہیں رہ جاتا۔  
 یہ آجانا علامت ہے کہ غیر میں محبت کی گنجائش تھی اور حالات نے روک رکھا تھا۔  
 ابو حمزہ کہتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا اور آپ کے اس مختلف  
 ملکوں اور نسلوں کے غلام حاضر تھے۔ آپ سب سے انہیں کی زبان میں گفتگو کر رہے  
 تھے۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ مدینہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ کہیں باہر کا سفر بھی نہیں  
 کیا اور اس طرح بے تکان ہر شخص کی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ابو حمزہ  
 تعجب نہ کرو میں حجت خدا ہوں اور اللہ اپنی حجت کو ساری کائنات کا علم عطا کرتا ہے۔  
 دنیا کا نمائندہ اور ہوتا ہے اور قدرت کا نمائندہ اور۔ جو مسائل میں عاجز  
 رہ جاتے وہ دنیا والوں کا نمائندہ ہے اور جو دل کے حالات دیکھ سکیں حل  
 کر دے وہ قدرت کا نمائندہ ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد بھی مسلمان اس بات کا  
 عقیدہ رکھتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی ناواقفیت کی بنا پر مختلف زبانوں کے ترجمانوں  
 کے محتاج تھے۔ جس کا وہی ایسا ہوا اس کا نبی کیا ہو گا؟ ان یہ بات ضرور ہے کہ  
 لوگوں نے وہی ہی ایسے اختیار کئے ہیں جو نبی کو جاہل ثابت کر سکتے ہیں۔ نبی کے علم  
 کا اعلان نہیں کر سکتے۔

تذکرہ سلسل ہے تو دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔  
 جن سے حضرت کے فضل و کمال کا مکمل طور سے اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ محسوس  
 ہوتا ہے کہ شدت عداوت کے باوجود حکومتیں مجبور تھیں کہ امامت کے

سانے دست سوال پھیلائیں۔ چنانچہ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ملک میں  
خطیرہ اہوا تھا۔ خلقت خدا پریشان تھی۔ دعاؤں پر دعائیں ہو رہی تھیں اور دور  
دور تک پانی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نصرانی تھا  
اور اس نے کہا کہ اس مشکل کو میں حل کر سکتا ہوں میں ابھی چاہوں تو پانی برسنا  
شروع ہو جائے۔ یہ کہہ کر جمع عام میں آیا اور بیٹھے ہی دعا کے لئے اٹھ اٹھائے  
ابر گھر کرا گیا اور بارش کے آثار نمودار ہو گئے۔ قوم میں ہنگامہ ہو گیا حکومت  
وقت کو خردی گئی کہ ایک عیسائی نے ایسا دعویٰ کیا ہے اور اس کی دعائیں یہ  
اثر ہے۔ مسلمانوں میں کسی ایک کی دعائیں یہ اثر نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ  
مذہب عیسائی کو حق مان لیں اور اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

غیر دین کا کیا ذکر۔ خود حکومت کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کرامت کو نہ ماننے تو جواب  
کیا دے اور ان کے لئے تو اسلام کہاں رہے گا۔ علماء کو طلب کیا گیا۔ فقہار سے دریافت  
کیا گیا۔ لیکن ہر طرف سنا۔ کوئی جواب نہیں ملتا اور عیسائی کا یہ عالم ہے کہ اکثر نامی پلا  
بارا ہے۔ کیوں نہ ہو جو فاتح ہوتا ہے وہ اکثر ہے۔ کل مرجع بھی اکثر ہوا تھا۔ عمرو  
بن عبدود بھی اکثر ہوا تھا۔ باطل بے باطل کے سامنے آتا ہے تو اکثر ہوتا ہے۔  
وہ تو بے حق سے مقابلہ ہو جاتا ہے تو فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں حق کہاں رکھا  
ہے یہاں تو ہر طرف باطل ہی باطل کا دور دورہ ہے۔ عیسائی کا دماغ چوتھے  
آسمان پر ہے اور حکومت کی روح فنا ہوئی جا رہی ہے۔ اسلام کی تباہی کا خطرہ  
نہیں ہے۔ سارا خطرہ یہ ہے کہ اسلام نہ رہ گیا تو اسلام کے نام پر یہ تخت و تاج  
کس طرح رہ جائے گا۔ اور قوم باطل سے نکل گئی تو حکومت کس پر کریں گے بالآخر  
ماجرہ ہو کہ امام حسن عسکریؑ کو طلب کیا گیا۔ اپنے جد کی نبوت کو بچا دیئے۔ دین خطروں  
سے اسلام بچا رہا ہے۔

میں کہوں گا آپ حاکم اسلام ہیں۔ وارث رسولؐ ہیں۔ مسند پیغمبرؐ پر  
بلوہ کر ہیں۔ آپ ہی بچا دیئے۔ تباہ نہ ہونے پائے۔ لیکن یہاں تو دور پروردہ اقرار  
ہے کہ ہم حکومت دلے ہیں ہدایت دالے نہیں ہیں۔ ہمارا کام حکومت چلانا ہے  
شریعت چلانا نہیں ہے۔ یاد دہری غفلتوں میں یہ کہنا جائے کہ فرزند رسولؐ دین پر  
وقت پڑا ہے جلدی بچائے۔ آپ نہ آئیں گے تو ہم بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

فرزند رسولؐ تشریف لائے نصرانی کو بلایا۔ کہا دُرّ آبادی سے باہر چل  
دہ آبادی کے باہر آیا۔ آپ نے فرمایا تیری کرامت کیا ہے۔ اس نے کہا کہیں دعا  
کرتا ہوں تو بارش ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا ذرا دعا تو کر۔ اس نے دعا کے  
لئے اٹھ اٹھائے۔ بیٹھے ہی اٹھ اٹھائے ابر گھر کرا گیا۔ آپ نے ایک شخص سے  
فرمایا کہ اس کی انگلیوں کے درمیان جو چیز چھپی ہوئی ہے اسے نکال لے۔ اس  
نے بڑھ کر وہ چیز کھینچ لی۔ آیا ہوا ابر واپس ہو گیا۔ جمع متحرکہ گیا۔ یہ کیا ہوا۔  
وہ دعا کہاں گئی۔ وہ اثر کہاں گیا۔ نصرانی بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا۔ بالآخر  
نے کہا فرزند رسولؐ یہ کیا ہوا۔ آپ نے فرمایا اس کو کسی قبر سے کسی ولی خدا کی ہڈی  
مل گئی ہے اور اس ہڈی کا یہ احترام ہے کہ جب زیر آسمان آجائے گی ابر گھر کرا جائے  
گا۔ اور رحمت کو جوش آجائے گا۔ میں نے وہ ہڈی واپس لے لی ہے اور سارا  
زور ختم ہو گیا ہے۔

یہ بھی امت جی کا علم تھا کہ ہڈی کا بھجوتہ لگایا۔ اور اس کا اثر بھی بتا دیا  
درد عالم اسلام میں کوئی اس حقیقت کا جاننے والا بھی نہ تھا۔ اور میں تو کہتا  
ہوں کہ کاش اب بھی عالم اسلام کو ہوش آجاتا کہ ایک غیر معلوم ولی کی ہڈی میں  
اتنا اثر ہے کہ زمین سے آسمان تک انقلاب آجاتا ہے۔ جب کہ اس کو دفن  
ہوئے زمانہ گزر چکا ہے تو پھر خاتم النبیینؐ کے گوشت و پوست کا کیا اثر ہوگا

ان حالات کو دیکھنے کے بعد بھی بے شرم مسلمان کہتے ہیں کہ نبی بھی سم جیسا ہوتا ہے۔ آپ ہی جیسا تھا تو آپ ہی نے پانی برسا یا ہوتا۔ آپ تو جیتے ہی وہ نہ کر سکے جو ایک دلی کی بوسیدہ ہڈی نے کر دیا۔ اور اب تو قدرت کا انتقام بھی منزل اعلیٰ تک پہنچ چکا ہے کہ جس دیا ہے "ہم جیسے" کا نعرہ بلند ہوا تھا وہیں چند بزرگمان ملت کی لاشیں قبروں سے نکال لی گئی ہیں۔ اور صبح و سائیم کلین ہیں قدرت نے آواز دی بے غیرت مسلمان! ہوش میں آ جاؤ۔ عبد اللہ رسول! نہیں ہیں۔ اصحاب نہیں ہیں اور میں نے ان کی لاشوں کو یہ امتیاز دے دیا ہے کہ سیکڑوں سال کے بعد بھی صبح و سلامت موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی کہتے ہو کہ نبی قبر میں مٹی کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ اب اس کی کیا حیثیت ہے اب اس کے احترام کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کے لئے قیام کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کے ذریعہ دعائیں کیوں مانگی جاتی ہیں۔ کاشش اب بھی مسلمانوں کو ہوش آجاتا۔ لیکن اس کی امید نہیں ہے اس لئے کہ جب نبی کی زندگی میں چاند کے ٹکڑے اور علیؑ کی حیات میں درخشش کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو اب کیا ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے والے غیب پر بھی ایمان لا کر مسلمان وادیس بن جاتے ہیں۔ اور نہ ماننے والے جلوے دیکھ کر بھی ابوہبہ و ابوہل ہی رہ جاتے ہیں۔

روایت کہتی ہے کہ اس کے بعد فرزند رسولؐ نے مصلیٰ اٹھایا اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ ہاتھوں کا اٹھنا تھا کہ ابرائے گنا۔ لوگ پریشان ہوئے۔ آپ نے فرمایا اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فلاں شہر میں برے گنا۔ پھر ایک ابراٹھا آپ نے فرمایا یہ فلاں شہر کا ہے۔ پھر ایک ابراٹھا۔ آپ نے فرمایا یہ فلاں مقام کے لئے ہے۔ آخر میں ایک عظیم

ابرنمودا ہوا۔ آپ نے فرمایا اب تم لوگ فوراً اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ یہ ابراٹھا دے دیں پر برسنے والا ہے۔ جمع تیزی سے گھروں کی طرف روانہ ہوا۔ ابراٹھا کر آیا اور ایسی بارش ہوئی کہ سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ دعا کا اثر بھی سامنے آگیا اور قحط بھی دور ہو گیا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں فرزند رسولؐ! موقع غنیمت تھا دعا کرتے۔ ابراٹھا لوگ آپ کی عظمت کے قائل ہوجاتے۔ یہ مصلیٰ پھانے کی کیا ضرورت تھی نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کی دعائیں اثر نہیں ہے کیا آپ کو قدرت نے اختیار نہیں دیا ہے۔ فرمائیں گے بیشک مجھے اختیار ہے۔ میری دعائیں اثر ہے۔ لیکن یاد رکھو ہمارے کمالات اپنی ذات کے لئے نہیں ہیں۔ اپنے پروردگار کے لئے ہیں۔ ہم جو جس کی امانت ہے اسی کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہم نے صرف دعا کی ہوتی تو ہمارا کمال ظاہر ہوتا۔ نماز قائم کی تو معبود کی عظمت سامنے آگئی۔ اور نماز کا شرف بھی ظاہر ہو گیا۔ اور یاد رکھو کہ ہمارا طریقہ یہ رہا ہے کہ ہم نے جب بھی کسی غیر معمولی کمال کا مظاہرہ کیا ہے تو نماز ضرور پڑھی ہے تاکہ بندے ہمارے کمال کو دیکھ کر ہمیں خدا نہ کہہ دیں۔ تم نے نہیں دیکھا کہ میرے جد نے سورج بھی پٹایا تھا تو نماز ہی کے لئے تاکہ دنیا پہچان لے کہ ہمارے کمال کا آغاز بھی بندگی سے ہوتا ہے اور انجام بھی بندگی پر ہوتا ہے۔ ہم بندگی سے ہٹ کر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔

بیان کا سلسلہ آخری منزل تک آگیا ہے اور فضائل و کمالات کا سلسلہ بھی ابتدا منزلوں میں ہے۔ کس کی محال ہے جو اس بحرناپیدائنا رکے کمالات کا احاطہ کر سکے اور کس میں طاقت ہے جو اس کے جملہ فضائل و مناقب کا تذکرہ کر سکے۔ اس وقت صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے۔ پیغمبرؐ کے اس گیارہویں وارث کو جس نے

کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن نام ہے اور عسکری لقب۔ کیفیت ابو محمد ہے جس کی وجہ معلوم ہے۔ حسن نام کے بارے میں بھی کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اہلبیت کے گھرانے میں یہ نام ہوتا ہے۔ لہذا آج بھی اگر قدرت نے تو اس نام کو اپنے خزانہ خاص میں محفوظ رکھا تھا کہ فرزند حضرت زہراؑ سے پہلے عرب میں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔ اور نہ کوئی حسن نام کا تھا نہ حسینؑ نام کا۔ یہ دونوں نام خزانہ قدرت میں محفوظ تھے اور کیوں نہ ہوتا جب ذات منفرد تھی تو نام بھی بے مثال ہونا چاہیے تھا۔ جب ذات کا کوئی جواب نہیں تھا تو نام کا بھی کوئی پتہ نہ ہونا چاہیے تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظ عسکری کا کیا مطلب ہے اور یہ حضرت کے نام کے ساتھ کیوں استعمال ہوتا ہے۔ علماء اسلام نے دو وجہیں بیان کی ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت میں علما میں رہتے تھے اس کا نام عسکر تھا اس لئے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ عسکری کا لفظ استعمال ہونے لگا اور ایک یہ ہے کہ متوکل یا واثق کے دو دریں جب بادشاہ نے امام علیؑ کو اپنے لشکر کا معائنہ کرایا تھا اور حضرت نے ہمدردی پر جانے کے بعد ایک مرتبہ اشارہ کیا تھا کہ اچھا اب ہمارے لشکر کو بھی دیکھ لے اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا تو ساری فضا میں زمین سے آسمان تک فوج ہی فوج نظر آرہی تھی۔ چونکہ حضرت نے اپنے لشکر کا مشاہدہ کرایا تھا۔ اور آپ کا لشکر زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا تھا اس لئے آپ کو عسکری کہا جانے لگا۔ جو امام علیؑ اور امام حسن عسکریؑ کا مشترک لقب ہو گیا۔ سامہ میں دونوں معصومین کو عسکرین سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ بھی عسکری ہیں اور یہ بھی عسکری ہیں۔ وہ بھی اکیٹھے کے رہنے والے ہیں اور یہ بھی اسی جگہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے پاس بھی وہی آسانی طاقت اور فضائی لشکر ہے اور ان کے پاس بھی وہی آسانی طاقت اور فضائی لشکر ہے۔ لیکن جب دونوں معصومین میں صرف امام حسن عسکریؑ ہی کو اس لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اور آپ ہی کی شہرت عسکری کے نام سے ہے تو ایک لفظ کہنے کو بھی چاہتا ہے۔ کہ شاید مصلحت الہی یہی رہی ہو کہ آپ ہی کا نام عسکری کے لقب کے ساتھ مشہور ہوتا کہ دنیا دیکھ لے کہ تاریخ عصمت میں دو حسن گذرے ہیں ایک امام حسن عسکریؑ اور ایک امام حسن عسکریؑ۔ ان کے علاوہ تمام معصومین۔ محمدؑ ہیں۔ علیؑ ہیں۔ جعفرؑ ہیں۔ موسیٰؑ ہیں۔ حسینؑ ہیں۔ لیکن حسن نہیں ہیں۔ حسن صرف دو ہی ہیں اور دونوں میں بظاہر فرق یہ ہے کہ ایک نے حکومت وقت سے صلح کر لی تو دوسرے نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اقتدار سے مرعوب ہو گئے۔ تخت و تاج سے خوفزدہ ہو گئے۔ شامی رعب و جلال کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر ہر انداختہ ہو گئے۔ اور دوسرے نے شدت مصائب کے باوجود حکومت کا مقابلہ کیا تو قدرت نے چاہا کہ اس امام کو عسکری کے لقب سے شہرت دی جائے تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ بیانیہ گن ان مصائب میں گھر کر حکومت سے مرعوب نہیں ہوتا تو پہلا حسن کس طرح مرعوب ہو جائے گا۔ حسن کے نام تم یہ نہ سمجھنا کہ تم جو چاہو گے کر دے وہ خاموش ہی رہے گا۔ کل کی مصلحت اور تقی اور آج کی مصلحت اور ہے۔ اور اس حسن کا لال اسٹے کا تو ظلم کا تختہ الٹ کر عدل و انصاف کا راج قائم کر دے گا۔ تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ الہی انقلاب سے پہلے ایک حسن کو خاموش رہنا پڑتا ہے۔ کل پہلا حسن خاموش تھا تو انقلاب کو بلا سامنے آیا تھا۔ آج دوسرا حسن خاموش ہے تو یہ علامت ہے کہ ایک عظیم انقلاب آنے والا ہے۔ جس میں کر بلا کا انتقام بھی ہو جائے گا اور نظام ظلم کی دھجیاں بھی اڑ جائیں گی۔ تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ حسن کا سکوت کتنا قیامت خیز ہوتا ہے اور اس سکوت کے پیچھے کتنا بڑا انقلاب پوشیدہ ہوتا ہے۔

صلوات

## امام ہمدی آخر الزماں

اسم مبارک

م-ج-م-د

لقب

قائم حجت۔ ہمدی۔ منتظر۔ صاحبِ لام

کنیت

ابوالقاسم

والد ماجد

امام حسن عسکریؑ

والد ماجد

جناب نوح بن خاتون

ولادت

۱۵ شعبان ۲۵۶ھ (سامرہ)

غیبت صغریٰ

۲۶۰ھ تا ۳۲۹ھ

غیبت کبریٰ

۳۲۹ھ الی ما شاء اللہ

مکان غیبت

سر داب سامرہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء  
والمرسلين خاتم النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد وآله  
الطيبين الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد  
فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم - بسم الله الرحمن الرحيم  
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَرَيْنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ -

مالک کائنات کا ارشاد ہے "جنگ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور  
دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مالک کائنات نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے  
اور تا مکمل انتظام کیا ہے کہ ہدایت لینے والوں کا فقدان تھا۔ لیکن ہدایت دینے والا  
آدم کی شکل میں موجود تھا۔ اولاد آدم بعد میں آئی ہے۔ اور آدم خلیفہ اللہ بنکر پہلے آئے  
ہیں اور آدم بھی بنکر بعد بنے ہیں خلیفہ اللہ پہلے بنے ہیں۔ بشریت کے اعلان سے پہلے یہ اعلان  
ہو گیا تھا کہ میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ ملائکہ کو بھی یہ خیال پیدا  
ہو گیا تھا کہ شاید میں کو خلیفہ بنا دیا جائے گا اور میں کو عظیم منصب دیدیا جائے گا۔ ہم سے  
بڑا اہل کون ہو گا۔ ہم فیض کرنے والے، تقدیر کرنے والے، سجدہ کرنے والے، عبادت  
کرنے والے، صاحب کردار اور معصوم ہیں اور ہمارے علاوہ جو مخلوق روئے زمین پر ہے  
وہ نہایت درجہ ذلیل۔ بہت بے کردار، سفاک، خونیروز، بد عمل اور بد سرشت ہے۔  
بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جیسے معصومین کے ہوتے ہوئے ایسے بہت کرداروں کو نامزد  
بنا دیا جائے۔ لیکن ایک مرتبہ اعلان ہوا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں اور جب  
اس کو پیکر تیار ہو جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو تم سب سجدہ میں گر پڑنا۔  
ملائکہ کی نظر میں ایک عجیب بات آئی۔ اب تک ہم سمجھتے تھے کہ یہ مخلوق جو روئے زمین پر پائی

جاتی ہے۔ اسی میں سے کوئی خلیفہ اللہ ہو گا۔ اس نے ہم نے بھی اپنا نام پیش کر دیا تھا اور یہ عرض کر دیا تھا کہ پروردگار ان سے تو ہمیں بہتر ہیں۔ لیکن جب اس نے کہہ دیا کہ تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں تو ہم خاموش بھی ہو گئے۔ اس کی مصلحت وہی جانتا ہے۔ اب مصلحت سامنے آئی کہ خلیفہ اللہ ان میں سے نہیں ہو گا۔ جن کا کردار شروع سے خراب ہو اور بعد میں ٹھیک ہو جائے۔ بلکہ خلیفہ اللہ ایسا کوئی ہو گا جو آغاز ہی سے اتنا لمز مریہ ہو گا کہ ملک معصوم سے سجدہ کرادیا جائے۔ چنانچہ ملائکہ معصومین نے مصلحت کو پہچانا اور سجدہ میں رکھ دیا۔ اب اس میں سوچنا ہوا کہ جیسے یہ ویسے وہ۔ آدم ہی میں کون سی خاص بات پائی جاتی ہے جو دوسرے زمین پر ہیں وہ تو بد کردار ہیں ہی۔ یہ نیا جو پیدا ہوا ہے یہ بھی مٹی سے بن رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ خاک کی بستی اس کے ساتھ بھی رہے گی۔ میں آتش مزاج ہو کر اس کے سامنے سر جھکاؤں۔ میرے بس کی بات نہیں ہے مجھے نرم قدس سے ٹکنا گوارا ہے۔ ذیل ہو گا گوارا ہے۔ لعنت کا طوق گوارا ہے لیکن یہ گوارا انہیں ہے کہ میں بلند ہو کر بستی کے سامنے سر جھکاؤں۔

واقعہ کے تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن روز اول ہی جو چند مسائل واضح ہو گئے ہیں انہیں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ خدائی رہنما پیدا ہو کر رہنما نہیں بنتا بلکہ رہنما بن کر پیدا ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ والا اتنا بلند ہوتا ہے کہ اسے معصوم فرشتہ بھی سجدہ کرتا ہے۔ اور اس کی عظمت کے سامنے تسبیح و تقدیس بھی کام نہیں آتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ ملائکہ نے حکم خدا پر اقامہ کیا تو سجدہ کر کے معصوم رہے اور ابلیس نے عیاں دیا کہنا شروع کر دیا۔ تو محفل قدس سے نکال دینے کے قابل ہو گیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابلیس کو اس کی آتش مزاجی نے تباہ کیا ہے۔ دین خدا میں تباہی کا رنگ بنیاد آتش مزاجی ہی نے رکھا ہے۔ اب جہاں جہاں یہ مزاج ہو گا وہیں سر جھکا

سے انکار ہو گا اور وہیں دربار سے نکلنے کا حکم ہو گا۔ تاریخ میں تلاش کیجئے مزار خود ہی کھل جائے گا کس کے مزاج میں آتش مزاجی تھی، کس نے تراب کے بجائے ابو تراب کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ کون محفل قدس سے نکلا گیا۔ جب یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں گی تو یہ معلوم کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ انسان کسے کہتے ہیں اور شیطان کیسا ہوتا ہے۔ "میں الجنتہ" کسے کہتے ہیں اور "والناس" کون ہے۔ قدرت نے روز اول آدم کو خلیفہ اللہ بنا کر پیدا کر کے واضح کر دیا کہ الہی نمائندگی کے لئے دو باتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ خلیفہ اللہ پیدا انہی صاحب منصب ہوتا ہے۔ اس کے منصب میں سن و سال، عمر و قامت کی قید نہیں ہوتی۔ وہ سارے ملائکہ سے افضل ہوتا ہے اور اس وقت بھی رہتا ہے جب کوئی ہدایت لینے والا نہ ہو تو جب ابتدائی منزل میں دینا رہنا کے بغیر نہیں رہ سکی تو آخری منزل میں یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا رہے اور کوئی رہنما نہ رہے۔ آج دنیا کی ساری قوموں سے یہ سوال ہو گا کہ تمہارا رہنما کہاں ہے اور تمہارے پاس دین الہی ہے تو دین کا نمائندہ کون ہے۔ ساری قومیں خاموش رہیں گی۔ سب کے پاس خود ساختہ نظام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک اثنا عشری فرقہ ہے جسے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہمارے پاس خدا کا دین بھی ہے اور خدا کا نمائندہ بھی ہے۔ جس طرح ہزار انقلابات کے بعد اس نے دین کو بجا رکھا ہے۔ اسی طرح اُدی اور رہنما کو بھی محفوظ کر کے رکھا ہے۔ کائنات نہ آغاز میں تحت خدا سے خالی تھی نہ انجام میں خالی ہوگی۔ آغاز میں ملائکہ کو سر جھکانے کا حکم دیا گیا تھا اور انجام میں ساکن فلک بنی کو جفا بڑھے کا حکم دیا جائے گا۔

قدرت نے ہر دور میں انتظام کیا اور اس اہتمام سے انتظام کیا کہ ہمیشہ ضرورت پڑی ویسا ہی اُدی بھیجا اور جس شان کے کمال کی ضرورت پڑی اسی انداز کا کمال دیکر مجسمہ بنا دینا نے طوفان بدتریزی اٹھایا تو صفحہ کو طوفان کا توڑ دے کر کھینچ دیا ضرورت نے فساد

کی ایک بھر کافی تو نیکو کو زور دے لانا ۲۸۷ باز کر مجھ دیا۔ فرعونیت نے جادوگری دکھائی تو موسیٰ کو ضرب کسی عنایت کر دی۔ یہودیت نے طب و حکمت کا زور دکھایا تو ابن مریم کو سبب بنا دیا۔ غرض کہ جب جیسی ضرورت پڑی ویسا ہی آدمی دراپنا بھیج دیا اور اسی انداز کا کمال دیدیا۔ خود مرسل اعظم کے دور میں فصاحت و بلاغت اور شجاعت و بہادری کا دور دورہ تھا تو پیغمبر کو دوسرے بجز ان عنایت کر دیئے۔ فصاحت و بلاغت کا زور توڑنے کے لئے قرآن مجید دیدیا۔ اور شجاعت و بہادری کی بات کرنے کے لئے ذوالفقار دیدی۔ زبان سے قرآن کی آیتیں پڑھی جائیں گی اور ذوالفقار سے باطل کے حلوں کی بات کی جائے گی اور یہ سب اس اہتمام سے ہوگا کہ قرآن کی ترجمانی کے لئے سورہ اسے دیا جائے گا جو سان اشد ہوگا۔ اور باطل کے دفاع کے لئے ذوالفقار اسے عنایت کی جائے گی۔ جو خدا اشد ہوگا۔

رسالت کے بعد امت کے بارے میں بھی یہی نظام رکھا گیا کہ جیسا زمانہ رہا اور جس کمال کا زور رہا۔ امام نے ویسا ہی ایجاد دکھلایا اور اسی انداز سے دنیا کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ معجزات کی ہرمت بہت طولانی ہے۔ کسی میں ہمت ہے جو ایک فرصت میں سارے تفصیلات بیان کر سکے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہوئے الگ کائنات نے اپنے نمائندوں کو ایسے کمالات عنایت کیے کہ کسی دور میں ان کی بات نہ ہو سکے۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی دلیل ہے جس سے ہم انھیں امام تسلیم کر سکتے اور کائنات سے مافوق سمجھتے اور جب یہ سلسلہ ہر دور میں قائم رہا ہے تو دنیا مجھے سوچ کر بتائے گا کہ جو قدرت کا آخری نمائندہ آئے گا اس کے پاس کتنے معجزات ہوں گے۔ اور کس انداز کی طاقت ہوگی۔ اب تو دنیا ترقی کی آخری منزل پر ہے اور کوئی کمال ایسا نہیں ہے جو بظاہر باقی رہ گیا ہو۔ تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ لمحات میں آسمانوں کی سرحدیں ہے۔ برقی قوت کی یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا نمود ہو رہی ہے۔ کہر پائی طاقت اور جوہری توانائی کا یہ انداز ہے کہ چشمِ نزول میں سارا عالم تہ و بالا ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں

جو ابھی نمائندہ آئے گا وہ کتنی طاقتیں لے کر آئے گا اور کیسے کیسے کمالات اپنے ساتھ لائے گا۔ اس کا اندازہ وہی افراد کر سکتے ہیں جنہوں نے انبیاء اور ائمہ کے معجزات کا جائزہ لیا ہے اور خود معجزہ کا فلسفہ سمجھا ہے۔ شاید اسی لئے روایت نے بیان کیا ہے کہ وہ آخری حجت ظہور کرے گا تو انگشت مبارک میں خاتمِ سلیمان ہوگی۔ دست مبارک میں عصا موسیٰ ہوگا۔ پشت اقدس پر ہر امانت ہوگی۔ روئے انور پر یوسفی خال ہوگا۔ لبوں پر محمدی نطق ہوگا۔ نفس میں مسیحائی دم ہوگا۔ دل میں فاطمی صبر ہوگا۔ اہمقہ میں حیدری ذوالفقار ہوگی اور کردار میں گیارہ امامتوں کا جلال و جمال ہوگا۔ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ”جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ“ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے انتقامِ خونِ ناحق کا جذبہ دل میں لے ہوئے اس شان سے آئے گا کہ قدرت پکاراٹھے گی۔ دیکھو میرا نمائندہ ایسا ہوتا ہے۔ میری دی ہوئی طاقت ایسی ہوتی ہے۔ تم دستانِ دوزخ سے اپنی آواز پہنچاتے ہو یہ بلا وسیلہ ساری کائنات کو آواز سنا دے گا۔ تم آلات کے ذریعہ سفر کی منزلیں طے کرتے ہو۔ اس کے چاہنے والے آواز پر کھنچ کر اس کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔ تم جوہری توانائی سے دنیا کو مٹا رہے ہو یہ ذوالفقار حیدری سے کائنات کی اصلاح کرے گا۔ بگاڑنے والے لاکھ ہوں گے اور بنانے والا ایک۔ فساد پھیلانے والے کر دڑ ہوں گے اور اصلاح کرنے والا ایک۔ لیکن وہ ایک اتنا طاقت ور ہوگا کہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو اکیلا عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ اس کی طاقت کا اندازہ کرنا ہے تو یوں اندازہ کرو کہ جب ساری جوہری توانائی اور ایٹمی طاقت ظلم و جور پر صرف ہو جائے گی تو ایک ذوالفقار حیدری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گی۔ ظلم عدل سے بدل جائے گا۔ بدکرداری کردار میں نیل

ہو جائے گی۔ کفر ایمان کا راستہ اختیار کر لے گا۔ شرک توحید میں بدل جائیگا۔  
 اتفاق اخلاص کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔ جبریل امینؑ جاؤ الحقؑ کا کلمہ  
 پڑھیں گے۔ میکائیل حمزہ بازو نہیں گے۔ مرسل اعظمؑ دعا میں دیں گے۔ زہراؑ  
 بڑھ کر بلائیں میں گی۔ دین خدا قربان ہو گا۔ کعبہ غفلتوں کا طواف کرے گا۔  
 قرآن قصیدہ پڑھے گا۔ قدرت الیقا وعدہ پر ناز کرے گی دینا بدل و انصاف  
 پر فخر کرے گی اور آدمیت آواز دے گی۔ فرشتہ توکل تم نے نہیں پہچانا تھا آج  
 پہچان لو۔ بشریت کا کام فساد کرنا نہیں ہے۔ بشریت کا منصب ماری کائنات  
 کے فساد کو نگوں میں اصلاح میں تبدیل کر دینا ہے۔ یہ وہ ہے جس پر آدمیت  
 ناز کرتا ہے۔ یہ وہ ہے جس پر خلقت قربان ہے۔ یہ وہ ہے جس پر کمیت  
 صدقے ہے۔ یہ وہ ہے جس کی سمیت اطاعت گزار ہے۔ یہ وہ ہے جو وارث  
 علم احمدؑ مختار ہے۔ یہ وہ ہے جو عامل زور حیدر کرار ہے۔ یہ وہ ہے جو فرزند  
 قسیم جنّت دار ہے۔ یہ وہ جو خلق حسنؑ اور صیر حسینؑ کی یادگار ہے اور مختصر  
 یہ ہے کہ لال مسیحاؑ کا ہے لیکن صاف ذوالفقار ہے۔ صلوات!

ہدایت کے دو طریقے ہیں راستہ دکھانا اور منسلک پہنچا دینا۔  
 قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے لیکن عام طور پر نظام ہدایت  
 راستہ دکھانے تک ہی محدود رہا اور انبیاء و مرسلین نے قوم کو نیک و بد کی  
 ہدایت دیدی منسلک کا پتہ بتا دیا۔ اب اس کے بعد قوم کو اختیار ہے کہ  
 وہ راہ راست پر آئے یا نہ آئے۔ جناب نوحؑ نے ۹۵ برس راستہ دکھایا لیکن  
 صرف چند آدمی راہ راست پر آئے۔ جناب ابراہیمؑ نے مدتوں زمیں برداشت  
 کیں لیکن کثرت بہت ہی راہ گئی۔ جناب موسیٰؑ مصائب کا سامنا کرتے رہے لیکن  
 قوم کو سالہا پست ہی رہ گئی۔ جناب عیسیٰؑ نے دنیا چھوڑ دی لیکن قوم راہ راست

پر رہا سکی۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ انبیاء نے کوئی کوتاہی کی ہے یا نہ  
 پیغام میں کوئی نقص تھا۔ نہیں۔ انہیں انہوں نے پیغام پہنچایا۔ اور پوری پچی  
 سے پہنچایا۔ یہ قوم کی بد نصیبی تھی کہ اس نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا اور اپنی  
 گمراہی پر قائم رہی۔ انبیاء کا فریضہ ادا ہو گیا۔ ان کے ذمہ صرف پیغام پہنچانا تھا،  
 انہوں نے پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسی لئے ہر آنے والے نے  
 صاف لفظوں میں کہہ دیا تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے اور میرا ابراہیمؑ پر ہے۔  
 ذمہ منسلک لے جا یا میرا کام تھا۔ اجر مانگنے کا بجھے حق ہے۔ جس نے بجھے  
 فریضہ سپرد کیا ہے وہ میرے اجر کا ذمہ دار ہے۔ میں نے اپنے فریضہ کو ادا  
 کر دیا۔ لیکن جب مرسل اعظمؑ کا دور آیا تو انداز بدل گیا یہاں اعلان ہوتا  
 ہے کہ ہم نے اپنے رسولؑ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ دین کو تمام  
 ادیان پر غالب بنائے اور اس کی برتری ثابت کرے چاہے مشرکین کتنے ہی  
 ناراض کیوں نہ ہوں اور انھیں یہ بات کتنی ہی بُری کیوں نہ معلوم ہو۔ آیت کا  
 انداز ہی بتا رہا ہے کہ مرسل اعظمؑ کی ذمہ داری دوسرے انبیاء سے زیادہ ہے  
 اور آپ کا فرض دیگر انبیاء سے بالاتر ہے۔ انبیاء کا کام پیغام پہنچانا تھا اور اس  
 لیکن آپ کو اس دین کو غالب بھی بنانا ہے اور سارے ادیان سے بالاتر بھی بنانا  
 کرنا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرسل اعظمؑ کے دور میں ایسا ہو گیا۔ اور کیا حضورؐ  
 نے دین الہی کو سارے ادیان پر غالب بنا دیا۔ اگر ایسا ہے تو آج دین  
 اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان کیوں نظر آ رہے ہیں۔ اور صرف نظری نہیں  
 آ رہے ہیں بلکہ علی طور سے دین اسلام پر غالب بھی ہیں۔ اسلام اپنے نظریات و  
 قوانین سے بختہ ضرور ہے۔ اس کے اصول و قواعد ناقابل شکیک فرد ہیں لیکن  
 علی اعتبار سے سارے ادیان اس سے بالاتر نظر آ رہے ہیں تو کیا اسلام کے غلبہ کے

یہی معنی ہیں کہ وہ اپنے اصول و قوانین میں سب سے بالاتر رہے اگر ایسا ہے تو رسول  
 کا کوئی کام ہی نہیں تھا جس خدا نے بنایا تھا اس نے دنا دل سے بنایا ہی بالاتر تھا  
 تو اس میں رسول کا کیا کام ہے۔ وہ نہ واضح قوانین ہے اور نہ اسے قوانین میں دخل  
 دینے کا کوئی حق ہے۔ اس کا کام تو صرف قوانین کو پہنچا دینا ہے اور اس پر عمل کر دینا  
 ہے۔ چاہے قوانین بالاتر ہوں یا بہت تر۔ بلندی اور پستی قانون کے بنانے والے کے  
 ہاتھ میں ہے۔ اس سے رسول کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو پھر رسول مے کیوں کہا گیا کہ  
 اس دین کو غالب بنانا ہے۔ آیت کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ قدرت اپنے دین کو عملی  
 طور پر غالب بنانا چاہتی ہے اور یہ کام حیات پیغمبر اسلام میں نہیں ہو سکا اور سچی  
 بات تو یہ ہے کہ آج تک نہیں ہو سکا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کام مکمل نہیں ہوا تو رسول  
 کو اجرت مانگنے کا کون سا حق تھا۔ اور انھوں نے قوم سے محبت کی تھی تو سوال کیوں کیا  
 انھیں بھی چاہئے تھا کہ دوسرے انبیاء کی طرح پیغام پہنچا کر چلے جاتے اور اپنا اجر  
 پروردگار سے لے لیتے۔ قوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اجرت مانگنا دلیل  
 ہے کہ کام تمام ہو گیا اور دین اسلام کا سارے ادیان پر غالب نہ آنا دلیل ہے کہ  
 ابھی مقصد مکمل نہیں ہوا تو آخر ماہر کیا ہے اور یہ کیسا نظام ہے کام مکمل نہیں ہوا  
 اور اجرت کا مطالبہ کر لیا۔ یاد رکھئے اگر مسلسل امامت کو نبوت سے الگ کر دیا جائے  
 تو مسئلہ قیامت تک حل نہ ہو گا اور رسول اکرم پر دو الزامات بہر حال باقی رہیں  
 گئے۔ ایک یہ الزام رہے گا کہ کام پورا نہیں کیا اور دوسرا یہ الزام بھی رہے گا  
 کہ کام مکمل کئے بغیر اجرت کا مطالبہ کر دیا۔ شاید قدرت نے اسی حوالہ کے طرف  
 اشارہ کیا تھا کہ اسے پیغمبر! اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو گویا رسالت کا حق ہی ادا  
 نہیں کیا اور پیغام الہی کو پہنچایا ہی نہیں۔ غدیر کے میدان میں قدرت  
 کے تہننا رہے ہیں کہ رسالت کی تکمیل امامت پر موقوف ہے اور امامت کے

پیغمبر رسالت کا کام بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔ تو جس دم پیغمبر اسلام نے امامت کا  
 اعلان کر دیا تو گویا اپنے فرض کو ادا کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ اگر میری زندگی میں  
 دین اسلام سارے ادیان پر غالب نہیں آیا۔ تو اس کو میری تبلیغ کا نقص نہ کہنا۔  
 میرا کام ابھی تمام نہیں ہوا ہے۔ میرا کام امامت کے خاتمہ کے ساتھ تمام ہو گا۔ اب اگر  
 امامت کی آخری منزل پر بھی دین اسلام غالب نہ آئے تو میرا کام نامکمل ہے اور میری  
 رسالت بے کام ہے لیکن اگر امامت کے تمام ہوتے ہوتے یہ کام تمام ہو جائے اور دین  
 اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے تو اسے میرا ہی کمال سمجھنا اور اس تبلیغ کو میری  
 تبلیغ سمجھنا۔ شاید محبت اہلبیت کو جو رسالت قرار دیے کا مقصد یہ بھی تھا کہ رسالت  
 کے کاروبار کو اہلبیت سے لاکر دیکھنا انھیں آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ کرنا  
 ورنہ رسالت کا مقصد بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اور جب دونوں کو آپس میں ملا دوں  
 تو راز کھل جائے گا کہ رسالت کے مقاصد کی انتہا کہاں ہے اور کار رسالت  
 کس طرح مکمل ہوتا ہے۔ اب اگر امامت کی آخری منزل میں دین الہی سارے  
 ادیان پر غالب آجائے تو اسے بھی رسالت ہی کا کار نمایاں قرار دینا۔ شاید  
 اسی لئے پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا کہ ہمارا آخری وارث صورت میں سیرت میں،  
 رفتار میں رفتار میں میری شبیہ ہو گا۔ اس کی کیفیت بھی میری کیفیت ہو گی اور  
 اس کا نام بھی میرا نام ہو گا۔ مجھ میں اور اس میں برائے نام "بھی فرق نہ ہو گا۔"  
 ارباب نظر قدرت نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے دین الہی کے  
 غلبہ کو رسالت کا فرض قرار دیا تھا تاکہ دنیا رسالت و امامت کے رشتے کو پہچان لے  
 اور اسے اندازہ ہو جائے کہ رسالت کا کام امامت کا کام ہے اور امامت کا کام  
 رسالت کا کام ہے۔ "حَسْبُكَ اللَّهُ وَآئَاتُ الْحُسَيْنِ" بے مقصد نہیں ہے۔ اس  
 کا مقصد بھی یہی ہے کہ جو رسول نے کیا وہ حسین کا مقصد ہے اور جو حسین نے کیا

وہ رسول کا کارنامہ ہے۔

رسالت و امامت کے اس اتحاد نے اسلام کے بے شمار عقیدے حل کر دیئے ہیں اور قدرت کے نظام ہدایت کو مکمل کر دیا ہے۔ قدرت کو یا آواز دے گی کہ تم نے آغاز میں پہلے محمد کو بھیجا تھا اور انجام میں آخری محمد کو بھیجیں گے۔ آغاز میں ۵۰۰ برس کی فترت کے بعد بھیجا تھا انجام میں ہزار سال کی غیبت کے بعد بھیجیں گے۔ آغاز میں تصدیق کے لئے نبت اسد کے لال کو ساتھ کر دیا تھا اور انجام میں تائید کے لئے مریم کے لال کو ساتھ کر دیں گے آغاز کی بندگی میں علیؑ شریک جماعت تھے اور انجام کی جماعت میں عیسیٰ شریک جماعت ہوں گے۔ آغاز کی نماز نے نصیریوں کی آنکھ کھول دی تھی انجام کی نماز نصاریٰ کی آنکھ کھول دیگی۔ علیؑ خدا ہوتے تو کعبہ میں پیدا نہ ہوتے اور عیسیٰ خدا ہوتے تو شریک جماعت نہ ہوتے۔

قدرت نے جسے بھیجا کمال دے کے بھیجا اور جتنے عظیم مقصد کے لئے بھیجا اتنا ہی عظیم کمال دیکر بھیجا۔ اور جب بھیجا تو آغاز ہی سے صاحب کمال بنا کر بھیجا۔ ابتدا میں آدمؑ کو پیدا کیا تو ساری کائنات کی مٹی جمع کر کے جو ہر کمال کر سیکر آدمؑ بنایا اور انتہا میں قائم کو بھیجا تو عرب و عجم کا سارا جہاں اکٹھا کر کے جو ہر خاتم تیار کیا۔

واقعہ مشہور ہے کہ جب قیصر روم کی پوتی ملیکہ قیدیوں کے لباس میں بغداد تک آئی اور اس کی خرید و فروخت کا مسئلہ شروع ہوا تو امام علیؑ نے ایک شخص کو ایک سو بیس دینار دے کر سامرے بغداد بھیجا کہ کل جب قیدیوں کو خرید و فروخت کا وقت آئے تو تم بھی چلے جانا اور ایک ان علامات کی قیدی خاتون ہوگی انھیں خرید لینا اور ایک سو بیس دینار قیمت کے طور پر

پر ویدینا۔ بشیر بن سلیمان رقم لے کر پہونچا تو کیا دیکھا کہ قیدیوں کی خسرید و فروخت کا کام جاری ہے اور درمیان میں ایک قیدی ہے جو کسی کے ہاتھ فروخت ہونا نہیں چاہتی اور ہر ایک کو اپنے سے دور رکھتی ہے۔ مالک پریشان ہے کہ کس طرح فروخت کرے۔ بشیر آگے بڑھا اور آگے بڑھ کر کہنے لگا کہ اس قیدی کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں ایک خط بھی لے کر آیا ہوں۔ رومی زبان میں لکھا ہوا حضرت کا خط اس قیدی کو دیا۔ اس نے آنکھوں سے لگایا اور کہا بس مجھے اسی کے ہاتھ فروخت ہونا ہے۔ اس نے ۱۲۰ دینار مالک کے حوالے کئے اور قیدی کو لے کر چل دیا۔ سر راہ اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیوں اس طرح آئی ہو کہ امام علیؑ نے تمہاری خریداری کے لئے مجھے بلارہے بغداد بھیجا ہے۔ اس نے کہا کہ ملیکہ قیصر روم کی پوتی ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے ہیں اور پیغمبر حضرت عیسیٰؑ سے میرے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور اپنے فرزند کے لئے میرا پیغام دے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس پیغام کو قبول کر لیا اور میں نے بھی اپنی رہنمائی ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد جب میں بیدار ہوئی تو میری عجیب کیفیت تھی۔ میں سخت حیرت میں تھی کہ ان بزرگوار تک کیسے پہنچوں گی جن کے ساتھ میرا رشتہ ہوا ہے۔ صدمہ میں بیمار ہوئی ہزار علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر میں نے اپنے دادا سے کہا کہ میری صحت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دے جس نے سب کو آزاد کر دیا اور میں نے بھی صحت کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے جناب مریمؑ اور جناب فاطمہؑ کو خواب میں دیکھا اور اپنی پریشانی بیان کی۔ آپ نے مجھے کلمہ پڑھوایا اور گلے سے لگا لیا۔ پھر آپ بشارت دے کر تشریف لے گئیں۔ اور میں نے خواب

میں امام حسن عسکریؑ کو دیکھا۔ میں نے عرض کی۔ سرکار میں آپ کی خدمت میں کس طرح پہنچوں گی۔ کہاں آپ اور کہاں میں؛ آپ کے جد نے پیغام کیوں دیا۔ آپ کی جدہ ماجدہ نے ہمارا کہا دیکھیں دی۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا دادا مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے لشکر بھیجے گا تو تم بھی لباس بدل کر کینزوں میں شامل ہو جانا اور جب لشکر سے الگ ہو کر قیدی بننا تو اپنا نام زبیں بتانا تاکہ لوگ کینز سمجھ کر گرفتار کر لیں اور فردخت کر دیں۔ میں تمہارے آنے کا انتظام کر دوں گا۔ چند روز کے بعد ایسا ہی ہوا اور میں گرفتار ہو گئی اور آٹھ گھنٹے کے بعد فردخت ہو کر جاری ہوں۔ بشیر نے کہا جب آپ قیصر روم کی پوتی ہیں تو عربی کیسے بولتی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے دادا نے مجھے بہت سی زبانیں سکھائی ہیں اور ان میں عربی کی بھی تعلیم دی ہے۔ بشیر انھیں نے ہوئے امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ آج اللہ نے دین اسلام کی عزت اور دین نصاریٰ کی ذلت کا اظہار کر دیا اور یاد رکھو کہ اللہ تم کو ایک ایسا فرزند عطا کرے گا جو ساری مملکتوں کو ظلم و جور سے بدلے بدل و الفان سے بھر دے گا۔ میں نے تمہارا عقد حسن عسکریؑ سے کر دیا ہے جس طرح کہ خواب میں میرے جد نے رشتہ کیا تھا۔ جناب زبیں جناب حکیمہ خاتون کی خدمت میں آگئیں۔ اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کر دیا۔ لیکن ذرا قدرت کا انتظام تو دیکھیے کہ کہاں قیصر روم اور کہاں امام علی نقیؑ۔ قدرت نے عجیب و غریب اہتمام کر کے دھی یسلی کی نواسی کو دھی رسولؐ کے پوتے تک پہنچا دیا۔ اور اب یہ رشتہ اتنا استوار ہوا کہ قیامت تک کے لئے قائم ہو گیا۔ ۱۵ شعبان ۳۲۰ھ ہجری کو امام علی نقیؑ کی خوشخبری پوری ہوئی۔ اور اللہ نے زبیں خاتون کی آغوش میں وہ نورانی دیدیا جس سے سارا عالم انسانیت نمودار ہونے والا تھا۔ قدرت نے اس آخری حجت کے سلسلے میں ہر بات انوکھی ہی رکھی۔ آپ کا

عقد ہوا تو عالم بالائیں۔ اس کی آمد ہوئی تو نئی شان ہے اور اب ولادت ہوتی اس انداز سے کشف ولادت آگئی۔ اور جب جناب حکیمہ سے کہا جاتا ہے پھر بھی جان آج کی شب آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اللہ مجھے ایک حجت عطا کرنے والا ہے تو فرماتی ہیں کہ بیٹا زبیں کے یہاں تو ایسے آثار نہیں ہیں!

فرمایا پھر بھی جان لیکن قدرت کا منشا یہی ہے کہ اس فرزند کی ولادت اسی انداز سے ہوگی۔ جناب حکیمہ ٹھہر گئیں۔ رات تمام ہوتے ہوئے ایک مرتبہ آثار ولادت ظاہر ہوئے۔ اور صبح صادق سے وقت ایک امام صادق اس دینائے انسانیت میں آگیا۔ ولادت کا انداز جناب موسیٰؑ سے قلم جلتا ہے۔ اور فرعون فکر مند تھا کہ موسیٰؑ پیدا نہ ہونے پائے لیکن فرعون کے علی الرغم قدرت نے موسیٰؑ کو پیدا کر دیا اور ساری دنیا کی کوشش کے باوجود اپنی آخری حجت کو دنیا میں بھیج دیا۔ آئے تو اس شان سے آئے کہ سر سجدہ خالق میں رکھ دیا۔ زبان پر کلمہ شہادتین جاری کیا۔ داہنے ہاتھ پر جلاء الحق و زحق الباطل "سا نقش کندہ تھا چہرے سے جلالت کے آثار نمایاں تھے۔ جناب حکیمہ امام حسن عسکریؑ کے پاس لے آئیں۔ آپ نے سینے سے لگایا۔ فرمایا فرزند کچھ بڑھو۔ فرزند نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا۔ آپ نے فرمایا اب انھیں لے جائیے اور ماں کو دیدیکھے۔ پھر سات دن کے بعد تشریف لائے سکا۔ جناب حکیمہ سات دن کے بعد آئیں تو بچہ کو ولادت کرتے ہوئے پایا۔ چند روز کے بعد جب پھر آئیں تو بچہ کو نہ پایا۔ سخت پریشان ہوئیں۔ پوچھا زبیں! میرا فرزند کہاں ہے۔ عرض کی حفظ خداوندی میں ہے۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا انتظام الگ سے کر دیا ہے۔ ایک طائر سفید آسمان کی طرف لے گیا ہے اور وہیں پرورش ہو رہی ہے۔ ۴۰ روز کے بعد بچہ واپس آیا اور اب جو جناب حکیمہ نے دیکھا تو بچہ دیرس کا معلوم ہو رہا تھا

امام حسن عسکریؑ سے فرمایا فرزند تمہارا بچہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ عرض کی چھو بھی جا  
یہ قدرت کا انتظام ہے۔ ہم اہلبیت کی پرورش اسی انداز سے ہوتی ہے اور  
ان کا قیاس دنیا کے دوسرے افراد پر نہیں ہو سکتا۔ ولادت کی شان نئی تربیت  
کا انداز نیا اور جب ہر مرحلہ میں ایک اعجازی شان نظر آ رہی ہے تو جب اپنے  
فرض امامت کو ادا کرنے کے لئے اٹھے گا تو اس وقت بھی نرالا ہی انداز ہو گا اور  
جب ساری دنیا ظلم و جور سے بھری ہوگی تو لمحوں میں ظلم و جور کو فنا کر کے عدل  
و انصاف سے بھر دے گا۔

چار برس تک فرزند باپ کے ساتھ رہا۔ سلسلہ ۳۶ میں امام حسن عسکری کا  
انتقال ہو گیا۔ تو غیبت کا آغاز ہو گیا۔ دنیا درپے آزار تھی۔ سلسلہ امامت کو مٹانے  
کی فکر تھی اور قدرت کا مقصد تھا کہ یہ سلسلہ قیام قیامت تک قائم رہے۔  
چنانچہ اس نے غیبت کا حکم دیدیا۔ آغاز کار میں جان کا خطرہ تھا تو ہجرت کام آئی  
اور انجام کار میں زندگی کو خطرہ پیدا ہوا تو غیبت کام آئی۔ نہ ہجرت میں رسول کے  
وجود سے انکار ممکن تھا۔ نہ غیبت میں امام کے وجود سے انکار ممکن ہے۔ وہاں بھی  
رسول جا رہے تھے اور کسی نے نہ دیکھا، یہاں بھی امام ہو رہے اور کوئی دیکھنے  
والا نہیں ہے۔ وہاں بھی مصلحت الہی کام کر رہی تھی یہاں بھی مشیت الہی کام  
کر رہی ہے۔ ایک جھلک سب نے دیکھی تھی جب باپ کی نماز جنازہ کے لئے آئے  
تھے۔ ورنہ اکثریت تو جو وہی سے بے خبر تھی۔ اور جو لوگ باخبر تھے وہ بھی اعلان  
کرنے سے مجبور تھے۔ اس کے بعد غیبت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زمانہ کے حالات پر  
نکاح رکھتے ہوئے اپنے نائب مقرر کر دیئے تاکہ لوگ ان کے ذریعہ مسائل دریافت  
کرتے رہیں اور تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہے۔ حالات باپ کے دور ہی کے نامور  
ہو گئے تھے۔ چنانچہ امام حسن عسکری نے بھی اپنا نائب مقرر کر دیا تھا جس کے پاس لوگ

خمس و زکوٰۃ کی رقیس جمع کرتے تھے اور وہ خفیہ طور پر امام علیہ السلام تک پہنچا  
دیا کرتے تھے۔ حکومت کی نگرانی اس قدر سخت تھی کہ عثمان بن سعید کے لئے یہ  
کام بہت مشکل تھا اور ہر آن خطرہ تھا کہ اگر حکومت نے شیعوں کی آمد و رفت  
دیکھ لی تو قتل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔ چنانچہ انہوں نے نہایت ہوشیار  
و ذہانت سے تیل کی دوکان کھولی اور حبان اہلبیت اسی بہانے دوکان  
پر آئے تھے۔ کوشش یہ کرتے تھے کہ کسی وقت اجتماع نہ ہونے پائے اور حکومت کو  
حق الامکان خبر بھی نہ ہونے پائے۔

امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد امام عسکری نے ان کے اس عہدہ کو قرار  
دکھا اور وہ برابر امام کی خدمت میں رقیس جمعیتے رہے۔ اور آپ کے اشاروں  
پر صرف کرتے رہے۔ مسائل کے جوابات بھی آپ ہی کے ذریعہ آتے جاتے تھے۔  
بعض اوقات جناب حکیمہ خاتون بھی نیابت کے فرائض انجام دیتی تھیں حضرت  
عثمان بن سعید کے انتقال کے بعد یہ عہدہ ان کے فرزند محمد بن عثمان بن سعید  
عمری کو ملا اور انھوں نے با حسن وجہ اس فریقہ کو انجام دیا اور امام و عوام  
کے درمیان واسطہ بنے رہے۔ ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت نے  
یہ کام جناب حسین بن روح کے حوالے کر دیا۔ جن کے ویلے سے آج تک عریضے  
امام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ حسین بن روح کے بعد یہ منصب جناب  
علی بن محمد عمری کو ملا اور انھوں نے اس فریقہ کو انجام دیا۔ لیکن جب ان کی وفات  
کا وقت قریب آیا تو حضرت نے فرمایا کہ اب تم کسی کو جانشین نہ بنانا۔ اب غیبت  
کبریٰ کا دور شروع ہو رہا ہے اور ہم سے کوئی باقاعدہ طور پر ملاقات نہ کر سکے  
گا۔ یہ دور صاحبان ایمان کے لئے بے حد آزمائش اور امتحان کا دور ہو گا لوگوں  
کے دل سخت ہو جائیں گے اور ذہن ظلم و جور سے بھر جائے گی۔ ہمارا بطور خروج

سفینی اور صحیحہ آسمانی کے بعد ہو گا۔ اس کے پہلے کوئی نہیں نہ دیکھ سکے گا۔  
یہ کہہ کر پردہ غیب میں تشریف لے گئے اور آج تک وہ غیب کا سلسلہ  
باقی ہے۔ سنہ ۳۲۷ھ سے غیبت صغریٰ کا سلسلہ شروع ہوا اور سنہ ۳۲۹ھ سے علی  
بن محمد سمری کے انتقال سے غیبت کبریٰ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دور میں  
قوم کو کن حالات سے گذرنا پڑا۔ اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخ  
کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ظالمین نے عجمان اہلبیت کو کس قدر تباہ کیا۔ کتنے افراد  
تہ تیغ کئے گئے۔ کتنا خون ناحق بہا یا گیا۔ کتنے قتل عام ہوئے۔ کس کس طرح  
حکومتوں نے پامال کیا۔ لیکن کیا کہنا جذبہ ایمانی کا کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی  
اور وہ اسی شان سے باقی رہا۔ بلکہ اذیتوں نے اور نکھار پیدا کر دیا۔ اور سونا  
جتنا پتہ لگا اور کھرا ہوتا گیا۔ وہ قوم بنی اسرائیل تھی جس کا نبی جابیلوں  
کے لئے نکھار ہوں سے غائب ہو گیا۔ تو گو سال پرستی کرنے لگی اور صراطِ مستقیم  
ہٹ گئی۔ یہ عجمان اہلبیت ہیں کہ گیارہ سو برس سے امام پروردہ غیب میں  
ہے اور ایمان میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی بلکہ جتنے طغے دیئے گئے اتنا ہی ایمان  
اور بختہ ہوتا گیا۔ صاحب غیبت خود ہتر جانتا ہے کہ قوم کو کس کس طرح ستایا  
گیا۔ جسمانی مدد سے ایک طرف اور روحانی مدد سے دوسری جانب۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ کسی قوم پر اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ اس  
کے امام کے وجود سے انکار کر دیا جائے اور امام کی غیبت ہی کی طغے دیئے  
جائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہیں تو فائدہ کیا ہے۔ کوئی کہتا  
ہے کہ اتنے دن سے کیسے زندہ ہیں۔ کوئی کہتا ہے ہیں تو کہاں ہیں۔ کوئی کہتا  
ہے ان کا کام کیا ہے اور کیا کر رہے ہیں۔ اپنے فریضہ کو کیوں نہیں ادا کرتے۔  
قوم کی بدایت کیوں نہیں کرتے۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی زبانیں ہیں۔

مگر اللہ سے جذبہ عقیدت کہ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا اور ہر  
سال نیم شعبان کو عرفینہ ڈال کر دنیا کی قوموں کو متوجہ کرتے ہیں کہ دیکھو  
ہمارا ایمان کیا ہے۔ ہمارا یقین کیا ہے۔ ہم شدت مصائب میں بھی لاوارث  
نہیں ہیں۔ ہمارا وارث موجود ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ جس کا کوئی والی و  
وارث نہیں ہے۔ ہم سے یہ نہ کہو کہ غائب ہیں تو بے فیض ہیں۔ بے  
اثر ہیں۔ بے فائدہ ہیں بے کار ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے تو مذہب ہی شروع  
کیا ہے غیب سے۔ ہم نے مذہب کا بنیاد تین چیزوں پر رکھی ہے۔ ایک خدا  
ہے ایک رسول ہے اور ایک قیامت ہے۔ خدا وہ غائب ہے جسے نہ دیکھا  
ہے نہ دیکھیں گے۔ رسول وہ غائب ہے جسے کبھی لوگوں نے دیکھا تھا لیکن  
اب نہ دیکھیں گے۔ قیامت وہ غائب ہے جسے اب تک نہیں دیکھا لیکن  
کبھی دیکھیں گے۔ یعنی ہمارے ہر بنیادی عقیدہ میں غیبت شامل ہے۔  
کوئی بالکل غائب ہے۔ کسی کے ظہور کے امکانات ہیں لیکن ہمارے ایمان میں  
کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم خدائے غائب کو بھی مانتے ہیں اور اس کے علاوہ  
دنیا میں ہزاروں لوگ غائب ہیں جن کو مانتے ہیں۔ عقل غائب ہے لیکن  
مانتے ہیں۔ فضا میں ہوا غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ ابر میں آفتاب غائب  
ہوتا ہے لیکن مانتے ہیں۔ پھول میں خوشبو غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ تاہم  
بجلی غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ اور یہ اس لئے مانتے ہیں کہ یہ سب خود غائب  
ہیں لیکن ان کے اثرات موجود ہیں۔ تو اگر اثرات کے ذریعہ انہی چیزوں کا  
اقرار کیا جاسکتا ہے تو بقائے کائنات سے امام کے وجود کا یقین کیوں نہیں  
کیا جاسکتا جس کے بارے میں پیغمبر نے صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ  
اگر حجت خدا نہ رہے تو زمین و صحن جائے اور کائنات تباہ و برباد ہو جائے۔

بقائے کائنات خود وجود امام کی دلیل ہے۔ یا دوسری نظروں میں یوں کہا جائے کہ وجود کائنات وجود خدا کی دلیل ہے اور بقائے کائنات وجود امام کی دلیل ہے۔ خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات نہ ہوتی اور امام نہ ہوتا تو یہ کائنات فنا ہو جاتی۔ خدا نے اسی نورِ قدس کے طفیل میں بنایا تھا اور اسی کے لئے باقی رکھا ہے۔ یہ آسمان اس کے لئے ہے یہ زمین اس کے لئے ہے۔ یہ کوکب و افلاک اس کے لئے ہیں۔ اور جب سب اس کے لئے ہیں تو جب تک وہ رہے گا رہیں گے۔ اور جب وہ نہ رہ جائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔

تو عزیزانِ محترم! غیبتِ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے غیبتِ کائنات کہ خدا کا قائل ہے نہ رسول کا۔ نہ معاد کا قائل ہے نہ قیامت کا۔ اور ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ غیبتِ امام تو ان تمام غیبتوں سے بہتر ہے اور آخری نظروں میں یوں کہیں کہ خدا وہ ہے جسے نہ دیکھا ہے نہ دیکھیں گے۔ قیامت وہ ہے جسے نہیں دیکھا لیکن دیکھیں گے۔ رسول وہ ہے جسے بھی دیکھا ہے اور کچھ دنیا میں نہ دیکھیں گے۔ لیکن امام تو وہ ہے جسے کل بھی دیکھا ہے اور کل بھی دیکھیں گے۔ تو جب ایسے ثابت پر ایمان ممکن ہے تو ایسے غیب پر ایمان کیوں نہیں ممکن ہے۔ اب آپ سمجھیں کہ امامت کو اصولِ دین میں کیوں رکھا گیا ہے۔ امامت وہ عقیدہ ہے کہ اگر یہ نہیں ہے تو تعید و رسالت و قیامت بھی نہیں ہے۔ شاید اسی لئے پیغمبرِ اسلام نے فرمایا تھا کہ جو امام کی معرفت کے بغیر جائے وہ کفر کی موت مر لے نہ تو حید کام آتی ہے نہ علان، نہ رسالت کام آتی ہے نہ قیامت۔ نہ قرآن کام آئے نہ کعبہ۔ سب کا دار و مدار اقتدارِ امامت پر ہے۔ اور اقتدارِ امامت ہے تو سب کچھ سلامت ہے اور اقرارِ امامت نہیں تو قیامت ہی قیامت

ہے۔ — صلوات!

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

بِسْمِ اللَّهِ

## حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

|             |                                                 |
|-------------|-------------------------------------------------|
| اسم مبارک   | : احمد، محمد                                    |
| لقب         | : مصطفیٰ، بشیر، نذیر، وغیرہ                     |
| کنیت        | : ابوالقاسم                                     |
| والد ماجد   | : جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم             |
| والدہ ماجدہ | : جناب آمنہ بنت وہب بن عبدمناف                  |
| ولادت       | : ۱۲ ربیع الاول ۱۰۰۰ھ عام الفیل جمعہ شعب الہلال |
| بادشاہ وقت  | : نو شیرواں عادل                                |
| ازواج       | : تیرہ (جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ)         |
| اولاد       | : جناب یزد، قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم            |
| شہادت       | : ۲۸ صفر ۱۰ ص ۱۰ بروز دوشنبہ مدینہ منورہ        |
| عمر شریف    | : ۶۳ سال                                        |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين  
خاتم النبيين سيدنا وولينا ابي القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين  
وعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله الحكيم  
في كتابه الكريم يسئل الله الرحمن الرحيم ان يثبت علينا الهدى وان  
يثبت علينا الاخلاص والهدى

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذرہ داری ہمارے اوپر ہے۔  
اودنیادافرن کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے  
اور تاریخ کے ہر موڑ پر راہنماؤں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے تاکہ انسان یہ نہ کہہ سکے کہ  
ہماری ہدایت کا انتظام ہمیں ہوا اور ہم راہ راست پر نہیں آسکے۔ ہم نے آدم جیسا سجد  
نہ کیجیگا ہم نے نوح جیسا طوفان آنا بندہ میں کیا۔ ہم نے ابراہیم جیسا بت شکن پیش  
کیا۔ ہم نے موسیٰ جیسا تہمت شکن راہنما بھیجا۔ ہم نے عیسیٰ جیسا مسیحا پیدا کیا اور پھر  
آخری منزل پر ایک عرش نشین بندہ کو فرش زمین پر اتار دیا کہ تعلیم ہدایت مکمل رہے۔  
اور اس میں کوئی غلط نہ پڑنے پائے۔ ہم نے اپنے محبوب کی جدائی برداشت کر لی،  
لیکن انسانیت کی تباہی برداشت نہیں کی۔ ہم نے صاحب عرش کو فرش نشین  
بنادیا لیکن بادہ نشینوں کا بھگنا گوارہ نہیں کیا۔ یہ سہارا کم تھا کہ ہم نے رسول  
بھیجا اور یہ ہمارے رسول کا ظرف تھا کہ اس نے دنیا کی ہدایت کی خاطر عرش کا  
ماحول چھوڑنا گوارا کیا اور یہ تمہارا انداز زندگی ہے کہ تمہیں اس کا کلمہ پڑھنا  
بھی گوارا نہیں ہے۔

دنائے انسانیت عدل و انصاف سے کام لیتی تو اسے اندازہ ہوتا

کہ ایک لمحہ کی کیا حقیقت ہے۔ ساری زندگی حضور سرور کائنات کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے بعد بھی ان کے حقوق سے عہدہ بکا نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے ہمارے لئے منزلِ سراجِ عرضِ الہی کو چھوڑا ہے اور ہم نے ان کی اطاعت کے طفیل سراجِ حق کی ہے۔ وہ سراج میں بھی گئے تو امت کیلئے تختہ نماز لے کر واپس آئے اور ہم مصلیٰ پر بھی گئے تو منزلِ سراج کی تمنا ہی لے کر گئے۔ مسلمات،

دنیا میں کون ہے جو سرکارِ دو عالم کے احسانات کا بدلہ ادا کر سکے اور آپچی بے پناہ محبتوں کا صلہ دے سکے۔ آپچی بہشت کہ خود خدائے کویم نے احسان قرار دیا ہے اور آپچی آئمہ کو خود رب العالمین نے نزولِ رحمت سے تعبیر کیا ہے اور آپچی زندگی کو سپیکے خون کے پیاسوں نے بھی بلند و بالا تسلیم کیا ہے آپ پتھر کھاتے رہے لیکن صداقت کا کلمہ پڑھتے رہے کانٹوں پر چلتے رہے لیکن امانت و دیانت کے خارِ زہر کو گلستان بناتے رہے۔ آج جبے انھیں سرورِ دو عالم کا تذکرہ کرنا ہے۔ اور انھیں کی سیرتِ مبارکہ پر لکھی سی روشنی ڈالنا ہے۔ ممکن نہیں تو کسی انسان کے لبس کی بات نہیں ہے کسی کی سیرت میں ایک پہلو ہوتا ہے تو اس کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے اور کسی کی زندگی میں ایک کمال ہونا ہے تو اس کی تفصیل ممکن ہو جاتی ہے لیکن جس کی زندگی سراپا کمال ہو، اور جس کا کردار سراپا اعجاز ہو اس کے کمالات پر کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ اور اس کے فضائل کون بیان کر سکتا ہے۔ اس کی توصیف کے لئے اللہ کا لہجہ درکار ہے۔ قرآن کی زبان لازم ہے۔ اعجاز کا انداز ضروری ہے۔ روح الامیں کا ترجمہ لازم ہے، ملامت کا خات کا ظرف درکار ہے۔ اسلام کا روح لازم ہے۔ ادرا بیان کی حیات درکار ہے۔

کوثر کی روانی ہو تو اس کی سخاوت کا بیان کیا جائے۔ جنت کی بہت ہو تو اس کے بہن کی توصیف کی جائے۔ سلسبیل کا ترجمہ ہو تو اس کے خزاں کا تذکرہ کیا جائے۔ جبریل کا لہجہ ہو تو اس کے اندازِ حکیم پر روشنی ڈال جائے اور علی کا انداز ہو تو اس کے جوش و جلال کا نقشہ کھینچا جائے اور دنیا کے کسی انسان میں یہ باتیں ممکن نہیں ہیں۔ اس لئے اس کی توصیف بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ مالک کائنات کا کریم تھا کہ اس نے توصیف کے کچھ اسباب فراہم کر دیے اور آواز دی کہ اے میرے بھائی! اگر میرے حبیب کا کردار کتنا ہے، میرے پیغمبر کی زندگی کا نقشہ کھینچنا ہے، میرے محبوب کے کمالات کا اندازہ کرنا ہے تو قرآن کا انداز لے لے علی کا کردار لے لے، حسن کا اخلاق لے لے، حسین کا صبرِ استقامت لے لے، سجاد کی عبادت لے لے، باقر کا علم لے لے، صادق کی صداقت لے لے، کاظم کا ظلم لے لے، رضا کی شائستگی لے لے، تقی کا تقویٰ لے لے، متقی کی پاکیزہ زندگی لے لے، عسکری کا جلال لے لے، اور ہادی کا اندازہ بابت لے لے۔ مسلمات،

جب یہ اسباب فراہم ہو جائیں گے تو میرے حبیب کی توصیف ممکن ہو جائے گی اور جب یہ آئینے سامنے لگ جائیں گے تو میرے حبیب کا کردار نظر آنے لگے گا۔ میں نے یہ آئینہ خاندانِ اسی لئے بنایا ہے کہ ہر دور میں میرے پیغمبر کی تصویر دیکھی جاسکے اور ہر زمانہ میں میرے حبیب کے کردار کا نقشہ نظر آسکے۔ میرا انتظام اتنا دائمی اور دائمی ہے کہ خود میرے حبیب کو کہنا پڑا کہ میرا آخری وارث میرا مقصد بھی ہوگا اور ہم نہاں بھی ہم صورت بھی ہوگا اور ہم سیرت بھی ہم شکل بھی ہوگا اور ہم رتبہ بھی۔ اس کا نود میرا نود ہوگا اور اس کا نود میرا نود ہوگا۔ اس کی رفتار میری رفتار ہوگی اور اس کی گفتار میری گفتار ہوگی، اس کا کردار میرا کردار ہوگا اور اس کا انداز میرا انداز ہوگا، اس کا لہجہ میرا لہجہ ہوگا اور اس کا حکم میرا حکم، اس کی حیات میری حیات ہوگی اور

حدید ہے کہ اس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی کیفیت میری کیفیت یعنی اس کے اندر سب کے انداز میں برائے نام بھی فرق نہ ہوگا۔ مصلوات،

ایسے صیب کی ایسی پاکیزہ سیرت پر روشنی ڈالنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور ہمیں بعض مسلمانوں کا یہ الزام بسر و ختم قبول ہے کہ ہم بنیسا مسلم کہہ کر حقتہ نہیں پہچانتا اور ہمیں سرکار کی مکمل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور نہ اس اعلان میں کوئی توہین سمجھتے ہیں۔ میں تمہاری بات کا اعتراف ہے کہ ہم نے سرکار کا مکمل عرفان نہیں حاصل کیا۔ ہم نور ہونے تو نور کی حقیقت کو سمجھتے، ہم پینیب ہونے تو پینیری کی صحیح عظمت سے آشنا ہونے میں مرکز وحی بنا یا گیا ہوتا تو ہم وحی کی کیفیت کا اندازہ کرتے، ہم پر قرآن نازل ہوتا تو ہم معیت قرآن سے باخبر ہوتے۔ ہم مرزہ ختم نبوت دیا جاتا تو ہم ختم نبوت کی منزل سے روشناس ہوتے اور جب ایسا کچھ نہیں ہے تو ہمارا کمال کھو رہا ہے کہ ہم اپنی عاجزی کا اقرار کر لیں اور یہ اعانہ کر دیں کہ سرکار ہم نے آپ کو اتنا ہی پہچانا ہے کہ آپ ہمارے ذہنوں سے بالاتر ہیں۔ ہمارے دماغوں سے بلند تر ہیں۔ ہماری فکر سے ماوراء ہیں۔ ہماری نظر سے دور ہیں۔ اور ایسا کہوں نہ ہوتا جب ہم آپ کے وحی کو نہ پہچان سکے اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمہارا طاثر فکر میری بلند یوں تک نہیں پہنچ سکتا تو ہم آپ کو کیا پہچانیں گے۔ مصلوات،

سیرت و کردار کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کا سمجھنا ہے حد ضروری ہوتا ہے اور ان کے نسب سیرت کا تجربہ نا کمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ صاحب کو دار نے اپنے بزرگوں سے کیا لیا ہے اور اپنے بعد والوں کو کیا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نے اپنے سماج اور معاشرہ سے کیا لیا ہے۔

اور اپنے سماج اور معاشرہ کو کیا دیا ہے۔ اور پھر اس کے ذاتی اوصاف و کمالات کا جائزہ لینے ہوئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان صفات و کمالات سے دنیا کو کیا حال ہوا اور اس کے فضا میں اس کی ذات تک محدود رہے یا اس سے دوسروں کو بھی فیض حاصل ہوا۔ اس نے صرف اپنے لئے زندگی گزار لی ہے یا اپنے سماج کو بھی کچھ دیا ہے اور اس کی بھی کوئی خدمت کی ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس نے جس ماحول میں کام کیا ہے اور جن حالات میں زندگی گزار لی ہے وہ حالات کیا تھے اور وہ ماحول کیسا تھا۔ دنیا اس کی آواز پر لپیک کہنے کو تیار تھی یا اسے فنا کے گھاٹ اتارنے پر آمادہ تھی۔ سماج کا ذہن اس کے پیغام کے لئے ہموار تھا یا اسے سستانے کے لئے تیار تھا۔ حالات کے دباؤ میں آکر اس نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی کی ہے یا اپنے موقف پر برابر قائم رہا ہے۔

سرور کائنات کی حیات طیبہ کا جائزہ لینے کے لئے انھیں امور کا تجربہ ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ مختصر سے وقت میں اتنی طویل داستان نہیں چھیڑ جاسکتی اور تھوڑے سے وقفہ میں عالم انوار سے لیکر صبح محشر تک کے کمالات کا نقشہ نہیں کھینچا جاسکتا۔ وہ ذہن کہاں سے آئے جو عالم انوار کی تصویر کھینچ سکے۔ وہ ظرف کہاں سے پیدا ہو جو صبح محشر کی منظر کشی کر سکے۔ وہ علم کہاں سے آئے جو محشر کے کمالات کا احاطہ کر سکے اور وہ فکر کہاں سے پیدا ہو جس میں کلر کا کردار سا سکے۔ جب یہ شرف انبیاء و مرسلین کو نہیں مل سکتا تو ہمیں اور آپ کو کہاں سے ملے گا۔ اور اس منزل کمال پر روح الامین عاجز رہے ہیں تو ہم اور آپ کہاں تک بردار کر سکیں گے۔ چند لمحوں میں صفت ایک خاک کھینچ دینا چاہتا ہوں اور بات کو کسی ایک منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

جہاں تک سرکارِ دو عالم کی سنس شرافت و عظمت کا تعلق ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نسلِ ابراہیم اور ذریتِ اسماعیل میں تھے۔ آپ کو میراث میں جذبہ قربانی اور حوصلہ ایثار ملا تھا۔ جناب ابراہیم واسمعیل کے بعد آپ کے جملہ آباء و اجداد طہیین و طاہرین اور اللہ کے پرستار تھے۔ آپ کے کسی بزرگ نے جبروں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور باطل کو سجدہ نہیں کیا۔ سب اس دعائے ابراہیم کا شرف بن کر دنیا میں آئے کہ پروردگار مجھے اذہیری ذریت کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا آپ کے بزرگوں میں جناب قصی بن کلاب جیسا سردارِ قریش، جناب عبد مناف جیسا ذوقِ وارہِ حرم، جناب اٹھم جیسا سخی و نیک دل، جناب عبدالمطلب جیسا صاحبِ ایمان و کردار، جناب عبداللہ جیسا ذبیح اللہ، جناب آمنہ جیسی پاکیزہ میرت خاتون اور جناب ابو طالب جیسا جاننازاد بشیرِ دل چچا تھا۔ بزرگوں سے ترکہ میں شرافت و نہایت سیادت و قیادت، سخاوت و عدالت، ایمان و کردار، تقویٰ و طہارت، قربانی و ایثار، ہمت و عزیمت و استقلال کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اور ایک انسان کی کردار سازی کے لئے یہ ترکہ بہت کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ الہی منصب وار بھی ہو۔ جہاں تک کسی کی تسلیم کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تربیت کی، نہ کسی کی آغوش کا محتاج ہوتا ہے، نہ ماحول کا۔ اس کی تعلیم صرف درسِ گاہِ رب العزت میں ہوتی ہے اور اس کی تربیت صرف دستِ قدرت سے انجام پاتی ہے اور ایلے حالات میں کہ دار کی عظمت کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مصلوات،

آپ نے اپنے بعد فالوں کو کیا دیا؟ اس کے لئے سبھی کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف آسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنے بعد

کے لئے وہ نسل جو مری ہے جس کا ایک ایک فرد بے نظیر اور ایک ایک شخصیتِ لاجواب ہے۔ یعنی ہے تدابیر کے لئے قابلِ تعظیم۔ پروردگار آغوشِ بھائی ہے تو نصیری کا کاغذ۔ نواسے ہیں تو اسلام کی عزت و اکبر۔ ذریت ہے تو دین و ایمان کی حفاظت اور آخری فرزند ہے تو عیسیٰ بن مریم کا امام مصلوات،

یہ صحیح ہے کہ ان میں ہر شہرہ تعلیم و تربیت سے بے نیاز ہے اور سب بارگاہِ رب العالمین کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ عالمِ سنئی میں اوویامہ کے کمالات میں نبوتِ بہر حال واسطہ ہوتی ہے۔ اور وہی تک کوئی مرتبہ نبوت کی نیابت ہی میں پہنچتا ہے۔ اس لئے اللہ نے جو کچھ بھی عطا کیا ہے اور جب بھی عطا کیا ہے نبی کو واسطہ ضرور بنایا ہے تاکہ شانِ نیابت و جانشینی محفوظ رہے اور دنیا و مہم کو نہ کھائے اور اسی لئے مولائے کائنات فرمایا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ نے ہزار بابِ تعلیم سکے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب نکالے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جو اتنا صاحبِ صلاحیت ہو کہ ایک ایک باب سے ہزار ہزار باب نکال سکے وہ کسی کی تعلیم کا محتاج کیا ہوگا علیٰ چاہتے تھے کہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ میں وہی رسول ہوں اور وہی کمال نبی کے واسطے آتا ہے۔ مجھے پیغمبر نے دنیا میں تسلیم نہیں دی ہے لیکن میرا کمال انہیں کے واسطے سے ملا ہے۔ مصلوات،

مرکزِ اعظم کو اپنے سماج سے کیا ملا؟ یہ داستان بڑی دردناک ہے آپ جس سماج میں مہوٹ ہوئے وہ اتنا پست اور ذلیل تھا کہ دنیا کی کوئی بڑائی ایسی نہیں تھی جو اس سماج میں موجود ہو۔ ذہنی اعتبار سے اتنے پست کو اپنے انہوں کے تراشے ہوئے جہم و دل کو خدا سمجھتے تھے اور اس کے بالاتر

قیامت یہ کہ صبح کو طوس کے خدا بناتے تھے اور خام کو سموس لگے پر نہیں کو کھا جاتے تھے۔ آپ خود روچیں کہ جو قوم اپنے خدا کو مٹا کر مٹا سکتی ہو اور اس کو ہضم کر جاتی ہو وہ دوسرے خدا کے بندوں کو کھول کر مٹا کر مٹا سکتی ہے۔

اخلاق اعتبار سے اتنے ذلیل کرنا عام، بدکاری شرف، عیاشی طرہ امتیاز، زکوٰۃ عزت نہ کوئی احترام، نہ کوئی شرافت نہ کوئی نجابت، چوری، دہشتی، رہزنی، شراب خوری، سود، جہاد اور ایسی تمام برائیوں کے سر تاپا عادی تھے۔

خیالات اتنے غلط کہ پیشوں کو زندہ دفن کر دینا شرف، عزتوں کا خون بہا دینا شجاعت، قبائلی کو تہ تیغ کر دینا ہمت، قوموں میں فساد کر دینا عزت اور انسانیت کا خون بہا دینا باعث امتیاز و منفردیت تھا۔

ایسی قوم کے لئے کیا دشوار تھا کہ اگر کوئی اس کے اپنے مذہب کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے خود ساختہ خداؤں کو باطل قرار دے تو اس کی راہ میں کانٹے بچھائیں، اس پر پتھروں کی بوچھاڑ کریں، اس کی زندگی کے درپے ہو جائیں اور اس کی پوری نسل کو تباہ و برباد کر دیں، لیکن کیا کہتا اس کریم النفس انسان کا اور کیا کہتا اس رحیم و کریم پیغمبر کا کہ اس نے سماج کو اتنے مظالم دیکھنے کے باوجود مقابلہ کرنا کیسا کبھی بددعا بھی نہیں کی، پیغمبر نے دالوں کو دعائیں دیں، کانٹے بچھانے والوں کو گلے لگایا، جان کے دشمنوں کو زندگی کا پیغام دیا، اخلاق کے مارے ہوئے افراد کو بارگاہ بنایا، شرابیوں کو عقل و ہوش کا سبق سکھایا، بدکرداروں کو نیک کردار بنایا، جہادوں کو اکل حلال کا سلیقہ بتایا، سود خوروں کو اثار کا سبق دیا، پیشوں کو زندگی کے کرنے والوں کو پیشوں کی تقسیم بتائی، بھائیوں کے قاتلوں کو موافقات کا سبق

دیا، قبائل کے دشمنوں کو محبت کا خون گر بنایا، رہزنیوں کو راہداریت دکھائی اور ڈاکوؤں کو جہاد راہ خدا کا راستہ دکھایا، غربت و پریشانی کا ذکر نہیں ہے، اس نے ہر حال میں قوم کے حال پر رحم کیا۔ وطن سے نکلا گیا لیکن قاتلانہ انداز سے داخلہ نہ کیا بھی انتقام نہیں لیا بلکہ ان ہی دی اور نادہی کیا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کال ایل امن کو بینا ہی بننے کا تھا اور عبداللہ کا فرزند عہدیت کے ناک پڑا دہی کا درس ہی دینے والا تھا۔ صلوات۔

نبی نے اپنے سماج کو کیا دیا؟ اس کا اندازہ اس دن ہر جا ب گئے فتح ہوا، اور آپ نے دشمنوں سے سوال کیا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ اور سب نے بیک زبان کہا کہ جو ایک کریم ابن کریم سے امید رکھی جاسکتی ہے۔ مرل اعظم نے عام معافی اور امن و امان کا اعلان کر کے بتا دیا کہ مسلح و آسشتی کے ماحول میں کردار کا اقرار لینا بہت آسان ہے اور متعدد فخریہ جنگوں کے بعد کرم کا کلمہ پرموعالینا بہت مشکل ہے۔ جیسے کردار کے آغاز و انجام کو ملا کر دیکھو تو میری زندگی کا راز کچھ میں آجائے گا، میں نے ابتدائی زندگی ایسی گزری کہ مجھے کچھ نہ سمجھنے والوں نے بھی صادق و امین سمجھا اور آخری زندگی اس شان سے گزاری کہ میرا مقابلہ کرنے والے بھی مجھے کریم ابن کریم ہی سمجھ رہے ہیں۔ صلوات،

لیکن اس مقام پر یہ یاد رکھئے گا کہ سرکاری معافی کا تعلق سرکاری جرائم ہی سے ہوتا ہے، عوام کے مجرمین کو معاف کرنے کا حق سرکار کو نہیں ہے، درندہ ظالموں سے ہمدردی اور کمزوری کے حق میں ایک نا ظلم ہو جائے گا۔ یہ وہ ہے کہ حق الہاد کو پروردگار بھی معاف نہیں کرتا۔ اب جو لوگ اسلامی انقلاب پر اعتماد رکھنے ہیں انہیں اس نکت پر بھی نگاہ رکھنا چاہیے۔

اور اسلامی قانون کو برطانوی قانون کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہیئے۔ اسلام ایک مستقل قانون ہے برطانیہ کا تابع نہیں ہے اور اس میں عوامی جرائم میں مراحیم ضرورہ کی کوئی گنجائش ہے۔

عزیزان محترم! جے اس موقع پر ایک منظر اور یا کم گجا جب مصنفین کے میدان میں علی کے لشکر نے شام کے لشکر کو شکست دے کر دریا پہ قبضہ کر لیا اور شام کے قبضہ کو ہٹا دیا تو لشکر علی کو پیاس سے مارنے والوں کے لشکر میں ایک ہتکھ تھ گیا۔ اب علی ہم سے انتقام لیں گے اور ہم پیاس سے تباہ ہو جائیں گے۔ شہزادہ یسویاد حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان تک پہنچی۔ اس نے آواز دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ علی بڑے کریم ہیں ہم پانی کا مطالبہ کرو وہ کبھی پانی بند نہ کریں گے۔

عزیزان محترم! منظر کو منظر سے ہٹا کر دیکھ لیجئے کہ دار کی عظمت کا اندازہ ہر جا بیگا۔ کن بنی تھے اور معاویہ کا باپ ابوسفیان تھا، اور آج علی ہیں اور ابوسفیان کا بیٹا معاویہ ہے۔ کن اپ نے بنی کے کرم کا اقرار کیا تھا اور آج بیٹا علی کے کرم کا اعتقاد کر رہا ہے۔ پہچانا آپ نے کون کس کا وارث ہے۔ اور کس کے پاس کس کی سیرت ہے۔ شام تک ابوسفیان کا اندازہ پہنچاؤ اور علی تک محمد مصطفیٰ کا کردار آ پاپا ہے۔ مسلمات،

بنی اکرم کی سیرت گواہ ہے کہ آپ نے اپنے سماج کو دیا ہی ہے اس سے کچھ لیا نہیں۔ سماج سے لیا ہوتا تو بت پرست ہوتے، شراب خوار ہوتے، قمار بازی فرماتے، سود کے عادی ہوتے، قاتل و سفاک ہوتے، اور ماسخوں کی برائیوں کے حصہ دار ہوتے، لیکن آپ کی زندگی میں ان باتوں کا تصور

نہیں ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے سماج سے کچھ لیا نہیں ہے۔ بلکہ اسے کچھ دیا ہی ہے اور اتنا عطا کیا ہے کہ شراب خواروں کو تسلی بنا دیا ہے۔ قمار بازوں کو کریم بنا دیا ہے۔ سود خواروں کو فنی بنا دیا ہے۔ قاتلوں کو شہید بنا دیا ہے۔ خوریزوں کو مجاہد بنا دیا ہے۔ پتھروں کے بجائے یوں کو دھندلا کر ایک کا بندہ بنا دیا ہے۔

حدیہ ہے کہ عرب کے امتیازی کمال فصاحت و بلاغت اور زبان واد سے بھی آپ نے کچھ لیا نہیں اور اس میدان میں بھی انھیں کچھ دیا ہی ہے۔ اسے ادب لیا ہوتا تو انھیں کے انداز میں گفتگو کرتے اور ساری فصاحت و بلاغت اونٹ، گھوڑا، تلوار، شراب اور عورت کی تہہ ہرجاتی، لیکن انھیں دیا اور اتنا دیا کہ اونٹ، گھوڑے، شراب، عورت اور تلوار کے پرستاروں کو تو میدان، عداوت، نبوت، امامت، قیامت، جنت و جہنم، زمین و آسمان، ماضی و معاصر کے جیسے اہم سوچاوت دے دیئے اور عورتوں کے ظاہری حسن اور مشوق کے کھنڈرات کا بتم کرنے والوں کو الحاح بلند کہنے کا سلیقہ سکھا دیا۔

تاریخ عرب گواہ ہے کہ حضور اکرم بھی سماج کے پروردہ اور ماسخوں کے پابن ہوتے تو عرب میں بیسے مملقات ہوتے قرآن حکیم نہ ہوتا، مسحور کن خطابت و شاعری ہوتی معجزنا کلام نہ ہوتا، یہ حضور سرور کائنات کا احسان ہے کہ آج دنیائے عرب ساری کائنات کو جلیج کر سکتی ہے اور اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ معجزنا کلام مرث جایی زبان میں آیا ہے اور کسی زبان میں نہیں ہے۔ اعجاز کے لہجہ میں صرف گفتگو کرتے ہیں کسی اور قوم کو اس لہجہ میں گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے۔ مسلمات اس کے بعد ایک نظر حضور کے ذاتی فضائل و کمالات پر ڈالئے کہ آپ نے

زندگی کے عظیم کارنامے کس ماحول میں انجام دیئے ہیں اور کتنے مختصر وقت میں کتنا اسہم کام کیا ہے۔

جہاں تک ذاتی کمالات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے، یہاں زبان کھولنا آفتاب کو چرخہ دکھانے کے برابر ہے اور اس موضوع پر بھی بحث کرنے کی ضرورت ہوتی اگر کسی نے کمال کے انکار کرنے کی ہمت کی ہوتی اور جب دشمن تک کمال کے مترق ہیں تو تفصیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ذکر خیر کی افادیت کے پیش نظر چند کلمات کافی ہیں۔

آپ کے علم کو دیکھا جائے تو آپ کے اس دنیا میں آنے کی عسہ من ہمایہ ہے کہ قوم کو کتاب و حکمت کی تسلیم دیں اور ان کے درمیان تلاوت کتاب کریں یعنی دنیا میں اگر تعلیم حاصل کرنے والے اور ہیں اور دنیا کو تسلیم دینے کے لئے آنے والے اور ہیں۔ آپ کے الہی علم کا نتیجہ ہے کہ جاوید گروں کو محبت سے آشنا کر دیا اور جاہلیت کے مارے ہمتوں کو علم کتاب و حکمت دے دیا۔ آپ کی محفل ایک مدرّسہ فکر و نظر تھی، جہاں صاحبانِ صلاحیت علوم و کمالات کے خواہر حاصل کر رہے تھے اور صبح و شام حقائقِ قرآن کا چرچا تھا۔ آپ کی نیانِ اقدس پر قرآن ہے تو سرِ شجرہ کمالات اور حدیث ہے تو مصدرِ فضائل و کمالات — اب یہ اپنے اپنے فن کی بات ہے کہ کتنا حاصل ہو گا اور کون کس قدر فائدہ اٹھائے گا۔ نبی کا دریا ئے فیض جاری ہے چاہے انسان مقدار بن جائے یا ابولہب ابوہو بن جائے یا ابوجہل حضرت کے کردار پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ بابِ بہار سے گلاب بھی پلنے میں اور کانٹے بھی۔ اب نیسان سے امرت بھی بنتا ہے اور زہر بھی۔ صاحبِ صلاحیت ہوتا ہے تو علم کے مسلمان بن جاتا ہے، کم ظرف ہوتا ہے

تو مسلمان بھی نہیں ہوتا۔ مسلمات،

سفادت کو دیکھا جائے تو پوری پوری دولتِ خدیجہ سماج پر عین ہوتی نظر آتی ہے۔ عرب کی تاریخ گماہ ہے کہ جنابِ خدیجہ عرب میں سب سے بڑی دولتمند خاتون تھیں۔ اور جب حضورِ سرورِ کائنات کے عہد میں آئی ہیں تو اپنی ساری دولت ہمراہ لے کر آئی ہیں لیکن چند روز کے بعد خدیجہ کی بیٹی کو فائے کونے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ دینا بتائے کہ اتنی بڑی دولت کیا ہوئی اور اتنا عظیم خزانہ کہاں چلا گیا۔ یہ حضورِ سرورِ کائنات کی سفادت اور آپ کا کرم ہی تھا کہ گھر میں نانے ہو رہے تھے اور قوم کے فقیر غنی بن رہے تھے۔ مسلمات، شانِ تجارت یہ ہے کہ زندگی میں دعائیں سفر تجارت فرمائے۔ ایک مرتبہ کمسنی کے عالم میں اپنے چچا جنابِ ابوطالب کے ساتھ گئے تو عالم یہ تھا کہ راستہ کے عیسائی ماب نے دیکھ کر آواز دی کہ ابوطالب اس بچے کو دالیں لے جاؤ اور اسے شہرِ شہنشاہ پہنچاؤ۔ میں اس کے چہرہ میں نبوت و رسالت کے آثار دیکھ رہا ہوں اور غریب یہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت ثابت ہو گا۔ اور دوسری مرتبہ جب جوانی کے عالم میں گئے تو اتنی برکت حاصل ہوئی کہ جب جنابِ خدیجہ کے غلام نے مالک کو راستہ کے کلمات کی اطلاع دی تو خدیجہ نے سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر عقد کا پیغام دے دیا اور ایک اپنے ہی مال سے تجارت کرنے والے، مال کے قدموں میں ساری دولت ڈال دی اور خود بھی اس کی خادیم بن گئیں۔ اس کو دار کا کوئی جواب ہے کہ انسان ایک سفر تجارت میں اتنی بڑی کائنات کا مالک ہو جائے اور ایک سال تجارت سے زندگی کے بیشتر مسائل حل کر دے اور مجھے تو جنابِ خدیجہ کے فنِ ذکر و دار کی بھی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ جہاں سماج میں اپنے سے

مزدِ طبع کے انسان کو منہ لگانا عیب ہو رہا اس طبقہ کی ایک فرد کو اپنے مقتدر کا مالک بنا دیا جائے، اور جہاں بڑے بڑے منادین قریش کے پناہات کو ٹھکوا دیا گیا ہو وہاں ایک فقیم عبادت کی کنیت ہی اختیار کر لی جائے۔

یاد رکھئے! غروت و اغلاس کے عالم میں زوجیت کے سایہ میں پناہ لینا اور ہے اور دولت و سرمایہ کی آغوش میں شرمہر کی پڑوسی اُمت کو پناہ دینا اور ہے مصلوات،

عبادت کا عالم اور بہن جنت انگینہ اور تعجب خیز تھا، کہ رات رات بھر مسجد اور دن بھر مسجد، قیام و قعود، رکعت و سجود، تلاوتِ قرآن، ذکر و فکر کے مشغلے، غار کی منزل اور عبادت پروردگار۔ زندگی کے کارناموں کا آغاز ہی شانِ عبادت سے ہوتا ہے اور تاریخ کو کردار کا تراش ہی غارِ حرا کے ذکر و فکر سے ملتا ہے اور معراجِ عبادت کا عالم یہ ہے کہ ساری کائنات سے بندگی کا مطالبہ کرنے والا پروردگار خود یہ کہتا ہے کہ میرے حبیبِ مانتوں کو ذرا سو جایا کر دیہ حکم خدا پر مسجدوں کے لئے اٹھنا اور ہے اور حکمِ خدا سے مصلیٰ چھوڑ کر آرام کرنا اور ہے۔

پیشانی اپنی میں دیکھی ہے یا مٹی میں کبھی حکمِ خدا سے بنی کہ آرام کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کبھی حکمِ رسول سے مٹی کو بسترِ ہجرت پر سونے ہوئے دیکھا ہے حکمِ خدا سے ذرا دیر آرام کرے تو بنی اور حکمِ بنی سے تمام راستہ چین سے سونے تو ملی مصلوات،

خدا کو بھی یہ شانِ عبادت اس قدر پسند آئی کہ معراج کی رات عرشِ اعظم پر بھی بلایا تو محبت و نبوت کے نام پر نہیں۔ رسالت و سیادت کے نام پر نہیں، بلکہ ارشاد ہوا۔ صَلَواتُ الذی اسرخی بعبادہ یعنی یہ معراج، رسالت و نبوت

کی معراج نہیں ہے، عبدیت اور بندگی کی معراج ہے مصلوات،

عبادت ہی کی طرح زہد و قناعت کا انداز بھی جدا گانہ ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں اور تبلیغِ اسلام ہو رہی ہے، گھر میں قلعے ہو رہے ہیں اور گاہِ ہایت انعام پارا ہے، دولتِ خدیجہ کٹ رہی ہے اور اپنے لئے ایک ایک خرمن کے عرصہ ایک ایک ڈول پانی کھینچا جا رہا ہے۔ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ زہد و تہمت کائنات ہر، زیرِ بگیں جنت اور بہارِ جنت ہوا زیرِ اثر جن و ملک ہوں اور گھر کی زندگی اتنی سادہ اور فقیرانہ ہو۔ یہ سب کیوں تھا یہ درحقیقت یہ محنت کا ایک انداز تھا، کہ آج میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا ہوں، میرے اختیار میں ساری کائنات ہے لیکن کن میری اُمت کا کیا ہو گا اور۔ پھر ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ ناہم اُمت عیش و عشرت ہی کہ مذہب و ملت کا نام دے دیگی اور یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا کہ آج جب سیرتِ رسول کی اتنی سادگی پیشِ نظر ہے تو درباروں پر رہنمی پرکھ پڑ گئے ہیں، اگر کہیں سرکار کی زندگی میں بھی رہنمائی آگئی ہوتی تو اسلامِ قہریت و کسرت کا دور نام ہو جاتا اور دینِ الہی فنا کے گھاٹ اُتر جاتا۔ کھد اور شام کی زندگی میں ہی فرق ہے کہ کوئی کاشنشاہِ حصرِ مسجد پر بیٹھا ہے اور شام کا حاکم قریشِ مغل پر آرام کرتا ہے۔ اور کوئی پنیسہ آواز دے رہا ہے کہ میرا جانشین آسمانِ مغل نہیں ہوتا، آؤ تو اب ہوتا ہے مصلوات،

ان حالات کو دیکھنے کے بعد جب سہ کا یہ دو عالم کی شانِ خجاعت پر نظر جاتی ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی، کہ ایک ایسا انسان جس کے دن محنت و مزدوری میں گزرتے ہوں، جس کی رات مصلیٰ پر گزرتی ہو، جس کے کام عبادت و ریاضت ہوں اور جس کی زندگی صرف زہد و قناعت ہو، اسے

میدان جنگ سے کیا واسطہ۔ لیکن یہ سرکارِ دود عالم کے کرواد کی ہمتی اور جامعیت تھی کہ آپ جہاں مصطفیٰ پر عاید شہ زندہ وار تھے وہاں میدانِ جہاد میں سرور لشکر۔ جہاں بوریائے فقر پر ایک خاکِ نشین انسان تھے۔ وہاں سناہِ جنگ پر ایک قائمہ ہم آزا۔ آپ بھی شجاعت کے تجزیہ کے لئے اسلام کے نام سرکاروں کا تجزیہ ضرور ہی ہے اور اس کا عمل و حرکت نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یہ کہنا کافی ہے کہ آپ سناہِ تسلیم پر آئے تو پھر برستے رہے لیکن اپنا ماسستہ نہیں بدلا، اور سناہِ جنگ پر آئے تو ثنات و استقلال کا مرتبہ بن گئے۔ آپ کا کوئی جہاد نہ اسلحہ کا معزین کرم سخاۃ لشکر کا، جہاں لشکر کے قدم اکھڑ گئے ہیں وہاں آپ ثابت قدم رہے، اور جہاں سپاہیوں کے سر نہ اٹھے تھے وہاں آپ میدانِ جنگ میں نظر آئے۔ سرکار کی شجاعت کا اندازہ دیکھنا ہے تو علی سے پوچھئے۔ جس نے ہر میدان میں آخر تک ثابت قدم رہا۔ وہ کرم شجاعت و استقلال کا مشاہدہ کیا ہے اور جب احد کے میدان میں حضورؐ نے کہا کیا علیؑ جب سب چلے گئے تو تم کیوں نہیں گئے؟ تو عرض کی، حضور میں آپ کے نقشہ قدم پر ہوں۔ جب تک آپ نہ چلے جائیں گے میں بھی نہ جاؤں گا۔ گمراہ اشارہ تھا کہ نبی کی شجاعت کا اندازہ کرنا ہے تو میری شجاعت کو دیکھو، جب وہی کا ثنات قدم یہ ہے تو نبی کا عالم کیا ہوگا اور شاید اسی لئے قدرت نے علیؑ کے ہاتھ میں ذوالفقار دے دی کہ علیؑ دینی کے مراتب کا فرق بھی محسوس طور ہے اور دنیا دیکھ لے کہ تلوار کے جوہر دکھانے والا وہی ہوتا ہے اور تلوار کے نسب۔ میدانِ جہاد میں ثابت قدم رہنے والا نبی صلوٰۃ ورحمۃ اللہ علیہ اس فرق سے قطع نظر کر لیا جائے تو علیؑ کی شجاعت و ہمت بھی تلوار کی معزین کرم نہیں ہے علیؑ نے روزِ اول ہی تلوار سے بے نیازی کا اعتراف کر دیا تھا اور دنیا کو بتا دیا تھا کہ بدر و احد و خیبر و خندق میں میری تلوار کے جوہر

بسد میں دیکھنا، ہجرت کی رات میرا صبر و سکون پہلے دیکھ لو تا کہ اندازہ ہو جائے کہ تلوار پر بھروسہ کرنے والے اور ہونے ہیں اور گرداہ پر بھروسہ کرنے والے اور۔ تلوار پر تکیہ کرنے والوں کی شان اور ہوتی ہے اور نصرت الہی پر اعتماد کرنے والوں کا اندازہ اور مصلوات،

گرداہ نیزہ کے انھیں پلوؤں پر منتظر کرنے کے سبب خاتمہ کلام میں سرکار کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاک پریش کر کے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے کتنے مختصر وقت میں کتنے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں، فراموشی کا یہ عالم تھا کہ تلاوتِ قرآن بھی کرنا ہے اور تہذیبہ نفوس بھی۔ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دینا ہے اور دین کے اصول بھی سکھانے ہیں۔ فردعی تعلیمات اور احکام شریعت بھی بتانا ہیں اور امت کی پردہ نشی بھی کرنا ہے، بگیوں اور کوچوں میں توحید کی آواز بھی بلند کرنا ہے اور مریضوں کی عیادت بھی کرنا ہے۔ مرنے والوں کے جنازے بھی اٹھانا ہیں اور دوسرے ملکوں میں اسلامی نمائندے بھی بھیجنا ہیں اور انھیں تبلیغی احکام و اصول کی بھی تعلیم دینا ہے، ازدواج کے نفقہ کا بھی انتظام کرنا ہے اور بچوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرنا ہے، اصحاب کی تعلیم و تدریس کا بھی اہتمام کرنا ہے اور سماج کے مشکلات میں بھی کام آنا ہے، لوگوں کی امانتوں کو رکھنا اور واپس بھی کرنا ہے، اور صافروہ کے ہر اہم موقع پر حاضر بھی رہنا ہے، حج بیت اللہ کی قیادت بھی کرنا ہے اور میدانوں میں حاضری بھی دینا ہے۔ مسلمانوں کو جماعت بھی پڑھانا ہے اور تلاوتِ قرآن کے آداب بھی سقور کرنا ہیں۔ خدیجہ کی بے پناہ تجارت و دولت کا انتظام بھی کرنا ہے اور ان تمام کاموں کے لئے وقت اتنا مختصر ہے کہ زندگی کے چالیس سال خاموش گزر گئے ہیں۔ ایک مدت غارِ حرا کی خاموش عبادت

ہیں گزری ہے تین سال شغب ابوطالب میں خاصہ کی مصیبت برداشت کی ہے۔  
 لگ بھگ اسی لڑائیاں لڑی ہیں، متعدد سفیرانِ مملکت سے ردِ باطل رکھے ہیں،  
 جنگوں کے لئے لشکر تیار کیا ہے اور انھیں فنونِ جنگ تسلیم کئے ہیں۔ مہاجر کے  
 میدان کو سر کیا ہے، بچوں کے لئے باقہ بنے ہیں، سجدہ کو ٹول دیا ہے، ذہک کا  
 بند دہشت کیا ہے، فتح مکہ کے سونے پر بت شکنی کا انتظام کیا ہے، دطن چھوڑ  
 کر ہجرت فرمائی ہے، انصار و مہاجرین کے درمیان موافقات و برادری قائم  
 کی ہے، حدیبیہ میں صلح کی ہے، بیٹی کا عقد کیا ہے، نواسوں کی ناز برداری  
 کی ہے، حاشیہ نشینوں کو عرب صحرائی سے خیر امت بنایا ہے، آدمی کو انسان  
 انسان کو سامان اور مسلمان کو مسلمان بنایا ہے، اتنے سکھانا سوں کو اتنی مختصر  
 ۴ سال کی تسلینی دت پر تقسیم کر دیا جائے تو شاید ایک کام کے لئے ایک  
 دن کا وقت بھی نہ ملے گا، لیکن یہ رسولِ اسلام کی مہرِ نازندگی تھی کہ اتنے ہی  
 عرصہ میں سارا کام انجام دے دیا اور اس طرح انجام دے دیا کہ درست  
 تو دوست دشمن نے بھی کمال کردار کا اقرار کر لیا اور مسلمان تو مسلمان ہے  
 خالق کائنات نے بھی میدانِ غدیر میں اعلان کر دیا کہ آج میں نے دین کو کمال  
 کر دیا، اور شیعتوں کو تمام کر دیا اور دینِ اسلام سے راضی ہو گیا۔ صلوات  
 ان تمام باتوں کے بعد سب سے بڑا امتیازی کردار یہ ہے کہ کبھی اپنے  
 کو رئیس اور حاکم کی شان سے نہیں پیش کیا، بلکہ امت کے ہر دھوکہ و درد میں  
 شریک رہے اور برابر کا ہر ناؤ کرتے رہے۔ آپ اس موقع کو یاد کریں کہ  
 جب زندگی کے آخری لمحات تھے اور مرض الموت میں مسجد تک آکر آپ نے اعلان  
 کیا کہ میں عنقریب دینا سے جانے والا ہوں، اگر کسی کا کوئی حق میرے ذمہ ہو

عزادارانِ امام! آپ نے محسوس کیا کہ امام محمد باقرؑ کو کس قدر حسرت ہے  
 کہ امام کا ماتم کیا جائے۔ اور ان پر گریہ کیا جائے۔ متی کے میدان میں حج کے موقع  
 پر تاکہ دنیا سے اسلام گریہ کو دیکھ کر یہ پوچھے کہ یہ کس مظلوم کا ماتم ہو رہا ہے۔  
 اور ہماری شہادت کا راز دنیا کے سامنے آجائے۔ اسی راز شہادت میں مذہب  
 کی زندگی ہے اور اسی جستجو میں ہمارے مقصد کی حیات ہے۔ نہ جانے اس  
 گریہ میں کیا کشش ہے کہ امام حسینؑ نے وصیت کی تو اسی گریہ کی۔ امام سجادؑ  
 نے زندگی گزار دی تو اسی گریہ میں۔ امام محمد باقرؑ نے تاکید کی تو اسی گریہ کے لئے  
 خود معصومہ عالم نے بھی سوال کیا تو یہی سوال کیا کہ بابا جب میرے لال کی شہادت  
 کے وقت آپ نہ ہوں گے۔ میں نہ ہوں گی۔ ابوالحسنؑ نہ ہوں گے۔ میرا حسنؑ نہ ہوگا  
 تو بابا میرے لال پر روئے گا کون؟ اور میرے فرزند کی صفِ عزاکون بچائے  
 گا؟ اور بغیرِ اسلام نے تسکین دی بیٹی نہ ہر گھر او نہیں۔ اللہ ایک قوم پیدا  
 کرے گا جس کے مرد مردوں کا ماتم کریں گے اور اس کی عورتیں عورتوں کے  
 مصائب پر گریہ کریں گی۔ میں کہتا ہوں شہزادی یہ اپنے یہ کیا سوال کر لیا۔ آپ  
 نہ رہیں گی۔ بابا نہ رہیں گے۔ مولائے کائنات نہ رہیں گے۔ حسنؑ مجتبیٰ نہ رہیں گے۔ خدا  
 رکھے زینبؑ تو رہیں گی۔ ام کلثومؑ تو رہیں گی۔ سکینہؑ تو رہیں گی۔ عابدؑ بیمار تو رہیں  
 گے۔ لیکن عجب نہیں شہزادی فرمائیں مجھے قیامت تک کے گریہ کی فکر ہے کہ  
 یہ سلسلہ عزا کیسے قائم رہے گا اور کربلا کے بارے میں بھی مجھے معلوم ہے کہ  
 سب رہیں گے۔ لیکن کوئی رو نہ سکے گا۔ زینبؑ دامِ کلثومؑ رہیں گی لیکن گریہ  
 کریں گی تو تازیانے لگیں گے۔ سکینہؑ رہے گی لیکن گریہ کرے گی تو شمرؑ طاعنے  
 کھائے گی۔ میرا عابد بیمار رہے گا لیکن ایتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی۔ بیرون  
 میں بیڑیاں۔ گلے میں طوقِ خاردار۔ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں گے تو نوکِ نیزہ

سے اذیت دی جائے گی۔ یہی تو راز تھا کہ جب قید شام سے رہائی ہوئی تو سات دن تک بہن نے بھائی کا ماتم کیا اور جب پٹ کر مدینہ آئیں تو قبر رسولؐ پر جا کر آواز دی "انا میں آپ کے حسین کی سنانی یکسر آئی ہوں۔ انا ہم کربلا میں رہ گئے۔ ہمارا بیٹا مارا گیا۔ انا ہمیں قیدی بنایا گیا۔ انا ہم کو فدو شام کے بازاروں میں گئے۔ انا ہمیں دربارِ بادشاہ میں لے جایا گیا۔ انا ہم پر کتنے مصائب پڑے کیسے بیان کریں۔ بس مختصر یہ ہے کہ اگر آپ کی قبر پر نامحرموں کا مجمع نہ ہوتا تو شانوں سے رواں ہوا کرد کھاتی کہ ہم کس طرح کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھاتے ہوئے گئے ہیں کوئی ہمارا فریاد سننے والا نہ تھا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

## جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

|             |   |                                                           |
|-------------|---|-----------------------------------------------------------|
| اسم مبارک   | : | فاطمہؑ                                                    |
| لقب         | : | زہرا، بتول، صدیقہ وغیرہ                                   |
| کنیت        | : | ام اللہ، ام ایہا                                          |
| والد ماجد   | : | حضرت محمد مصطفیٰؐ                                         |
| والدہ ماجدہ | : | جناب خدیجہؑ                                               |
| ولادت       | : | ۲۰ جمادی الثانیہ ۶۱۰ھ، یثرب، مکہ معظمہ                    |
| اولاد       | : | امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب اکرمؑ، جناب محمدؑ |
| شہادت       | : | ۱۰ جمادی الاولیٰ ۶۱۱ھ، ۱۲ جمادی الثانیہ ۶۱۱ھ              |
| عمر مبارک   | : | ۱۸ سال                                                    |
| قبر مطہر    | : | بین قبر و قبر رسولؐ، یا حنت البقیع                        |

درجہ منورہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على اشرف الاولين  
والآخين خاتم النبيين سيدنا ورحلانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين  
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله  
الحكيم في كتابه الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَرَاتٍ لَّنَا كَلَّاخَرَّةً ۖ وَلَا اُولٰٓئِكَ

الکتاب کائنات کا ارشاد ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر  
ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

کتنا کریم ہے وہ مالک جس نے عالم ہستی میں انسانیت کو بنے رہنا نہیں  
چھوڑا اور ہر دور میں ہدایت کی ذمہ داری لے کر انسانیت کو منزل کمال تک پہنچنے  
کا سہارا دے دیا، بد نصیب ہیں وہ افراد جو الہی رہنمائی سے غافل نہ اٹھائیں اور  
قدرت کے انتظام ہدایت کو چھوڑ کر اپنے انتظام کی فکر میں لگ جائیں اور خوش نصیب  
ہیں وہ افراد جو منزل تسلیم و رضا طے کرتے ہوئے اپنے اختیار حیات کو مالک کائنات  
کے حوالے کر دیں اور سراپا اتنا اللہ کی تصویر بن جائیں۔

میں نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جسے پروردگار عالم ہدایت  
عالم کے لئے معین کرتا ہے اس کا انداز دنیا کے رہنماؤں سے بالکل مختلف  
ہوتا ہے۔ وہ عالم پیدا ہوتا ہے اور عالم رہتا ہے، وہ صواب عصمت پیدا  
ہوتا ہے اور معصوم رہتا ہے، اس کی زندگی کمالات کا آئینہ ہوتی ہے، اور  
اس کے کمالات جمال و جلال الہی کا برتو ہوتے ہیں۔

تفصیل کے ساتھ جملہ رہنمایانِ امت کے حالات پر تبصرو کرنا مقصود نہیں  
ہے اور ذاتی گنجائش ہے، صرف ایک فرد کے حالات پر بھی سی روشنی ڈال دینا  
چاہتا ہوں جس سے باقی افراد کے کردار کا باسانی اندازہ ہو جائے گا اور یہ محسوس  
کرنا آسان ہوگا کہ جب پہلی منزل پر اتنا اہتمام ہے تو باقی منازل پر اس اہتمام  
کے نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟

مختصر الفاظ میں مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب کے حالات زندگی اور  
آپ کی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ الہی رہنمائی کیسے سخت حالات  
میں اپنے فرائض ہدایت کو انجام دیتا ہے۔

مولائے کائنات کی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ  
یہ ہے کہ آپ کے ذاتی فرائض و کمالات کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ  
نفسانی کمالات اور روحانی فرائض میں کس منزل پر فائز تھے اور آپ کی منزل  
خدا و رسول یا الہی دنیا کی نگاہ میں کیا تھی؟ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے کامیابیوں  
پر نگاہ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ نے مساعدا یا مساعد حالات میں کس طرح  
زندگی گزاری ہے؟ اور اپنے گرد و پیش کے حالات کو کس طرح برتنا ہے؟

سیکھنے والوں راستے ایسے ہیں جس کا طے کرنا محال نہیں تو در خوا  
ضرر ہے، کہاں کو دایا بن ابی طالب اور کہاں مجھ جیسا بندہ ذلیل، کہاں محمد و ج  
خدا و رسول اور کہاں مجھ جیسا بے بغاوت مہاجر، کہاں ساقی کوثر کی مثلہ اور کہاں  
یہ زبانی محسن، کہاں بابِ بین العلم کی توصیف اور کہاں مجھ جیسا جاہل، کہاں گروشن آفتاب  
کا بٹکانے والا اور کہاں میرا جیسا برگشتہ مقدر، لیکن اسی کا نام لے کر قدم آگے  
بڑھانا چاہتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ جہاں ٹھوکر کھاؤں مجھ کو وہ سبب ضرور دے گا۔

اور جب کوئی مشک پڑے گی وہ حل ضرور کر دے گا، اور مشکلات میں اسے نہ پکارو گے تو کسے پکاروں گا، دوسرا کون ہے جو مشکلات میں کام آسکے، اور زندگی کے مسائل حل کر سکے۔ تجربہ ہی کہتا ہے کہ اسے بلاؤ جو غریبوں اور مفلسوں کے بلائے پر آجائے، اسے نہ بلاؤ جو پیسہ کے بلائے پر بھی نہ آئے، مصلوات،

مولائے کائنات کے ذاتی فضائل کو دیکھنا ہے تو آغاز حیات سے دیکھئے پہلی ہی منزل پر وہ شرف نظر آئیگا جس میں کائنات کا کوئی انسان حصہ دار نہیں ہے اور دوسرے کا کیا ذکر، اس شرف میں خاتم النبیین کو بھی شریک نہیں بنایا گیا تو کسی دوسرے کو کیا بنایا جائے گا۔ یہ علی کا تھا شرف ہے کہ اولین و آخرین میں خاندان کعبہ میں سوائے مولائے کائنات کے کوئی دوسرا نہیں پیدا ہوا، ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کچھ کچھ ممکن ہے کوئی ایسا شرف دیا جائے جس سے نبی کو بھی محروم رکھا جائے، کیا علی کا مرتبہ نبی سے بالاتر ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ لیکن میں عرض کر دوں گا کہ ایک ولادت کا کیا ذکر ہے، شہادت کی مسند پر نہ دیکھ لیجئے جہاں خود محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ نے مصلحتاً اپنے حبیب کو شرف شہادت سے الگ رکھا اور مصلحت یہ ہے کہ اگر حضور کو تلوار کی شہادت دی جاتی تو زہر کی شہادت سے محروم رہ جاتے اور اگر زہر کی شہادت دی جاتی تو تلوار کی شہادت سے محروم رہ جاتے، دونوں شہادتیں بیک وقت ممکن نہیں تھیں، اس لئے اللہ نے آپ کو شہادت سے الگ کر کے آپ کے فرزند حسن و حسین کو دونوں طرح کی شہادت دی تاکہ ان کی شہادت نبی کی شہادت بن جائے اور ان کے ذریعہ سے نبی کے کلمات کی تکمیل ہو جائے۔ اب اگر محدث دہلوی کی نگاہ میں

شہزادوں کی شہادت سے نبی کی شہادت کی تکمیل ہو سکتی ہے تو دوسری ولادت سے نبی کے شرف ولادت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

اور مجھے تو اس منزل پر یہ کہنا ہے کہ محدث دہلوی کی تحقیق میں بھی مولائے کائنات کے فضائل کا ایک پہلو نظر آتا ہے کہ اللہ نے پیغمبر کو درجہ شہادت اس لئے نہیں دیا کہ ایک ذائقہ شرف شہادت سے محروم رہ جائیں گے اور درجہ شہادت ناممکن رہ جائے گا۔ مجھ کو کہنا مولائے کائنات کا کہ انھیں دونوں شرف براہ راست مل گئے اور کسی واسطہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم نے زہر میں تلوار بھائی ہے اور علی پنج دسکیں گے اور علی مطمئن تھے کہ دشمنی ہی سے بیکہ شرف کی تکمیل ہو رہی ہے اور بیک وقت زہر کی شہادت بھی مل رہی ہے اور تلوار کی شہادت بھی نصیب ہو رہی ہے۔ مصلوات،

ولادت کے بعد ایک نظر علم و فضل پر ڈالنا اگرگی جہاں یہ دیکھنا ہے کہ مولائے کائنات کے علم کی منزل کیا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے خانہ کعبہ کے قریب آجائے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ سے آ رہی ہیں، پیغمبر اسلام استقبال کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ بچہ نبی کی آغوش میں آ رہا ہے اور انھیں کھول کر تقاضہ کر رہا ہے، خدا کے حبیب کچھ پڑھوں؟ پیغمبر نے اجازت دی تو بیت و انجیل و زبور و سہ آں کی تلاوت شروع کر دی، اور اس انداز سے تلاوت کی کہ نبی کو کہنا پڑا کہ آسمانی صحیفے یوں پڑھے کہ ان کے انبیاء بھی نہ پڑھ سکتے تھے، اور قرآن حکیم اس طرح پڑھا جو تلاوت کرنے کا حق تھا۔ مصلوات،

کھلی ہوئی بات ہے کہ جو بچہ پیدا ہو کر آسمانی صحیفوں کی تلاوت

کرسکتا ہے۔ اس کی جانی کا دیکھ کمال کیا ہوگا۔ اور یہ تو میں نے بہم دنیا کی بنا پر کہہ دیا اور نہ یہاں تو کمال کی وہ منزل ہے جہاں پہنچنے اور جانی کا کوئی فرق نہیں ہے، جو منزل ہے وہ منزل کمال ہے اور جو عمر ہے وہ عمر فضائل ہے۔ شوق صرف یہ ہے کہ پہنچنے میں نبی نے کمال دیکھا تھا تو انہوں نے سند فضیلت دے دی، اور آگے چل کر ساری دنیا کالات کا مشاہدہ کرے گا تو سب عمت ابن فضیلت کریں گے۔ اور ایوں کا کیا ذکر ہے جو غیہ میں وہ بھی ہیں کہیں گے تو اگر علی نہ ہوتے تو سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں تھا۔

دنیا نے اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ علی بن ابی طالب سے نہ ملتا ہو علم قرآن ہو یا تفسیر، علم حدیث ہو یا فقہ، علم فرائض ہو یا علم احکام، علم تصون ہو یا علم کلام، علم نحو ہو یا علم صرف، علم منطق ہو یا علم فلسفہ، علم شعر ہو یا علم کتابت، علم خطابت ہو یا علم حساب، علم ہیئت ہو یا علم جفر۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ مولائے کائنات سے نہ ملتا ہو۔ اور اس کی قرآنی دلیل بھی یہ ہے کہ اللہ نے علی کو دارث کتاب اور امام بین قرار دیا ہے اور جو کچھ کتاب میں ہے وہ سینہ علی میں ہے اور جو کچھ کائنات میں ہے وہ قلب امام میں ہے، یہی علم ہے جسے دیکھ کر نبی نے فرمایا تھا کہ میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، جیسے شہر کے پاس آنا ہو وہ دروازے سے آئے اور نہ ہی علم تھا جس کا مشاہدہ کر کے دنیا نے علم و فلسفہ سب سے بڑا سمجھا اور آج تک ہے، اور اسی علم کا کرشمہ تھا کہ سب کو وہ بے سلسل اعلان ہو رہا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو، قبل اس کے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہ جاؤں۔ میرے پاس زمین و آسمان دونوں کا

علم ہے، میرے سینے میں علم کا خزانہ ہے، میں اس بلندی پر ہوں جہاں سے علم کا سیلاب بہہ کر نکلتا ہے اور جہاں تک کسی کا طائر خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔

تاریخ کائنات میں کوئی اس شان کا دعویٰ کرنے والا نہیں ملا، مگر علی نے یہ دعویٰ کر کے واضح کر دیا کہ اہل دنیا میرے علم کا مقابلہ کیا کریں گے وہ میرے علم کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، تحت و تاج پر قبضہ کر لینا آسان ہے، مسند علم پر جلوہ گر ہونا مشکل ہے، یہ میری ہی منزل ہے جہاں یہ اعلان کر رہا ہوں کہ اگر مسند علم پہنچا دی جائے اور مجھے سمجھا دیا جائے تو توریت والوں کے درمیان توریت سے فیصلہ کر دیں گا، انجیل والوں کے درمیان انجیل سے فیصلہ کر دیں گا، زبور والوں کے درمیان زبور سے فیصلہ کر دیں گا اور قرآن والوں کے درمیان قرآن سے فیصلہ کر دیں گا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی ہے، کب نازل ہوئی ہے کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کا مفہوم کیا ہے، اس میں ناسخ و منسوخ کیا ہے، عام و خاص کیا ہے، حکم و مشاہدہ کیا ہے، میرے سینے میں علوم کا ایک دریا موجزن ہے مگر انہوں نے کوئی لینے والا نہیں ہے اور کسی میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

یہ انداز اعلان ہی بتا رہا ہے کہ علی کا کمال کیا ہے، اور علی کا دور کیا تھا، کس انداز سے بیقرار تھے کہ کوئی علم لینے والا اہل جائے، اور کس طریقہ سے کوشش ہو رہی تھی کہ کوئی دوا بلیٹ پر نہ جائے، اس انداز علم کا کوئی جواب ہو سکتا ہے کہ مقابلی قرآن کر جاتے والے سے قرآن نہ لیا جائے اور جاہلان امت تفسیر قرآن کرنے بیٹھ جائیں اور اہل کتاب سے علم کتاب نہ لیا جائے اور جاہلان تحت و تاج کتاب کہ لا وارث بنا دیں، بلکہ تو کہنا چاہیے گا کہ یہ اہل دنیا کی پستی تھی کہ انہوں نے دوا بلیٹ کو

چھوڑ دیا اور ان سے علم نہ لیا، ورنہ ذرا اہلیت پر کیا کمی ہے، یہاں فرشتے علم لینے آئے، جنات علم لینے آئے، آسمان والے علم لینے آئے، اہل زر آئیں یا نہ آئیں ابو ذر آئے، مسلمان آئیں یا نہ آئیں مسلمان آئے، بشر آئیں یا نہ آئیں ملک آئے، صاحبان اقتدار آئیں یا نہ آئیں سیدالملك آئے اور روایت گواہ ہے کہ جب بزم پیغمبر میں جبریل کی موجودگی میں علیؑ آگئے تو جبریل تنظیم کیلئے کھڑے ہو گئے، پیغمبر اسلامؐ نے مسکرا کر پوچھا "جب میں تم نے علیؑ کی تنظیم کیوں کی؟" عرض کی: حضور کو تو معلوم ہی ہے کہ علیؑ کا کھڑا ہونا حق ہے اور اسناد کی تنظیم ضروری ہے۔ فرمایا: جبریل یہ تمہارے استاد کیلئے ہو گئے؟ عرض کی: سرکار! جب مجھ سے عرشِ اعظم پر سوال کیا گیا کہ جبریل تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ تو میری کچھ گھڑ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ ایک مرتب میں نے اس نور کو دیکھا کہ آواز نہ رہا ہے۔ جبریل کہہ دے کہ میں عبد ذلیل ہوں اور میرا نام جبریل ہے اور تو ربِّ جلیل ہے اور میرا نام بھی جلیل ہے۔ اور باپ نظر آپ تعجب نہ کریں، جب ساکن جنت آدمؑ ملائکہ سے علم میں افضل ہو سکتے ہیں تو قسم جنتِ اعلیٰ کیوں کہ افضل نہیں ہو سکتے۔

صلوات،

علم کے ساتھ شجاعت کو دیکھا جائے تو گھوارہ میں کلا اشد در کے "محرک" نظر آئیں گے۔ سمادات کو دیکھا جائے گا تو ڈیوڑھی پر زمین سے لے کر آسمان تک والوں کی قطاریں نظر آئیں گی اور جب کوئی یہ کہے گا کہ عالم کی سمادات کا برعکس تھا کہ مکان میں چالینٹ دروازے تھے اور ایک ایک سائل کو ہر دروازے سے دیا کرتا تھا تو مسکرا کر فرمائیں گے کہ ایک ہی دروازے سے اتنا کیوں نہ دے گا چالینٹ دروازوں پر جانے کی نہ تحت نہ ہوتی۔

زہد و قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام زندگی ایک غذا پر گزار دیتی، اور عیبِ شہادت بیٹھی نے تنگ اور دو دو حلا کر انعام میں رکھا تو فرمایا: بیٹی ام کلثوم! ان میں سے ایک چیز کو اٹھا لو، تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے باپ نے ایک وقت میں دو عقابیں نہیں استعمال کیں اور اس سے بالائے اعلان کہ جب تک میرے حدودِ مملکت میں کوئی ایک سہوکارہ جائے گا میں شکم میرا مرنے کھاؤں گا۔

مملکتِ اسلامیہ کے نفیوں کو دیکھ کر کھانا کھانے والا امام اور اس کے مقابلہ میں وہ افراد لائے جائیں جنہیں اپنے گھراؤ و محلہ کی بھی خبر نہ ہو، کردارِ علیؑ آواز دے رہا ہے کہ سماج سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے والے کو غنی کہا جاتا ہے اور سماج کو مال مال کر دینے والے انسان کو جناب امیر کہا جاتا ہے۔

صلوات،

محنت و مشقت کا یہ عالم تھا کہ کبھی غرباء کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کبھی باغ میں مزدوری کر رہے ہیں، کبھی کھیت میں پانی دے رہے ہیں، کبھی بازار میں خرے فروخت کر رہے ہیں، کبھی دستِ مبارک سے خیلین کی اصلاح کر رہے ہیں، کبھی چاہنے والوں کی امداد کر رہے ہیں، کبھی دشمنوں کی مشکل کشائی کر رہے ہیں اور پھر ہر منزل پر دشمنوں کا سامنا کر رہے ہیں لیکن دنیا کو بتا رہے ہیں کہ ہاتھ پوٹا تھا رکھ کر بیٹھ جانا اسلام نہیں ہے، قوتِ بازو کا مظاہرہ کر کے زندگی گزارنا اسلام ہے، مہمل اکھوست انسان صاحبِ مال و معسر ہوتا ہے، اور زہدِ بازو کا مظاہرہ کرنے والا فاقہ خیز ہو گیا ہے۔

ان کمالات کے ساتھ اگر عبادات کا بھی جائزہ لیا جائے تو عالم ہی دوسرا نظر آئے گا، جس کی مجال ہے کہ نہ ننگی میسر کی عبادتوں کا حساب لگا سکے جب کہ

خدا کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر مجاہدی ہے اور کس کی مہال ہے کہ ساری  
سائنات کا حساب کر سکے جبکہ ایک رات کا سر جانا مر جانا پروردگار کی جنت بن جائے  
صلوات،

لیکن ہر حال اجمالی طور پر یہ عرض کرنا ہے کہ علیؑ کے اعمال نگاہ قدرت  
میں اس قدر عزیز اور بلند ہیں کہ جیسے آیات قرآن منظر پیش ہیں، علیؑ کس مسئل کا  
مظاہرہ کریں اور ہم عرضِ اعظم سے زمین کی طرف قصیدہ بگڑ آجائیں، نماز پڑھیں تو ہم  
دعے مرائی کریں، زکوٰۃ دیں تو ہم سرورِ تاج ولایت رکھیں، جہاد کریں تو ہم بھانجرا مریم  
کا بیٹا بن جائیں، ساکنوں کو دعوت دیں تو ہم سورہ دہرے کر جائیں، جادو میں آجائیں  
تو آیتِ تطہیر نازل کر دیں، مباہلہ میں جائیں تو صدقات کا اعلان کر دیں، غیر شیعہ  
کریں تو کشتِ خدا و رسول کی قرینے کریں اور غدیر میں مولانا بن جائیں تو دین  
کے کمال اور نعمتوں کے اتمام کا سند و دید بن صلوات،

علیؑ کی عبادتوں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ سرِ غیر خدا کے سامنے نہیں  
جھکا اور خدا کے سامنے بھی کسی طمع یا خوف کی بناء پر نہیں جھکا بلکہ اپنے افعال  
کا اعلان کر کے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہے اور ہر گاہ احدیت میں عرض کی پروردگار میں نے تیری بندگی  
جنت کی لافٹ یا جہنم کے خوف سے نہیں کی ہے، تجھے بندگی کا اہل پایا ہے تو نہ سر  
جھکایا ہے، مگر علیؑ واضح کر رہے ہیں کہ اہل دنیا ہر شاہ ہر مہاجر علیؑ کا  
سر کسی نااہل کے سامنے نہیں جھک سکتا، علیؑ کو طمع جنت اور خوف جہنم نہیں  
ہے تو دنیا کے خوف اور سلطانین کے تازیانے علیؑ کو بچا جھکا سکیں گے۔

علیؑ کی عبادت کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی بندگی کسی طمع یا خوف کی بناء پر نہیں  
تھی بلکہ الجہیت و استحقاق کی بناء پر تھی یعنی خدا اہل اور عقدا تھا اس لئے علیؑ

نے سر جھکا دیا ورنہ اس کے سامنے بھی نہ جھکتے، تو اب کچھ کی ضرورت نہیں ہے  
کہ علیؑ کس نااہل کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور جہاتِ مرتضیٰ میں کس بت پرستی کا  
امکان نہیں ہے اور یہ وہ فضیلت ہے جس کا احترام اور احساس ساری دنیا کو  
ہے کہ آج بھی عالم اسلام میں سب رضی اللہ عنہ ہیں صرف علیؑ کو م اللہ وجہہ ہیں،  
جس کی وجہ یہ ہے کہ سب کے سر، تلوں کے سامنے جھکے، ہیں، علیؑ کا سر کسی کے  
سامنے نہیں جھکا، اور یہی تو وجہ ہے کہ سب کے لئے رہائے خدا کی دعا ہو رہی ہو  
اور علیؑ نے ہجرت کی رات بسترِ پیغمبرؐ پر سو کر رنائے الہی کا سو دا کر لیا ہے۔

بات کو طول بٹھارنا ہے اور ابھی جہات مولائے کائنات کا دوسرا پہلو  
بالکل تشذیب ہے۔ اس لئے دل چاہتا ہے کہ مختصر لفظوں میں مد اور صریح اشارہ کر دیا  
جائے، یہ ذاتی کمالات ایک طرف دنیا کے ساتھ علیؑ کا برتاؤ اور اسلام میں مولائے  
کائنات کی خدمات کا جائزہ لینا ہے تو اس خاک کو نگاہ میں رکھنا ہو گا اور حیات  
علی مرتضیٰ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہو گا۔ ایک حصہ حیاتِ پیغمبر اسلامؐ میں اور  
ایک حصہ بعد پیغمبر اسلامؐ، تاکہ یہ تجزیہ آسان ہو جائے کہ حیاتِ پیغمبر میں علیؑ کے کاتلے  
کیا تھے اور بعد پیغمبر اسلامؐ مولائے کائنات نے کیوں کر زندگی گزار لی ہے اور آپ اسلام  
اور امت اسلام کے کس طرح کام آئے ہیں۔

یہ تقسیم کوئی جدید تقسیم نہیں ہے، حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک ضروری  
تقسیم ہے کہ جس طرح پیغمبر اسلامؐ کے کردار کے تجزیہ کے لئے مکہ اور مدینہ کی  
زندگی کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ عالمِ عربیت اور بے کسی  
میں رسولؐ کو کاد کیا گیا تھا اور اعلانِ انعام کے مل جانے کے بعد زندگی کا انداز کیا  
رہا، اس طرح مولائے کائنات کی زندگی کو بھی دو حصوں پر بانٹنا پڑے گا اور جہات

وفات رسولؐ دونوں کے ماحول میں کردار کا جائزہ لیا جائے گا بلکہ بعد رسولؐ بھی  
وہ قسم کے حالات کو دیکھنا پڑے گا کہ غارتشین رہے تو کیا انداز رہا اور سخت عکس  
پر آگئے تو کیا انداز رہا۔

تفصیلات سے قطع نظر ایک لمحہ کے لئے یہ دیکھنا ہو گا کہ حیاتِ پیغمبرِ اسلامؐ  
تک علیؑ کے کئے فعلات و کمالات اور کارنامہ اُسے حیاتِ سامنے آئے ہیں اور ان میں  
مولائے کائنات کا کیا انداز رہا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں عرض کر دیا جائے کہ  
آئے تو غارتخانہ میں آئے، غارت کعبہ سے آغوشِ پیغمبرؐ میں آئے، آغوشِ پیغمبرؐ میں  
تلاوتِ قرآن کی آغوش سے گھوارے میں آئے تو از وہے کے دُور مکتوبے  
کر دیئے۔ ایک مدت تک باپ کے ساتھ رہے، اس کے بعد رسول اکرمؐ کی محبت  
میں آگئے، دس گیارہ برس کی عمر میں پیغمبرِ اسلامؐ نے اعلانِ رسالت کیا اور سارے  
قبیلہ کو جمع کر کے اسلام کا پیغام سنایا تو اس دعوت کا پورا انتظام علیؑ کے  
ہاتھوں سے ہوا۔ اعلانِ رسالت پر کفار و مشرکین نے ماحول کا بن اور مبنوں کا  
تو علیؑ نے نصرتِ پیغمبرؐ کا وعدہ کیا، اور وعدہ نصرت کے بعد قدم قدم پر رسولؐ پر  
جان قربان کرتے رہے۔ پیغمبرؐ مکہ کی گلیوں میں رہے تو علیؑ پیچھے پیچھے چلتے  
رہے اور کفار سے مقابلہ کرتے رہے۔ نیا شعب ابی طالب میں گئے تو انوں کو کُنا  
دیا پر بستر بدل کے نئے بستر پر سوتے رہے تاکہ حملہ ہو جائے تو میں قتل ہو  
جاؤں۔ میرا رسولؐ بچے جائے۔ نئے سال کے مہاجرہ کے بعد مہمِ ہجرت ہوا تو تمام  
رات تلواروں کی چھاؤں میں سو کر رہائے الہی کا سودا کیا، صبح کو اُٹھے تو  
کفار و مشرکین کی امانتیں واپس کر کے دُعا ربوبت کو بچایا، ناموس رسالت  
کو لے کر مکہ سے مدینہ کی طرف چلے اور پیغمبرؐ اس وقت تک مدینہ میں داخل

نہیں ہوئے جب تک علیؑ انہیں گئے۔ مگر بایں پیغمبرِ اسلامؐ کو رہے تھے کہ باور کھو، نہ  
میں نے مکہ میں کابرجہ علیؑ کے قبیلہ شروع کیا ہے نہ مدینہ میں شروع کرونگا۔  
میں عرض کروں گا یا رسول اللہ! کُن آپ ہوتا تھے تو علیؑ کا انتظار کر رہے  
تھے، آج خدا کے آپ اکیلے نہیں ہیں۔ ایت کے بزرگ و تجربہ کار آپ کے ساتھ  
ہیں، اب علیؑ کی کجا فروت ہے؟ آپ فرمائیں گے میں ہیں تو واضح کرنا چاہتا ہوں  
کہ میں نے اسلام کے مسائل میں کس کس پر اعتماد کیا ہے، یاد رکھو! میری جان خطرے  
میں تھی تو علیؑ کو بستر پر لٹایا تھا، میرا دُعا خطرہ میں تھا تو علیؑ کو امانتوں کے واپس  
کرنے کا ذمہ دار بنایا تھا البتہ اسلام خطرات سے دو چار ہونے والا ہے تو علیؑ کے  
بخیرہ ایک قدم نہ اٹھاؤں گا۔

کاش دنیا کو اس بات کا احساس ہو جاتا کہ اہل دنیا کی بساطِ وفات  
ہے، علیؑ کے قبیلہ نئی قدم نہیں اٹھاتے اور جب نبیؐ، علیؑ کی ضرورت محسوس  
کر رہے ہیں تو ہم علیؑ کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو کھلا ہوا اعلان ہے کہ  
جس علیؑ کا سہارا لے کر نبیؐ اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف گئے ہیں، اسی علیؑ کا سہارا  
لے کر ہم اپنی آخری منزلِ جنت کی طرف جائیں گے۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد حضورؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا عقد علیؑ  
سے کیا اور ساری درخواستوں کو رد کر کے وحی الہی کے فیصلہ پر کیا کہ نور کا رشتہ  
نور ہی سے ہو سکتا ہے، ظلمت کو نور سے رشتہ کی ہوس بے کار ہے۔

اور یہ بھی عجب قیامت ہے کہ جس کے حصہ میں نور کا رشتہ آیا، وہ ایک  
نور والا کون نہ کہا گیا، اور جس کے حصے میں ظلمت کے رشتے آئے وہ دو دو نور والا  
ہو گیا۔ عقد زہراؑ علیؑ کی سادگی و سبیل ہے کہ اسلامی رشتہ میں پہلی رسولؐ کی

گنجائش نہیں ہے۔ یہاں مغرب کو سادہ رہنا چاہیے، مگر نقد ہونا چاہیے، چیز کو ہر کمقدار کے اندر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہر رسم اسلام میں دخل اندازی ہے اسلام نہیں ہے۔ کافری علی و ملائکہ کے غلام و کنیز اس صحنہ کی طرف متوجہ ہوتے اور سماج کو جتلاتے مصائب نہ کرتے۔

عقد کے بعد اسلامی موعوں کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے شہدہ میں بد کا سورہ پیش آیا جس میں سقائی لشکر کا فریضہ علیٰ ہی نے انجام دیا۔ اور سارے مسلمانوں کے برابر کفار تہنا علیٰ ہی نے قتل کیا۔ بد کے بعد سلسلہ میں اہل کی منسل آئی، یہاں بھی سارے مسلمانوں کے میدان سے بھاگ جانے کے بعد ثبات قدم کا مظاہرہ علیٰ ہی نے کیا اور جب بنیبر اسلام نے پوچھا کہ کیا علیٰ سب چلے گئے، تم کیوں نہیں گئے؟ تو عمر بن کلاسہ کہ: میں آپ کے نقش قدم پر ہوں، میں ایمان کے بعد کفر نہیں اختیار کر سکتا، اب کوئی پتہ چھپے کہ کیا علیٰ کجا میدان جنگ سے بھاگ جانا کفر ہے اور اگر کفر ہے تو بھاگنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

عمر بنان مزم (آپ) دیکھ رہے ہیں کہ عالم اسلام کا جو سخت غلبہ کیا کہہ سکتا ہے۔ اور بنیبر اسلام کو کیا ہو گیا ہے کہ ڈرتے بھی نہیں کہ یا علیٰ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بھلا فرار کو کفر سے کیا متعلق ہے؟ تو کیا یہ دونوں بھائیوں کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ ایک اعلان کر رہا ہے، اور دوسرا اپنی خاموشی سے اس کے اعلان کی تائید کر رہا ہے اور اس طرح نصرت و پیروی سے تنہا ہونے والوں کے مسلک کا اعلان ہو رہا ہے۔

اہل کے بعد سلسلہ میں طہری کا سورہ پیش آیا جہاں عمر بن عبدود

کے حملے کے بعد بھی مسلمانوں کے سر نہیں اٹھے اور بنیبر اسلام کے ارادہ پر بھی کوئی نہیں گیا تو آکر علیٰ ہی نے جاکر عمرو کا سر لٹم کیا اور نبی نے آواز دی: آج علیٰ کی ایک ضربت شعلیں کی عبادت پر بھاری ہے۔ صلوات،

خدیج کے بعد سلسلہ میں صلح حدیبیہ کی منسل آئی، جہاں بنیبر اسلام حج کے ارادے سے نکلے اور کفار کی مزاحمت کے بعد صلح کی نوبت آگئی، جس پر بہت سے مسلمانوں نے اعتراض بھی کیا اور بنیبر اسلام کی رسالت میں شک بھی کیا تو صلح کی دستاویز علیٰ ہی کے ہاتھوں سے مرتب ہوئی اور صلح نامہ کی سبابت کا کام علیٰ ہی نے انجام دیا، نہ کوئی کتاب وہی نظر آیا، نہ کتاب الہام، مسئلہ ایک علیٰ تھے جو صلح نامہ مرتب کر رہے تھے اور نبی کھمبار ہے تھے۔ اور قرآن اس صلح کو فتح بین قرار دے کر دنیائے اسلام کو متوجہ کر رہا تھا کہ اسلام میں علماء کا فاتح بھی علیٰ ہی ہے اور اسلام میں مسلم کا فاتح بھی علیٰ ہی ہے۔ صلوات،

حدیبیہ کے بعد سلسلہ میں خیبر کا سورہ سامنے آتا ہے جہاں یہودیوں کے قلعوں کو فتح کرنے کے لئے بعض مسلمان سپاہی میدان تک جاتے ہیں اور اٹلے پاؤں واپس چلے آتے ہیں اور بقول تاریخ سرور یہ کہتا ہے کہ لشکر کمزور ہے اور لشکر یہ کہتا ہے کہ سردار بزدل ہے اور آخر کار نبی علیٰ طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے دونوں بے کار ہیں اور پھر کراہ غیر فرار کا خطاب دے کر علیٰ کو میدان میں بھیجتے ہیں اور علیٰ مرحوب و مغتر کو تہ تیغ کر کے خیبر کو فتح کر کے واپس آتے ہیں۔ صلوات،

خیبر کے بعد سلسلہ میں مکہ فتح ہوتا ہے، جہاں بنیبر اسلام خانہ کعبہ میں بت شکنی کا فرض انجام دیتے ہیں اور علیٰ کو حکم دیتے ہیں کہ

دوش پر سوار ہو کر طاق کعبہ سے بٹ گراؤ اور علی دوش رسول پر بلند ہو کر اپنا دستِ  
فضیلت بھی ظاہر کر دیتے ہیں اور دنیا کو بتا دیتے ہیں کہ رسول اسلام نے فاطمی  
سے باطل کے قبضے کے ہٹانے کا کام مجھ ہی سے لیا ہے اور خلیل کے مقابل میں اس  
جہاد کا فریضہ میں نے ہی انجام دیا ہے فرق صفت یہ ہے کہ انھوں نے پیادہ  
جہاد کیا تھا اور میں نے دوش رسول پر سوار ہو کر جہاد کیا ہے۔ مصلوات،

فتح مکہ کے بعد مشعر میں مباہلہ کی منزل آتی ہے، جہاں عیاشی  
حضرت علیؑ کو اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کے لئے مدینہ آتے ہیں۔ اور آیات قرآن کے  
نزل کے باوجود ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور آخر کار قرآن مجید مباہلہ کا حکم  
دیتا ہے تو نبیؐ اس شان سے براہ کمرہ کرتے ہیں کہ گھر میں حسینؑ ہوتے ہیں،  
انگل پکڑے ہوئے امام حقؑ حضورؑ کے پیچھے فہرادی کائنات فاطمہ زہراؑ  
اور ان کے پیچھے نفیس پینسبر علیؑ بن ابی طالب۔ مباہلہ ختم ہوتا ہے، متعاری  
اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں اور تارت آواز دیتی ہے۔ مسلمانو!۔  
اب آل محمدؑ کا احسان پہناؤ، اب تک تو میدانوں میں بعض اصحابِ فسطح بھی  
اٹھتے تھے، اب اسلام کے اس سرکردہ حق و صداقت میں سوائے آل محمدؑ  
کے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے، مسلمان فضا ئل آل محمدؑ کو مائیں یا ذابنِ جنت  
کو احساس ہے کہ ہماری شکست اہلیت سے ہوئی ہے، اصحاب سے نہیں،  
اور شاید اسی فضیلت کو باقی رکھنے کے لئے اللہ نے عیاشی کو بجا رکھا ہے کہ  
اسلام کے آخری ماہنامہ کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو دنیا کے اسلام کو بھی آل محمدؑ  
کے کمالات و احسانات کا اندازہ ہو جائے۔ مصلوات،  
مباہلہ کے بعد مشعر میں یمن کی ہم پیش آتی ہے، چاروں لے کائنات

نسلِ اسلام کو کے پورے قبیلہ ہمدان کو مسلمان بناتے ہیں اور واپسی پر نبیؐ کے  
ساتھ احسنی حج میں شریک ہو جاتے ہیں، جس کی واپسی پر میدانِ غدیر میں  
حاجوں کا قافلہ ردکا جاتا ہے اور پیغمبر اسلامؐ منبر پر جا کر علیؑ کو ہاتھوں پر  
بلند کر کے آواز دیتے ہیں۔ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے  
اور قرآن مجید تکمیل دین کا اعلان کرتا ہے اور اُت سے دستِ علیؑ پر  
بیعت لی جاتی ہے تاکہ مسلمانوں کو ہوش آ جائے کہ علیؑ کا ہاتھ بیعت لینے  
کے لئے پیدا ہوا ہے، بیعت کرنے کے لئے نہیں۔ مصلوات،

غدیر کے دو مہینہ قبل دن کے بعد ۱۸ صفر سال ۱۰ کو حضورؐ سر دکان  
کا انتقال ہوتا ہے، جہاں سے علیؑ کی زندگی کا دورِ سرور شروع ہوتا ہے  
اور اُت کے علیہ ہو جانے کے بعد علیؑ، پینسبر کو غسل و کفن دے کر  
دفن کر دیتے ہیں اور دنیا کو مزید کر دیتے ہیں کہ تین دن کے لئے دور کرنے والے  
اور ہیں اور نبوت کی تجہیز و تکفین کرنے والے اور — اور سچے ہے، جو جس کا  
مقصود ہوتا ہے وہ اس کے لئے ہر آن کو شاں رہنا ہے۔ دنیا کا رشتہ تخت و تاج  
سے ہے اور میرا رشتہ محلِ اُکرم سے ہے، اکل کعبہ سے مجھے پیغمبر لائے تھے،  
آج آخری منزل تک پینسبر کو میں پہنچا رہا ہوں۔

ابا بکرؓ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا کہنے کو سب حال  
جی چاہتا ہے کہ آج کی دنیا میں بھی اگر کوئی جنازہ چور و کراک ہو جائے تو  
چھا خاہر رشتہ بھی ختم ہو جاتا ہے، خدا جانے یہ کیسی بڑی وارادت تھی  
کہ جنازہ رسولؐ چور و کراک بھی رشتہ محض رہ گیا؟  
بھی نہیں، بلکہ فیصلہ خلافت کے بعد اہلیت کی طرف متعاری ہو گیا۔

موثر دیا جاتا ہے اور پھر دینے کے بجائے بیٹی کی جائیداد پر قبضہ کیا جاتا ہے  
 والد کو قید ہی بنایا جاتا ہے۔ دروازے پر آگ اور کھڑکیاں جس کی جاتی  
 ہیں اور دروازہ حکومت میں کھینچ کر طلب کیا جاتا ہے اور قتل کی دھمکی دے کر بیوت  
 کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب مولے کا جنازہ فرماتے ہیں کہ تم ایک اللہ  
 کے بندے اور تمہارے بھائی کو قتل کر رہے ہو، تو جواب ملتا ہے کہ ہم  
 تمہیں زندہ خدا تو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسول کا بھائی تسلیم نہیں کرتے،  
 دیکھا آپ نے انقلاب آتے، جب یہ آتے علی کے بیٹے کا بھائی ہونے سے  
 انکار کر سکتے ہیں تو اگر باغی ملک اور منصب حکومت کا انکار کر دے تو  
 کیا قیام ہے، علی نے اس مقبہت پر بھی صبر کیا اور فرکانے کر کے پڑ  
 گیا، وہ بھی رو کر دیا گیا، معاش پریش آنے رہے اور علی حسب وصیت پہنچا  
 خاموش رہے۔

شہر سے عرصہ کے بعد حکومت بدلی، اور حکومت کا دوسرا دور آیا،  
 اس دور میں بھی معاش پریش ہوا، اور بھائی اور بیوی کے ساتھ  
 روحانی اور دینی امور میں نمایاں طور سے شامی ہو گئیں، اس اپنے حقوق کا انکار ہو رہا  
 تھا اور درپردہ دین خدا پر حملہ ہو رہا تھا اور آج کلمہ کلمہ احکام الہیہ کی مخالفت  
 ہو رہی ہے، حلال خدا کو حرام کیا جا رہا ہے اور حرام خدا کو حلال بنایا جا رہا ہے  
 اور حق علی کے پامال کرنے کی عظیم سازش ہو رہی ہے کہ ایک طرف جاگیر ملک کے  
 ساتھ حق ختم کو بند کر دیا گیا کہ آل محمد کے پاس کوئی دولت باقی نہ رہ جائے اور  
 دوسری طرف چلتے چلتے نئے حکومت کا ایسا منصوبہ بنایا گیا کہ خلافت مولے کا مناسبت  
 نہ رہے بلکہ یہ چلتے چلتے چھوڑ دی جائے۔ چھوڑ دی جائے کی بجائے بنائی گئی، اکثریت پر فیصلہ رکھا گیا،

مخالفت کے تکل کا فرمان نامزد ہوا، ایک شخص کو ثالث فرما دیا اور ان سب کے بعد بھی  
 جب علی کے حق کا انکار ممکن نہ ہو سکا تو سیرت بخین پر عمل کرنے کی شرط لگانا لگئی، سرکاری  
 کائنات نے وقت وصیت ہی اس سلسلے کو محسوس فرمایا اور آپ کو معلوم تھا کہ یہ  
 خلافت کچھ تک آنے والی نہیں ہے اس لئے آپ نے چاہا کہ خلافت نہیں ملتی ہے  
 تو نہ ملے، کم از کم اس خلافت کی حقیقت تو دماغ پر جلے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا،  
 کو سیرت بخین مطابق سیرت رسول ہے تو اس شرط کی ضرورت نہیں ہے اور خلافت  
 بہتر رسول ہے تو میں سیرت رسول سے بہت کر کسی شخص پر عمل کرنے کے لئے  
 تیار نہیں ہوں۔ خلافت نہیں ملے اور دوسرے کو دے دی گئی، لیکن علی کا  
 سوال آج بھی محفوظ ہے اور مسلمانوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ بتاؤ یہ سیرت،  
 سیرت رسول کے موافق ہے یا مخالف؟ اور علی آواز دے رہے ہیں کہ کچھ  
 بھولنے والا سیرت رسول کو بھی نہیں پاسکتا، سیرت رسول میری ہی سیرت  
 کا نام ہے، جو کہو سے الگ ہو گیا وہ رسول سے الگ ہو گیا اور جو رسول  
 سے الگ ہو گیا وہ خدا سے الگ ہو گیا۔ اب خدا سے الگ ہونے والے کے  
 بارے میں تم فیصلہ کرو۔

عزیزانِ محترم! اس مقام پر یہ نہکتے بھی قابلِ توجہ ہے کہ سیرت  
 نے سیرت حکام پر عمل کرنے سے انکار کر کے ایک مسئلہ اور بھی واضح کر  
 دیا کہ اگر علی نے کل حکام وقت کی بیعت کر لی ہوتی تو آج سیرت کو  
 ضرور قبول کر لیتے، مسئلہ نے سیرت کو ٹھکرا کر واضح کر دیا کہ جب میں  
 سیرت کے نام پر پوری حکومت چھوڑ سکتا ہوں تو جو سے یہ توفیق ہوگی  
 نہ رکھنا کہ میں کسی اقتدار سے مرعوب ہو کر باطل کے سامنے سر جھکا دوں گا

اور غیر حق کی بیعت کرلوں گا۔

تاریخ کے دس سال یہ بھی گزر گئے اور حکومت کا تیسرا دور لگا۔ اس دور میں بھی مصائب و محال کا سلسلہ اس شدت کے ساتھ جاری رہا اور دین و جاں کو بین و بیل ہوئی رہی۔

بنی امیہ پر وظائف و انعامات تقسیم ہوئے اور بنی ہاشم کے گھرانے ہوتے رہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب خلیفہ سوم کو حکومت ملی تو بنی ہاشم کا مذاق حضرت ابو سفیان نے اُکڑ کر کہا۔ بیٹا! اب یہ خلافت تمہارے قبضہ میں آگئی ہے، اس گین کو جس طرح چاہو بچاؤ، ضرور جنت و جہنم کے بھروسے نہ پڑنا، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ساداتِ محمدؐ فرزند نے بزرگ خاندان کی بات مانی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس بات پر ابو سفیان کو ٹوکا بھی نہیں اور یہیں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر خلافت میں جنت و جہنم کا اندازہ ہوتا تو ملکیت میں غصب و دہی کو بنی ہاشم کا کھیل نہ بنایا جاتا، بنی امیہ کا قدیم عقیدہ تھا جبراً تک بڑھکے پتھیر انداز سے چلا آ رہا تھا، اور اب بڑبڑانے اس پردہ کو چاک کر دیا۔ بڑبڑ میں اور دوسروں میں اتنا ہی فرق ہے کہ دوسروں نے بات کو پردہ میں رکھا تھا اور بڑبڑانے پردہ کو ہٹا دیا تاکہ دنیا پہچان لے کر بڑبڑیت ہر دور میں رہی ہے اور عیناً بنت آج بھی زندہ ہے اور اس طرح یہ بھی واضح ہو جائے کہ حسنینت ہر دور میں رہی ہے اور محبت آج بھی زندہ ہے اور یہی معنی ہیں "حَسَنٌ وَحَسْبٌ ذَا نَا مِنْ حَسَنَاتِ" کے۔

تقریباً ۱۰ سال تک معالیم کا یہ سلسلہ بھی جاری رہا اور دین و جاں کی توہین و تحقیر ہوتی رہی، ہاں تک کہ ام المومنین عائشہؓ کی کوششوں سے خلیفہ ثالث کا قتل واقع ہوا۔ اور مسلمانانِ لا ادارت ہو گئے۔ اب مشکلات تھیں، اور

مشکل کشادہ تھا، مسائل تھے اور محال مسائل نہ تھا، شریعت تھی اور ممانعت شریعت نہ تھا، قرآن تھا اور مفسر قرآن نہ تھا، اسلام تھا اور ذمہ دار اسلام نہ تھا، اُمت تھی اور قائد اُمت نہ تھا، احسانات عاجز اگر در علیؓ پر آئی اور آواز دی یا علیؓ! اب مشکل کشاکش آپ ہیں، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، ہم سے بیعت لے لیجئے علیؓ نے انکار کیا، اور جب اصرار پر سنا تو مسجدِ نبویؐ میں منبر پر بیٹھ کر بیعت لی اور ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں تمہاری بیعت کا محتاج نہیں ہوں، تم میری بیعت کے محتاج ہو، یہ بات کچھ میں ذرا سی تھی اور آج کچھ میں آگئی۔ سچ بات کو جب ٹھوکر لگتی ہے تو باطلی ہٹنا ہی پڑتا ہے جملہات۔

تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا، اور سلسلہ کی حکومت سے مالوس سے بعد ام المومنین نے خونِ عثمان کے انتقام کا نوہ بلند کیا، مولائے کائنات بر قتل عثمان کا الزام لگا کر انتقام کے لئے جل کے میدان تک آگئیں، مولائے کائنات نے لاکھ کھجیا، لیکن کسی کی کچھ میں نہ آیا اور کراہ کر جل کی لڑائی ہوئی، ام المومنین کی شکست ہوئی، حضرت علیؓ کو فسح نصیب ہوئی، لیکن آپ نے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ انھیں دینہ پہنچا دیا کہ دنیا پہچان لے کہ عزتِ پیغمبر کا محافظ کون ہے اور ناموس رسول کو سر میدان لا بوالا کون ہے اور اس طرح حق و باطل کا فیصلہ بھی ہو جائے۔

جل کی آگ سرد نہ ہوئی تھی کہ انتقام کی دوسری ہم شام سے شہر و شہر ہوئی اور عسکین کا میدان گرم ہو گیا، ہاں بھی لڑائی علیؓ کی فتح پر تمام ہوئی لیکن اچانک حکومت شام نے نیرود پر قرآن بلند کر کے جنگ کا رخ بدل دیا، مقصد یہ تھا کہ ہم قرآن سے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، اب دیکھیں علیؓ کا مسلک کیا ہے؟ مولائے کائنات نے جنگ روک دی، اور مالکِ اشر کو دالیں بلالیا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ہم وہ محافظ قرآن

ہیں جو عزت کتاب کے لئے جینی ہوئی جنگ بھی چھوڑ سکتے ہیں، قرآن کو چھوڑ کر حکومت کرنا خدا کا کام ہے اور قرآن کی عزت کے نام پر حکومت چھوڑ دینا ہمارا کام ہے۔  
جنگ کی، طرفین کے حکم میں ہونے اور آخر میں ایک گہری سازش کے نتیجہ میں مولائے کائنات کے خلاف فیصلہ ہو گیا، فیصلہ میں اس قرآن کا نام بھی نہ آیا جس کے لئے جنگ رکی تھی اور اس طرح مولائے کائنات کے لشکر میں بھی بنادہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور آپ کو ہمدان کی لڑائی سے دوچار ہونا پڑا۔ الحمد للہ کہ آپ اس میں بھی فاتح رہے۔

بات تمام ہو گئی لیکن انا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافتوں کے دور میں علی سے عین مماندن پر جنگ کیوں ہوئی اور ان لڑائیوں کا ذکر دیکھ کر یہ ہے؟ جنگوں کی نوعیت حقیقت کا فیصلہ کر رہی ہے کہ ان جنگوں میں ایک میں خلیفہ اول کی بیٹی قادی نہیں اور دوسری میں خلیفہ دوم کا بنایا ہوا گورنر خاندان اور تیسری میں بنی امیہ کے ہوا خواہ خوارج اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر صحابیت نے اہلیت کے خلاف مماندن کی ہو تو آج مسلمانوں میں یہ جتن نہ ہوتی اور شاید تاریخ کے اس تسلسل کو امام غزالی نے لمس کر لیا تھا، جب یہ فتویٰ دیا تھا کہ "واعظم رذکر شہادت حسین حرام ہے کہ اس کو شہید صحابہ پیدا ہوتا ہے۔"

میسرے گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امیر المومنین نے اپنا چار سالہ دور حکومت ایسی ہی پریشانیوں اور الجھنوں میں گزارا لیکن اپنے فریضہ ہدایت سے قفل نہیں رہے اور جب زندگی کا آخری لمحہ آیا اور شام کی سادش سے خوارج نے قتل علی کا منصوبہ بنایا تو اس وقت بھی آپ قدم قدم پر اپنا فریضہ ہدایت ادا کرتے رہے۔

مجاہدین اسلام اس قیامت خیز رات کو فراموش کر سکتے تھے جب کائنات کا امیر اپنی بیٹی کے گھر مہمان تھا اور بیٹی نے افطار میں دودھ اور ٹھنک لاکر حاضر کیا تو سر ہایا۔ مسیحی لال ام کلثوم! تجھے معلوم ہے کہ تیرے باپ نے ایک وقت میں دودھ غذا میں نہیں کھائیں، بیٹی! دودھ کا پیالہ اٹھا لو۔

کسے معلوم تھا کہ مولائے دودھ کا پیالہ کیوں اٹھوا دیا؟۔ راز تو اس رازتہ کھلا جب ابن ابی سلمہ کی تلوار مرقدس پر لگی اور مولائے نبی کو بہت الشرف میں تشریف لائے اور جبرائیل نے زخم سرد بچھ کر دودھ تجویز کیا،

غزادہ! ۱۹ویں شب افطار سے فارغ ہونے کے بعد مولایہ عالمہ تھا کہ بار بار حجرہ عبادت میں تشریف لے جاتے تھے اور کھل آتے تھے اور فرماتے تھے: دیکھ یہ وہی رات ہے! بیٹی نے گہرا کے پوچھا: بابا جان! یہ کون سی رات ہے؟ فرمایا: میری لال یہ میری اور میری جدائی کی رات ہے، یہ وہ رات ہے جس کی پیغمبر اسلام خرد سے گئے ہیں، جس کے بعد مجھے بارگاہ الہی میں حاضر ہونا ہے، بیٹی! دیکھ تیرا باپ کس طرح نذر رہا ہے، آج مجھے دنیا کے کسی بہادر سے مقابلہ نہیں کرنا ہے آج مجھے رب العالمین کی بارگاہ میں جانا ہے۔

رات گزرتی رہی، سحر کا ہنگام آیا، نجد بد و فوفا کر گھر سے باہر نکلنے کا قصد کیا، مرغابیوں نے بڑھ کر دامن تھاما، پائے کر امام حسن کو دیکھا، فرزند! ان جانوروں کا خیال رکھنا ان میں کوئی بھوکا پیاسا نہ رہ جائے، اگر ان کے آب و روز کا انتظام نہ ہو سکے تو انھیں آزاد کر دینا، میں کسی کو بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

ارباب عزت! یہ کون ہے کونہ! کاش کوئی اہل کونہ میں اس وصیت کو سننا اور یاد رکھنا کہ علی جانوروں کی بھوک اور پیاس برداشت نہیں کر سکتے،

اور کئی انھیں مٹی کی اولاد ہو گئی جن کے غمروں سے العطش العطش کی آوازیں بلند ہو گئی  
 ہی پاتا ہے پھر عرض کر دیں، مولاً! آپ کے گھر کے جانور پیاسے نہ رہیں اور آپ کی  
 اولاد بھڑکے کر بلا میں تین دن کی پیاس، نگاہوں کے سامنے دھواں زبانوں  
 پر العطش العطش، داما داما علیہا داحسناہ کی آوازیں۔

عزادارانِ امیرالمومنین! مولاً بیت الشرف سے باہر چلے، امام حسن اور  
 امام حسین ساتھ چلے، مژکوں کی بجائے، میسر لال داپس جاؤ، آج تمہارا گھر میں سنا  
 زیادہ ضروری ہے، خنزرا سے داپس ہو گئے، لیکن کسے معلوم تھا کہ مولاً نے کیوں  
 داپس کر دیا، بر تو باپ جانے یا فرزند۔ راز اس وقت کھلا جب مٹی کا سچا شروع  
 ہوا اور ہر اقدس پرابن لہجہ کی تلوار لگی، نغنا میں قتل امیر المومنین کی آواز گونجی اور  
 شہزادی زینب دام کشوم ٹوپ کر بھائی کے پاس آئیں۔ سبھا! یہ میں کیا سن رہی ہوں  
 کیا بابا مارے گئے؟ سبھا جلدی مسجد میں جا کر بابا کی خبر لائیے۔ میں کہوں گا شہزادی  
 آج بھائی گھر میں موجود ہے، باپ کی خبر گیری کے لئے بھیج دئے لیکن بی بی!  
 کل جب فحائے کر بلا میں آواز گونجے گی "اَلَا قَتِلَ الْحَمِیْنُ بِحَرْبِکَ" تو کسے میدان  
 میں بھیجئے گا جو مقتل سے بھائی کی خبر لائے۔ عجیب نہیں۔ شہزادی آوازیں کہ  
 میں خود ریت ہی تک جاؤں گی اور بھائی کے گلے پر چلتا ہوا خنجر دیکھ کر آواز دوں گی  
 پس سجد! میرا بنایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

عزاداران! مولاً مسجد میں آئے اسخری فرضِ ہدایت انجام دیا، غلہ سستہ  
 پر اذان کہی، صحنِ مسجد سے قاتل کو بیدار کیا اور دنیا کو یہ پیام سننا کہ مصلے پر آئے  
 کوئی وقت نماز قاتل کا سونا بھی برداشت نہیں کر سکتا تو جانے والوں کا بے نزاری ہونا  
 کیونکر برداشت کرے گا۔

نماز شروع کی، مسجد خالق میں رکھا، ابن لہجہ کی تلوار چلی، ستون مسجد بنے چاروں  
 مسجد بچے، نغنا میں کہرام برپا ہوا، آسمانوں میں تلاطم پیدا ہوا، روح الامین ٹھپ کر چلائے  
 نبی کا بھائی اما گریا، مٹی فہید ہو گئے، ستون ہدایت گر گیا، رسیاں ہدایت ٹوٹ گئی۔  
 بیت الشرف تک آواز پہنچی، سیدائیں میں کہرام برپا ہوا، والدِ شہیدوں کی آوازیں بلند  
 ہوئیں، خنزرا سے مسجد تک آئے، امام حسن نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور دنیا کو سبق دیا  
 کہ خنجر وار قتل مٹی کو مسجد میں نہ جانے کا بہانہ قرار نہ دیا، جگہ سے زیادہ مٹی کا چاہئے والا کون  
 ہوگا، میں داپس مٹی اور فرزند مٹی ہوں، میں نے ٹھیک وقت غربت مسجد میں آکر نماز پڑھائی  
 ہے اور ہمیشہ مسجد میں نماز پڑھی ہے، خود مرلائے کائنات نے ۱۹ ویں ماہ رمضان کی صبح سب  
 کچھ جانتے ہوئے مسجد میں آکر دافع کو دیا کہ مٹی جان دے سکتا ہے مسجد کو ترک نہیں کر  
 سکتا، درز گھوٹی میں نماز ادا کر لیتا اور بظاہر خطرہ سے محفوظ رہتا۔

اس کے بعد خنزرا سے باپ کو لے کر چلے، بیت الشرف کے قریب پہنچے امیر المومنین  
 نے آواز دی۔ بیٹا حسن! چاہئے والوں کو داپس کر دے، اب گھر قریب آ گیا ہے، میں نہیں  
 چاہتا کہ نا محرموں کے کانوں میں میری بیٹیوں کی آواز جائے،

میں کہوں گا، مولاً یہ سنو کہ کون ہے جو چاہئے وصیت کر لیجئے، ابھی محل کرنے  
 والے فرزند موجود ہیں، لیکن مولاً کل سلسلہ کا کوہ ہوگا، جب سے ہوئے بازار ہونگے  
 ترافائیوں کا بچہ ہوگا، لہجائیوں کا، ہجوم ہوگا، ہر طرف آواز بند ہوگی، جشن کا سامان  
 ہوگا، اور اس عالم میں آپ کی بیٹیاں رسن لبتہ لالی جائیں گی، آپ کے فرزند عابدیاد کے  
 ہاتھوں میں چھوٹے پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقی خاردار، آپ کی زبیر زبان حال سے  
 فریاد کر رہی ہوگی، بابا! مجھ دودھ نہیں ہے، آپ کی بیٹی آپ کے دار حکومت میں آ رہی ہے،  
 بابا! آپ کو گورازا نہیں تھا کہ آپ کی بیٹی کی آواز نا محرموں کے کانوں میں جائے، اب تو

زینبؓ آپ کو بکا رہی نہیں تھی، ہر طرف ناخروں کا جھوم عام ہے کس کس سے منو چھاؤں،  
کسے پر وہ کروں، ابا زینبؓ کے سر پر چادر نہیں ہے، بیٹی کے سر کے بال کھلے ہوئے  
ہیں۔ بابا شہم دجیا سے لول ہی نظر نہیں اٹھتی اور جب کبھی نظر اٹھ جاتی ہے تو  
سامنے لڑک نیرہ پر آپ کے حسینؓ کا سر نظر آتا ہے، بابا! آپ کو اپنے حسینؓ سے  
بڑی محبت تھی اور آج آپ کا حسینؓ آپ کے قہر سے آ رہا ہے اور آپ لینے نہیں  
آتے۔

۱۱ رمضان کو آپ بہن ام کلثومؓ کے گھر یہاں تھے اور آج ام کلثومؓ آپ کے  
گھر یہاں بن کے آئی ہے، ابا ذرا اٹھ کے دیکھئے آپ کی سیکڑ کا کیا عالم ہے۔ کہیں  
بیٹی، یہ بیٹی، یہ بیٹی کی محنت، یہ بے کھی، یہ امیری اور یہ عالم غربت۔  
یہ اپنی لال کی غربت تو دیکھئے ابا! نہیں ہے باپ تو گوری میں لیجئے ابا!  
عجیب آپ کے عابد کا حال زار بھی ہے کمال ضعف بھی ہے طوق خدا دار بھی ہے  
سلام ملک غم کے تاج دار سلام سلام بیسے بھرے گھر کے سو گوار سلام  
جو بڑے تو کبھی کر بلا بھی جائے گا گلے سے تربت بے تیر بھی لگائے گا  
مدد کرو مے ابا کہ شام جاتی ہوں بہنہ سر سونے لہرائے عام جاتی ہوں

وَسَيُعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنَّىٰ مُنْقَلَبُ يَشْفَعِلِبُوت

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ



## مولائے کائنات حضرت علی ابن ابیطالبؓ

|             |   |                                                                                       |
|-------------|---|---------------------------------------------------------------------------------------|
| اسم مبارک   | : | علیؓ، حیدرؓ، ایلیاؓ،                                                                  |
| لقب         | : | مرتضیٰؓ، امیر المومنین وغیرہ                                                          |
| کنیت        | : | ابو الحسنؓ، ابو الائمہؓ،                                                              |
| والد ماجد   | : | عمران (کنیت ابو طالب)                                                                 |
| والدہ ماجدہ | : | فاطمہ بنت اسدؓ،                                                                       |
| ولادت       | : | ۱۳ رجب سنہ ۱ عام الفیل، خانہ کعبہ، بروز جمعہ،                                         |
| ازواج       | : | جناب سیدہؓ، ام البنین وغیرہ                                                           |
| اولاد       | : | امام حسنؓ، امام حسینؓ، جناب زینبؓ، جناب ام کلثومؓ، جناب عباسؓ، جناب محمد حنفیہؓ وغیرہ |
| شہادت       | : | ۲۱ رمضان المبارک یکشنبہ                                                               |
| عمر مبارک   | : | ۶۳ سال                                                                                |
| قبر مطہر    | : | بغداد اشرف                                                                            |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء  
والمرسليين وخاتمة النبيين سيدنا و مولانا ابى القاسم محمد و آله الطيبين  
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم جميعين اما بعد فقد قال الله  
الحكيم فى كتابه الكريم -  
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَ اِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَ الْاُولٰٓئِ

الاولىٰ کائنات کا ارشاد ہے کہ ” بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر  
ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس ارشاد گرامی نے یہ واضح کر دیا کہ مسئلہ ہدایت میں انسان کو دخل دینے  
کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اطاعت کرنا ہے اور بلائیں کا فرض ہے  
کہ جس کو پروردگار عالم ہادی و رہنما بنا دے اس کے سامنے تسلیم خم کرنے  
اور اس کی اطاعت سے انکار نہ کرے۔ اس سے زیادہ اختیار اسے نہیں دیا  
گیا ہے اور جس نے اس سے زیادہ اختیار کا مظاہرہ کرنا چاہا اس کا مشر بھی  
معلوم ہو گیا۔ پروردگار عالم نے روز اول ہی واضح کر دیا تھا کہ آسمان کو  
تھکا کر فرض ہے کہ میرے رہنما اور جانشین کے سامنے سر جھکا دو۔ سر جھکا دو  
تو فلک مصوم ہے جاؤ گے۔ سر کشی کرو گے تو شیطان رجیم ہو جاؤ گے

قدرت کا یہ قانون آج تک زندہ ہے اور انسانوں کو آواز دے  
رہا ہے کہ آدم کے فرزندو! ہوشیار ہو جاؤ۔ تمہارے سامنے تمہارے مورث  
اعلیٰ کی تاریخ موجود ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ جس نے ہمارے نمائندہ کے سامنے  
سر نہیں جھکایا اس کا کیا مشر ہوا۔ اب تمہیں اختیار ہے پائسر جھکا کے آدمی  
بن جاؤ یا سر کشی کر کے ابلیس بن جاؤ۔

کیا کہنا ان خاصان خدا کا جن کی اطاعت میاں انسانیت ہے اور جن کی  
فرمانبرداری بنیاد شرافت۔ ان کی بارگاہ میں سر نیاز خم کر دے تو انسان انسان  
بن جائے اور ان کے سامنے اگر جائے تو شیطان بن جائے۔ اور میں تو سمجھتا  
ہوں کہ انسان کا کیا ذکر ہے۔ انسان بھی ان کی بارگاہ میں سر جھکائے تو مسلمان  
بن جائے۔ اور مسلمان سر جھکائے تو صاحب ایمان بن جائے۔ صاحب ایمان سر  
جھکائے تو پوزر و مسلمان بن جائے۔ صلوات

اس بارگاہ کی جلالت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس پر سر تسلیم خم کرنے  
والے صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ جنت کا رضوان بھی ہے۔ ملائکہ کا سر دار بھی ہے  
آسمان کے بنے والے بھی ہیں، عرش کا تارہ بھی ہے۔ کلام اللہ کا پارہ بھی ہے۔  
یہاں اگر رضوان درزی بنے تو رضوان نذرہ جائے۔ جبریل خدمت نہ کرے  
تو یس اللہ لکھ نہ بجائے۔ آسمان والے ماضی نہ دیں تو قابل فلک نذرہ جائیں۔ نجم  
فلک سجدہ نہ کرے تو مقدر روشن نہ ہو۔ اور قرآن درج نہ کرے تو صامت  
رہ جائے۔ صلوات

انسان کی زندگی اور اس کا وجود و چیزوں سے قائم ہے ایک اس کا  
دل اور ایک اس کی زبان۔ جتنا دل پاکیزہ ہوگا اتنی ہی انسانیت روشن تر  
ہوگی اور جتنی زبان فیض و بلین ہوگی اتنی ہی شرافت واضح تر ہوگی۔  
انسانیت کا کل کمال یہی ہے کہ دل کو مرکز علوم و کمالات بنائے اور  
زبان کو مرکز حق و صداقت بنائے اور جسے انسانیت کے لئے علم و صداقت  
کا ہونا لازم ہے تو جسے انسانیت کا رہبر بنایا جائے گا اس کے کردار کا کیا عالم ہوگا  
اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے جسے بھی دنیا کے انسانیت کا رہنما بنایا اسے  
ان دونوں جوہروں سے ضرور نوازا۔ دل کو علوم و فنون کا مرکز بنایا اور زبان

کو حق و صداقت کا ترجمان بنادیا۔ اور کبھی کبھی یہ جو ہر اس قدر نمایاں ہوا کہ دل کے علوم پر ہنگامہ گئی تو باقر العلوم کا لقب ملا اور زبان کی صداقت پر نظر گئی تو ”صادق آل محمد“ کا خطاب مل گیا۔ اور کیا کہنا اس امام برحق کا جو خود صادق آل محمد ہوا اور اس کا باپ باقر علوم اولین و آخرین ہو۔ اور باپ اور بیٹے ہی پر کیا منحصر ہے۔ پورے خاندان میں جس طرف دیکھو کمالات ہی کمالات نظر آئیں۔ سب علم کے مرکز۔ سب صداقت کے پیکر۔ علم ایسا کہ دشمن بھی مسائل دریا کرنے آئیں اور صداقت ایسی کہ نصاریٰ بھی مبالغہ کی ہمت نہ کریں۔ صلوات

صادق آل محمدؑ کا تذکرہ آگیا ہے تو ایک فقرہ عرض کر دوں کہ اہلبیتؑ اہل ہار کے کردار کی کیسانیت اور اس کے اتحاد ہی کا نتیجہ ہے کہ معصومیت نے یہ اختیار دیدیا ہے کہ ہماری روایت کو ہم میں سے کسی کی طرف بھی منسوب کر دیا جائے کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے اول کی بات آخر کی طرف منسوب کر دی جائے۔ اور آخر کی بات اول کی طرف منسوب کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ حرج وہاں ہوتا ہے جہاں اول کچھ کہتا ہے اور آخر کچھ

اویہ یہاں عالم یہ کہے جو اول نے کہا ہے وہی آخر نے کہا ہے اور جو آخر نے کہا ہے وہی اول نے کہا ہے۔ سب کا کلام ایک۔ سب کا بیان ایک۔ سب کا مدعا ایک۔ سب کا مقصد ایک۔ سب کا مفہوم ایک۔ سب کی مراد ایک۔ کوئی تفرقہ نہیں۔ کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی جدائی نہیں۔ کوئی علیحدگی نہیں اور جدائی ہو بھی تو کیسے ہو۔ بیان میں جدائی ہوتی اگر ذات میں جدائی ہوتی اور یہاں تو ذات کا یہ عالم کہ اول بھی محمدؑ اور وسط بھی محمدؑ آخر بھی محمدؑ اور کل کے کل محمدؑ۔ صلوات

ایسا اتحاد عمل۔ ایسا اتحاد فکر و نظر ایسی یکسانیت۔ ایسی کیسانیت کہ سب کا قول ایک۔ سب کا عمل ایک۔ جو اول نے کہا اس کا آخر ذمہ دار اور جو آخر

نے کیا اس کا اول ذمہ دار۔ سب صادق آل محمدؑ ہیں۔ جسے چاہو صادق کہہ کے روایت بیان کر دو کوئی غلط بیانی نہ ہوگی۔ اور بات صداقت کے سانچے میں دھلی ہی نظر آئے گی۔ یہ وہ دنیا نہیں ہے جہاں چارہ ہیں تو چاروں کی بات الگ۔ فتویٰ الگ۔ قانون الگ۔ نظام الگ۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں چودہ ہیں لیکن سب کی بات ایک۔ سب کا کلام ایک۔ سب کا بیان ایک۔ کیوں نہ ہوتا۔ بات کلام اللہ سے الگ ہو جاتی ہے تو فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب سب خدا ہی کے ترجمان ہیں تو نہ اس کے یہاں کوئی فرق ہے نہ ان کے یہاں فرق ہوگا مصلوات

علم ایسا کہ کل کائنات نگاہوں کے سامنے آئینہ اور بیان ایسا کہ کلام اللہ کی ترجمانی شمار۔ دنیائے ہر منزل پر آزمایا۔ کبھی علوم و کمالات کا امتحان لیا اور کبھی صداقت بھجی کی آزمائش کی لیکن نہ کبھی علم میں جہالت کا اعتراف دیکھا نہ کبھی بیان میں غلطی کا شبہ نظر آیا۔

بیشمار واقعات ہیں جہاں اہل دنیائے امتحان لیا ہے اور لا تعداد مواقع آئے ہیں جہاں اپنوں اور غیروں نے آزمایا ہے لیکن یہ کمال کا اثر تھا کہ کوئی فضیلت کا اقرار کئے بغیر نہ جاسکا۔ وہ دنیا کے نمائندے ہوتے ہیں جو ہر بات پر جہالت کا اقرار کرتے ہیں۔ اور یہ خدا کا نمائندہ ہے جو ہر جمع میں سلوٹی کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ صلوات

آئیے صادق آل محمدؑ کی زندگی کے چند واقعات پر نظر کریں اور یہ دیکھیں کہ آپؐ نے اشاروں اشاروں میں کیسے کیسے اہم مسائل حل کر دیے ہیں۔ ایک دشمن دین دہریہ جس کا نام عبداللہ دیصانی تھا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپؐ سے وجود خدا پر بحث کرنا چاہتا ہوں میں خدا کا قائل نہیں ہوں۔

آپ نے فرمایا تو کیا پریشانی ہے بحث ہو جائے گی۔ پہلے یہ تو بتا کہ تیرا نام کیا ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے کہ سلام نہ کلام جھگڑا شروع کر دیا۔ کچھ اخلاقیات تو ہونے چاہئیں۔ دہریہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان انسانیت سے خارج ہو جائے۔

اس نے یہ سوال سنا اور رخصت ہو گیا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ اس قدر زور و شور سے آیا اور اتنی جلدی چلا گیا۔ نہ کوئی بحث نہ مباحثہ نہ دلیل نہ جواب۔

کسی نے عرض کی فرزند رسول! یہ کیا ہو گیا کہ یہ تو بڑی شان سے بحث کرنے آیا تھا یہ کیا رنگ چلا کیسے گیا۔

آپ نے فرمایا تمہیں نہیں معلوم۔ بحث ہو گئی اور وہ بار بھی گیا۔ لوگوں نے عرض کی کہ ہم نے تو کوئی بحث نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے غور نہیں کیا۔ میں نے اس سے نام پوچھ لیا۔ اب وہ اس کشمکش میں پڑ گیا کہ نہ بتائے تو جہالت ثابت ہوتی ہے اور بتا دے تو فوراً سوال ہو گا کہ جب کوئی اللہ نہیں ہے تو عید اللہ کیسے ہو گیا۔ عید اللہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی اللہ ہے۔

صلوات

مقصود نے کس خوبصورتی کے ساتھ لفظوں ہی لفظوں میں استدلال کر دیا اور دہریہ کا سارا زور گھٹ گیا۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ لفظ عید اللہ خود بھی وجود خدا کی ایک دلیل ہے۔ اور شاید یہی راز تھا کہ جس کے وجود کو وجود خدا کی مجسم دلیل بنا کر دنیا میں بھیجنا تھا۔ اس کے نوکر کو آخری منزل میں صلب عید اللہ ہی میں رکھا تا کہ آغاز حیات ہی بتا دے کہ یہ زندگی پروردگار کا سبق دینے آیا ہے۔ عیسیٰ میں اور مرسل اعظم میں یہی فرق ہے کہ

عیسیٰ بقول خود عید اللہ تھے۔ لیکن ابن عید اللہ نہ تھے۔ اسی لئے عیسیٰ میں نے گہرا کر "ابن اللہ" کہہ دیا اور حضور پر کائنات عید اللہ بھی تھے اور ابن عید اللہ بھی تھے۔ عیسیٰ کی عبدیت کا اعلان خود جناب عیسیٰ نے کیا تھا۔ اور حضور سرور کائنات کی عبدیت کا اعلان معراج کی منزل میں پروردگار نے کیا ہے۔

— صلوات

ایک دہریہ اور حضرت کی خدمت میں آیا۔ اور دین اسلام پر مختلف اعتراضات لے کر آیا۔

پہلی بات تو یہ کہ خدا نے شیطان کو اپنے بندوں پر کیوں قابو دیا کہ وہ ایسا ساری خلقت کو گمراہ کر رہا ہے اور اسے کوئی روک نہیں پاتا۔

آپ نے فرمایا کہ شیطان کے اختیار کی دو صورتیں ہیں۔ خدا کے مقابلہ میں یا بندوں کے مقابلہ میں۔ اگر اس کا اختیار خدا کے مقابلہ میں ہوتا تو خدا کو خطرہ ہوتا اور خدا یہ اختیار نہ دیتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے اختیار سے خدا پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ خدا کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان دے گی یا بندوں کے مقابلہ میں اختیار تو یہاں بھی اتنا ہی اختیار ہے کہ دلوں میں دوسرے ہدا کر سکتا ہے جبر نہیں کر سکتا اور دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ نے عقل دیدی ہے۔ اب اگر کوئی عقل سے کام نہ لے اور شیطان کے دوسرے میں آجائے

تو وہ خود بھی ایک شیطان ہے۔ اس میں خدا کا کیا قصور ہے۔ شیطان یہی روز اول سے شیطان نہیں تھا۔ ایک بہترین عبادت گزار بندہ تھا۔ ملائکہ کے ساتھ سجدے کیا کرتا تھا۔ اب ایک آدم کو سجدہ نہیں کیا اور ایسا بن گیا تو اس میں تخلیق کا کیا قصور ہے؟

اس نے کہا کہ جب غیر خدا کو سجدہ نہیں ہو سکتا تو آدم کے سجدہ کا حکم یہ

کیوں دیا گیا۔

آپ نے فرمایا کہ جو سجدہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے وہ خدا ہی کا ہوتا ہے بندہ کا نہیں ہوتا۔ ابلیس کا یہی تو تصور تھا کہ خدا کا قائل تھا۔ حکم خدا کا قائل نہیں تھا۔ اور بندہ وہی ہوتا جو حکم کے سامنے سر جھکائے۔

یہیں ہے دور حاضر کی توحید خالص کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ خدا کے نام پر رسول کا بھی احترام چھوڑ دیتے ہیں اور سلام و قیام کو سراسر اہم و بدعت سمجھتے ہیں ان کی یہ توحید بھی کچھ ابلیس ہی کی توحید سے ملتی جلتی ہے کہ بغیر خدا کے آگے نہ جھکیں گے چاہے خدا ہی کیوں نہ حکم دے۔ یہی تو ابلیس بھی کہتا تھا کہ غیر خدا کو سجدہ نہ کرو گا چاہے خدا ہی کیوں نہ کہے۔ ان انسانوں میں اور ابلیس میں کیا فرق رہ گیا معصوم کردار اختیار کرنا ہے تو حکم خدا کے آگے جھکنا پڑے گا۔ وہ آدم کی تعلیم کے لئے مقرر کیا دے تو جھکنا پڑے گا۔ اور نبی کی تعلیم کو اٹھا دے تو اٹھنا پڑے گا۔ ورنہ نبی خود ہی محفل سے اٹھا دے گا۔ صلوات

دہریہ نے کہا کہ جب آپ کے خیال میں خدا کی صنعت میں عیب نہیں ہے تو یہ فتنہ کیا چیز ہے۔ خدا نے جس چیز کو جیسے پیدا کیا ویسے ہی رہنے دیجئے اس تعمیر کی کیا ضرورت آپ نے فرمایا کہ فتنہ نہ صنعت خدا میں عیب ہے نہ عیب کی اصلاح۔ یہ ایک ضرورت ہے جس سے بہت سے فسادات کو روکا جاتا ہے۔ اور یہ بھی مصلحت پروردگار ہے کہ بچے اس جبر کو لے کر آئے اور دنیا میں اسے جدا کیا جائے جیسے بال، ناخن، ناف وغیرہ کہ ان سب کی اصلاح دینا میں ہوتی ہے۔ حالانکہ خدا کے امکان میں یہ بھی تھا کہ وہیں سے اصلاح کر کے بھیجتا۔ یہ مصلحت الہی ہے کہ اتنی کثافت لے کر آئے اور اسے دنیا میں جدا کیا جائے۔ اب اگر کوئی صاحبِ قہر ہے تو وہ وہیں سے کثافت سے طیب و طاهر بن کر آئے گا۔ اور اسے فتنہ کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ صلوات

اس مقام پر ایک لفظ اور بھی ہے جو خطابت ہے استدلال نہیں ہے۔ لیکن لطف سے خالی بھی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں فتنہ کو اسلام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور بچہ کو اس دن صبح طور سے مسلمان تصور کیا جاتا ہے۔ جس دن اس کا فتنہ ہو جاتا ہے اور شاید یہ بھی ایک مصلحت الہی ہو کہ سب کو فتنہ کا محتاج پیدا کیا ہے۔ اور اپنے خاندانوں کو فتنہ سے مستثنیٰ کر کے پیدا کیا ہے کہ دنیا دیکھ دے کہ مسلمان بنانے کے محتاج اور ہوتے ہیں اور مسلمان بن کر آنے والے اور ہوتے ہیں۔ صلوات

اس نے کہا اچھا یہ تو بتائیے کہ اسلام میں غسل جنابت کیوں رکھا گیا ہے۔ کیا غسل حلال بھی اتنا برا ہوتا ہے کہ سارے بدن کو دھونے کی ضرورت پڑے؟ آپ نے فرمایا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ جنابت کے مادہ کا تعلق سارے بدن سے ہوتا ہے۔ اور وہ مادہ سارے بدن سے کھینک کر نکلتا ہے۔ اور بدن کو ایک قسم کی بدبو دے دیتا ہے۔ اسلام نے چاہا کہ جب بھی کوئی ایسا مادہ خارج ہو تو غسل کر دیا جائے تاکہ بدن کی طہارت و پاکیزگی پر کوئی اثر نہ پڑے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی طرف اور اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جنابت کے مادہ کا تعلق سارے جسم سے ہے اور یہ مادہ پورے جسم سے کھینچ کر نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غسلی عمل کے انجام دیتے وقت اگر کوئی بھی جزو بدن دوسرے کام میں مصروف ہو جاتا ہے تو آنے والے پچ میں وہ عضو ناقص ہو جاتا ہے۔ شریعت نے اسی نکتہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہا تھا کہ جب رازا یہ وقت میں کسی عضو بدن کو دوسری طرف متوجہ نہ کرنا دینا آنے والی نسل میں تصور پیدا ہو جائے گا۔ نظر مصروف ہو جائے گی تو آنے والے کی نگاہ کمزور ہوگی۔ زبان مصروف ہوگی تو آنے والے کی بکریائی کم ہوگی۔ تصورات دوسری طرف ہونگے تو آنے والے کا ذہن پرانندہ ہوگا۔ غرض کہ جیسا عمل ہوگا ویسا ہی نتیجہ ہوگا۔ اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ رشتہ زود حیات کو صرف اپنی راحت

کا ذریعہ نہ سمجھے بلکہ ایک پوری نسل کی ذمہ داری تصور کرے اور سوچے کہ روز قیامت اس نسل کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

اس نے کہا کہ آپ کے نزدیک جو بیت اسلام سے زیادہ قریب ہے یا عرب کا قدیم مذہب؟ آپ نے فرمایا کہ عرب کا قدیم مذہب اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ عرب میں غسل جنابت تھا۔ غلتہ تھا۔ غسل و کفن تھا۔ مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ خانہ کعبہ کا احترام تھا۔ ان بہن بیٹی اور بیوی میں امتیاز تھا۔ توریت و انجیل کے آسمانی کتاب ہونے کا اقرار تھا۔ اور عجیبوں میں یہ کچھ نہیں تھا۔ وہ نہایت ہی ناہنجار لوگ تھے۔ ان سے اسلام کی کوئی قربت نہیں ہے۔

دہریہ نے کہا کہ جو بیویوں کے پاس بہن سے عقد کرنے کا جواز ہے کہ حضرت آدمؑ نے بھائی بہن کا عقد کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر یہ مان لیا جائے تو ان بیٹی کے جواز کی کیا دلیل ہے۔

اس نے کہا یہ اسلام نے شراب بھی لذیذ چیز کو کیوں حرام کر دیا ہے آخر شراب نے مسلمانوں کا کیا بگاڑا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ شراب ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ شراب کا حملہ عقل پر ہوتا ہے۔ اور جس کی عقل قابو میں نہ رہے وہ ہر حرام کر سکتا ہے۔ ان بہن سے زنا بھی کر سکتا ہے۔ اور بتوں کو سجدہ بھی کر سکتا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ امامؑ نے ایک ایسے عظیم نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کا تجربہ آج بھی ہو رہا ہے اور صدر اسلام میں بھی ہو چکا ہے کہ جس نے شراب کو اپنا لیا اس نے حلال و حرام کا امتیاز کھو دیا۔ یزید نے سوشلی ماؤں کو حلال کر لیا۔ عبد الملک نے فشر کی حالت میں کنیز سے نماز جماعت پڑھوادی

کسی اور بادشاہ نے مردہ کنیز سے زنا کر لی۔ کسی نے کسی اور حرام پر ہاتھ صاف کر لیا غرض کہ شراب آئی اور اسلام گیا۔ قرآن حکیم نے اسی دن کے لئے شراب کو جس سے تعبیر کیا تھا۔ اور اسلام کے سچے رہنماؤں کی تعریف میں ”لَيْسَ هَبْ عَنْكُمُ الرِّجْسَ“ کہہ دیا تھا کہ یہاں زندگی میں جس کا گزر رہی نہیں ہے۔ اور یہی زندگی خالص اسلامی زندگی ہے۔ صلوات

اس نے کہا کہ ذبیحہ اور مردار میں کیا فرق ہے کہ ذبیحہ کو حلال کیا گیا ہے اور مردار کو حرام کر دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک طبی فرق ہے اور ایک اخلاقی فرق ہے۔

طبی فرق یہ ہے کہ ذبیحہ کا خون نکل جاتا ہے اور گوشت کا نقصان ختم ہو جاتا ہے۔ اور مردار میں خون باقی رہ جاتا ہے۔ جو نقصان رہ جاتا ہے اور اخلاقی فرق یہ ہے کہ ذبیحہ میں نام خدا لیا جاتا ہے اور مردار میں نام خدا نہیں ہوتا۔ اور حلال و حرام کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اب اس کی مرضی یہی ہے کہ جس پر اس کا نام لے لیا جائے اسے اپنے نام کے صدقہ میں حلال کر دے۔ اور جس پر اس کا نام نہ لیا جائے اسے اس بغاوت و سرکشی کے طفیل میں حرام کر دے۔ صلوات

یہ مردار کا خون بھی کیوں حرام ہے؟ اسی کو حلال کر دیا گیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ خون کا استعمال سنگدلی کا باعث ہوتا ہے اور خون انسان کے جسم کو بدبو دار بنا کر اس میں جزام کے جراثیم پیدا کرتا ہے اور اسلام کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کر سکتا۔ جس سے ایسی بیماریوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ صلوات

اس نے کہا کہ اچھا ذبیحہ اور مردار کا یہ فرق ہے تو پھلی کا ذبیحہ کیوں

نہیں ہوتا اور وہ پانی کے باہر آکر مر جائے تو حلال ہو جاتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ادل تو یہ باہر آنا ہی اس کا ذبح ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے جسم میں اتنا خون نہیں ہوتا کہ گوشت کو فاسد کر سکے اس لئے اس کا مردہ جائز ہے۔ اور دوسرے حیوانات کا مردہ جائز نہیں ہے۔ بھیلی کا قیاس ٹڈی پر ہو سکتا ہے۔ اور دوسرے جانوروں پر نہیں۔ — صلوات

کہنے لگا یہ قیامت میں میزان کیا ہے جس پر اعمال توے جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ عمل کوئی مجسم چیز نہیں ہے کہ اسے ترازو میں تو لا جائے۔ یہ ایک تغیر ہے۔ اعمال کے سبب و کتاب کی کہ جس کو لا بھاری ہو گا یعنی نیکیاں زیادہ ہوں گے اسے بہترین اجر دیا جائے گا۔

کہنے لگا اچھا یہ تو بتائیے کہ جب اہل بہشت میوہ استعمال کریں گے تو فضلہ کا کیا ہوگا؟

آپ نے فرمایا کہ وہ بہشت ہے اور بہشت کوئی دنیا نہیں ہے جہاں فضلہ وغیرہ کا سوال پیدا ہو۔ وہاں کی غذا میں اتنی لطیف ہوگی کہ فاضل اجزا و پسینہ بن کر نکل جائیں گے اور احساس بھی نہ ہوگا۔

کہنے لگا۔ اچھا یہ حوریں کیا ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ستر ستر کپڑے پہنے ہوں گی اور پھر بھی بدن نظر آئے گا۔ یہ کیسے کپڑے ہوں گے اور کیا بدن ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے دنیا میں بھی پانی صاف ہوتا ہے تو نہ تک کی چیز نظر آ جاتی ہے۔ یہ تو لطافت کی بات ہے کہ ان کے جسم اور لباس اتنے لطیف اور شفاف ہوں گے کہ ستر کپڑوں کے باوجود نظر آئیں گے۔

کہنے لگا یہ سب صبح ہے لیکن ایسی جنت سے کیا فائدہ جس میں آدمی تنہا جائے اور اس کے سارے اعزاء و اقربا و احباب جہنم میں رہیں وہاں تو عیش جنت بھی

خاک میں مل جائے گا؟

آپ نے فرمایا سچ ہے۔ اگر ایسے لوگ جائیں گے جنہیں جہنمیوں کی یاد ستائے گی تو ان کا عیش یقیناً غارت ہو جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جائیں گے ہی کیوں جنہیں جہنمیوں کی یاد ستائے۔ ان کے لئے تو مناسب یہ ہے کہ جہنم ہی میں پہلے جائیں تاکہ پوری پارٹی ایک جگہ پر رہے اور بعد ازاں سوال ہی پیدا نہ ہو۔ — صلوات

اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جو استفادہ یا امتحان کی غرض سے کئے گئے ہیں اور امام نے ان کی روشنی میں مذہب کے اہم مسائل سے نقاب کشائی کی ہے موقع نہیں ہے کہ تمام سوالات کی طرف اشارہ کیا جائے۔ لیکن چند سوالات کا ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں آج کے تازہ ترین مسائل بھی حل ہو جائیں۔ اور امامت کی شان بھی نمایاں ہو جائے۔

ایک شخص نے آکر پوچھا کہ اولاد علی و فاطمہ کو کون سا امتیاز حاصل ہے جو دوسرے مسلمانوں کو نہیں ہے۔ جواب آپ اس پر فرم کرتے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ یہی فقر کیا کم ہے کہ سب ہمارے نسب میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہم کسی کے نسب میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ — صلوات

ارباب کرم! امام نے اس ایک فقرہ سے اسلام کے بہت سے واقعات کی نقاب کشائی کر دی ہے۔ جہاں اہل حکومت و اقتدار خاندان نبوت میں رشتہ کے طلبگار بن کر آئے ہیں۔ کبھی بیٹیاں لے کر آئے کبھی بیٹیاں لینے کے لئے آئے۔ اور دونوں مواقع پر درپردہ اقرار کر گئے کہ ان کو جو شرافت و جلالت حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہ بیٹی لے بھی لیں تو شرف ہے دنیا تو بڑی بات ہے۔

— صلوات

ایک چاہنے والا عرض کرتا ہے۔ فرزند رسولؐ بہت غریب ہوں۔ فاقوں میں بسر ہو رہا ہے۔ فرمایا کیوں غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ خزانہ چھپا کر رکھا ہے اور غربت کی شکایت کرتا ہے۔

اس نے عرض کی سرکار خدا گواہ ہے میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے اور حد درجہ نادار ہوں۔

آپؐ نے فرمایا غلط بیانی سے کام نہ لے۔ اس نے عرض کی حضورؐ میں بالکل صیغ کہتا ہوں۔ فرمایا اچھا اپنا خزانہ مجھے دے دے اور جو ابرت چاہے میں تجھے دوں۔ اس نے عرض کی سرکار میرے پاس کون سا خزانہ ہے جو میں آپؐ کو دیدوں فرمایا تیرے سینے میں جو ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے اسے دیدے پھر جو چاہے لے۔ اس نے عرض کی سرکاریہ تو نہیں ہو سکتا۔ فرمایا بے اتنی قیمتی شے رکھے ہوئے ہے۔ تو غربت کی شکایت کیوں کرتا ہے۔ گویا امامؑ نے واضح کر دیا کہ عجب اہلبیتؑ کی حجازہ مال دنیا پر نہیں ہوتی چاہئے۔ اور جس کے پاس محبت کا خزانہ ہوتا ہے اسے دنیا کے سرمایہ دار خسرید بھی نہیں کہتے۔ بھلا یہ سرمایہ دار اس محبت کی قیمت کیا لگا لگا کر جس کی قیمت خدا نے بھی لگا لی ہے تو مقابلہ میں رسالتؐ ہی کو رکھا ہے۔ کسی اور شے کو

نہیں رکھا۔ صلوات

ایک شخص اگر مسئلہ دریافت کرتا ہے کہ مولا میری ماں بے حد ضعیف ہو گئی ہے اعد میں اس کی اسی طرح خدمت کرتا ہوں جس طرح بچپن میں اس نے مجھ کو پالا تھا کیا اس کا حق ادا ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا نہ ادا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس نے عرض کی فرزند رسولؐ میں نے بعد خدمت کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا بیشک لیکن حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس نے عرض کی کیوں؟ میری خدمت میں کیا کسر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تیری ماں جب تیری پرورش کر رہی تھی تو دعا کرتی تھی کہ برادر گار میرا لال سلامت

رہے تاکہ میں اور بھی خدمت کروں اور توجہ خدمت کرتا ہے تو تمنا کرتا ہے کہ پروردگار سے اٹھائے تاکہ اس کی مشکل آسان ہو جائے۔ اب تو ہی فیصلہ کر کر کیا تمناے موت بھی دعاے حیات کے برابر ہو سکتی ہے۔ صلوات

امامؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ عمل کی قدر و قیمت زحمت و مشقت سے طے نہیں نہیں ہوتی۔ عمل کی قدر و قیمت نیت و خلوص سے طے ہوتی ہے۔ خلوص نہیں ہے تو زندگی بھر کے سجدے بھی بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور خلوص ہے تو ایک مہریت بھی ثقلین کی عبادت پر بھاری ہو جاتا ہے۔ صلوات

اپنوں ہی کا ذکر نہیں۔ عیسروں نے بھی بے شمار مسائل دریافت کئے ہیں۔ اور اپنی جانب میں امامؑ کو عاجز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن قادر مطلق کا نام نہ کہیں عاجز ہو سکتا ہے۔ جاہل عوام کا نام نہ ہوتا تو چپ ہو جاتا یہ غلام کا نام نہ ہے جو سوال کیا جائے گا فوراً جواب دینگا۔ چنانچہ چند سوالات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جن سے امامؑ کے علم کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور امامؑ کا فلسفہ حیات بھی سامنے آجائے گا کہ حکومتوں کی مخالفت کے باوجود کس طرح زندگی گزاری ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ امام صادقؑ کا دور سیاسی اعتبار سے بڑی کشمکش کا دور تھا۔ آپؑ کی زندگی میں متعدد بادشاہ گزرے ہیں۔ اور آپؑ نے بنی امیہ کا بھی اقتدار دیکھا ہے۔ اور بنی عباس کا بھی اور کمال یہ ہے کہ دونوں کے درمیان ایسی حسین اور پاکیزہ زندگی گزاری ہے کہ نہ انھیں گرفت کرنے کا موقع ملا نہ انھیں۔ آپؑ کی زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ مشہور میں عبد الملک بن مروان کے دور حکومت میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ۳ سال کی عمر تک یہ دور دیکھا۔ اس کے بعد مشہور تک ولید بن عبد الملک بن مروان کی حکومت رہی مشہور سے ۱۱۰

نک سلیمان بن عبدالملک حاکم رہا۔ ۱۰۹۰ء سے ۱۱۰۰ء تک مردان کو پوتا عمر بن عبدالعزیز حاکم رہا۔ ۱۱۰۰ء سے ۱۱۱۰ء تک یزید بن عبدالملک کی حکومت رہی۔ ۱۱۱۰ء سے ۱۱۲۰ء تک ۲۰ سال ہشام بن عبدالملک حکومت کرتا رہا۔ ۱۱۲۰ء سے چند ماہ تک ولید بن یزید کی حکومت رہی اور بالآخر ۱۱۲۳ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل کے بعد ۱۱۲۳ء میں یزید بن ولید حاکم ہوا اور تین ماہ کے بعد مغزول کر دیا گیا۔ ۱۱۲۴ء میں مردان الحمار بنی امیہ کا آخری بادشاہ ہوا اور ۱۱۲۴ء میں بنی عباس کے ہاتھوں تریخ ہو گیا۔ اس کے قتل کا دلچسپ واقعہ تاریخ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب سفاح کو عراق پر تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے مردان پر حملہ کیا۔ مردان نے ایک لاکھ فوج سے مقابلہ کیا لیکن آخر میں شکست کے آثار نمایاں ہو گئے تو مروان گھوڑے سے اتر کر پیشاب کرتے گیا اور گھوڑا بھی اگ نکلا۔ لوگوں نے خالی گھوڑا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ بادشاہ قتل ہو گیا ہے۔ اور فوج منتشر ہو گئی۔ اور بالآخر مردان نے فرار اختیار کیا۔ اثنائے راہ میں سفاح کے ایک سپاہی نے اسے قتل کر دیا اور بنی امیہ کی برسوں کی حکومت پیشاب کے ساتھ بہہ گئی۔

آپ اسے مزاح نہ سمجھیں۔ یہ بھی معصوم ہی کا استدلال ہے کہ جب بادشاہ وقت نے امام کو حکومت سے مرغوب کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس ملک دنیا کی کیا قیمت ہے جس پر تو نے قبضہ جارکھا ہے۔ یہ بتا کہ اگر نکلے میں تکلیف ہو جائے اور طبیب آدمی حکومت مانگے کہ نصف حکومت دیدے تو طاع کر دوں گا اور بانی پینے کے لائق ہو جائے گا تو دے گا یا نہیں؟۔ اس نے کہا ضرور دیدوں گا۔ فرمایا اچھا اس کے بعد اگر پیشاب رک جائے اور پھر آدمی حکومت مانگے تو دیگا یا موت اختیار کرے گا۔ اس نے کہا دے دوں گا۔ فرمایا اب بچان لے کر تیرے

کل ملک کی قیمت ایک پیشاب سے زیادہ نہیں ہے اور اس ملک کو لے کر ہم اہلبیت سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ صلوات

یہ مالک کائنات ہاکرم ہے کہ ہمیں اس قسم کے امراض سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ آپ اپنی غربت و پریشانی کو نہ دیکھیں۔ یہ دیکھیں کہ اس نے ایسے امراض سے محفوظ رکھا ہے جن پر پوری پوری حکومت قربان کی جاسکتی ہے۔ یہ صحت نہیں درحقیقت ایک سلطنت ہے جس کا شکر یہ نہیں ادا کیا جاسکتا۔ ورنہ انسان سناڑ معرفت ہوتا تو پوری زندگی سجدہ شکر میں گزار دیتا۔ صلوات

معصوم نے مخفی مدت میں ۹ حکومتیں بنی امیہ کی دیکھیں اور اس کے بعد ۱۳۲۰ء سے بنی عباس کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ۴ سال تک سفاح کی حکومت رہی۔ ۴ سال کے بعد ۱۱۵۰ء تک منصور کی حکومت رہی اور اسی کے دور حکومت میں ۱۱۵۰ء میں امام جعفر صادقؑ کو زہر دے دیا گیا۔ منصور سے آپ کا وجود برداشت نہ ہوتا تھا۔ اور اس نے بار بار چاہا کہ امام کو اپنا تاج بنائے لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ ایک مرتبہ منصور نے کہا کہ آپ میرے دربار میں کیوں نہیں آتے۔ آپ نے فرمایا کہ نہ تیرے عذاب کا خوف ہے نہ تیرے انعام کی لالچ پھر کیا کرنے آؤں۔ کہنے لگا کہ نصیحت ہی کے لئے آیا کچھ۔ فرمایا کہ طالب دنیا تجھے نصیحت نہ کرے گا اور طالب آخرت تیرے قریب نہ آئے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ

تجھ پر نصیحت کا اثر نہ ہوگا۔ صلوات

ایک روز اہل شریعہ کے بعد منصور کے دربار میں تشریف لے گئے۔ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کلمی منصور کی ناک پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اڑا ناچا۔ پھر آگئی۔ پھر اڑا پھر آگئی۔ آخر میں بیٹھا کہ کہا کہ اللہ نے یہ کیا ہے کہ مخلوق پیدا کی ہے جس کا کوئی معرفت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا اس کے بے شمار فوائد ہیں اور یہی کیا کم ہے کہ اس طرح

یہ فرمائی کہ دیکھو نماز سے غفلت نہ ہونے پائے۔ ہم اہلبیت کی شفاعت اسے نہیں مل سکتی جو نماز کو بیک شمار کرے گا۔ یہ کہتے کہتے تین مرتبہ الصلوٰۃ الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امام کو کس قدر نماز کی فکر تھی کہ وقت آخر چاہتے والوں کو کوئی وصیت کی تو نماز ہی کی وصیت کی اور آپ جانتے ہیں کہ امام کی وصیت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ سے اس لئے وصیت کی ہے کہ آپ سے وفا کی امید ہے۔ امام حسینؑ نے بھی آپ ہی سے وصیت کی تھی کہ میرے لال جب قید شام سے چھوٹ کر مدینے جانا تو میرے شیعوں سے میرا سلام کہہ دینا۔ اور کہنا شیعوں! جب ٹھنڈا پانی پینا تو امامؑ کی پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و بیکس کا ذکر آئے تو بوجھ پرا تسو بہانا۔ امام جعفر صادقؑ نے رحلت فرمائی۔ اعزاء موجود۔ افریاد موجود۔ چاہنے والے موجود۔ مدینہ وطن۔ دعووم سے جنازہ اٹھا۔ اہتمام سے مثالیعت جنازہ کی گئی۔ کیوں نہ ہو جب کوئی وطن میں ہوتا ہے اور اس کے اقربا موجود ہوتے ہیں تو جنازہ اہتمام سے اٹھتا ہے۔

اے وہ غریب الوطن کیا کرے جس کو وطن چھوٹ کر جانا بھی نصیب نہ ہوا اور جس کے وارثوں کو اتنی بھی جہالت نہ ملی کہ امامؑ کے لاشہ کو دفن کر دیتے۔ اور فرزند رسولؐ کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر دس بستہ کر بلا سے چلے گئے۔ عزا دارو! غربت کا ذکر آگیا تو ایک غریب الوطن کی یاد آگئی جس کو کربلا کی خاک پر بھی سونا نصیب نہ ہوا۔ اور گھر کی فضا کو چھوڑا تو شام کے زندان میں سونا پڑا ہائے وہ قیامت کا وقت جب شام کے زندان میں باپ کو یاد کر کے رونے والی۔ روتے روتے خاموش ہوئی اور ثانی نہ ہرائے شانہ ہلایا۔ بیٹی اٹھو! میری لال نہ روؤ بیٹی بابا اب نہ آئیں گے۔ اٹھو میری جان بیو بھی گئے لگائے۔ بیٹی اب تیری ذمہ داریں ہوں

بھائی تھے میرے حوالے کر گئے ہیں۔ اور کوئی جواب نہ ملا تو غور سے جھک کر دیکھا کیا دیکھا کہ  
ایسی دینا سے رخصت ہو چکی ہے۔ ہائے وہ باپ کی عزادار ایک نیا صدمہ دے گئی۔  
عزادار وہاں سوچ سکو تو سوچو غربت کا عالم قید کی مشقت۔ تاریک نذران  
اور اس میں ایک ننھی سی میت غسل کون دے گا۔ کفن کہاں سے آئے۔ قبر کون بنائے  
جنازہ کون اٹھائے اور میت کو کیسے سپرد خاک کیا جائے۔ ہائے رے بے کسی۔  
اف رے بے بسی۔ عجب نہیں قلبِ زینب نے آواز دی ہو۔ بھیا آؤ! تمھاری چاہنے  
والی دینا سے رخصت ہو گئی۔ عباس آؤ بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔ اکبر کہاں ہو۔ قاسم دعویٰ  
و محمد ذرا میری بے کسی کا عالم تو دیکھو۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ عجب نہیں بقیع کا رخ کر کے  
آواز دی ہو۔ اماں آپ کا جنازہ تو پردہ شب میں اٹھ گیا لیکن یہاں کوئی سامان  
نہیں ہے۔ اماں آؤ زینب کا دل سنبھالو۔ اللہ کیا قیامت کی ساعت تھی جب  
بیارام غسل و کفن دے رہا تھا اور ثنائی زہرا جنازہ تیار کر رہی تھیں۔ جنازہ  
تیار ہوا۔ پھر دھڑکیا گیا۔ سر تیں دفن ہوئیں۔ ارمان پر و خاک ہوئے۔ اور ایک دیکھا  
ماں کے دل نے آواز دی۔ شاباش بیٹی شاباش۔ اصغر نے کر بلا بسائی اور تو نے قید خانہ  
بسیا۔ اب ماں کس منہ سے وطن جائے گی۔ اور اہل وطن کو کیا منہ دکھائے گی۔ شاباش  
میری لال غربت میں یوں ہی ماں کا ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ بیٹی یہ تو بتاؤ کہ ب  
قید خانہ سے رہائی ملے گی تو میں کیا کروں گی۔ اور تیری قبر کو کیسے تنہا چھوڑ دوں گی۔  
میری لال اگر قافلہ رہا ہو کہہ کر بلا گیا تو میں وارث کو کیا جواب دوں گی۔ بیٹی تجھے  
وطن جانے کی تنہا تھی۔ تو نے وقت آخر میں مولا سے کہا تھا کہ میں مدینہ پہنچا دیجئے۔  
بیٹی وقت آ گیا ہے عنقریب قافلہ رہا ہو کہہ مدینہ جانے والا ہے۔ ایک تمھیں نہ ہوگی  
باقی تو سارا قافلہ وطن جائے گا۔

ارباب ۱۶! کون جانے کہ ماں پر کیا لگد لگئی اور بیٹی کا کیا عالم ہوا تاریخ

خاموش ہے۔ مقتل انگشت بزدلان ہے۔ فضا میں سناٹا چھایا ہوا ہے کسی طرف  
سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی بیٹی یہ کہہ  
رہی ہو۔ اماں کر بلا جائیے گا تو بابا سے ہمارا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور وطن جائیے  
گا تو بہن کو گلے سے لگا لیجئے گا۔ اماں اگر کبھی پانی مل جائے تو یہ یاد رکھئے گا  
کہ آپ کا اصغر بھی پیاسا ہے اور آپ کی بیٹی بھی پیاسی ہے۔

اِنَاللّٰہِ وَاِنَا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

## جناب امام حسن علیہ السلام

|               |                                                 |
|---------------|-------------------------------------------------|
| اسم مبارک :   | حسنؑ                                            |
| لقب :         | عقیلی، زکی، وغیرہ                               |
| کنیت :        | ابو محمدؑ                                       |
| والد ماجد :   | حضرت علی ابن ابیطالبؑ                           |
| والدہ ماجدہ : | جناب فاطمہ زہراؑ                                |
| ولادت :       | ۱۵ رمضان المبارک ۳۰ مدینہ منورہ                 |
| ازواج :       | کنیزوں سمیت ۶۴                                  |
| اولاد :       | جناب قاسم، حسن، شعیب، عبداللہ وغیرہ ۱۵ سے ۳۲ تک |
| شہادت :       | ۲۸ صفر ۴۰ مدینہ منورہ                           |
| عمر شریف :    | ۴۰ سال                                          |
| قبر مطہر :    | جنت البقیع                                      |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سیدنا  
 وعلیٰ آلہ الطیبین سیدنا وعلیٰ ابی القاسم محمد وآلہ  
 الطیبین اطہرین ولعنتہ اللہ علی اعدائہم اجمعین۔  
 اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَرِثَآءَ لَنَا لَلْآخِرَةِ وَالْاُولٰٓئِ

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے، بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے  
 اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ارشاد و کرامی سے واضح ہو گیا کہ عالم بشریت کی ہدایت و راہنمائی میں کسی بشر اور  
 کسی انسان کا دخل نہیں ہے، یہ کام صرف رب العالمین کا ہے اور وہ برابر انجام دے  
 گا۔ آپے یاد رکھئے! مالک کائنات نے صفت اعلان کر دیا ہوتا اور کوئی عملی مظاہرہ نہ  
 کیا ہوتا تو بھی امت کو یقین کر لینا چاہیے تھا، چہ جائیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ  
 اس قانون پر عمل کرنے کے بعد بھی امت کو اعتبار نہ آیا اور یہی خیال ذہن میں رہا۔  
 کہ اپنی ہدایت کا انتظام ہمیں خود کرنا ہے اور رب العالمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں  
 ہے، مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس قوم کو خدا کی تیسرا اعتبار نہ آیا اسے نبی کی سیرت پر  
 کیا اعتبار آئے گا۔

مالک کائنات نے ہر دور اور ہر عہد میں ہدایت کا انتظام کیا اور اس کے  
 انتظام میں سن و سال اور قد و قامت کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس نے کمسن افراد کو  
 بھی ذمہ دار بنایا ہے اور مسن افراد کو بھی، چوتھے قدم والوں کو بھی دین کا عہدہ دار

بنایا ہے اور دروازہ قامت انسانوں کو بھی، اس کے یہاں ایسی کوئی تفریق نہیں  
اس کا تائید دہیں سے منصب دارین کر اسما ہے۔ اس کے تائید سے بنیاد  
طور پر کمسن اور کم عمری ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھوں کو منصب دار نہیں بناتا بلکہ اب  
ہی سے منصب دار بنا کر بھیجتا ہے۔

آج آپ کے سامنے ایک ایسے ہی مابنا اور ہادی کا تذکرہ کرنا ہے جس نے  
بچپن ہی سے کار تبلیغ شروع کر دیا اور امت کی راہنمائی کی ذمہ داری سنبھال  
لی، قانونی طور پر ذمہ داریاں بہت دیر میں منتقل ہوئیں لیکن عملی طور پر وہ کار کا  
نمایاں انجام دینے کے ہادی اعظم کو گود میں لیکر فرما نا پڑا کہ "یہ میرے دونوں  
فرزند امام ہیں چاہے کھڑے رہیں یا بیٹھ جائیں یہ دونوں جنان ابن جنت  
کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان سے بھی افضل ہے۔" پیغمبر اسلام نے یہ نہیں فرماتا  
کہ یہ دونوں بچے امام ہوں گے اور انھیں سردار بنایا جائے گا بلکہ یہ فرمایا  
کہ یہ دونوں امام ہیں اور جنان ابن جنت کے سردار ہیں، تاکہ دنیا واضح ہو جائے  
کہ اللہ والوں کا کال سن و سال اور حالات کا پابند نہیں ہوتا، وہ جہاں  
رہتے ہیں، جیسے رہتے ہیں صاحب کمال، ہمارے ہتھے ہیں، صلوات،  
بلکہ واضح لفظوں میں یہ مہدی یا کو جائے کہ پیغمبر اسلام نے اشارہ  
کر دیا کہ امت کے بوڑھے بھی اگر جنت میں جانا چاہیں تو ان بچوں کو اپنا  
سردار اور ان کے باپ کو ان سے افضل مانیں، انھیں جنت کا سردار اور  
ان کے باپ کو ان سے افضل مانے بغیر نہ دنیا میں اسلام رہ جائے گا اور  
نہ آخرت میں جنت و کوثر کی امید رہ جائے گی جنت ان کے بقصد میں  
ہے اور کوثر پر ان کے باپ کا قبضہ ہے۔ صلوات،

آج مجھے اس شہزادہ صلح و امن، سردار جنان ابن جنت، سبط رسولؐ ا جانِ نبوت  
امامت اور صلح ملت کا تذکرہ کرنا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ یہ ہے کہ  
سید میں ماہ رمضان المبارک کی پندرہ تاریخ کو ولادت ہوئی۔ سات برس نانا کے  
زیر سایہ گزارے، نانا کے بعد چند ماہ ماں کا ساتھ رہا، ماں کے بعد ۳ سال کا عمر صہ باپ  
کے زیر سایہ گزارا، سید میں باپ کی شہادت کے بعد دس سال کا زمانہ اپنے فرائض کی  
انجام دہی میں گزارا جس میں شریک کار اور مددگار جوڑے سبھاں امام حسینؑ اور پسند  
اطاعت شعا۔ افراد کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

تقریباً ۷ سال کی اس زندگی میں اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات  
کا مشاہدہ کیا اور حالات و معالج کے مطابق واقعات میں حصہ بھی لیا سید میں  
جنگ خندق دیکھی، سید میں صلح حدیبیہ کا مشاہدہ کیا، سید میں جنگ خیبر دیکھی، شہد  
میں فتح مکہ کا مشاہدہ کیا، سید میں مابہ میں شرکت کی، سید میں آخری حج میں  
شریک رہے، سید کے آغاز میں ۲۸ صفر کو نانا کا غم برداشت کیا اور اسی سید  
میں نانا کے چند دن کے بعد ماں کا داغ دیکھا، باپ کے مسائل الگ قابلِ دید تھے  
میراث لٹی، جاگیر چینی، تخت و تاج گھیا، عزت و احترام رخصت ہوا، سلام و کلام  
بند ہوا، قرآن واپس ہوا اور تقریباً ۱۲ سال تختِ حکومت پر ایک حاکم کا قبضہ  
رہا، دس سال دوسرے حاکم کا قبضہ رہا، بارہ سال تیسرے حاکم کا قبضہ رہا، چند سال  
کی حکومت باپ کو ملی تو اس میں بھی فتنوں، جنگ موں، شورشوں اور بغاوتوں کا ایک  
طوفان رہا، عثمان حکومت سنبھالنے ہی خونِ عثمان کے نام پر امامِ مومنین جل کے میدان  
میں آگئیں، ان سے فرصت ملی تو معاویہ نے صفین کا مرکز گرم کر دیا، اس سے نجات  
ملی تو خواجه نہروان کے میدان میں اتر پڑے، اور بالآخر حکومت خاتم کی سازش کے

شعبہ کے ماہ رمضان میں ۱۹ دس تا۔ پنج کی صبح کو باپ کے سر اقدس پر اس طبع کی تلوار لگی،  
اور ۲۴ رمضان کی صبح کو باپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

باپ کے بعد شعبہ میں حالات کے تحت حکومت شام سے صلح کی اور شعبہ  
میں خاموش زندگی گزارنے کے باوجود حکومت شام کی قدیم سازش کی بناء پر جلد  
بنت اشدت کے ہاتھوں ۲۸ صفر کو زبرد غاصے خمید ہو گئے۔

تفصیلی حالات کا تذکرہ بعد میں کیا جائیگا، اجنبی طور پر یہ دیکھ لیا جائے  
کہ ۴۴ سال کی زندگی کتنے مصائب و آلام سے گزری ہے اور کس طرح حالات دنیا  
کا مقابلہ کیا ہے اور کئی مرتبہ زندگی کا ایسا نہیں آیا جس میں کسی نہ کسی انداز سے صف  
زیبا ہو، پچھنے کے واقعات میں بھی خاموش تماشائی نہیں رہے اور تعلیم تربیت کے  
طور پر حالات کو نہیں دیکھا، بلکہ اکثر مقامات پر ذر ذر دائرہ عقیدت سے حصہ لیا  
جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا بچپنا اور ہے اور امامت کا بچپنا اور۔

اخلاق میں نبی کا انداز، کردار میں علی کا انداز، صبر میں زہرا کا انداز، شجاعت میں باہم کا  
جلال، استقلال میں ابو طالب کے تہجد، ایمان و یقین میں عبدالمطلب کا نقشہ،  
خاندان کی عزت، بزرگوں کی یادگار، مذہب کا ذرہ دار، اسلام کا خطیب، صلح کا  
شقیب، قرآن کا مفسر، اہل بیت کا صلح، کعبہ کا محافظ اور سیرت رسول کا ایسا ورثہ  
دار کہ جب ہجوم مصائب میں ظمن و ظن کے باوجود عدم مصیبت کی تاریخ دہرا کر صلح کر لی اور  
اسلام کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا تو قدرت کو یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ وہ دونوں  
کی تاریخ وفات کو ایک کر دیا، جس تاریخ میں پہلا صلح دنیا سے گیا تھا اسی  
تاریخ کو دوسرا شہزادہ صلح بھی دنیا سے رخصت ہوا۔

امام منجبتی کی زندگی کے اس خاکہ کو نظر میں رکھنے کے بعد وہاں پہلوؤں کے

نظر کرنا پڑتی ہے، ایک یہ کہ آپ کی ذاتی شخصیت اور آپ کا ذاتی کردار کیا تھا؟  
اور دوسرے یہ کہ آپ نے کن حالات کا سامنا کیا ہے اور ان حالات میں آپ کا طرز عمل  
کیا ہے؟

جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے تاریخ میں بے شمار واقعات ملتے  
ہیں جن سے آپ کی عظمت و جلالت کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ کے واقعات کیا خود  
قرآن مجید کی آیتیں اور مرسل عظمیٰ کے ارشادات و عظمت کی گواہی دے رہے ہیں آیت  
تطہیر عصمت کا اعلان کہ یہی ہے، آیت مباہلہ صداقت کا اعلان کر رہی ہے، آیت  
صلح کر دیا۔ پردوشنی ڈال رہی ہے اور سورہ دہر سخاوت کا قصیدہ پڑھ رہا ہے،  
صلوات،

مرسل عظمیٰ کی زندگی کو دیکھیں گے تو دیاں بھی تول و مل سے مسلسل فضائل  
کلمات کا اعلان ملے گا، کبھی اپنے لال کہ سردار جوانان جنت کہیں گے، کبھی امام  
کے لقب سے یاد کریں گے، کبھی اپنا سبط اور نائب قرار دیں گے اور کبھی اصلاح  
امت کا خزانہ سناہیں گے، کبھی اسے اپنے سے قرار دیں گے اور کبھی اپنے کو  
اس سے قرار دیں گے، صلوات،

اور یہ کلمات فقط زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کا اظہار ہو گا، لواء  
مسیح میں آجائے گا تو ہنر سے اتر کر گودی میں اٹھائیں گے، سب یہ میں آجائے  
گا تو سردا اٹھائیں گے، عید کا دن ہو گا تو کا ندھے پر بٹھائیں گے، باہلہ کا  
موت ہو گا تو انگلی بچھڑا کر لے چلیں گے، تطہیر کی منزل ہوگی تو گئے سے نکا کر  
صف رسالت کو فوت میں تبدیل کریں گے، زہرا کے گھر آئیں گے تو دہن آئند  
کے بر سے لیں گے اور ہر فی کا بچہ آجائے گا تو اسے شہزادے کے حوالے

کروں گے۔

تاریخ نے مختلف منزلوں پر فضائل و کمالات کا اعتراف کیا ہے، علم کا یہ عالم ہے کہ ایمر المؤمنینؑ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا ہے تو اپنے فرزند ہی کو جواب دلاتے ہیں۔ اور حکومت وقت تو بہرہ حال امامت کی محتاج ہے،

شہد و سرور واقع ہے کہ بادشاہِ روم نے حاکمِ شام حادیہ بن ابی سفیان سے دو سوالات کئے، زمین پر وہ کون سی جگہ ہے جہاں آسمان کے ٹھیک وسط میں واقع ہے اور زمین کا وہ کون سا خطہ ہے جس پر سورج کی روشنی صرف ایک مرتبہ پڑی ہے، حاکمِ شام جواب سے عاجز ہو گیا اور مسئلہ کو امامِ حقؑ کے سامنے پیش کر دیا، آپؑ نے فرمایا کہ وسطِ آسمان کی زمین میں پشتِ خانہ کعبہ ہے، اور ایک مرتبہ سورج کی روشنی دیکھنے والی نیل کی گہرائی ہے جس پر صوفِ جنابِ موسیٰؑ کے گزرتے وقت آفتاب کی روشنی پڑی تھی، اس کے بعد پھر دریا حائل ہو گیا اور سورج کی شعاع نہ پہنچ سکی۔

آپؑ نے اندازہ کیا کہ امامِ حقؑ نے کس آسانی سے مسائل کو حل کر دیا اور واضح کر دیا کہ حاکمِ شام جب تجھے زمین کی خبر نہیں ہے تو آسمان کی خبر کیا ہوگی اور جب تو بیت کے فضائل سے باخبر نہیں ہے تو اہلبیتؑ کے کمالات کو کیا سمجھے گا؟

اس علم کی دستِ وجاہت کا یہ عالم تھا کہ اپوزن کا کیا ذکر غریب نے بھی اقرار کیا ہے کہ امامِ حقؑ گہوارہ سے لوحِ محفوظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے، یہ ادبیات ہے کہ اعترافِ فضیلت میں ایک ایسی روایت

بھی خالص کردی کہ فضیلتِ روشن ہو کر سامنے نہ آسکی، نیکن مجھے روایت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ دشمن نے فضائل کا اقرار کیا ہے اور ایسی روایت کا اضافہ تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ ایسے ہی حالات گہوارہ کے علم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر ذلیفانے کردارِ یوسف سے غلط رفتہ وابستہ نہ کی ہوتی تو گہوارہ کا بچہ کیسے بولتا۔ اگر یہودیوں نے جنابِ مریمؑ کے ساتھ غلط بہت منسوب نہ کی ہوتی تو عیسیٰؑ کا کمال کیسے سامنے آسکتا اور اگر امت میں ایسی روایت نہ ہوتی تو امامِ حقؑ کے علم کا اقرار کیسے کیا جاتا۔؟

علم کے بعد عمل کی منزل آتی ہے، زہد و تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ سادہ لباس میں، زندگی گزار رہے ہیں اور اگر کبھی مجبوراً غنڈ لباس پہن لیا اور یہودی نے اعتراض کر دیا کہ آپؑ کے جہتے تو فرمایا ہے کہ دنیا کا فرکے لئے جنت ہے اور رومن کے لئے قید خانہ، یہ آپؑ کا لباس مجھ کو بہتر کیوں ہے؟ تو ایک عظیم حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ یاد رکھو، بہتر اندر پردہ کا فیصلہ نتیجہ کے ساتھ ہوتا ہے تمہیں آخرت میں جو کچھ ملے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ لباس کہیں بہتر ہے اور مجھے جنت میں جو کچھ حاصل ہونے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ ایک قیدی کا لباس ہے۔ یا داخی لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے کہ یہودی حقائق سے بے خبر تھا در نہ یہ سوال ہی نہ اٹھاتا، اسے یہ معلوم ہوتا کہ جس کے چھین جانے پر جنت سے لباس آجاتا ہے اس کے لئے دنیا کا لباس تو بہر حال ایک قیدی کا لباس ہو گیا۔

زہد و تقویٰ کے ساتھ اس عظیم دسترخوان کا بھی اضافہ کر لیجئے جس پر ہاؤں اور سیکنڈ کی بیچرنگ تھی ہے تو کمالات کی منزل اور نمایاں ہو جائے گی کہ اس بھڑکتی اپنی زندگی میں یہ سادگی کو ایک دن لباس نو دیکھ کر یہودی کو تعجب ہو گیا اور وہ سوال کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے سوال نے واضح کر دیا کہ اگر امام حسنؑ کی زندگی میں راحت پسندی اور عیش و آرام کا دخل ہوتا تو یہودی کو تعجب نہ ہوتا، یہودی کا تعجب خود کردار کی بلندی کی ایک دلیل ہے۔

اور دوسری طرف عظیم دسترخوان جس کی بناء پر خلق حسن کا شہرہ ہوا اور جس کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل دروازہ سے واپس نہ جانے پائے، آل محمدؑ کی زندگی میں یہ کوئی خاص بات نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ ان کے گھر کا معمول ہے، جن کے گھر برینہ کے سائل بھی آتے، میں اور آسمان کے فرشتے بھی اور قرآن کا سورہ دوسری صلوٰۃ،

لیکن بھئی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ واقعہ ہو جائے کہ اہلبیتؑ کی اپنی زندگی کتنی سادہ تھی اور ان کی خدمت خلق کا عالم کیا تھا۔ شہرہ معروف واقعہ ہے کہ ایک شخص امام حسنؑ کے دسترخوان پر بہانہ بولا، اور کھانے کے لئے بیٹھا تو عالم یہ تھا کہ ایک لقمہ کھاتا تھا اور ایک لقمہ بجاتا جاتا تھا آپ نے فرمایا: بھائی! کیا تو صاحب عیال ہے؟ اس نے کہا نہیں، میں نے مسجد میں ایک شخص کو سوکھی روٹیاں کھانے دیکھا ہے، چاہتا ہوں کہ اسکی بھی کچھ دے دوں۔ آپ نے فرمایا: بھائی! وہ مسکے، آپ بولنے کا سنا علیؑ ابن ابی طالب ہیں، ان کی زندگی کا یہی معمول ہے کہ ہم اہلبیت جو دنیا کو کھاتے ہیں وہ اور ہوتا ہے اور جس پر خود اپنی زندگی گزارتے ہیں وہ

اور ہوتا ہے۔ تو رزق دنیا کھائے اور اپنا راستہ لے، ہم اہلبیت کی فکر نہ کر، ہماری نعمتوں کا دسترخوان وہاں بچھایا گیا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ ایک مسافرِ غریب اور عام مسلمان کی بات ہے جس محبت کی سماعت کا یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر بڑے بڑے سلاطین وقت دنگ رہ جاتے تھے مارنے کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ مدینہ آیا ادا اعلانِ عام کر دیا کہ لوگ بادشاہ وقت کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوں، خزانوں کا منہ کھلا ہوا ہے، آج لوگوں کو انعام تقسیم کیا جائے گا۔ لوگ آنے لگے اور دولت تقسیم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ امام حسنؑ کو بھی مجبور کیا گیا، آپ دربار میں آخری وقت تشریف لائے، معاویہ نے ارکانِ دولت کی طرف اشارہ کیا کہ حسنؑ نے آنے میں صرف اس لئے دیر کی ہے کہ میرا خزانہ خالی ہو جائے اور مجھے شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے۔ تو یہی کہ صبح سے اب تک جس قدر مال تقسیم ہوا ہے اتنی ہی مقدار میں تنہا حسنؑ کو دیدیا جائے، دشمن کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ جو حیثیت ساری امت کی ہے، وہ رفتار تنہا ہر اک کے لال حسنؑ کی ہے۔

خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے، جو اہرات اکٹھا ہونے لگے، معاویہ مسکرا رہا ہے، امام حسنؑ دیکھ رہے ہیں، جیب سب مال اکٹھا ہو گیا تو معاویہ نے بڑے غرور سے کہا: لیجئے یہ مال آپ کے لئے ہے آپ نے قبول فرمایا اور چلنے کا ارادہ کیا۔ معاویہ کے خادم نے بڑھ کر جو تیاں سیدھی کر دیں۔ آپ نے مال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تو نے میری خدمت کی ہے اور ہم اہلبیت کسی کا احسان نہیں چاہتے لہذا یہ کل مال تیری خدمت کا صلہ ہے۔

اربابِ کرم! دیکھا آپ نے جو مال معاویہ نے امام حسنؑ کو فرزندِ رسولؐ کو

بڑے غرور سے دیا تھا اسے امام حقؑ نے معاویہ کے غلام کو عطا کر دیا اور دامنِ فتح  
کو دیا کہ اب دونوں کے کرم کا فرق پہچان لے، جتنا تو نہ اسے رسولؐ کو دیتا ہے  
اتنا تو ہم ایک غلام کو دیدیا کرتے ہیں۔

اور میں تو کہوں گا بولا! اس شانِ کرم پر ہماری جانیں قربان، اپنے غلاموں  
کا دل رکھ لیا اور بتویر اطمینان ہو گیا کہ جب آپ معاویہ کے غلام کو اتنی بڑی دولت  
دے سکتے ہیں تو جب قیامت کے دن آپ کے اپنے غلام آئیں گے تو انہیں کیا  
نہ دیدیں گے صلوات،

لیکن عزیزانِ محترم! یاد رکھئے، یہ سب بھی معاویہ کے غلام کو ملا ہے  
معاویہ کو نہیں ملا، گویا امام حقؑ نے واضح کر دیا کہ ہمارے یہاں قدرت  
کرنے والوں کی قدر ہے مقابلہ کرنے والوں کی نہیں۔

واقعہ یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومتِ ادرامات کی نگاہ میں مالِ دنیا کی  
کیا وقعت ہے؟ حکومتِ اعلان کہہ رہی ہے کہ مالِ دنیا میں رسولؐ کی قربت  
توئی جاتی ہے اور ادرامات آواز دے رہا ہے کہ ہم مالِ دنیا میں اپنی جوتیوں کو  
تولا کرتے ہیں۔ ہم حسدِ اذہ شاہی کو رسالت سے منسوب نہیں کرتے اپنی جوتیوں  
میں رکھا کرتے ہیں صلوات،

دقت نہیں ہے وہ نہ واقعہ کے دور کے خصوصیات پر کسی روشنی ڈالی  
جاتا اور یہ دیکھا جاتا کہ امام حقؑ نے ایک ہی واقعہ میں کتنے مسائل کا حل  
پیش کر دیا ہے اس وقت تو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اہلبیتؑ کی توضیح  
وفاکاری، ان کی عبادت و ریاضت، ان کا نہاد تقویٰ اور ان کی سخاوت و  
عنایت اس مسئلہ پر تھی کہ اہل دنیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے،

حج بیت اللہ کے لئے جارہے ہیں، ناتنے آگے آگے، اور خود پیادہ پا، دنیا  
دیکھ رہی ہے کہ مشقت و زحمت کے ساتھ عبادت کیسے کی جاتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ  
کی نگاہ میں خانہٴ خدا کی عظمت کیا ہے اور جب مکان کی یہ عظمت ہے تو مالکِ مکان  
کی کیا جلالت ہوگی؟

عملی زندگی میں بھی امام حقؑ کی انفرادیت قابلِ ملاحظہ ہے، زندگیِ حید  
ہی مسئلوں سے گزری ہے مگر خندق، خیمہ، حنین، فتح مکہ، غدیر، سارک  
واقعات نگاہوں سے گزر گئے اور سب میں کسی نہ کسی مقدار میں حصہ بھی لیا،  
دقائقِ غیر کے بعد مصائب کا سلسلہ شروع ہوا، حق چھٹا، گھر جلا، محسن کی  
شہادت واقع ہوئی، آپ کی حکومت گئی، مال کی تکذیب کی گئی اور امام  
حقؑ حالاً کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جو دن موتے ملے کا امت کو بتا دوں گا  
کہ تمہاری بساطِ واقعات کیا ہے؟ میرے باپ کا حق چھین لیا، میری  
مادر گرامی سر دیا، اس میں ادران کے دعویٰ کو رد کر دیا، حد یہ ہے کہ خود  
بھی گواہی میں پیش کیا گیا لیکن مصوم بچوں کی گواہی کو بھی نہ مانا۔۔۔  
عصمت کے اعلیٰ تصور سے ناواقف تھے تو کمسن بچوں ہی کی عصمت پر  
اعتماد کر لیا ہوتا، آخر حضرت یوسف کے مسئلہ میں بچہ کی گواہی مانی گئی یا  
نہیں لیکن یہاں تو فلسفہ ہی دوسرا ہے، خیر کج نیزہ بھارا قبضہ ہو گیا ہر  
جو چاہے فیصلہ کر دے، دقت آنے والا ہے تمہیں تمہاری حقیقت سے  
باخبر کر دیا گیا۔

چند دن گزرے تھے کہ شہزادے کا گزرمسجد کی طرف سے ہو گیا، دیکھا  
بادشاہ دقتِ نبویہ تشریف فرما، میں ادراپے حوالی دھماکی کے درمیان

کچھ وعظ و نصیحت فرما رہے ہیں، امام حسن آگے بڑھے اور بڑھ کر فرمایا ایک باپ کے نمبر سے اتر آؤ جہاں تمہارے باپ کا نمبر بند ہوا جاؤ۔ لیچہ میں کچھ اس قدر جلال تھا کہ کوئی بچپنا کہہ کر نہ ڈال سکا اور حاکم وقت کو نمبر سے اترنا پڑا، یہ ادب بات ہر گوشہ منگی کو ملنے کے لئے ہنزا دے کو گود میں لے کر نمبر لگ گئے اور نمبر لایا بیشک یہ ان کے باپ کا نمبر ہے، اسکے باپ کا نہیں ہے۔

نیز ان محرم! واقہ آپ کی نگاہوں میں ہے، اب ذرا ایک ایک لفظ کا تجزیہ کیجئے تو کتنے ہی عقائد سامنے آجائیں گے۔ ہنزا دے صلح نے اپنے باپ کا نمبر کہا اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ میسر نانا کا بھی نمبر ہے اور میرے بابا کا بھی نمبر ہے۔ اگر بابا کا نمبر سمجھتے ہو تو ہمیں بیٹھنے کا حق نہیں ہے اور اگر نانا کا نمبر سمجھتے ہو تو تسلیم کر دو کہ میں ان کا فرزند ہوں اور باہلہ کے میدان میں ان کی صداقت و عقائد کی گواہی کے لئے میں ہی گیا تھا۔ صلوات،

اپنے باپ کے نمبر پر جاؤ۔ ہمہ کرامت کی بے کسی کی طرف اشارہ کر دیا کہ تحت و تاج پر تہیز کرنے والوں کا کوئی مافیاضی نہیں ہے اور ان کے آباؤ اجداد میں کوئی صاحب نمبر تھا، اب یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے گھر کا نمبر ہے وہ زیر نمبر رہے اور جس کے بند گوں نے نمبر نہیں دیکھا وہ بالائے نمبر جلوہ انگن ہر جائے۔

بادشاہ وقت نے بھی میرے اتر کر امام حسن کے بیان کی تصدیق کر دی اور عصمت حسن نے آواز دی ابھی چند ہی دن گزرے ہیں جب تم نے میری گواہی کر رکھی تھی، دیکھا تم نے کس طرح میں نے اپنے

حق کا اقرار لے لیا اور تمہیں نمبر سے اتار لیا۔

تو ان اس شہزادہ صلح فرزند رسول کے کو قیامت تک کے لئے نمبر کا فیصلہ کر دیا، ابھی بھی آنے والے بادشاہ کے لئے یہ جواز نہ رہے گا کہ میں امت سے نمبر لاپے یا سابق خلفاء سلطان سے نمبر لاپے، اس لئے کہ میرا امام حسن کے بزرگوں کا ترکہ ہے، نہ کسی امت کو قبضہ کرنے کا حق ہے نہ بادشاہ کو، اس نمبر پر جو بھی قدم رکھے گا وہ حق آل محمد کا غاصب ہوگا، اور غاصب کو حقدار نہیں کہا جاسکتا۔

دیکھا آپ نے، ایک خاموش انسان نے کس طرح بڑے بڑے خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں، اور عقائد کے دریا بہا دیئے، پہلی منزل پر حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے بعد امام حسن نے سکوت اختیار کر لیا اور باپ کی روش پر قائم رہے، باپ خانہ نشین رہے تو فرزند نے بھی گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی، اور تھوڑے عرصہ کے بعد باپ محل کے میدان میں نظر آیا تو بیٹا بھی علم لشکر لے کر میدان میں آ گیا، مشہور واقعہ ہے کہ محل میں علم لشکر محمد حنفیہ کے ہاتھوں میں تھا لیکن جب محمد حنفیہ بار بار حملہ کرنے سے رک گئے تو امیر المومنین نے علم لشکر امام حسن کے ہاتھ میں دیدیا اور فرمایا: تمہیں لالہ ذرا اس صاحب محل کے آؤٹ پر حملہ کر دو، امام حسن پرچم لے کر آگے بڑھے اور چند محلوں میں محل تک پہنچ گئے، آؤٹ کو نمبر مارا اور کھواتے ہوئے باپ کی خدمت میں آ گئے، محمد حنفیہ حبشہ سے دیکھتے رہ گئے اور علی کے لالہ نے معرکہ کو سر کر لیا، امرائے کائنات نے درویشوں کا دل رکھنے کے لئے فرمایا، محمد! پریشان نہ ہو

تم میں اور حق میں بڑا فرق ہے، تم میرے فرزند ہو اور یہ رسول اللہ کے فرزند ہیں۔ یہ ظرف بھی مولائے کائنات کا تھا ورنہ دنیا کا کوئی اور انسان ہوتا تو بتدی کہو اپنی طرف منسوب کرتا اور کہتا کیوں نہ ہو، یہ طرفین سے ہاشمی ہونے کا اثر ہے، لیکن مولائے کائنات نے کامل کو پیغمبر کی طرف منسوب کر کے دنیا پر واضح کر دیا کہ اپنے لئے جینا اور ہوتا ہے اور یہ منسوب کر کے لئے زندہ رہنا اور ہوتا ہے، مصنفین اور ہندوان میں بھی امام حق کی یہی کیفیت تھی اور باپ کے زیر سایہ برابر مجاہدات میں حصہ لیتے رہے۔ مسئلہ دو میں شام کی حکومت نے اپنی پے در پے شکست کا انتقام لینے کے لئے ابن بلعم سے سازش کی اور مسجد کو نہ میں عین حالت سجدہ میں ایمرالمومنین کو شہید کر دیا۔ اور علی نے اس شہادت کو بھی اپنی کامیابی قرار دیکر فزت ورب الکعبہ کا اعلان کر دیا۔ شہادت ایمرالمومنین کے بعد امام حق کی زندگی کا مستقل دور شروع ہوتا ہے، اب تک کبھی نانا کے ساتھ رہے، کبھی بابا کے ساتھ، اب امت کے جملہ معاملات کے خود ذمہ دار ہیں اور قوم کے مفکر کا فیصلہ اپنے ہی ہاتھوں کرتا ہے، چنانچہ آپ نے بابا کی شہادت کے بعد ایک تاریخی خطبہ پڑھا اور امت کو جملہ حالات سے باخبر کرتے ہوئے بیعت لی، سادین ابی سفیان کو اس بیعت کی اطلاع ملی تو ۶۰ ہزار کا لشکر روانہ کر دیا اور عراق کو زیر کرنے کا منصوبہ بنالیا، آپ نے بھی ۴۰ ہزار کا لشکر مرتب کیا لیکن ایک منزل پر جب آپ نے صلح امیر گفگکو کا سلسلہ شروع کیا تو فوج میں بغاوت پھیل گئی اور لوگوں نے یہ نعرہ لگایا،

کو خدا واللہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح گمراہ ہیں، کئی انھوں نے بھی صلح کر لی تھی اور آخر کار شکست کھا گئے تھے اور آج یہ بھی صلح کر کے امت کو دلیس در سوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ ایک سو تھوڑا ذبحوں کا سامنا کرنا پڑا، اور عادیہ نے عراقیوں کی حالت دیکھ کر باقاعدہ صلح کی پیش کش کر دی۔ اور یہ سوچا کہ اس طرح حق کا سارا لشکر منتشر ہو جائے گا، اور میں سب کو اپنی طرف کھینچ لوں گا، صلح میں اتنی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہ سادہ ماغذ بھیج دیا اور ہر شرط پر رضامندی کا اعلان کر دیا، امام حق نے حالات کا گہرا جائزہ لیا اور فوج کی بغاوت کے امکانات پر بھی ننگ ڈالا، لیکن آپ نے صلح پر رضامندی ظاہر کر دی اور یہ واضح کر دیا کہ میں فوج کی مدد کی خاطر مرضی پروردگار کو کمال مال نہیں کر سکتا، کل جب نانائے صلح کی تھی تب بھی لوگ مخالف تھے، جب بابائے مصنف کے بعد حکیم پر شکست اختیار کیا تھا جب بھی لوگ مخالف تھے اور آج بھی بغاوت ہوگئی، لیکن میں صلح کا دامن نہیں چھوڑ سکتا آپ نے صلح نامہ مرتب کر دیا اور جس طرح باپ نے تحکیم میں کتاب خدا کو حکم بنایا تھا اسی طرح بیٹے نے بھی دنیوی شرطیں رکھیں پہلی شرط یہ کہ حاکم شام کو کتاب دست پر عمل کرنا ہوگا اور دوسری شرط یہ ہے کہ ایمرالمومنین پر سب شتم کے سلسلے کو لایہ کرنا پڑے گا چھٹا نامہ مرتب ہو گیا، حاکم شام نے قبول بھی کر لیا، امام حق نے تخت و تاج چھوڑ دیا اور فوج میں حسب تدریج بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے مومنین کو ذلیل در سوا کرنے کا الزام لگانا شروع کر دیا اور فرزند رسولؐ نانا کی سیرت پر عمل کر کے مطمئن رہا۔

ماقتل تاریخ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور ہر مقام پر

مشابہ کیا جاسکتا ہے، مجھے تو صدمہ یہ عرض کرنا ہے کہ شام کے حاکم نے مادہ کاغذ بھیج کر واضح کر دیا کہ امام حسن کوئی غلط اقدام نہیں کر سکتے اور امام حسن نے بھی شرائط کو بھگوانا ان مسلمانوں کی زبان بند کر دی کہ خود را اب مجھ پر معاویہ کی بیعت کرنے کا الزام نہ لگائے میں نے معاویہ کی شرائط پر عمل نہیں کیا ہے، معاویہ سے اپنے شرائط پر عمل کر لیا ہے، اب اگر صلح کوئی بیعت کو نبی کے لال نے بیعت لی ہے، بیعت کی نہیں، صلوات،

دوسری طرف معاویہ کے صلح نامہ کو رد دینے سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ فریبکار حکومت کے امامت نہیں، اور یہی وجہ کہ جب یہ سوال اٹھا کہ امام حسن حکومت شام کے مقابل میں دھوکہ کھا گئے اور انھیں حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تو امامت کی جلالیت مسکرا کر ادا ہوئی کہ خدا کا شکر کہ دھوکہ کھا یا ہے دھوکہ دیا نہیں، نادانوں! اسلام میں دھوکہ دینا جرم ہے دھوکہ کھانا کوئی جرم نہیں ہے، صلوات،

صلح نامہ میں امام حسن نے تاپ خدا پر عمل کرنے کی شرط لگا کر واضح کر دیا کہ اگر حکومت شام کتاب و سنت پر عمل، ہوتی تو مجھے شرط لگانے کی ضرورت نہ پڑتی، میں نے شرط اسلئے لگائی ہے کہ شام کی حکومت سے دستخط کرنا کہ اس کے طرز حکومت کو واضح کر دوں اور اس کے کتاب و سنت سے الگ ہو جائیکہ اقرار لوں، اب بتاؤ کہ میں ہمارا باجید ہیں صلح کر کے کچھ کھو یا ہے یا کچھ پایا ہے، صلوات،

سب مشق کے بند کرنے کی شرط بھی اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ شام میں سلسلہ جاری ہے دوسرے مجھ پر نہ کرنا یہی ضرورت نہ پڑتی، اب کوئی بنی ایر کا نمک خوار یہ نہیں کہہ سکتا کہ خلیفہ کی حکومت علی کے خلیفہ کوئی اقتدار نہیں کیا اور غلامان علی اگر غاصب حکومتوں پر تہقیر کرتے ہیں تو یہ ان کی کوئی ایجاد یا بدعت ہے، نہیں نہیں! یہ انداز حکومت شام پہلے اختیار کر چکی ہے، غلامان علی پہل نہیں کرتے لیکن جواب دینے میں کہیں بند بھی نہیں کرتے،

حکومت شام نے بروقت ان حالات کا اندازہ نہیں کیا لیکن چند ہی دنوں میں یہ محسوس کر لیا کہ اس صلح میں حکومت کو گھٹا لگا ہوا ہے اور امام حسن نے صلح کر کے تیر پیر فرشتہ کی قید کر دی ہے، اب کسی مسلمان کو ان کی صلح پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، البتہ میری غلط دردی پر اعتراض کرنے کا حق ہے اس لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا فائدہ کر دیا جائے اور توہین و ذلت کا یہ سلسلہ بند ہو جائے، حکومت کیلئے یہ کام کوئی اہم کام نہیں تھا، ایرالمونین اپنی زندگی میں فرما گئے تھے کہ حاکم شام مجھ پر زیادہ ہر شے نہیں لکھتا لیکن کیا کروں میرا اقدامات میں دین حال ہو جاتا ہے اور اسے دین کی کوئی پرواہ نہیں ہے، چنانچہ اس نے اب بھی ایک مذبح جمعیت اشعث سے ساز باز کی اور ایک دہم انعام کے عوض آجکے دم دلوادیا، نہرا یا کام کر گیا اور امام حسن دنیا سے انتقال فرما گئے لیکن دنیائے انصاف پر واضح ہو گیا کہ غلطیت امامت کا خاتمہ اور ظلم و ستم حکومت کا کردار امامت اسلام کے نام پر باپ کا قاتل بھی صلح کر سکتی ہے اور حکومت تخت تاج کے لئے صلح کے بعد بھی نہ ہر دے سکتی ہے

نہ ہر دیا گیا اور نہ ہر کراؤ بھلا، عالم یہ تھا کہ امام حسن کا جسم اقدس بن کر ہو گیا اور ایک غشی کی کیفیت طاری ہو گئی، بہن زینب قریب بیٹھی تھیں اعزاء و اقرباء کا مجمع تھا کہ ایک مرتبہ تھمے مرنے لگی اور بہن نے دیکھا کہ بھائی کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کٹ کٹ کر گن میں آ رہے ہیں، کون بہن ہو گئی جو اس منظر کو دیکھ سکے مگر اللہ رے زینب کا حوصلہ، مدینہ میں بھائی کے جگر کے بہتر ٹکڑے دیکھے اور کہہ لیا میں بھائی کے ساتھیوں کے بہتر لاشے دیکھے، ہاں بھائی کو موت کے بستر پر دیکھا اور وہاں بھائی کو شمر کے خنجر کے نیچے دیکھا لیکن نہ یہاں فریاد کی زوہاں بد دعا کے لئے ہاتھ اٹھے، ہاتھ اٹھے بھی تو دعا کے لئے، پروردگار میرے حسین کی قربانی قبول کر لے۔

امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، اما حسینؑ بے سہارا ہو گئے، تاکم و عبد اللہ بنیہم ہو گئے، ام فردہ کے سر سے وارث کا سایہ اٹھ گیا، زینبؑ بھائی سے جدا ہو گئی، ام کلثومؑ کا سہارا ٹوٹ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جنازہ تیار ہوا، اما حسینؑ حسب وصیت جنازہ کو بے قبر رسولؐ کی طرف چلے، بنی امیہ نے راستہ روکا، ایک خاتونؑ نے بنی امیہ کی قیادت کی اور ہاتھی شیروں کے غیظ و غضب کو دیکھ کر خاتونوں نے تیروں کی بوجھل شروع کر دی، اما حسینؑ نے بھائی کی وصیت کے مطابق ہاتھی جو ان کو روکا اور اب جو جنازہ رکھا گیا تو متوجہ تر جنازہ میں پیوست پائے گئے، میں نہیں جانتا کہ بھائی پر کیا گزری اور محمد حنفیہؑ اور عباسؑ جیسے بہادر دل کیسے برداشت کیا لیکن اللہ سے میرا استقلال کو ان مصائب کے باوجود جواز کو واپس لا کر یقین میں دفن کر دیا۔

میں کہوں گا ملاحین ہادی جانیں قربان، یہ منبر پر چلے بھائی کے جنازہ میں تیر دیکھو اور ان کی لیکن مولانا سر تردیکھ کر صبر کرنا آپکا کا تھا اور تیروں پر جسم نازنین کو ملحق دیکھ کر صبر کرنا آپکی بہن زینبؑ کا کام تھا، اللہ! وہ صبر کا ہنگام، وہ زمین کر بلا کا زلزلہ جیت کا زخمی ہو کر گھوڑے سے گزرا، وہ تیروں پر جسم نازنین، وہ شہر ملون کا فخر وہ فاطمہؑ کی فراہم کردہ فضا کر بلا کی آواز لا اَرحم الراحمین بَرَکَاتُهَا عَلَیْہِمْ أَجْمَعِینَ ہو کر حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر اما حسینؑ مدے غم منایا، مژدہ پر بھلا، لیکن مجھے کہیں نہیں ملا کہ خدمت غم میں یہ کہدیا ہو کہ بھیا آپکے مرنے سے میری مکر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی، عجب نہیں معلوم یہ رہی ہو کہ ابھی میرا عباسؑ زندہ ہے میری عمر مضبوط ہے لیکن جب کر بلا میں مقتل سے آواز آئی تو حسینؑ کے ہاتھ کتر تک پہنچ گئے، بھیا عباسؑ ہمارے مکر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی، بھیا! دشمن طعنے دے رہے ہیں کہ علیہا کہاں؟ عباسؑ اٹھو، میں دشمنوں کو کیا جواب دوں؟..... میرے بھیا.....!

عزادادو! بیان آخری منزل تک آ گیا ہے، ایک حملہ کہہ کے مجلس کو تمام کر دینا چاہتا ہوں، صاحبانِ اولاد کا مجمع ہے، ایک لمحہ کے لئے سوئیں، آل محمدؑ کے لئے سارے صدمے ایک طرف ہیں اور کسمن بچے کی تیمی کا خیال ایک طرف۔ پائے وہاں کیا کرے جس کا دوبرس کا بچہ قیم ہو گیا ہو، وہ بی بی کیا کرے جس کی آغوش میں مرحوم خوبرو کی یادگار ہو، اور حضرت سے بڑھ کر کے جنازہ کو دیکھ رہی ہو، وہ اپنے والی کا ماتم کرے یا اپنے کسمن بچے کو بھلائے، غم دالم کی ماری خاتون اپنے حالات کا مژدہ پڑھے یا اپنے بچوں کو لوریاں دے، کون سمجھ سکتا ہے کہ غم کیسا ہے اور ام فردہ کے دل پر کیا گز رہی ہے لیکن میں اتنا عرض کروں گا کہ بی بی آپ پریشان نہ ہوں، خدا رکھے ابھی حسینؑ کا سایہ قائم ہے، ابھی عباسؑ جیسا جوان موجود ہے، ابھی نسکین بیٹے کے لئے شہزادی زینبؑ ہیں، ابھی بچوں کو بھلانے کے لئے بی بی ام کلثومؑ ہیں، ابھی خواتین کا مجمع ہے، ابھی ہاتھی گھرانے کی عورتیں موجود ہیں، بی بی! ابھی غم ایک ہے اور ننگنار ماتم ایک ہے اور ماتم دار بہت، صدمہ ایک ہے اور نسکین دینے والے بہت، مگر اس وقت کیا کیجئے گا جب سدا احوال غمزدہ ہوگا، جس بی بی کو دیکھا کسی کی مانگ ابھو گئی، کسی کی گود خالی ہو گئی، کسی کا جواں بیٹا مارا گیا، کسی کا بھائی شہید ہو گیا، کسی کا ستاؤ بے ہو گیا کسی کا فدیہ میدان سے بلٹ کر نہیں آیا، ہر طرف غم، ہر طرف مصیبت، ہر طرف لاشیں، ہر طرف کوہِ الم، ایسے میں جب آپ کے لال کا پامال جنازہ آئے گا تو کیا کیجئے گا، اور جب مقتل میں آپ کی گود کے پالے کے ہاتھ چپا پر قربان ہوں گے تو کیا عالم ہوگا، اور بی بی! آج آپ کا کسمن فرزند قیم ہوا ہے تو خدا کے نسکین دینے والے ہیں، بھلائے والے ہیں، گود میں کھلانے والے ہیں، مگر بی بی! جب کر بلا میں سکینہ قیم ہوگی تو اس وقت کا عالم ہی عجیب ہوگا، نہ کوئی نسکین دینے والا نہ کوئی پوسہ دینے والا

گھر میں رہے تو خیمہ میں آگ، بھٹنا چاہے تو دامن میں آگ، خاک پر پڑھ جائے  
 تو ظالموں کے طمانچے اور گھبر کر باپ کی لاش کے قریب آجائے تو شریکوں کے تازیانے  
 زمین کو بلا کا زلزلہ، سیکڑ کی فریاد، بابا خمر نے طمانچے مارے، بابا چادر میں چھن  
 گئیں، بابا گوشت خوارے اٹار لئے گئے، بابا خیموں میں آگ لگ گئی، بابا آپ سوکے  
 ہیں اور سیکڑ جاگ رہی ہے، بابا وہ سینہ کہاں ہے جس پر میں سویا کرتی تھی،  
 یہ آپ کے سینے پر تیر کیسے ہیں، یہ آپ کا جسم زخمی کیوں ہے، بابا! یہ آپ کے  
 جسم پر مرکبوں نہیں ہے؟ بابا.....

اُن وہ بچی جواندھیوں میں سحر ڈھونڈتی تھی  
 باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی سر ڈھونڈتی ہے  
 اَنَا لَشَاءُ دَانَا اَلْيَهُ رَا جَعُونِ  
 وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيُّ مَنْعَلَبٍ يَنْقَلِبُوْنَ



## جناب امام حسین علیہ السلام

|             |   |                    |
|-------------|---|--------------------|
| اسم مبارک   | : | حسینؑ              |
| لقب         | : | سید الشہداءؑ       |
| کنیت        | : | ابو عبد اللہؑ      |
| والدہ ماجدہ | : | جناب فاطمہؑ        |
| والد ماجد   | : | حضرت علیؑ          |
| ولادت       | : | ۳ شعبان المعظم ۴ؑ  |
| ازواج       | : | پانچ               |
| اولاد       | : | چھ                 |
| شہادت       | : | ۱۰ محرم الحرام ۶۰ؑ |
| عمر شریف    | : | ۵۵ سال             |
| قبر مطہر    | : | کربلائے معلیٰ      |

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء  
والاخيرين خاتم النبيين سيدنا وولانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين  
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله  
الحكيم في كتابه الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَانَّا لَلْآخِرَةُ وَالْاُولَىٰ

اور خدا جاب ادیت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اور پرے  
اور زیادہ آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالک کائنات نے اس ذمہ داری ہدایت کو ادا کرنے کے لئے ہر دور میں انبیاء  
جیسے مرسلین بھیجے، کتابیں نازل کیں، شریعتیں بتیں کیں اور سب کا مقصد ایک رہا جو عالم  
انسانیت راہ راست پر آجائے اور ہدایت در پہنائل میں کوئی گمراہی نہ رہ جائے۔ انبیاء  
رحمتیں برداشت کریں یہ گوارہ بنے مرسلین پیغمبر کھائیں یہ گوارہ بنے۔ اولیاء خدا کا نثرں پر  
چلیں یہ گوارہ بنے، صادق و صدیق بندے جھٹلائے جائیں یہ گوارہ بنے، آدم جنت  
چھوڑ کر دنیا میں آجائیں یہ گوارہ بنے، نوح طوفانوں میں رہیں، ابراہیم آتش فردوس  
جائیں یہ گوارہ بنے۔ موسیٰ نیل کی موجوں میں رہیں یہ گوارہ بنے، عیسیٰ بہت عصمت مادی کو  
دوچار ہوں یہ گوارہ بنے، مرسل عظیم مکر کی نگیدوں میں بہر لبان ہو جائیں یہ گوارہ بنے لیکن  
انسانیت بے راہنما رہ جائے یہ گوارہ نہیں بنے، عالم بشریت بے ہادی رہ جائے یہ رداشت  
نہیں ہے، بندوں کی حجت خدا پر تمام ہو جائے یہ ممکن نہیں ہے، اور ہر سے قرآن آئے گا  
تو ہمدی للمتقین بن کر، رسول آئیں گے تو یہ جہاد دن باریا کا مصداق بن کر دلی راہ

آئیں گے تو لکل خود جہاد کا نمونہ بن کر، یہ پورا نظام ہدایت ہے اور یہ پورا رسول  
ماہنامہ ہے یہ اور بات ہے کہ گمراہی ابتدائی منزلوں میں رہتی ہے تو راہنما ابتدائی کمالات  
کا حامل ہوتا ہے اور گمراہی آخری منزلوں میں پہنچ جاتی ہے تو راہنما بھی صاف سراج  
ہوتا ہے۔

آدم کے دور میں گمراہوں کی تعداد قابل تھی تو انھیں اسماء کا علم دیکر بھیجا گیا  
تھا، نوح کے دور میں یہ تعداد بڑھی تو انھیں طوفانوں سے نکلانے کی طاقت دیدی  
گئی، ابراہیم کے دور میں حالات اور شدید ہوئے تو انھیں آگ کو گلزار بنانے کی  
صلاحیت دیدی، موسیٰ کو موجوں سے کھینکنے کا حوصلہ دیا تو عیسیٰ کو مصائب جھیلنے  
کا دم دیا۔ سردی کائنات کا دور آتے آتے گمراہی منزل کمال کو پہنچ گئی، اب ابراہیم  
بے دور کے پیغمبر بھی خدا ہیں، موسیٰ کے دور کے جانی بھی خدا ہیں، عیسیٰ کے دور کے  
انسان بھی خدائی کے دعویدار ہیں اور کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جسے خدائی مضیغ  
نہ ہو، اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو جہالت کے سمندر میں غرق نہ ہو، افراد جاہل  
نہیں ہیں، ازراہ جاہلیت کا ہے، سماج جاہل نہیں ہے، عالم غرق جہالت ہے، ایسے دور  
میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسا راہنما آئے جو ہر ضلالت سے ٹکرائے سکے اور ہر طوفان  
کو فٹا کر سکے اس میں نوح کا حوصلہ بھی ہوا، ابراہیم کا استقلال بھی ہو، موسیٰ کی ہمت  
ہو، عیسیٰ کا کردار بھی ہوا، یہ سب ان سب سے بالاتر ہو کر اپنے دور کا باقاعدہ مقابلہ  
کر سکے اور قیامت یہ ہے کہ اس کا دور بھی قیامت کا دور ہے، اس کے بعد کوئی نبی  
آنے والا نہیں ہے ضرورت ہے کہ اس میں وہ تمام صلاحیتیں اور وہ تمام حوصلے  
موجود ہوں جو قیامت تک کے لئے کافی ہوں اور اس کے پاس وہ تمام کمالات ہوں  
جن کا جواب صبح قیامت تک نہ ہو سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ قرآن کائنات نے

سے ہر اس کمال سے نوازا جس کا قیامت تک کوئی امکان نہ تھا اور ہر وہ اعجاز عطا کیا جس کی راہ پر دنیا کے چلنے کے امکانات تھے، قرآن جیسی کتاب دیدی تاکہ قیامت تک علم کیلئے جیلغ رہے، چاند کے چکر دے کر دینے تاکہ آسمان نور دی کیلئے جیلغ رہے صاحب سراج بنادیا تاکہ معرفت و رفتار پر نازاں انسان بھی تسلیم ہو سکا تاہم جاہلیت زدہ نا فہم دور میں عرشِ عظیم تک بلا کے سراج دینے کا منشاء یہی تھا کہ انہی دنیا بھی اندازہ کر لے کہ جس قدر درخش کی سرکار حوصلہ پیدا کرنا اور ہے اور ایک رات میں سارے عالم کو زیر قدم رکھ لینا اور ہے۔

سرور کائنات تک یہ سلسلہ ہدایت اسی انداز سے پہنچا اور پروردگار نے حالات کے مطابق ہادی اور راہنما کیجیے اور انھیں کے تقاضوں کے مطابق انہی صلاحیتیں مقرر کیں، خود اعلان فرمایا کہ تم نے رسولوں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور سب کو یکساں نہیں بنایا۔ اور اس منزل پر کہنے کو بھی چاہتا ہے کہ جب اللہ والے ایک جیسے نہ ہو سکے تو امت والے کیسے برابر ہو جائیں گے اور جب انبیاء ایک مرتبہ کے نہ ہو سکے تو ان کے اصحاب میں سب ہم مرتبہ کیسے ہو جائیں گے؟ انبیاء کو ہم مرتبہ سمجھنا مرسلِ عظیم کی توہین ہے اور امت کو ہم مرتبہ سمجھنا آلِ محمد کی توہین ہے!

اکابر کائنات نے جاہلیت کے آثار کو دیکھ کر مرسلِ عظیم جیسا کامل و اکمل پیغمبر بھیج دیا لیکن کیا ۲۲ سال میں سارا زمانہ راہِ راست پر آگیا، کیا جاہلیت فنا ہو گئی، کیا کفر و شرک کا جذر انتقام ختم ہو گیا، کیا خفا کی جنگا سیاں بجھ گئیں؟ ہرگز نہیں! تو اگر ایسا نہیں ہے اور جاہلیت اور جہالت کے اثرات باقی ہیں تو کیا خدا نے اپنے نظامِ ہدایت کو معطل کر دیا ہے اور اسے مرسلِ عظیم

کے بعد کی امت سے کوئی ہمدردی و محبت نہیں ہے، وہ سب کو تباہ و برباد ہی دیکھنا چاہتا ہے اور اس کا منشاء یہی ہے کہ تم میرے پیغمبر کے بعد کیوں پیدا ہوئے، اب یونہی تباہ و برباد ہو جاؤ تاکہ میں تمہیں داخل جہنم کر دوں اور اگر یہ ظلم موجود نہیں ہے تو قدرت نے نظامِ ہدایت کے بارے میں کیا کیا کیا بدترین حالات میں قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور میرے ملے کو دیا کہ جذبہ انتقام سے خالی سماج کو خاتم النبیین جیسے راہنما کی ضرورت ہے اور جذبہ معنی و حدود انتقام سے لبریز ماحول کے لئے جاہل، گمراہ، خطا کار راہنما کافی ہیں؟ (الغیر) واللہ! ایسا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تو ماننا پڑیگا کہ جیسا دور تھا اس کے لیے ہی راہنما معین کئے اور جیسا زمانہ آیا دے ہی ہادی مقرر کئے، اگر جاہلیت کے ماحول میں سب سے بہتر پیغمبر کو قانون کا ذرہ دار بنا کر بھیجا تو جذر انتقام سے لبریز ماحول کے لئے محافظ قانون بھی ایسے ہی افراد کو بنایا جن میں سارے انبیاء کی صلاحیتیں، سارے سرملین کے کمالات، ساری کتابوں کا علم اور سارے قوانین کی جامعیت پائی جاتی تھی، ان کا پہلا ہی وہ تھا جس کے لئے پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا کہ اگر آدم کا علم دیکھنا ہے تو سچ کا تقویٰ دیکھنا ہے، اگر آدم کی خلقت دیکھنا ہے تو سچ کی محبت دیکھنا ہے، عیسیٰ کا زہد دیکھنا ہے، الیہ کا صبر دیکھنا ہے، یوسف کا حسن و جمال دیکھنا ہے تو علی کے چہرے پر نظر کرو، یہاں سارے انبیاء کے کمالات نظر آجائیں گے، سارے سرملین کا جلال و جمال نظر آ جائیگا، اور انبیاء و سرملین کا کیا ذکر ہے، اس کے چہرے میں الہی جلال و جمال کا پرتو نظر آئیگا، زبان اس کی ہوگی لیکن لسان اللہ ہوگی، پہلو اس کا ہوگا لیکن جنب اللہ ہوگا، ہاتھ اس کا ہوگا لیکن ید اللہ ہوگا، چہرہ

اس کا بوجھ لیکن وجہ الت بوجھ اور نفس اس کا بوجھ لیکن نفس اللہ بوجھ۔

اس کے بعد جب حالات متقلب ہوں گے اور افاق شریعت پر گمراہی کے دلدل چلیں گے، جاہلیت دوبارہ مٹا دینے کی اسلام کے نام پر کفر کی تبلیغ ہوگی حلال محمد کو حرام اور حرام محمد کو حلال بنایا جائیگا تو ایسے راہنما کو معین کیا جائیگا جس میں سب انبیاء کے کمالات بدرجہ اتم موجود ہوں گے اور شخص اس کے بارے میں اقرار کرے گا، آدم کے وارث تھے پر سلام، نوح کے وارث تھے پر سلام، موسیٰ کے وارث تھے پر سلام، عیسیٰ کے وارث تھے پر سلام، محمد مصطفیٰ کے وارث تھے پر سلام، ایشیاء خدیجہ کے وارث تھے پر سلام، صبر نہ ہر کے وارث تھے پر سلام۔

اور عز و ان گمراہی انت ہی کیا ذکر ہے خود پیغمبر بھی ڈر رہے ہیں۔ آئیں گے تو سلام ہی کریں گے گھر میں رہے گا تو سلام کریں گے، باہر نکلے گا تو دوش پر بیٹھا کرنا تو نہیں گئے مسجد میں آجائیکا تو مسجد سے سر نہ اٹھائیں گے، منزل جا دیں، رہیگا تو صبر و ثبات کو دیکھ کر خچن مہر فرین کے کلمات کہیں گے زندہ رہیگا تو اس پر شاہ نہیں گئے اور پیغمبر جانیگا تو سر کے بال کچھ اڑیں گے آغاز حیات دیکھیں گے تو حسین متی کہیں گے اور انجام عمل پر نگاہ ڈالیں گے تو انامن الحسین کہیں گے۔

آج مختصر لفظوں میں اسی حسینؑ کا تذکرہ کرنا ہے جو انبیاء کا وارث قرآن کا محافظ، حرم کعبہ کا پاسبان، اسلام کا ذرہ دار، پیغمبر اکرمؐ کا لال، علیؑ کا نور نظر، فاطمہؑ کا لخت جگر، دوش رسولؐ کا سوار، اوصیاء انبیاء کا آئینہ دار، تبلیغ اسلام کا جہر، کمالات کبریا کا منہ، جمال رسولؐ کا جواب، جلال علیؑ کا شاہد، عرصہ کریم کا خطیب، نفع مرتبی کا نقیب، قلب رسالت کا جبین اور رسالت

کا حیش ہے۔

حسینؑ کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ ۳۰ شبان مسعود کی صبح کو فاطمہ زہراؑ کی آغوش میں آئے، نانا کی زبان جو سی، باپ کی گود میں رہے، بھائی کیساتھ کھیلے، شہد میں خندق کا سرکہ دیکھا، شہد میں خیر کی فتح دیکھی، شہد میں فتح مکہ کا منظر دیکھا، شہد میں مبادلہ کے میدان میں گمراہ رسالت بن کر آئے، براہ میں زہراؑ کا ہرگز کرکرہ تسلیم نہ بنے، شہد میں ۲۸ صفر کو ناباکا غم دیکھا اور ۳۰ جمادی الاول کو مال کا صبر اٹھایا، ۲۵ سال تک باپ کے ساتھ خانہ نشین رہ کر خدائوں کے حالات کا جائزہ لیا، گھر میں جمع قرآن کا منظر دیکھا، باہر جانے والوں پر شہد کی پرورش کا مشاہدہ کیا، اور سب کے ساتھ باپ کا صبر و استقلال بھی دیکھتے رہے، سفید کعبہ بیت دیکھی، مذک میں گمراہ بن کر گئے تو اہل کی تکذیب کی نصیبت دیکھی، گھر بھاگ اور کھڑیاں دیکھیں، اسلامی فتوحات کے نام پر عہد ردوں کی پامالی دیکھی، بنو امیہ کی پرورش کا منظر دیکھا، بنی ہاشم اور ان کے پرستاروں کا قتل عام دیکھا، آخری دور میں حاکم وقت کا محاصرہ دیکھا اور باپ کے رحم و کرم کا مشاہدہ کیا، خلیفہ سوم کے بعد باپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے والوں کا جھوم دیکھا، اور جھل دھنن و نہروان کے سر کے دیکھے اور فقط دیکھے نہیں بلکہ ان میں شریک بھی رہے، شہد میں باپ کی شہادت دیکھی، شہد میں بھائی کی صلح دیکھی، صلح کے سوا اس کا انجام دیکھا، دس سال تک بھائی کی طرف سے صلح کی پابندی دیکھی، شہد میں بھائی کی شہادت اور جنازہ کی بے حرمتی دیکھی، شہد تک دس سال بھائی کی صلح کو نباتے رہے اور جب شہد کو خناس کے حاکم کی وفات ہوئی اور حالات نے انجیاری بڑھا کھایا تو جو کام شہد میں ہوا تھا، یعنی پیغمبر کے بعد

امیر المؤمنین سے مطالبہ بیت کیا گیا تھا وہی کام پھر ستہ میں ہوا اور اب حنین نے طے کر لیا کہ حنین میں نے آج تک بزرگوں کی روش سے علیحدگی نہیں اختیار کی تو آج علیحدگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے، مجھے ثابت کر دینا ہے کہ میں بھائی کے صلح کے احرام میں خاموش تھا ورنہ مجھ میں تانا کا عزم، دادا کا حوصلہ، باشم کا خون، عبدالمطلب کا جوش سب سلامت ہے۔

میرزا بڑا کا تھا منہ تھا جانتا تھا خورش

در سپاہ میں دل حیدر بکوار بھی ہے (پیام)  
ان واقعات کی تفصیل پر اس لئے روشنی ڈالی گئی ہے کہ آپ ایک نظر سے واقعات پر ڈال لیں اور یہ دیکھ لیں کہ حنین بن علی کی زندگی کس سرد گرم سے گزری ہے تانا کے ساتھ رہے تو خیر و خندق کی جنگ بھی دیکھی اور حدیبیہ کی صلح بھی، حنین سے چلے بھی دیکھے اور فتح مکہ کی عید منائی بھی، تانا کے بعد دروازہ پر آگ اور کھڑا بھی دیکھی ہیں اور سردار ماں کا عظیم الشان خطبہ بھی، ان کے بعد کھوتوں کا جبر و تشدد بھی دیکھا ہے اور باپ کی شکل کشائی بھی، خلیفہ ثالث کی فائدہ ان پرستی بھی دیکھی ہے اور باپ کا رحم و کرم بھی، خلیفہ ثالث کے بعد جل کی جنگ بھی دیکھی ہے اور باپ کا دشمن کو با مزام فالس کر دینا بھی، مصیبت کا مرکز بھی دیکھا ہے اور قرآن کے نام پر جیتی ہوئی جنگ کا چھوڑ دینا بھی، نہروان میں خاموشی کی بنیاد بھی دیکھی ہے اور مسجد کوفہ میں باپ کا قاتل کو بیدار کر کے مسجد آخر کو لایا بھی، ابن لبم کی گرفتاری بھی دیکھی ہے اور باپ کا خنک کھلا دینا بھی، باپ کے بعد بھائی کا عزم جہاد بھی دیکھا ہے اور مصلحت اسلام کی خاطر باپ کے قاتل کے صلح کو لینا، شام کی طرف سے تسلیم کرنا بھی دیکھی ہے اور بھائی کی طرف سے پابندی بھی۔

باپ پر سب دشمن بھی دیکھا ہے اور بھائی کا مصروفیات بھی، مشرق میں بھائی کی فہادت بھی دیکھی ہے اور جنازہ پر تیر بھی، بھائی کے بعد مسلسل دس سال تک غام کے محلے بھی دیکھے ہیں اور اپنا صبر و استقلال بھی، یہاں تک کہ ۶۸ھ کی ۲۸ رجب کو اسٹھے اور اسٹھے کی دس محرم کو بیشتر ساتھیوں کے ساتھ راہ خدا میں قربان ہو گئے۔ امام حنین نے چار دوڑ تک سر و گرم زمانہ کا جائزہ لیا، تانا کے ساتھ رہے، ماں کے حالات دیکھے، باپ کا زمانہ دیکھا، بھائی کا دور دیکھا، اور سردور میں مختلف حالات دیکھے، اب اگر حنین کا اپنا کوئی مزاج ہوتا تو کسی بنزل پر تو بزرگوں سے اختلاف کرنے جنگ کا مزاج ہوتا تو تانا کی صلح کو رد دکتے، ماں کے صبر کو رد دکتے، باپ کے سکوت کو رد دکتے، بھائی کی صلح کو رد دکتے اور صلح کا مزاج ہوتا تو خندق و خیبر و حنین کے مواقع پر محل جانے، ماں کے مطالبہ فدک کو رد دکتے، باپ کے حمل و مصیبت و نہروان کے معرکوں پر پابندی عائد کرتے، بھائی کی جنگ کی تیاریوں پر ہاتھ پیر دلیتے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، اور جس کے ساتھ رہے اس کے عمل کے پابند رہے اور بھائی کے توہمنے کے بعد بھی دس سال تک ان کی صلح پر قائم رہے اور جنگ کا نام نہیں لیا، جوئے میں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حنین حنین کے مزاج میں فرق تھا، حنین مزاجی اعتبار سے صلح پسند تھے اور حنین کے مزاج میں حرارت تھی، اسی لئے امام حنین نے صلح کر لی، اور امام حنین کو بلا کے میدان میں آگئے، ان فرزند ہنوں سے کہہ دو کہ کتنک مفاتیح کا انکار کرنے میں گئے اور کب تک واقعات پر پردہ ڈالتے رہیں گے یاد رکھیں کہ جس کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے وہ اتنی خاموشی سے زندگی نہیں گزارتا ہے اور جس کی طبیعت میں جنگ پسندی ہوتی ہے وہ باپ پر سب دشمن بن کر بھائی کی صلح کی پابندی نہیں کرتا، حنین کا مزاج نہ جنگ کا مزاج تھا نہ صلح کا، حنین کا مزاج مثبت کا

مزاج محتاج بہ مشیت پروردگار ہوئی حسین نے وہی اقدام کیا، بزرگوں کے دور میں وہ تہجان مشیت تھے حسین ان کے اقدام میں برابر شریک رہے، بزرگوں کے بعد حسین وارث مزاج مشیت بنے تو ان کے نصائح پر قدم اٹھایا، حسین کا مزاج پہچانا ہے تو پہچنے میں دوش رسول اور پشت رسول پر دیکھو رسول مشیت الہی کا پابند ہے، حسین کا مزاج ذرہ یا رب مشیت سے الگ ہوتا تو نہ رسول دوش پر بٹھا کر نہ انیس حوالے کرتے نہ پشت پر بٹھا کر سجدہ کو طول دیتے، یہ سجدہ کو طول اس لئے دیا جا رہا ہے کہ دنیا پہچان لے کہ جو حسین کا مزاج ہے وہ شریعت کا مزاج ہے اور یہ زلفیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ باہم دیکھ لیں کہ جو حسین کا ارادہ ہے وہی مشیت کا حوصلہ ہے۔

سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب حسین کے مزاج میں اور بزرگوں کے مزاج میں فرق نہیں تھا تو حسین خاموش کیوں نہیں رہے اور جنگ کے لئے کیوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اتنی بڑی قربانی کیوں دیدی؟ لیکن مجھے اتنا ہی ہنسنا ہے کہ یہ بھی بزرگوں ہی کے مزاج کا اثر تھا، وہ بدو دأمد، خندق وغیرہ زمین میں اٹھے، وہ حمل و معین و نہروان میں اٹھے، وہ جنگ کے مختلف محاذوں پر اٹھے، اور یہ کر بلا کے ماذبراٹھے۔ مزاج کا اختلاف ہوتا تو ایسا اتحاد کیوں ہوتا؟ اب اگر ان سب کا اقدام صحیح ہے تو حسین کا اقدام بھی صحیح ہے، اگر حسین کا اقدام غلط ہے تو ان سب کا اقدام بھی غلط ہے (معاذ اللہ)

آپ کہیں گے کہ ان سب کی جنگ میں اور حسین کی جنگ میں ایک فرق تھا، اصل غلظ کی جگہیں مکہ سے دور مدینہ سے قریب حضور کے علاقہ میں ہوئی ہیں، اور مولائے کائنات کے مجاہدان شام سے دور کوئٹہ سے قریب علی کے علاقہ میں ہوئے ہیں لیکن کر بلا تو حسین کا علاقہ نہیں تھا، بزرگوں کی جنگ کو دفاعی کہا

جاسکتا ہے لیکن حسین کی جنگ کو دفاع نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ارباب کرم! ادلّٰ تو رسول اکرم اور مولائے کائنات میدانوں میں خود گئے تھے لیہائے نہیں گئے تھے لہذا ان پر یہ الزام زیادہ عائد ہو سکتا ہے، امام حسین تو حر کے رسالہ کے ذریعہ لیہائے گئے تھے، ان پر یہ الزام کیوں کر عائد ہو سکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ امام حسین کی دودھ اندیشی اور نگاہ امامت کی دست تھی کہ آپ نے سرزمین کر بلا پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ اہل قریہ کو بلا کر ان سے زمین کو خرید لی اور زمین کو خرید کر قیامت تک کے لئے مسئلہ کو مان کر دیا کہ خبردار اب یہ نہ کہنا کہ میں اپنے ناناکا سیرت سے الگ ہو گیا ہوں، میں نے ناناکا کی سیرت کا ایک حسین غمزہ پیش کیا ہے، وہ فقط علاقوں پر حملہ کرنے والوں کو روکے تھے اور میں نے تو ان سے جہاد کیا ہے جو میری زمین پر آگئے تھے، یاد رکھو کر بلا کا جہاد کسی غیر کی زمین پر نہیں ہے، یہ جہاد حسین کی زمین پر ہے اس لئے دنیا کی ہر طاقت پر جہاد جیت کا الزام لگایا جاسکتا ہے لیکن حسین پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

دوسرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ امام حسین کے حالات بزرگوں کے حالات سے قدرے مختلف تھے اور امام حسین کے حالات سے تو قطعاً مختلف تھے، امام حسین کے حالات میں صلح کرنا ہی عین اسلام تھا اس لئے امام حسین صلح میں شریک رہے اور امام حسین کے دور میں جنگ کرنا ہی واجب تھا، اسلئے امام حسین نے قاسم کو دعیت کر دی تھی کہ بیٹا جب بھی تیرے چچا پر کوئی وقت پڑ جائے تو اپنے چچا پر قربان ہو جانا، تاکہ میری صلح میں حسین کی شرکت رہے اور ان کی جنگ میں میری شرکت ہو جائے۔

حالات کے فرق کو سمجھنا ہے تو تاریخ اسلام کے ایک واقعہ پر نگاہ کرنا ہوگی جس کے بنیہ بدے ہوئے حالات میں اقدام کی نوعیت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ دنیائے اسلام میں مبارک واقعہ کسے نہیں معلوم، کون نہیں جانتا کہ کون سے جتنوں کے سرور کا خاتمہ سے ادریں یوں سے بڑا سموت مقابلہ ہوا اور یہ مقابلہ تیر و شیر کا نہ تھا بلکہ حق و صداقت، علم و آگہی اور زندگی اور فناء کی مقابلہ تھا، تیر و شیر کے مقابلہ میں بظاہر ہار جانا بھی غیب نہیں ہوتا اس پر کسی نہ کسی جہت سے منظریت کی چھاپ لگا دی جاتی ہے لیکن علم و دانش اور حق و صداقت کی جنگ میں ہار جانا قانون کی قضا اور مذہب کی بربادی کے مترادف ہے۔ دنیا میں بے شمار افراد ہیں جو حملہ کرنے کے بعد بھی جی ہار جاتے ہیں تو اپنی ہار کو تسلیم کر کے جاہلیت پر منظریت کا لیل لگا دیتے ہیں، لیکن مقام بحث میں یہ پسند نہیں کرتے کہ انہیں خاتمہ و جاسٹ اور باطل پرست کہہ دیا جائے گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیر و شیر کا سرور کا سامان ہوتا ہے اور علم و آگہی کا سرور سموت، ہمارا کا زخم جلدی بند نہ ہو جائے اور زبان کا زخم کبھی مند نہ ہو جاتا، خصوصیت کے ساتھ اسلام کے ساتھ تو یہ سرور اور بھی سموت ہے، وہ تیر و شیر کا مذہب نہیں ہے علم و دانش کا مذہب ہے، اس کی نظریں تحت و تاج، حکومت و ملک گیری اقتدار و اختیار کوئی شے نہیں ہے، وہ دنیا کو عقائد کی تعلیم اور صحیح نظریات کی تلقین کرنے کے لئے آیا ہے، وہ اس دن اپنی فتح نہیں سمجھتا جب دشمن تہ تیہ ہو جائے بلکہ وہ اس دن کو فتح مبین سمجھتا ہے جب اصول کی فتح ہو اور ظلم و فساد و دلوں کو غلبت کر دیا اور اقرار کرنا پڑے۔ ایسے حالات میں مبارک کا مقابلہ اسلام کی موت و حیات کا مقابلہ تھا، اسلام شکست کھا جائے تو اسے روئے زمین پر رہنے کا حق نہیں ہوگا۔

اور مسابقت ہار جائے تو اسے جلد بھیرائی میں ڈوب کر مرنے کا چاہیے مسئلہ بے حد نازک ہے، مسابقت کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اسلام کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے ہیں، مسابقت کی نگاہ میں تو حیدریت قیمت ہے اور اسلام کی نگاہ میں تو حیدریت اہل مذہب اور جان عقیدہ ہے۔ اگلے سموت کو فتح پر عیسائیوں نے اپنے علم و عقل کے غرور میں اسلام کے دباؤ پر سرور حاصل کر دیا، اذہم غلبہ اسلام کی خدمت میں یہ ثابت کرنے کے لئے آگے کو عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں جسکے نہیں، سوال یہ ہے اگر اللہ کے بیٹے ہیں تو آپ مانجے، کوئی آپ کو منہ کرنا ہے آپ تو صدیوں سے ماتھے چھتا رہے ہیں خود رسولِ عظیم کی زندگی میں تقریباً ساٹھ برس سے آپ مان رہے ہیں، کہاں پیغمبر آپ پر حملہ کر دیا، کون سی جنگ آپ سے کی کس کو تلوار مار دی، کس کو نیزہ چھو دیا، یہ سب کیا ہو گیا ہے کہ آپ اپنے وطن دین چلے آئے ہیں اور یہ مذہب ہے کہ پیغمبر بھی عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مان لیں، یہ جبر و جبر کر دینے کی کیا ضرورت ہے، اگر پیغمبر نہ بھی مانیں گے تو آپ کے عقیدہ پر کیا اثر پڑے گا اور آپ کا مذہب کہاں باطل و برباد ہو جائے گا لیکن زبانی کیا راز تھا کہ مسابقت کو اس کے وطن میں قرار نہیں آیا اور بالآخر دین اسلام میں آگے قدم نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر آجروں پر آئیں نازل کیں، عیسیٰ کا حال آدم جیسی جب آدم غیب سے ماں باپ کے پیدا ہو کر اللہ کے بیٹے نہ ہو سکے تو عیسیٰ مرت باپ سے غیب سے پیدا ہو کر کیوں کر ابن اللہ ہو سکتے ہیں۔ آئیں نازل ہوئیں لیکن عیسائی اپنی ضد پر اڑے رہے اور خود حملہ کر دیا کہ اسلام تو شکست دے کر تو صمد کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ قدرت کی خبریوں پر دل آگے میرے پیغمبر! اب یہ نہیں مانتے ہیں تو ان سے مبارک سے لئے کہہ دو اذہم و دلوں کی کہ ہمارے بارگاہ میں جھوٹوں پر

لنت کرد، جو جوٹا ہو گا ہم اسے ہلاک و برباد کر دیں گے۔ پیغمبرؐ نے مباہلہ کی پیشکش کر دی، عیسائیوں نے غرور و حقانیت میں اسے قبول کر لیا، اور دوسرے دن مباہلہ کی بات طے ہو گئی۔

واقعہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں نے تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا تو مجھے یہ عجیب ہوا کہ آخر مباہلہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ بد دعا کی لڑائی کیسی لڑائی ہے، مجھے بھر عیسائی اپنے وطن سے دور آئے ہوئے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کا ہجوم ہے، ایک سے ایک جڑی، ایک سے ایک سادنت، ایک سے ایک سورما، ایک سے ایک غازی، حضورؐ تلوار اٹھائیے اور سب کا فخر کر دیجئے حقیقت کو مانیں یا دھل جینم ہو جائیں، یہ مباہلہ وغیرہ کیا چیز ہے؟

پیغمبرؐ فرمائیں گے، تو نے مصلحت کو پہچانا نہیں، اسلام تیر دشمن کا مذہب نہیں ہے، عیسائی طاقت کے بھروسے برائے ہوتے تو اب تک سب کا فائدہ ہو گیا ہوتا۔ یہ علم و دانش کے اعتبار پر آئے ہیں لہذا ان سے علمی مقابلہ ہی ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ کل انھیں موقوف بل جائے کہ اسلام کے پاس علم و حق نہیں تھا، اس لئے تلوار پراڑ آیا میں مباہلہ کروں گا اور جارحیت کا الزام زلوں گا۔ وہ جاہل ہوتے ہیں جو علمی مسائل میں تلوار اٹھالیا کرتے ہیں، بری سیرت ہی ہے کہ علم کا جھاب علم سے دیا جائے تلوار سے نہیں۔ اب اگر کوئی علمی میدان میں تلوار اور تازیانہ سے کام لے لے گا تو اسے وارث رسولؐ نہیں کہا جاسکتا، اور وہ بری سیرت سے کوئی لائق نہیں رکھتا۔

مباہلہ ہوا، تلوار نہیں اٹھی اور عیسائیوں نے شکست کا اعتراف کیا، اور بچے کہنا پڑا کہ کس قدر بے غم و بے غم ہے وہ قوم جس کے مقابلہ میں کہیں تلوار نہیں

اٹھی اور اللہ اسلام پر بزرگوں پر پھیلنے کا الزام لگا رہی ہے۔ کاش یہ بات کفار و مشرکین نے کہی ہوتی تو کوئی پہلو نکل بھی سکتا۔ عیسائی کس منہ سے کہہ رہے ہیں جنھوں نے نبیؐ تلوار سے اٹھے ہوئے اپنی شکست کا اقرار کر لیا تھا۔

مباہلہ کی صبح آئی، رسولؐ بیت الفرت سے برآمد ہوئے، انھیں پھرے ہوئے امام حسنؑ، محمدؑ، امام حسینؑ، رسول اکرمؐ کے پیچھے حضورؐ عالمہ اور ان کے پیچھے مولائے کائناتؑ نہ کوئی صحابی، نہ کوئی زوجہ، نہ کوئی سادنت، نہ کوئی ہم آہواز نہ کوئی میٹر کار پہچان لیجئے کہ اسلام کے محافظ کون ہیں اور دین الہی کا حقانیت پر دقت پڑتا ہے تو کون کام آتا ہے؟ یہاں غلاموں کا ذکر نہیں ہے، وہ تو آقا کے ہمنے ہوئے ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، اور اپنے کو فرضی سرلا کا پابند سمجھتے ہیں ان کا ذکر ہے جنھیں محافظہ اسلام اور پاسبان شریعت بننے کا شوق ہے اور جن کے دامن صداقت پر کوئی ایسا دھبہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مباہلہ میں لیجانے سے محرم کر رہے ہیں بلکہ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس کی صداقت مباہلہ میں جانے کے لائق نہ ہو وہ اسلام میں بچاؤ سبب ہو جائے اور جسے مباہلہ کا فائدہ اور رسالت کا مصدق قرار دیا جائے اس کی گواہی ناقابل اعتبار ہو جائے، ایسے مسلمانوں سے تو عیسائی بہتر تھے کہ انھوں نے صداقت آل محمدؐ کو پہچان لیا تھا، مسلمان تو اتنا بھی نہیں پہچان سکے۔

میدان میں قدم رکھنا تھا کہ عیسائی عالم نے آواز دی۔ خبردار مباہلہ نہ کرنا، یہ وہ جیسے ہیں کہ اگر خدا سے دعا کر دیں تو پہاڑ اپنا ٹکڑے سے ہٹ جائیں، یہ بد دعا کر دیں گے تو روئے زمین پر ایک بھی عیسائی باقی نہ رہے گا۔ مباہلہ رکھا، اسلام فاتح بنا، جزیرہ طہ، قرآن کی آبرو بھی، توحید کا وقار قائم ہوا، رسالت

کی صداقت ثابت ہوئی، وہ بن خدا کا بھرم، با مسلمان مرلت ہوئے، وہ یہ سب  
عقد ہے آل محمد کی صداقت و حقانیت و جلالت کا، قیامت ہے کہ پیغمبر اکرم آج  
بھی ان کی صداقت و حقانیت میں مشبہ کر رہے ہیں۔

بات آگے بڑھ گئی، پہلے صفت یہ عرض کرنا تھا کہ جب ذرہ نے  
سیکڑوں سال عیسائیوں کے عقیدہ کو برداشت کر لیا تھا اور عذاب نازل نہیں کیا  
تھا، مگر اٹھ سو سال دیکھتے رہے، اور مقابلہ پر نہیں آئے تو آج کیا ہو گیا  
ہے کہ رسول باہلہ کے لئے تیار ہو گئے، اور عقیدت عذاب نازل کرنے پر آمادہ  
اب وہ صبر کی طاقت کہاں گئی؟ اب وہ قہر برداشت کیا ہو گئی؟ کیا یہ کب دیا  
جائے کہ خدا کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے؟ کیا یہ سہج لیا جائے کہ نبوت کے مزارت  
کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے یا نہیں؟... بات مرنے سے کہ جب تک  
باطل اپنے دیار میں باطل پرست رہتا ہے، جس سے اسے برداشت کرنا ہے اور جب  
حق سے اپنے باطل کو منانے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو مقابلہ سخت ہو جاتا ہے۔

صلح من اور جنگ حسین میں ہی فرق تھا، امام حسن کے دور میں باطل  
اپنے باطل پر اڑا ہوا تھا لیکن حق سے بیعت کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا اور امام حسین  
کے دور میں مطالبہ بیعت بھی ہو گیا تھا، اسی لئے امام حسن کے دور میں باطل نے  
صلح کر کے حکومت مانگی تو آپ نے تحت و تاج کو ٹھوکر مار دی اور امام حسین  
کے دور میں بیعت یا سر کا سوال ہو گیا تو آپ نے بیعت کو ٹھوکر مار کر سر  
دبایا جو حق نے کیا، وہ حسین نے کیا، جو حسین نے کیا وہ حق نے کیا۔

عیسائیت نے شکست کھائی لیکن دل میں جو جذبہ انتقام پیدا ہوا  
وہ ناقابل برداشت تھا، مختلف راستوں سے اسلام کو نشانے کا منصوبہ بنایا

محی، کبھی معاویہ کے دربار میں شاہی طیب کی شکل میں پہنچی اور ایسا نہر تیار کیا جس سے  
مولا کے کائنات تک محفوظ رہ سکے اور ابن ملجم کی تلوار کے ذریعہ وہ نہر حضرت علیؓ پر آگیا  
گیا اور جودہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؓ پر آگیا اور اب باہلہ کی آخری فراوانی حسین  
باتی تھے اور عیسائیت انھیں بھی فنا کر دینا چاہتی تھی، چنانچہ حاکم شام کے محل میں زوجہ  
کی شکل میں پہنچی اور پندہ جیسے نحوس فرزند کو جنم دیا، یزید وہاں میں عیسائی ماحول  
میں پیدا اور شراب و کباب کا ایسا خورگ ہو گیا کہ خبری اسلام بھی نہ دیا، اور اسی  
یزید کے ذریعہ امام حسینؓ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا، یزید کو باپ کی طرف سے نفاق  
تھا تھا اور مال کی طرف سے عیسائیت، اور دونوں اسلام کے شدید دشمن تھے  
اب اسلام کے ذریعہ دار تھا امام حسینؓ تھے، چنانچہ دونوں طاقتوں نے مل کر انتقام  
کا منصوبہ بنایا، اور ۲۷ رجب کو امام حسینؓ کے سامنے بیعت کا سوال پیش  
کر دیا گیا، امام حسینؓ نے سوال بیت کو رد کر دیا، اور وطن چھوڑ کر باہر نکلنے کا عزم  
کر لیا، جس رات میں خدا کا رسولؐ مراجع میں تھا اس رات میں رسولؐ کا نواسہ  
نانا کی قبر سے لپٹا ہوا دربار ہے اور فرمایا کہ رہا ہے کو نانا! آپ کی امت  
نے بہت سستا ہے، اب میرے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟

آواز آئی: بیٹا حسینؓ کو بلانا جاؤ میرے لال، بیٹا اتم سرگشاؤ! کہ میرا دین  
سر بلند ہو اور میرے لال تہناؤ جانا، میری بیٹیوں کو ہمراہ لے کر جانا، کہ یہ  
قیدی نہیں تو میرا دین آزاد ہو،

نانا کی قبر سے اٹھو کہ حسینؓ ماں کی لحد پر کئے، آخری سلام کیا۔  
اماں! آپ کی قبر کا جادو حسینؓ جا رہا ہے، اماں اپنے لال کا آخری سلام لے لو،  
قبر اطہر سے آواز آئی: میرے لال! میرا بھی سلام لے لے، حسینؓ تم تہنا نہیں

جاؤ گے۔ یہ ماں بھارت سے ساتھ چلے گی، جہاں تم رہو گے وہیں یہاں بھی رہیگی۔  
 قبر سے رخصت ہو کر گھر آئے، سامان سفر تیار کیا، صبح کو قافلہ روانہ ہوا، ہاشمی  
 خواتین نے شہزادیوں کو رخصت کیا، ام البنین نے اپنے فرزندوں کو خدا حافظ کیا  
 عبداللہ بن جعفر نے عون و محمد کو ساتھ کیا۔ محمد خفیر بھائی سے لپٹ کر دئے اور  
 ایک گھنٹہ بچی اپنے گھنٹے سے لپٹ کر دئی۔ ام سلمہ نے حسین کو خدا حافظ کیا،  
 بیبیوں نے حلقہ بنایا، سیانیوں کی سراپاں دریاں سے گزری۔ الوداع الوداع  
 الفراق الفراق، السلام السلام کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کیا قیامت کا منظر تھا، قبر رسول اہل رہی تھی، زہرا کی لحد کو زلزلہ تھا  
 حق تربت میں ٹوٹ رہے تھے، بیبیوں میں شور و غم تھا، دیکھیے اب یہ قافلہ  
 کب آتا ہے اور ایک منادی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ مدینہ والو! جی بھوک  
 دیکھو، اب یہ قافلہ اس شان سے نہ آئیگا، اور جب آئیگا تو یوں کو گودیوں  
 میں بچے نہ ہوں گے، مردوں پر دانتوں سے سائے نہ ہوں گے، ام کلثوم کی فریاد  
 ہوگی، بابا کے مدینہ پہلے آنے کو قبول نہ کرنا، ہم ٹٹ کر آئے ہیں۔

چند دنوں کے بعد قافلہ مکہ پہنچا، اہل کوفہ نے طلب کے خطوط کئے، امام  
 حسین نے اپنے بھائی مسلم کو روانہ کیا۔ ۹ رذی الحجہ کو مسلم کوفہ میں شہید ہوئے  
 اور ادھر حاجیوں کے بھیس میں قاتلوں کا قافلہ مکہ آیا۔ امام حسین نے ۱۲ رذی الحجہ  
 حج کو عہد سے تبدیل کر کے سفر شروع کیا۔

ابن عباس نے روکا، مولا! سب کہہ رہے ہیں اور آپ جا رہے ہیں؟  
 آپ نے فرمایا: ابن عباس میں عراق جا رہا ہوں، انا کے حکم سے سرکھانے جا رہا ہوں  
 یمن کی۔ فرزند رسول! بھر عمر توں اور بچوں کو کیوں لیے جا رہے ہیں؟ فرمایا

ابن عباس مصلحت پروردگار ہی ہے، ادھر عہد مکہ سے نہایت کی آواز آئی، ابن عباس  
 خاموش، خبردار کیا چاہتے ہو، نہایت اپنے حسین کا ساتھ جوڑ دے، یاد رکھو! نہایت  
 جب تک زندہ ہے اپنے انجانے کا ساتھ نہ چھوڑے گی

قافلہ چلا۔ راستہ میں شہادت مسلم کی خبر ملی، آگے بڑھے تو حُر کا لشکر ملا، راستہ  
 روکا گیا۔ آپ نے حُر کے لشکر کو سرب کیا اور دونوں قافلے ساتھ چلنے لگے، دوسری  
 محکم کو سرزمین کربلا پر وارد ہوئے، قافلہ آٹرا، نہایت نے کہا: بھیا اس مٹی سے تو آپ کے  
 خون کی بوا آئی ہے۔ فرمایا: ہن! بس یہی ہماری آخری منزل ہے، ہمیں یہیں شہید ہونا  
 ... ہے اور تمہیں یہیں قیدی بننا ہے، وقت گزرتا رہا، دشمنوں کے لشکر آتے

رہے۔ انچیز سے پانی بند ہوا، ساتویں سے قحط آب ہوا، نوز کو امام حسینؑ زلفہ اعدا میں  
 گھر گئے، عصر کو حُر کی تیاریاں ہوئیں، علمدار حسینی نے ایک شرب کی مہلت مانگی، تمام رات  
 عبادت الہی میں بسر ہوئی، بیبیوں نے بچوں کو جنگ کی تلقین کی، شہزادیوں نے گود کے  
 پالوں کو نوز جنگ تعلیم کئے، سحر کا ہنگام آیا، علی اکبرؑ نے اذان صبح کہی، بیبیوں نے  
 صدائے پیغمبرؐ سنئی، اصحاب نے صلیٰ پہنائے، امام نے نماز پڑھائی، نوحہ دشمن میں  
 طبل جنگ بجا، حلف شروع ہوا، تیروں کی بوچھاڑ ہوئی، اصحاب نے حلوں کو روکا،  
 چند ساعت میں تقریباً ۵۰ اصحاب کام آ گئے، ظہر کا ہنگام آیا، اصحاب کی خواہش پر  
 صفیں اُپرئیں، امام نے نماز پڑھائی، تیر آتے رہے، سیدہ زہیرہؑ رو کتے رہے اور  
 زخمی ہوتے رہے، نماز کے بعد ایک ایک کو کے میدان میں گئے، حبیب مسلم، زہیرہ  
 بریرہ، عائشہ، ہلال، حُر، دہب سب کام آئے، اصحاب کے بعد دل کے محکموں کی  
 باجی آئی، اولادِ عقیل، اولادِ الوطاب، اولادِ علی سب راہ خدا میں مست بیان  
 ہوئے، اکبرؑ نے برجی کئی، قاسم کا لاشہ پامال ہوا، عون و محمد کی لاشیں آئیں۔

جاس ترائی میں سو گئے۔ اصغر کو امام حسینؑ کو دی میں لے کر آئے۔ بچہ تیسرے حملہ کا  
 نشانہ بنا۔ رخصت آخر کے لئے آئے۔ بیارہ بیٹے کو وصیت کی۔ میرے لال قید خنام  
 سے چھٹ کر مدینہ جانا تو ہمارے شیعوں سے ہمارا اسلام کہہ دینا اور کہنا، شیعوں!  
 ٹھنڈا پانی پینا تو ہماری پیاس کو یاد کر لینا، اور کسی غریب دے کس کا ذکر سنا تو  
 ایسے روزنا جیسے کوئی ماں اپنے لال کو تڑپ تڑپ کر روتی ہے۔ بیبیوں کو رخصت  
 کیا۔ بہن کو بھرا گھر سوچا، بیٹی سے دامن چھڑایا، سلام آخر کر کے باہر آئے۔ اہم  
 کو پکار کر ضعف و ناتوانی کا اعلان کیا۔ زینبؑ نے خیمہ سے نکل کر گھوڑے پر سوار  
 کیا، سکینے نے دامن پکڑا، بابا! مدینہ پہنچا دو۔ حسینؑ نے مرتبہ پر بڑھا، بیٹی  
 مدینہ جاتا ممکن ہوتا تو یہ بھرا گھر کیوں اُڑتا ہوا اور تیسرا باب مرنے کے لئے  
 کیوں جاتا ہوا؟ رخصت کیا، میدان میں آئے، حملہ پر حملہ کیا، ندائے قدرت آئی،  
 بس اے حسینؑ بس! میرے نفس مطمئن اب پلٹ آ، تلوار نیام میں رکھی، پشت زین  
 پر سر بھکایا، حملے شروع ہوئے۔ تیر۔ تلوار، نیزہ، پتھر، زخموں سے چور ہو کر  
 گھوڑے سے گرے۔ ذوالجناح نے جھک کر سہلہ ادا کیا۔ تیسروں نے اٹھ کے  
 استقبال کیا۔ خاک کر بلا تک پہنچے۔ مجدد آخر میں پیشانی رکھی، مناجات کا  
 سلسلہ شروع ہوا۔ پروردگار! حسین تیری مرضی پر راضی ہے۔ تیرے حکم کے  
 ساتھ مہر تسلیم جھکائے ہوئے ہے، میرے معبود! میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا،  
 اب تو نانا کی امت کا خیال رکھنا۔ مناجات تمام ہوئی، شمر کا تاجر چلا۔ زینبؑ  
 نے پسر سعد کو آواز دی۔ پسر سعد! میرا بچایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا  
 دیکھ رہا ہے۔ زین کر بلا ہلی، سیاہ آنکھیاں چلیں، آفتاب کو گھن  
 لگا، صحرا میں نہ بڑا کی فساد کی آواز گونجی۔ آسمان سے منادی نے پکار کر کہا۔

أَلَا قَتَلَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَا أَلَا ذَبَحَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَا

زینبؑ تڑپ کے عابد بیمار کے قریب آئیں، میرے لال آنکھیں کھولو، قیامت  
 آگئی، بیٹا! زینبؑ بن بھائی کے ہو گئی۔ میرے لال تم یتیم ہو گئے۔ عابد بیمار نے آنکھیں  
 کھولیں۔ پھر بھی اماں۔ ذرا خیمہ کا پردہ تو اٹھائیے۔ زینبؑ نے بڑھ کر خیمہ کا  
 پردہ اٹھایا۔ بیمار نے سمجھ کر دیکھا۔ ایک نیزہ طویل پر باپ کا سر۔ آواز دی۔  
 اسلام علیک یا ابا عبد اللہ، اسلام علیک یا بن رسول اللہ۔ بابا یتیم بیٹے کا  
 سلام لے لو بابا۔

إِنَّ لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَا جِعُونَ - !

و سيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون





دین ہے واقعہ کہ ہلاک ۔ کہ اگر کہ ہلاکے حادثہ عظمیٰ نے "نہیں" کی قدر و قیمت نہ سمجھا دی ہوئی تو شاعر کا ذہن اس بلندی کہ دار تک نہ پہنچ سکا یہ باپ ادب بیٹے کے کردار کا اتحاد ہے کہ وہاں "نہیں" سنائی دی تو بیعت یزید کے نام پر اور یہاں "نہیں" سنائی دی تو تشدد کے موقع پر۔ اور یہ دونوں "نہیں" باپ ادب بیٹے میں منتر ہیں۔ تشدد میں "لا" ہے دونوں کے یہاں ہے اور بیعت یزید سے انکار ہے تو دونوں کے یہاں ہے۔ اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں فرزدق کے کلمہ کہ امام حسینؑ کے انکار بیعت سے ملا کہ یہ کہوں کہ جس کے یہاں لا الہ الا اللہ سلامت ہے اس کے یہاں بیعت یزید سے انکار بھی ہے اور جہاں بیعت یزید سے انکار نہیں ہے وہاں کلمہ "لا الہ" بھی بریا کا دی ہے ایمان نہیں ہے۔

اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں خواجہ اجیری کہہ گئے ہیں "حقاکہ بنائے لا الہ است حسینؑ"۔ اور علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے: "نقش لا الہ الا اللہ بر صحرانوش"۔ حسینؑ لا الہ کی بنیاد بھی ہیں اور حسینؑ ہی الا اللہ کے نقاش بھی ہیں۔ اب جو حسینؑ کا نہیں ہے وہ نہ لا الہ کا ہے نہ الا اللہ کا۔ اور جو لا الہ الا اللہ کا نہیں ہے وہ مسلمان کہ جانے کے قابل نہیں ہے۔

عزیزان محترم! میرا موضوع کلام فلسفہ کہ جلا نہیں ہے اور نہ اس وقت اس سلسلے میں کوئی تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کے بندے اور اس کے خاندانے ہمیشہ اس کی مرضی کے پابند اور اس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھتا۔ وہ بیدار ہو کر میدان میں آتے ہیں نہ "مراحمیۃ مرضیۃ" کی سند لیتے ہیں اور بستر پر لیٹ کر سو جاتے ہیں تو رضائے الہی کا سوز اکر لیتے ہیں۔

ایسے پاکیزہ کردار بندے یا آسمان پر ملائکہ میں دیکھے ہیں یا زمین پر انبیاء و سرسلین میں۔ ملائکہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "يَقْعَلُونَ مَا لَوْ مُرُّونَ" وہ ہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے اور انبیاء کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "جَعَلْنَا هُمْ رُسُلًا لِّيُفَكِّدُوا نَفْسَهُمْ بِأَفْرُنَا" ہم نے انھیں امام اور رہنما بنایا ہے تاکہ ہمارے حکم سے ہدایت کریں اور ان کی طرف جہی کی کینک عمل کرتے رہیں۔ نمازیں قائم کرتے رہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں اور یہ سب ہمارے عابد اور عبادت گزار بندے تھے۔

آیت کریمہ میں ایک طرف انبیاء و سرسلین کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف ان کی شان بھی بیان کر دی گئی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم نے ذمہ داری میں کر دی اور انھوں نے مقام عمل میں فرار اختیار کیا۔ نہیں نہیں۔ ہم نے انھیں ذمہ دار بنایا تو انھوں نے مکمل طور پر اپنی ذمہ داری کو ادا کیا اور اس شان سے ادا کیا کہ ہم نے انھیں "عابدین" کی سند دے دی اور ان کی عبادت کا اعلان کر دیا۔ لیکن یاد رکھو کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے انھیں امام بنادیا اور نیک عمل نماز۔ زکوٰۃ کی نصیحت کر دی تو وہ عابدین گئے۔ بلکہ ہم نے واضح نکتوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ عابد تھے اس لئے ہم نے انھیں منصب امامت عطا کیا ہے۔

ارباب نظر! غور فرمائیں کہ مالک کائنات نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ یہاں عبادت گزاروں کی منصب کے بعد نہیں ہے کہ انبیاء کو اپنا بیسا بشر فرض کر لیا جائے منصب عبادت کے بعد ہے کہ اگر منصب کا اعلان دنیا میں ہوا ہے تو شان عبادت یہاں دیکھنا ہوگی اور اگر منصب کا اعلان قبل خلقت آدمؑ ہوا ہے تو شان عبادت بھی وہی نظر آئے گی۔ ملا اعلیٰ کا ماحول ہوگا۔ عالم قدس کی فضا ہوگی۔ کائنات میں سنانا ہوگا۔ موجودات کا دور دورہ پتہ نہ ہوگا ایک خالق کا جلوہ ہوگا اور ایک نوہم

ہوگا جو تجسید و تحلیل ہوگا اور اسی کی تسبیح و تہلیل کس کس ملائکہ تسبیح و تہلیل کریں گے۔ وہ استاد ہوگا۔ سید الملائکہ شاگرد ہوگا۔ وہ معلم ہوگا اور عالم عصمت متعلم ہوگا۔ وہ طریقے معین کرے گا اور آسمان والے اس کے نقش قدم پر چلیں گے۔ دنیا والے اس کی راہ پر چلیں یا نہ چلیں آسمان والے جانتے ہیں کہ صراط مستقیم اسی کے نقش قدم کا نام ہے اور نعمتیں انھیں بندوں پر تمام ہوتی ہیں۔ اللہ انھیں کے عمل سے راضی ہے اور دین انھیں کا دین کامل ہے۔

مخلوقات الہی میں دو قسم کی مخلوقات معصوم ہیں جن کے دامن کردار پر خطا و غلطی کا کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک ملائکہ ہیں اور دوسرے انبیاء و مرسلین۔ لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کو اللہ نے اپنے منصب امامت کا اہل سمجھا ہے اور ایک وہ ہے جسے اس منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور روز اول ہی اعلان کر دیا گیا کہ تمھاری تسبیح و تہلیل اپنے مقام پر ہے۔ تمھاری عبادت و بندگی اپنے مقام پر ہے لیکن عباد منصب اس سے بالاتر ہے اور ہم ہر عبادت گزار۔ ہر معصوم کردار کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو منصب اتنا طیب و طاہر ہو کہ معصوم فرشتوں کو نہ مل سکے وہ غیر معصوم بندوں کو کیوں کر مل سکتا ہے۔

میں تو اس سے بالاتر کہنا چاہتا ہوں کہ نگاہ مذہب میں کل عزت آدمؑ یہی ہے کہ انھیں اس عظیم منصب کا اہل قرار دیا گیا جس کے اہل معصوم فرشتے بھی نہیں تھے۔ اسلام میں منصب خلافت فرشتوں کا حصہ نہیں ہے آدمؑ جیسے نیک کردار انسانوں کا حصہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص خلافت و امامت کے منصب سے عصمت کردار کی شرط نکال دے تو وہ عظمت قرآن کا بھی مخالف ہے اور عزت آدمؑ کا بھی۔

اور یاد رکھئے کہ عظمت قرآن سے ایمان وابستہ ہے اور عزت آدمؑ سے آدمیت وابستہ ہے۔ اس منسند میں راہ حق سے ہٹ جانے والا نہ آدمی رہ سکتا ہے نہ صاحب ایمان۔

معصوم مخلوقات میں اللہ نے ایک کو منصب کا اہل بنایا ہے اور ایک کو نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کے عمل و اخلاص اور ان کے معصوم کردار میں کوئی فرق ہے۔ نہیں۔ اس نے خود فرشتوں کے کردار کی بلندی کا اعلان کیا ہے اور ان کی پیدائشی عصمت کو واضح کیا ہے بلکہ خود آدمؑ کے مسئلے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ میرے معصوم فرشتہ اتم منصب خلافت کے اہل نہیں ہر لیکن تمھارا فرض ہے کہ جب پیکر آدمؑ میں روح ہدایت پھونک دی جائے تو تم سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا۔ اس انداز سے تمھاری عصمت کا امتحان ہوگا کہ تم کس قدر اطاعت شعور اور فرماں بردار ہو۔ صرف منصب کی طلب ہے یا ذوق بندگی بھی ہے۔ ملائکہ نے سجدہ کر کے بتا دیا کہ ہم بندے ہیں اور ہمارا کام بندگی کرنا ہے۔ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر کے دافع کر دیا کہ میں صرف منصب کی ضرورت ہے اور وہ نہ ملے گا تو سجدہ بھی نہ کریں گے۔ اور سجدہ بھی تیرا ہوتا تو شاید کر لیتے لیکن یہ کیا غضب ہے کہ آدمؑ کے مقابلہ میں منصب سے محروم بھی کیا اور اب اسی آدمؑ کو سجدہ بھی کرایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ملائکہ اور ابلیس میں یہی فرق ہے کہ ملائکہ میں ہوس منصب نہیں ہے ذوق بندگی ہے اور ابلیس میں ہوس منصب ہے ذوق بندگی نہیں ہے اور یہی میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جس میں ہوس منصب کے بجائے ذوق بندگی ہو اسے فرشتوں سے ملایا جائے اور جس میں ہوس منصب ہو اور خلیفۃ اللہ کے سامنے جھکنے کا حوصلہ نہ ہو اسے ابلیس سے ملایا

جائے۔ وہ آدم سے نہیں ملایا جاسکتا۔

ملائکہ نے سجدہ کیا اور "ساجدین" کہلائے۔ ابلیس نے انکار کیا اور مردود یا رگاہ الہی قرار پایا۔ اب یہ فیصلہ آسان ہو گیا کہ نگاہ قدرت میں مقرب کون ہے۔ اور ابلیس کون ہے؟ دین الہی میں سجدہ کی کیا اہمیت ہے اور سجدہ نہ کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ تجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک لفظ کہ دینا کافی ہے کہ جب آدم کو سجدہ نہ کرنا ابلیس بنا دیتا ہے تو خود پروردگار کو سجدہ نہ کرنا کیا بنا دیگا۔ یہ آپ خود فیصلہ کریں۔ اور تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب آدم کے سامنے سر جھکا دینے والے "ساجدین" بن گئے تو زندگی بھر سجدہ پروردگار کرنے والے کسی منصب کے حامل ہوں گے اور ان کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اس سلسلے میں صرف ایک لفظ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اللہ نے اپنی دونوں معصوم مخلوقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دو تعظیلات استعمال کی ہیں۔ انبیاء کے بارے میں لفظ "عابدین" استعمال کیا ہے اور ملائکہ کے بارے میں لفظ "ساجدین"۔ اب ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ اس بندہ پروردگار کا کیا مرتبہ ہوگا تو عابدین کی محفل میں جائے تو زین العابدین بن جائے اور ساجدین کی بزم میں آئے تو سید الساجدین بن جائے۔ اس کا مقابلہ انبیاء سے ہو سکتا ہے نہ ملائکہ سے۔ وہ انبیاء کے بزم کی رونق ہے تو ملائکہ کے کاروان خود کا میر کا رزاں۔

اسے ان معصوم مخلوقات سے بھی ملانا۔ اس کا مرتب ان دونوں سے بھی بلند ہے۔ وہ انبیاء سے بھی بالاتر ہے اور ملائکہ سے بھی افضل۔ وہ ناظم مسلمان ہیں جو ایسے عظیم کردار کو امت کے گنہگاروں سے ملاتے ہیں اور وہ جلیل قرآن یزید تھا جو ایسے عظیم انسانوں سے مطالبہ سمیت کر رہا تھا۔ کہ بلا کے داہتھاؤں نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ جب مجھ سے انبیاء اور ملائکہ اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تو یزید کی کیا بساط اذقات ہے اور امام زین العابدینؑ

نے تو صامت انداز سے واضح کر دیا کہ جب دوسرے علیؑ کو امت کے گنہگاروں سے نہیں ملایا جاسکتا تو پہلے علیؑ کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اور جب دوسرا علیؑ انبیاء اور ملائکہ سے بہتر ہے تو پہلے علیؑ کی کیا منزل ہوگی یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جب حسینؑ کا بیٹا کائنات کے تمام ارباب عصمت سے افضل و بالاتر ہے تو حسینؑ کے باپ کی کیا منزل ہوگی۔ اور شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے کہہ دیا تھا کہ میرے فرزند حسنؑ و حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے بھی افضل و بہتر ہیں۔ اب دنیا خود فیصلہ کرے کہ جب سرداروں کو چھوڑ کر جنت نہیں مل سکتی تو ان کے باپ سے لڑا کہ کس جنت مل سکتی ہے۔

امام زین العابدینؑ کی زندگی میں انصافیت و برتری کے دلائل تلاش کئے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کون سے امتیازات ہیں جن کی بنا پر آپ کا مرتبہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ سے بہتر ہے تو اس ذیل میں سب سے پہلے معرفت کی منزل میں قدم رکھنا ہوگا۔ انبیاء و مرسلین کی معرفت اور ملائکہ مقررین کے عرفان میں کوئی شک نہیں ہے۔ عرفان میں کمی ہوتی تو معصوم نہ ہوتے اور معرفت میں کوئی نقص ہوتا تو عصمت کی منزل نہ حاصل ہوتی۔ لیکن قرآن مجید اور تاریخ مذہب نے ان معصومین کے عرفان کے جو مرتع پیش کئے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کی منزل کچھ اور ہے اور ان کا طرز معرفت کچھ نرالا اور انوکھا ہی ہے۔

سارے معصومین کے تذکرہ کا محل نہیں ہے۔ صرف ایک جناب ابراہیمؑ کی مثال لے لیجئے۔ جن کا مرتبہ مرسل اعظم کے بعد سارے انبیاء سے افضل و برتر ہے اور جنہیں نسی اعتبار سے بھی مرسل اعظم کا مورث اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قرآن مجید ان کے بارے میں حکایت کر رہا ہے کہ جب ابراہیمؑ قوم کے سامنے آئے اور دیم کو گمراہی میں غرق

پایا: کوئی ستارہ پرست تھا کوئی چاند کو خدا بنائے ہوئے تھا۔ کوئی سورج کی پوجا کر رہا تھا تو ایک نظر میں سب کی خدائی کو باطل کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ سارہ خدا ہے تو ڈوبتا کیوں ہے۔ اگر یہ چاند خدا ہے تو غروب کیوں ہوتا ہے اور اگر یہ سورج خدا ہے تو اسے زوال کیوں ہوتا ہے۔ خدا کے لئے تو زوال و غروب نہیں ہے۔ خدا کو زوال آگیا تو بندوں کا کیا حشر ہوگا اور خدا ڈوب گیا تو بندوں کا کیا انجام ہوگا۔ انھیں تو ایک چلو پانی بھی نہ ملے گا کہ اسی میں ڈوب مریں۔

انداز گفتگو بتا رہا ہے کہ ابراہیمؑ نے معرفت الہی میں مخلوقات کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ بندوں کو معرفت خدا میں مخلوقات ہی کو ذریعہ بنانا ہوگا اور اسی طرح سوچنا ہوگا کہ جب یہ مخلوقات خدائی کرنے کے قابل نہیں ہیں تو کوئی دوسری ہستی ہے جو خدائی کی اہل ہے اور اسی کے اشاروں پر یہ کائنات چل رہی ہے لیکن امام زین العابدینؑ کا انداز معرفت اس سے جدا گانہ ہے۔ آپ دعائے ابو حمزہ شمالی میں بارگاہ احدیت میں عرض کرتے ہیں بِدَعْوَتِكَ وَأَنْتَ ذَلَّلْتَنِي عَلَيَّهَا وَدَعَوْتَنِي إِلَيْكَ۔ پروردگار میں نے تجھ کو تیرے ہی ذریعہ پہنچا پایا ہے اور تو نے ہی اپنی طرف مجھے دعوت دی ہے اور تو نے ہی میری راہنمائی کی ہے۔ تو نہ ہوتا تو تیری معرفت نہ ہوتی اور تیری راہنمائی نہ ہوتی تو کوئی تجھ تک پہنچ نہ سکتا۔ یہ انداز امام زین العابدینؑ کا نہیں ہے بلکہ محمدؐ و آل محمدؑ کا مشترک انداز ہے۔

مولائے کائنات "دعائے صباح" میں عرض کرتے ہیں: يَا مَنْ وَلَّى عَلَيَّ ذَاتِي وَجَدَّ أُنْفِي۔ اے وہ خدا جس نے اپنی ذات کی طرف اپنی ذات ہی سے راہنمائی کی ہے اس کی معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے وہ اپنی معرفت کا خود ذریعہ ہے۔ ایسا کیوں ہے اور آل محمدؑ نے یہ نیا طریقہ کیوں نکالا ہے۔ انبیاء اس راہ پر کیوں نہیں چلے۔

راز بہت واضح ہے۔ ایک لمحہ کے لئے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے انبیاء اس راستہ کو اختیار کر لیتے تو بے معرفت رہ جاتے اور اہلیت اس راستہ کو اختیار نہ کرتے تو بے معرفت رہ جاتے۔ یعنی اہلیت کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے اور انبیاء مرسلین کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ ان کا کوئی قصور ہے اور نہ ان کا کوئی قصور۔ یہ تخلیق کا ایک فلسفہ ہے جس نے ہر ایک کا انداز معرفت جدا جدا کر دیا تاکہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انبیاء کی تخلیق زمین و آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ انھوں نے پیدا ہو کر زمین کو دیکھا ہے۔ آسمان کو دیکھا ہے۔ ستاروں کو دیکھا ہے۔ چاند کو دیکھا ہے سورج کو دیکھا ہے۔ کو اکب کو دیکھا ہے۔ سیارات کو دیکھا ہے اور پھر انھیں کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور دنیا کو آواز دی ہے کہ اگر خدا کو پہچاننا ہے تو انھیں مخلوقات کو ذریعہ بناؤ۔ میں معرفت لے کر آیا ہوں لیکن اس کائنات میں معرفت کا واحد ذریعہ یہی مخلوقات ہیں جھیں دیکھ کر خالق کے وجود، اس کے علم و قدرت اور اس کی حکمت و عدالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے لیکن آل محمدؑ کی منزل اس سے جدا گانہ ہے۔ ان کا نور اس وقت پیدا ہوا ہے جب زمین نہیں تھی۔ آسمان نہیں تھا۔ ستارے نہیں تھے۔ کو اکب و سیارات نہیں تھے۔ ایسے موقع پر ان مخلوقات کو معرفت کا ذریعہ بنایا جاتا تو یہ ذریعہ معرفت ہی رہ جاتا اور نور کا بے معرفت رہنا ممکن نہیں تھا اس لئے قدرت نے اس کے لئے معرفت کا نیا راستہ نکالا اور آواز دی۔ لئے نور محمدی کائنات مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہنچانے کی جگہ میں اپنی معرفت براہ راست عطا کروں گا۔ تو نہ زمین کا محتاج ہوگا نہ آسمان کا۔ نہ ستاروں کا محتاج ہوگا نہ کو اکب و سیارات کا۔ تیرا انداز الگ ہوگا۔ تیری منزل الگ ہوگی اور تجھے اتنا بلند تر بنا دوں گا کہ دنیا مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہنچانے کی اور میں مخلوقات کے

اپنی معرفت تیرے ذریعہ سے عطا کروں گا۔ سب مجھے دنیا کے ذریعہ پہچانیں گے اور دنیا مجھے تیرے ذریعہ پہچانے کی تاک محتاج اور بے نیاز کا فرق واضح ہو جائے اور اہل دنیا سمجھ لیں کہ جو کائنات کا محتاج ہوتا ہے وہ کون ہوتا ہے اور جس کی کائنات محتاج ہوتی وہ کون ہوتا ہے۔

اور جب کائنات اپنے وجود میں تیری محتاج رہے گی تو معرفت میں تیری محتاج کیسے نہ رہے گی اور جب سب کو تیرا محتاج بنادوں گا تو سب تیرے تابع فرمان ہوں گے چاند تیرے اشاروں پر ٹکڑے ہوگا۔ سورج تیرے اشاروں پر مغرب سے پلٹ آئیگا۔ پانی تیرے اشاروں پر جو اہرات میں تبدیل ہو جائے گا۔ سنگ پڑے تیرے اشارہ پر کلہ پڑھے لگیں گے اور ملک الموت تیرے اشارہ پر تیری دائرہ کی روت کو داپس کر دیگا۔ دنیا پہچان لے کہ تجھے میں نے کچھ اور بنایا ہے اور دنیا کا اور — تیری منزل کچھ اور دکھی ہے اور انبیاء کی منزل کچھ اور — انبیاء میں لیماں بھی ہونگے تو ملک الموت انھیں بٹھنے کی اجازت نہ دیں گے اور تیرے گھرانے کا قیدی بھی ہوگا تو ملک الموت بلا اذن قدم آگے نہ بڑھائیں گے۔

جب انبیاء کا انداز معرفت دیکھ لیا اور آل محمد کی انفرادیت سمجھ میں آگئی تو ملائکہ کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں معرفت کر دگا تو بڑی چیز ہے۔ بلا وسیلہ اپنی معرفت بھی نہیں ہے۔ کیا دنیا اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ بزم پیغمبر میں جبریلؑ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک علیؑ آگئے۔ جبریلؑ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا جبریلؑ تم نے تعظیم کیوں کی۔ عرض کی خدا کے رسولؐ! علیؑ کا بھڑپ رہی ہے۔ جب عالم انوار میں مجھ سے سوال ہوا تھا کہ جبریلؑ تباؤ تم کون ہوا اور میں کون ہوں؟ تر نور علیؑ ہی نے میری راہنمائی کی تھی — اب کتنی بد نصیب ہے وہ امت جس کو

ملائکہ کا استاد اور عالم قدس کا راہنما مل جائے اور وہ اسے چھوڑ کر کرامت کے گنہگاروں کو راہنما بنالے —

صحیفہ کاملہ آپ کے انداز معرفت کا شاہکار ہے اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعد و معبود کا رشتہ کیا ہے اور بندگی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ وہ دعائیں، وہ مناجاتیں، وہ حسن طلب، وہ حسن قبول، وہ صفات جلال و جمال کا تذکرہ، وہ ذات و صفت کی بحثیں، وہ معرفت کے درس، وہ انجام دنیا کا اعلان، وہ عاقبت کی فکر، وہ خوف خدا، وہ بیان جنت، وہ تذکرہ جہنم، غرض جو کچھ صحیفہ انبیاء میں ہے سب اسی مختصر مجموعہ میں موجود ہے اور بدرجہ اتم موجود ہے مجھی تو صاحبان معرفت نے کبھی اسے زیور آل محمد کہا ہے اور کبھی انجیل اہلسنت اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر قرآن کتاب باقی نہ ہوتا اور یہ بیانات تفسیر و تشریح قرآن نہ ہوتے تو اسے مصحف کا مرتبہ حاصل ہوتا لیکن یہ عظمت قرآن ہے کہ اسے مصحف کا مرتبہ نہیں دیا گیا اور انفرادیت کے اظہار کے لئے کلام کو صحیفہ کہا گیا اور مکمل کو مصحف ناطق

معرفت کے ساتھ جب عبادت کی منزل پر نظر جاتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر سزا اس شان سے ادا ہوتی ہے جیسے یہ زندگی کی آخری نماز ہو اور ہر سجدہ اس شان سے ادا ہوتا ہے جیسے یہ زندگی کا آخری سجدہ ہو۔ واقعہ کہ بلا کے بعد بھی آپ کی زندگی صرف گریہ و زاری میں نہیں گذری اور یہ الزام بالکل غلط ہے کہ آپؐ پاس روئے پٹینے کے سوا کوئی کام نہیں تھا جیسا کہ بعض نافرمان فرما دیا کرتے ہیں کہ امام کا کام ہدایت امت ہے۔ گریہ و زاری نہیں ہے۔ اور امام زین العابدینؑ نے سارا وقت گریہ و زاری میں صرف کر دیا اور سزا اللہ اپنے

فریضہ منہی کو ادا نہیں کیا۔ آپ کا مشغلہ عبادت الہی بھی تھا اور تبلیغ دین بھی۔  
ہدایت امت بھی تھا اور باپ پر گریہ و زاری بھی۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث آخر کلام میں ہوگی۔ فی الحال امام کے مشاغل زندگی پر گفتگو ہو رہی ہے۔ عبادت۔ درسِ معرفت۔ احترام طالب علم دین۔ فرما برداری۔  
یتیم نوازی ہی وہ مشاغل تھے جن میں آپ کے صبح و شام بسر ہوتے تھے۔

عبادت کا یہ عالم تھا کہ زین العابدین اور سید الساجدین لقب مل گیا۔ درسِ معرفت کی یہ کیفیت تھی کہ کلام کا مجموعہ زیور آل محمد اور انجیل اہلبیت ہو گیا۔.....  
احترام طالب علم کا یہ انداز تھا کہ کوئی معمولی سا طالب علم بھی آگیا تو یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ اس کا احترام وصیت پیغمبر ہے اور اس کی ذات سے وصیت پیغمبر زندہ ہے۔ غریب پروری اور یتیم نوازی کا یہ عالم تھا کہ رات کا بڑا حصہ غریبوں کے گھر سامان بخدا پہنچانے میں صرف ہوتا تھا اور اکثر یتیموں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارا سامان لانے والا کون ہے۔ یہ تو اس دن معلوم ہوا جب یتیموں کا یہ دالی، غریبوں کا یہ وارث زہر دغا سے شہید ہو کر دنیا سے گذر گیا اور میکسوں کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ ایسی مصروف اور فعال زندگی پر بنے کاری کا الزام جہالت نہیں تو اور کیا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ واقعہ کہنِ بلا کے بعد فوراً ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو آپ کی امامت سے الگ ہو گیا تھا اور اس نے محمد حنفیہ کو امام مان لیا تھا۔ اس طبقہ کے پاس دو تصورات تھے۔ ایک تو یہ کہ محمد حنفیہ امام حسینؑ کے بھائی ہیں اور حضرت علیؑ بن الحسینؑ بیٹے ہیں اور کھلی ہوئی بات یہ کہ بھائی کے ہوتے ہوئے بیٹے کے امام ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یعنی جس طرح امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ امام ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بعد ان کے

دوسرے بھائی محمد حنفیہ کو امام ہونا چاہیے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ واقعہ کربلا ایک نیا اقدام چاہتا ہے اور اتنا عظیم ظلم خاموشی سے برداشت نہیں کیا جاسکتا فردوس ہے کہ وقت کا امام اٹھے اور یتیمیت سے انتقام لے کر اسے فنا کر دے اور امام علیؑ بن الحسینؑ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور صرف اپنے باپ کا ماتم کر رہے ہیں۔ لہذا کسی ایسے کو امام بنالینا چاہیے جو حالات کے تقاضے کے مطابق اٹھے اور بنو امیہ کے تحت و تاج کو خاک میں ملا دے۔

ان دونوں تصورات کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں امامت کو اہلیت کے بجائے وراثت سے مربوط کر دیا گیا ہے اور دین الہی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ امامت کے لئے اقدام اور انتقام کو ضروری سمجھا گیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ امامت کے لئے اقدام و انتقام ضروری ہوتا تو وفات پیغمبرؐ کے بعد امیر المؤمنینؑ بھی امام نہ رہ جاتے اور آپ کا مسلسل ۲۵ سال کا سکوت محض اعتراض بن جاتا۔ امام کا سکوت خود اس بات کی دلیل ہے کہ امامت کے اقدامات حالات اور مصالح کے تابع ہوتے ہیں۔ مصلحت ہوتی ہے تو اقدام کیا جاتا ہے ورنہ سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کے حالات کیا تھے اور آپ کی ذمہ داریاں کیا تھیں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات ہر انسان کی نگاہ کے سامنے ہیں۔ اب یہ ذمہ داری براہِ راست خباب محمد حنفیہ کی تھی کہ وہ قوم کو امامت کے مفہوم سے آشنا کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ امام میں نہیں ہوں۔ امام میرا بیعتیہ ہے لیکن ان کے ساتھ بھی یہ دشواری تھی کہ وہ ایک ایسی نااہل قوم دیکھ چکے تھے جس نے باپ کی صلح پسندی کو دیکھ کر خوار و مرجع کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور باپ ہی سے درپے جنگ ہو گئے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ

مجموعی طور پر اس گھرانہ سے بیزاد بھی نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ آپ نے نہایت حسین رخ یہ اختیار کیا کہ مجمع جام میں امام زین العابدینؑ سے بحث کرنے لگے اور یہ کہا کہ امامت کا حقدار مجھے ہونا چاہیئے۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ تم میراث امامت میرے حوالے کر دو اور اس طرح امت پر حقیقت واضح کر دی۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ بچا آپ تو جانتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد امامت کا امام میں ہوں اور اگر آپ کہ اس میں کچھ کلام ہے تو چلئے خاد کعبہ میں حجر اسود سے شہادت طلب کریں وہ جس کی امامت کی گواہی دے دیگا اسے امام تسلیم کر لیا جائے گا۔ محمد حنفیہ خوش ہو گئے اور خوشی خوشی مجمع کے ساتھ حجر اسود تک آئے۔ سلام کیا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد امام زین العابدینؑ نے سلام کیا۔ حجر اسود نے جواب سلام دیا اور آوازی کہیں گواہی دیتا ہوں کہ آپ دمی رسولؐ اور امت کے امام ہیں۔

فیصلہ ہو گیا۔ حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ محمد حنفیہ مطمئن ہو گئے لیکن قوم کے ناظم افراد یہ کہنے لگے کہ محمد حنفیہ نے بھی معاذ اللہ اسی طرح دعوائے امامت کیا تھا جس طرح امیر المومنینؑ کے دور میں اور لوگوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ لہذا دونوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ لیکن میں کہوں گا کہ کاش دنیا نے اتنا سوچا ہوتا کہ کل کے دعویہ اوروں میں اور محمد حنفیہ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ وہ لوگ امامت کو قوم کا حق سمجھتے تھے اور محمد حنفیہ اسے خدائی منصب سمجھتے ہیں۔ خدائی منصب نہ سمجھتے تو قوم سے الگشن کراتے۔ حجر اسود سے فیصلہ نہ کراتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ محمد حنفیہ کو معلوم تھا کہ حجر اسود کسی کا تابع نہیں ہے۔ قوم کا امام مان لینا آسان ہے۔ حجر اسود کا گواہی دینا بہت مشکل ہے۔ اگر ان کی نیت میں ذرا بھی فساد ہوتا تو کبھی اس فیصلہ پر راضی نہ ہوتے لیکن ان کا تو منشا ہی یہی تھا کہ

قوم دیکھ لے کہ امام کیسا ہوتا ہے اور امامت کے کمالات کیا ہوتے ہیں تاکہ جہاں ایسے کمالات نظر آئیں وہاں امامت تسلیم کی جائے اور جہاں ایسے کمالات نہ ہوں وہاں خلافت و حکومت ہو تو ہو امامت نہ مانی جائے۔

محمد حنفیہ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ امامت یہاں اسباب میں کا حق ہے میراث میں نہیں ہے۔ اب امام کی ذمہ داری ہے کہ چچا کی نیک نفسی کی جزا دیں اور دنیا پر واضح کر دیں کہ میرا چچا بد نفس اور بے عمل نہیں ہے۔ چنانچہ امامؑ نے بھی حسن نیت کی جزا دی اور بہترین جزا دی کہ جب حضرت مختارؑ نے انتقام خون حسینؑ کی تحریک چلائی کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا یہ مسئلہ میرے چچا کے حوالے ہے۔ اب اگر محمد حنفیہ مخالفت ہوتے تو اتنا بڑا مسئلہ ان کے حوالے نہ کیا جاتا اور ان کی مرضی کو مرضی امامت نہ قرار دیا جاتا۔ یہ محمد حنفیہ کے حسن نیت کی جزا تھی کہ میرے کمال کا اظہار آپ کا فریضہ ہے اور آپ کے کمال کا اعلان میرا فرض ہے۔ اس کا ایک عظیم مذہبی فائدہ یہ ہوا کہ مختارؑ کو تحریک انتقام کی اجازت مل گئی اور سیاسی دنیا میں امامت پر انتقام کا الزام نہیں لگایا جاسکا۔ ورنہ جس طرح کل امیر المومنینؑ کے اقدامات پر جرحی ملک کا الزام لگا دیا گیا تھا اسی طرح آج بھی مختارؑ کی تحریک کو امام زین العابدینؑ کے ”جرحی ملک“ کا نام دے دیا جاتا۔ کیا کتنا مصلحت امامت کا کہ قاتلان حسینؑ کا خاتمہ بھی ہو گیا اور دامن امامت پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پایا اور کیا کتنا مختارؑ کی نیک نیتی کا کہ اپنے اقدام میں کھلم کھلا امامؑ کو شریک نہیں بنایا اور آواز دی بولا! غلام ملک گیری کا الزام لے سکتا ہے لیکن آپ کے دامن پر کوئی الزام نہیں آنے دے گا۔ دنیا امام زین العابدینؑ کی شخصیت کو پامال کرنے پر کس طرح تلی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرت حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ادھر سے

ہشام بن عبد الملک بھی آگیا۔ ہشام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ نہ ملا اور حضرت بڑھے تو جمع خود بخود ہٹ گیا۔ کسی نے ہشام سے پوچھا یہ کون ہیں جن کے لئے قدرتی طور پر یہ اہتمام ہوا ہے۔ ہشام نے کہا کہ میں نہیں پہچانتا۔ یہ سننا تھا کہ فرزدق شاعر کو جوش آگیا۔ کہنے لگا کہ امیر تو اسے نہ پہچانے گا۔ یہ وہ ہے جس کے قدموں کی چاپ کو سرزمین بطحا پہنچتی ہے۔ اسے حل و حزم پہنچاتے ہیں۔ اسے خانہ کعبہ پہنچاتا ہے۔ یہ رسول اعظمؐ کا دارش ہے۔ بہترین بندگان خدا بتقی۔ پرہیزگار۔ اور قریش میں انتہائی کرم کی منزل پر فائز ہے۔ یہ کعبہ کی طرف بڑھتا ہے تو کعبہ خود اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔ یہ ابن فاطمہؑ ہے۔ یہ فرزند رسولؐ ہے۔ اس کا عالم یہ ہے کہ جب کوئی سامنے آجاتا ہے تو یہ کمالِ غیرت سے سر نہیں اٹھاتا اور وہ بھی کمالِ ہیبت سے سر جھکائے رہتا ہے۔

فرزدق کا کیا انجام ہوا یہ آپ کو معلوم ہے۔ حکومتوں کے پاس سزا دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن فرزدق نے مدح کا حق ادا کر دیا اور بتا دیا کہ انھیں نہ پہچانتا اپنے کفر کی علامت ہے۔ ان کی شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

حالات کی یہی نزاکت تھی جس نے بظاہر امام کا مشغلہ گر یہ وزارت کو بنا دیا تھا اور آپ آنسوؤں کی چھاؤں میں تبلیغ دین کر رہے تھے۔ منشاء یہ تھا کہ گریہ و بکا کے ذریعہ ذہنوں کو ہموار کیا جائے۔ طبیعتوں کو پگھلایا جائے اور جب غم کی آہ بچ پر لوہا نرم ہو جائے تو صحیفہ کائنات کی چوٹ لگائی جائے۔ گریہ مقصد زندگی نہیں تھا۔ غمیدہ تبلیغ تھا۔ جس طرح مرسل اعظمؐ نے چالیس سال سکوت سے قوم کے ذہن کو ہموار کیا تھا اور اس کے بعد اپنے نظام کو پیش کیا تھا۔ اسی طرح امام زین العابدینؑ نے گریہ و زاری۔

جلس دمام سے ذہنوں کو ہموار کیا اور پھر معرفت کے سبق سکھائے۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب قید شام سے رہائی ہوئی اور ثانی زہراؑ نے کہا بیٹا۔ یزید سے کہہ دو کہ مجھ سے لئے ایک مکان خالی کرادے تاکہ ہم اپنے داروں کا ماتم کر سکیں۔ ثانی زہراؑ کو بلایا مدینہ جا کر بھی ماتم کر سکتی تھیں۔ لیکن چاہتی تھیں کہ صف ماتم شام میں بچے تاکہ یہاں کے لوگ اور یہاں کی عورتیں پر سہ دینے کے لئے آئیں اور ہم ان سے اپنے واقعات بیان کریں اور یہی آنسوئید غم بن جائیں۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا انداز بھی یہی تھا کہ پہلے مجلس غم برپا کرتے تھے اور جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو اپنے مصائب کے ذیل اسلام کے حقائق نشر کر دیا کرتے تھے۔ تاریخ کائنات میں اس سے زیادہ حسین طریقہ تبلیغ دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ یہ امامت کا کمال تھا کہ ہجوم مصائب میں تبلیغ کا انوکھا راستہ نکال لیا اور ایسا راستہ نکالا کہ دشمن کو بھی اس کی تاثیر کا کلمہ پڑھنا پڑا اور آج جو لوگ بیان فضائل کو حرام نہیں کہتے وہ بھی بیان مصائب اور ذکر قتل کو حرام کہتے ہیں یہ آنسوؤں کے خلاف فتوے۔ یہ گریہ و بکا کے خلاف آوازیں۔ یہ بدعت و حرام کے نعرے دلیل ہیں کہ دوست غم کی تاثیر کو پہچانیں یا نہ پہچانیں دشمن فردر پہچانتا ہے اور اس سلسلہ کو روکنا چاہتا ہے لیکن وہ سیلاب کیا رکے گا جس میں عابد بیمار کے ۳۵ سال کے آنسو شامل ہوں۔ جس میں زینب کبریٰ کا گریہ شامل ہو جس میں فاطمہ زہراؑ کی فریاد شامل ہو۔ جس میں آل محمدؑ کی صف عز اشامل ہو۔ جس میں اولاد رسولؐ کا درد شامل ہو۔ حکومتیں مٹ گئیں غم حسینؑ نہ مٹ سکا۔ سلطنتیں فنا ہو گئیں۔ فوق عز و فناء ہو سکا۔ یہ فاطمہ زہراؑ کی تنہا ہے۔ یہ پیغمبر اکرمؐ کا وعدہ ہے۔ یہ قدرت کا انتظام ہے۔ یہ زینب کبریٰ کی بنیاد ہے۔ یہ عابد بیمار کا جہاد ہے۔ وہ شام کا بازار۔ وہ دربار۔ وہ قید خانہ۔ وہ ہجوم مصائب اور وہ بیمار امام کا درد و غم۔

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ زندگی کن مصائب سے گزری ہے اور بیماریاں ماٹنے کس طرح سے مبر کیا ہے۔ دنیا سے تو آلِ عمر کا ردنا بھی برداشت نہ ہو سکا۔ کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے مارے گئے کہ کوئی عزیزوں کے غم میں رو نہ سکے۔

آپ سہجہ سکتے ہیں کہ سکینہ باپ کے لاشہ سے لپٹی ہوئی ہے اور شہر تازیانے لگا رہا ہے۔ عابد بیماریاں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اشقیاء و نک نیرہ جھوڑے میں شہزادیاں ردنا چاہتی ہیں اور سامنے داروں کے سر لاکر دکھ دیتے جاتے ہیں اور تماشا یوں کا مجمع لگا دیا جاتا ہے جس پر یہ مصائب گزرے ہوں انھیں کا دل جانتا ہے کہ ایک دوپہر میں لاشوں پر لاشیں جنازوں پر جنازے آئیں۔ عصر ہوتے ہوتے باپ کا سر لوگ نیزہ پر۔ تھوڑی دیر میں باپ کے لاشہ پر ادھر کے سوار ادھر۔ ادھر کے سوار ادھر چند لمحے گزرے تھے کہ خیوں میں آگ، بھڑکنے شعلے، لٹی چادریں، تازیانے، طاپنے۔ احرم کو بے گورد کفن لاشوں کو چھوڑ کر اس شان کی روانگی کہ ماں بہنیں کھلے سر۔ اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوق خاردار۔ پھر کوئہ کا بازار۔ ابن زیاد کا دربار۔ شام کی منزلیں۔ منادی کی آواز تماشا یوں تماشا دکھو یہ اہلبیت رسولؐ ہیں جنھیں قیدی بنا کر لجا یا جا رہا ہے۔ جس کی نظر میں ایسے مصائب ہوں اس کا گریہ کیا تم سکتا ہے۔ یہی تو وہ ہے کہ جب خادم نے عرض کی کہ مولا کب تک روئے گا۔ فرمایا بھائی تو نے انصاف نہیں کیا۔ یعقوبؑ سے ایک یوسفؑ جدا ہو گیا تھا۔ اتنا روئے کہ آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ میرے تو اتنے یوسف ایک دوپہر میں ذبح کر دیئے گئے۔ عرض کی مولا! یعقوب کے لئے یہ نیا حادثہ تھا لیکن آپ کے لئے تو شہادت میراث ہے۔ فرمایا۔ بھائی شہادت میراث ہے لیکن کیا یہ بھی میراث ہے کہ ماں بہنوں کے کھلے ہوئے سر ہوں۔ تماشا یوں کا مجمع ہو۔ نوک نیزہ پر سر ہائے شہداء ہوں اور میں قافلہ کوئے کہ دیار بہ دیار

اور شہر بہ شہر جاؤں۔

امامؑ کا یہ عالم ہے کہ دن ہے تو ردنا۔ رات ہے تو ردنا۔ کھانا دیکھا تو ردنا۔ پانی آیا تو ردنا۔ کیسے کھاؤں میرا بابا بھوکا ذبح ہو گیا۔ کیسے پانی پیوں میرا باپ پیاسا مارا گیا۔ دھوکا پانی سامنے آیا تو اتنا روئے کہ پانی دو چند ہو گیا اور پھینک دیا۔ دنیا سے یہ گریہ بھی برداشت نہ ہو سکا اور ظالم دلیہ بن جند الملک نے ۲۵ محرم ۶۱ھ کو ہر دے کہ امامؑ کو شیشہ کرادیا۔ زہر کا اثر شروع ہوا تو امامؑ محمد باقرؑ کو بلا کر فرمایا۔ بیٹا اب میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میری تجیز و تکفین کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ زہر کا اثر بڑھا۔ امامؑ خاموش ہوئے۔ ملک الموت نے مدح قبض کی اور امامؑ نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ مدینہ میں خبر شہادت پھیلی۔ چاروں طرف کھرام۔ پرہہ دینے والوں کا ہجوم۔ روئے والوں کا مجمع۔ نماز جنازہ ادا کرنے والوں کا ازدحام۔ آج مدینہ کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ آج مسلمانوں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ گریہ ہمارا کا اثر۔ یہ اہلبیتؑ میں پہلا جنازہ ہے جو اہتمام سے اٹھ رہا ہے۔ جنازہ پیغمبرؐ میں چند افراد۔ جنازہ زہراءؑ کی تاریکی میں۔ جنازہ امیرؑ خاموشی کے ساتھ۔ جنازہ جن عتبیؑ پر تیروں کی بارش اور جنازہ حسینؑ کر بلا کی خاک پر کہ ادھر کے سوار ادھر اور ادھر کے سوار ادھر۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب امامؑ محمد باقرؑ نے غسل و کفن دے کر جنازہ رکھا ہے تو نماز پڑھنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ آسمان سے ملائکہ کی تیسر کی آوازیں بلند تھیں۔ ہر طرف شور مگر یہ دیکھا تھا۔ مگر عرض ادا کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ منظر دیکھ کر روح سید سجادؑ شام ہوگی اور اپنے جنازہ کا یہ عالم دیکھ کر مدح امامؑ مطمئن ہوگی۔ نہیں ہرگز نہیں! میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ جب جنازہ کا ندھوں پر بلند

ہوا ہوگا اندر ہزاروں کے مجمع میں بیعت کی طرف چلا ہوگا تو بیمار امامؑ نے تابوت سے کربلا کا رخ کر کے آواز دی ہوگی۔ بابا! یہ آپ کا لال شرمندہ ہے کہ آج میرے جنازہ میں یہ مجمع۔ میرا تابوت اٹھانے والے اتنے۔ مگر کل جب میں کربلا سے رخصت ہو رہا تھا تو آپ کا جنازہ خاک گرم پر پڑا ہوا تھا۔ ریگ صحر اکافن۔ بابا آپ کا جنازہ دفن بھی ہوا تو ایک اکیلا بیمار فرزند۔ نہ اعز نہ اقربا۔ نہ چاہنے والے۔ نہ دل کے ٹکڑے۔ ہاں یہ فرد ہے کہ جب میں نے آپ کے جسم اقدس کو قبر میں اتارا تھا تو وہ ہاتھ برآمد ہوئے تھے اور آواز آئی تھی۔ لاؤ بیٹا زین العابدینؑ۔ لاؤ میری امانت کو میرے حوالے کر دو۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ  
وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

نختم شد

~~~~~

امام محمد باقر علیہ السلام

اسم مبارک	محمد
لقب	باقر، شاکر، ہادی، امین
کنیت	ابو جعفر
والد ماجد	امام زین العابدینؑ
والدہ ماجدہ	فاطمہ بنت حسنؑ
ولادت	یکم رجب ۵۰ھ۔ مدینہ منورہ بروز جمعہ
ازواج	۲
اولاد	سات
شہادت	۷ ذی الحجہ ۱۱۰ھ۔ مدینہ منورہ
عمر مبارک	۵۷ سال
قبر مطہر	جنت البقیع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی اشرف الاولین
والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآله
الطیبین الطاهرین ولعنة الله علی اعدائهم اجمعین اما بعد
فقد قال الله الحکیم فی کتابه الکریم - لیسما الله الرحمن الرحیم
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰی وَآثَانَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُولٰی

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے: ”بیشک ہدایت کی ذمہ داری
ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔“
کائنات کا اختیار رکھنے والا پروردگار اپنے فضل و کرم انسان کو جملہ امور
کا اختیار دے دیتا ہے۔ کھانا، پینا، سونا، باگنا، رہنا، سہنا، اٹھنا بیٹھنا
سب اس کے اختیار میں ہے۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ اپنے
پادی و رہنما کی انتظام خود کرے بلکہ صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا اھا کہ اَنْ
لَهُمُ الْاٰخِرَةُ كَالْاُولٰی کا حق انسان کو نہیں ہے۔ یہ صرف رب العالمین کا
اختیار ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے منتہی کرتا
کرتا ہے۔ انتخاب بندوں کے بس کا نہیں ہے اور یاد رکھو اگر کسی نے یہ اختیار
اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ صرف گنہگار ہی نہ ہو گا بلکہ پروردگار کے حق کا غاصب
اور اسلام کا باغی بھی کہا جائے گا۔ اور دنیا کے کسی نظام میں باغی کے لئے کوئی
جگہ نہیں ہے۔ قانون اپنے گنہگاروں کو جھوٹ دے سکتا ہے لیکن باغیوں کو

جھوٹ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ صلوات

یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے انتخاب کا حق اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے بعد یہ
بھی بتا دیا کہ ہم کسے منتخب کریں گے اور ہمارے منتخب بندوں کا انداز کیا
ہو گا۔ اس مسئلہ کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ اور اس علم کو خاص
علم غیب نہیں بنا دیا۔ ایسا کر دیا ہوتا تو کل جس کا جی چاہتا وہ الہی انتخاب
کا دعویٰ کر دیتا۔ اور بندوں کے پاس کوئی تردید کا حق بھی نہ ہوتا۔ ہر شخص
نگاہ قدرت میں منتخب بن جاتا اور بندے اس کے اس کے انتخاب کے
چکر میں آجاتے۔ یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے ایک طرف غلط دعویٰ کرنے والوں
کے حوصلے بہت کر دیئے اور دوسری طرف صاف دل اور سادہ لوح بندوں
کو آگاہ کر دیا کہ خیر دار ہمارے معیار سے ہٹ کر کسی کے دعویٰ پر اعتماد
نہ کرنا اور جب تک ہمارے بنائے ہوئے قوانین نہ مل جائیں کسی کو اپنا ہادی
اور رہنما تسلیم نہ کرنا۔

شرائط اور قوانین کو سمجھنے کا بھی بار انتظام کیا گیا۔ اور مختلف
مواقع پر اس کا اعلان ہوتا رہا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم انتظام روز اول
کیا گیا۔ جب ملائکہ معصومین کے مقابلہ میں جناب آدمؑ کو اپنا خلیفہ اور جانشین
بنایا گیا اور آنے والی نسل انسانیت پر واضح کر دیا گیا کہ اگر تمہیں عزت آدمؑ
کا خیال ہے اور تم آدمؑ کی صحیح اولاد ہو۔ تم میں ذرہ برابر آدمیت پائی جاتی
ہے تو اس کا لحاظ رکھنا کہ تمہارے بابا آدمؑ کا امتیاز بھی ملائکہ مقربین کے مقابلہ
میں ان کا علم و فضل تھا ورنہ عصمت ملائکہ میں بھی تھی۔ نیک کردار وہ بھی
تھے۔ سجدہ گزاری میں ان کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ تسبیح و تہلیل ان کا بھی
شعار تھی۔ اور ایسا شعار کہ انہیں اس کے اظہار و اعلان میں کوئی شکلف بھی نہ ہوا

اور اے عظمت آدمؑ کے مقابلہ میں پیش کر دیا۔ لیکن وہ علم و فضل میں آدمؑ جیسے نہ تھے۔ اس لئے میں نے آدمؑ کو خلیفہ بنا دیا۔ اور ملائکہ کو نہیں بنایا۔ تو اے اولاد آدمؑ! یاد رکھنا کہ ہمارے منصب کے لئے عصمت بھی ضروری ہے اور علم بھی۔ تنہا علم کافی ہوتا تو آدمؑ کو معصوم نہ بناتا اور تنہا عصمت کافی ہوتی تو ملائکہ کو خلافت دے دیتا۔ آدمؑ کو عصمت و علم دے کر میں نے واضح کر دیا کہ میرا منصب صاحبان علم و کردار کے لئے ہے۔ اب اگر کسی کے پاس ملائکہ سے بلند تر علم اور آسمان والوں سے زیادہ عصمت کر دار نہیں ہے تو وہ ہمارا منصب دار نہیں ہے۔ اور نہ فقط یہ کہ منصب دار نہیں ہے بلکہ دعوائے منصب کرے تو ہمارے حق کا غاصب اور ہمارے قانون کا باغی کہا جائے گا اور باغی کو کسی قانون میں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ صلوات

ملائک کائنات نے روز اول اپنے ہادی و رہنما کے شرائط بیان کیے عالم انسانیت کو مطمئن کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ہمارے رہنما کو تسلیم و کردار سے سچا مانا جاسکتا ہے۔ ہم اس وقت تک کسی کو صاحب منصب نہیں بناتے جب تک اس کے علم میں ہمہ گیری اور کردار میں معصومیت نہ پیدا ہو جائے۔ گنہگاروں کو منصب دینا ہوتا تو ہم یہ کام اپنے ذمہ لیتے ہی کیوں؟ گنہگاروں کو تو تم بھی پہچانتے ہو۔ اور خوب پہچانتے ہو۔ وہ تمہاری ہی برادری کے آدمی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم گنہگار کو منصب دے کر اپنے منصب کی توہین کریں۔ اور دین کی قیادت کو بھی دنیا کی حکومت بنادیں۔ یہ عصمت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا علم تمہیں نہیں ہے۔ یہ کردار کی پاکیزگی ہی ایک ایسا جوہر ہے جو تمہیں نہیں معلوم ہے۔ جس کے لئے ہم نے یہ کام اپنے

ذمہ لیا ہے تاکہ تمہیں حالات سے آگاہ کرتے رہیں اور یہ بتاتے رہیں کہ جنہیں ہم منصب دار بناتے ہیں سمجھ لو کہ ان کے کردار میں عصمت ہے اور جن مردوں کو منصب سے محروم کر دیں۔ سمجھ لو کہ ان کے کردار میں عصمت نہیں ہے۔

— صلوات

عصمت کردار کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ اس وقت صرف مختصر انداز سے گفتگو کرتے ہوئے ایک لفظ کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا ہے کہ جس وقت اللہ نے پہلے خلیفہ جناب آدمؑ کو خلافت دی ہے اس وقت انسانی آبادی کتنی تھی۔ کتنے مخالف تھے۔ کتنے موافق۔ کتنی فوج تھی کتنی لشکر۔ کتنے حملوں کا خطرہ تھا۔ کتنے تباہی میں بیٹھے ہوئے تھے؟ آپ کہیں گے یہ کچھ نہیں تھا۔ اس وقت انسان تھے ہی کہاں جو فوجیں ہوتیں۔ لشکر ہوتے۔ حملہ آور ہوتے۔ حملے ہوتے۔ خطرات ہوتے۔ اندیشے ہوتے۔ انسان تو آدمؑ کی اولاد ہی کا نام ہے آدمؑ سے پہلے انسان کہاں سے آتے اور لشکر و فوج تو اولاد آدمؑ ہی سے ترتیب پاتی ہے۔ خلقت آدمؑ کے وقت لشکر و فوج کا کیا تصور ہو سکتا تھا۔ یہ بحثیں اس مقام پر بالکل بے کار ہیں اور ان کے اٹھانے کا کوئی عمل نہیں ہے۔ میں کہوں گا کہ بحثیں بیکار نہیں ہیں۔ اس کے بعد ایک بحث اور پیدا ہو گئی کہ جب لشکر نہیں تھے۔ فوجیں نہیں تھیں۔ مخالف نہیں تھے حملے نہیں تھے اندیشے نہیں تھے۔ خطرات نہیں تھے تو آدمؑ کو خلیفہ بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دنیا کو بونہی چھوڑ دیا جاتا۔ جب آدمؑ پیدا ہو جاتے نسل آدمؑ خلق ہو جاتی۔ دینائے انسانیت وجود میں آ جاتی۔ بدکردار اور باغی جنم لے لیتے۔ دین خدا کے مٹنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔ حملوں کی تیاریاں ہو جاتیں

ملکہ خطرہ میں پڑ جاتا۔ دشمن فوج کشی پر آمادہ ہو جاتے۔ منافقین کی ریشہ
روائیاں منزلِ عروج پر پہنچ جاتیں۔ کفر و پلیدی سے تیار ہو جاتا تو آدم کو
خلافت دے دی جاتی۔ اور آدم فوراً حملہ کر کے دشمنوں کو فنا کر دیتے
یا دفاعی لڑائی لڑ کر دین الہی کو بچا لیتے۔ گیارہ قبل از مرگ وادیل کی کیا ضرورت
تھی۔ اور قبل از وقت اتنے بڑے جنگاے کی کیا ضرورت تھی کہ خلافت کا
اعلان بھی ہو جائے۔ سجدہ کا حکم بھی ہو جائے۔ ملائکہ کا دعویٰ بھی ہو جائے
”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ کہہ کے اس کی تردید بھی ہو جائے۔ ملائکہ قریب
بھی بن جائیں۔ اطمینان کامل بھی دیا جائے۔ آدم جنت چھوڑ کر روئے زمین
پر آ بھی جائیں اور ساری کائنات درہم برہم ہو جائے۔ نہ کوئی موضوع نہ
کوئی ضرورت۔ صرف گھر کی رونق کے لئے اتنا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ آپ کہیں گے
خبردار۔ یہ کیسی گھڑکی باتیں ہیں۔ نظام الہی پر اعتراض۔ انتظام قدرت پر
اعتراض؟ میں کہوں گا استغفر اللہ۔ میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو
لفظ پوچھ رہا ہوں کہ جب کوئی حملہ کا خطرہ اور اندیشہ نہیں تھا۔ جب دنیا میں
کوئی شر و فساد نہیں تھا تو آدم کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے فرزند
آدم ہونے کے اعتبار سے خوشی ہے کہ ہمارے بابا کو مفت میں خلافت مل گئی۔
لیکن ایک صاحب نظر ہونے کے اعتبار سے یہ جستجو بھی ہے کہ یہ خلافت کبھی
ملی اور اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کہیں گے تم نے غلط سمجھا ہے۔ خلافت
کا مصرف لشکر کشی اور جنگ و دفاع نہیں ہے۔ خلافت کا منصب فوجی رہی
اور کشت و خون کے لئے نہیں دیا جاتا۔ خلافت کے لئے داخلی یا خارجی غلوں
کی ضرورت نہیں ہے۔ خلافت ایک نیابت الہیہ ہے جو دین کی حفاظت کے
لئے دی جاتی ہے اور اس کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ دین الہی محفوظ رہے

اور اس کے احکام میں کوئی غلط نہ پڑنے پائے۔ دین کے واقعی احکام لوگوں
کی فکر و نظر کی نذر نہ ہو جائیں اور ایک ایسا ذمہ دار انسان بھی رہے جو دین
کے جملہ قوانین کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے۔ اور جب دنیا میں یہ مسئلہ اٹھے
کہ اس موضوع میں دین کی صحیح رائے کیا ہے تو وہ فکر و نظر کے اجتہاد کے
بجائے علم الہی پر اعتماد کر کے مسئلہ کو بیان کر دے اور دین کی صحیح صورت
محفوظ رکھے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ منصب پروردگار کی کو عنایت کرتا ہے
جس میں دین کو رائج کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو دین پر ہونے والے
حلوں کو رد کر سکتا ہے اور اس میں روکنے کی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اگر ارا
لشکر ایک طرف ہو جائے تو وہ اکیلا بھی میدان سے ہٹا کر رہے۔ تم نے
موسیٰ اور ہارون کی تاریخ پڑھی ہے۔ پروردگار عالم نے انہیں منصب
سے سرفراز فرمایا لیکن اس حوصلہ کے ساتھ کہ جب ساری قوم نے کہہ دیا کہ
موسیٰ تم ہارون کو لے کر چلے جاؤ اور فرعون سے مقابلہ کر دو۔ ہم یہیں بیٹھ کر
تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تو جناب موسیٰ نے یہ نہیں کہا کہ جب تمہیں نہ جاؤ
گے تو میں اکیلا جا کر کیا کروں گا۔ اور ایک بیچارے ہارون کیا کریں گے۔
بلکہ جناب موسیٰ آگے بڑھ گئے اور ہارون نے ساتھ دیکر واضح کر دیا کہ جو
لشکر دے کے ساتھ بھاگ جائے وہ موسیٰ کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ میرا کردار
یاد رکھنا۔ میں خاتم النبیین کا دسی نہیں ہوں۔ لیکن مجھ میں یہ حوصلہ ہے کہ لشکر
کے بغیر بھی حملہ کر سکتا ہوں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں گا کہ جب لشکر بھاگ گیا تو میں
ہی ٹھہر کر کیا کرتا۔ اب تم خود فیصلہ کر دو کہ خاتم النبیین کے دسی کو کیا ہونا
چاہئے۔ صلوات

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پروردگار خلافت کا معیار علم و کردار ہے۔

اور یہ خلافت اس کی طرف سے اسی انسان کو دی جاتی ہے۔ جس میں علم و کردار کے ساتھ ایسا عزم و حوصلہ ہو کہ ہر مخالفت کا مقابلہ کر سکے اور ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر سکے۔ اس کا جانشین کسی عاقل و پختہ شخص نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا نمائندہ کسی میدان سے فرار نہیں کر سکتا۔ لشکر کشی اور فوجداری اصل خلافت نہیں ہے۔ خلافت کی بنیاد صداقت و دین ہے۔ لشکر و فوج بعد کے مسائل ہیں اور یہ سب میں نے اس لئے عرض کر دیا کہ آدمؑ کی اولاد کو پوش آجائے کہ آدمؑ کی خلافت میں لشکر و فوج۔ خطرہ و حملہ بنیاد نہیں تھا۔ تو خاتم کی خلافت میں یہ مسائل کیسے بنیاد بن سکتے ہیں۔ اور ایک لفظ اور بھی کہہ دوں کہ اگر خلافت کا معیار دشمن سے مقابلہ ہی تھا تو میرا خیال تھا کہ ملک الموت کو خلیفہ بنا دیا جاتا۔ وہ آدمؑ سے کہیں بہتر ہوتے۔ آدمؑ تو فقط جنگ کر سکتے ہیں۔ اور آخر میں قتل بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ملک الموت دوسرے کو فنا کر سکتے ہیں اور خود نہیں مر سکتے۔ لیکن پروردگار عالم نے ملک الموت کے مقابلہ میں آدمؑ کو منتخب کر کے واضح کر دیا کہ ہیں لشکر و فوج درکار نہیں ہے۔ علم درکار ہے۔ اب خبردار نبی آخر کے بعد یہ کہہ کے خلافت نہ لے لینا کہ دشمنوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ لہذا ہم نے سردار چن لیا اور عالم کا انتظار نہ کیا۔ کاشش تم نے ایسا ہی کیا ہوتا اور اس سردار کا انتخاب کیا ہوتا جو کسی میدان سے پیچھے نہ ہوتا ہو۔ اور خلیفہ میں کڑا غیر فرار کی سنبھلے چکا ہو۔

خلافت الہیہ کو علم و کردار سے مہیا کر سرداری فوج و لشکر میں ڈال دینے کا نتیجہ یہ کہ اسلام میں مزید جیسے شراخوار اور ولید فاسق جیسے ہاشمیانہ بھی خلیفہ بن گئے۔ اور آج تک امت اسلامیہ بارہ کی تعداد پورا کرنے کے

لئے روزانہ ایک خلیفہ کو نکالتی ہے۔ اور ایک کو داخل کرتی ہے۔ کوئی انھیں نکال کر انھیں شامل کرتا ہے۔ کوئی انھیں نکال کر انھیں شامل کرتا ہے۔ اسی طرح یہ دنیا چل رہی ہے۔ اور خلافت کی تعداد مکمل نہیں ہو رہی ہے۔ اب آپ سوچیں کہ جب تعداد تک معلوم نہیں ہے تو شرائط و قوانین کیا معلوم ہوں گے۔ یہ نتیجہ ہے انتخاب الہی سے ہٹ کر اپنے ہاتھ میں انتظام لے لینے اور انہیں کے مقابلہ میں اپنی رائے کو مقدم کرنے کا۔ اس نے صاف واضح کر دیا تھا کہ دین ہمارا ہے تو ذمہ دار بھی ہمارا ہو گا۔ نہ تم نے دین بنایا ہے نہ تمہیں اس کا ذمہ دار بنانے کا کوئی حق ہے۔ اگر تم نے کوئی دین بھی بنایا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم جسے چاہو اس کا ذمہ دار بنا سکتے ہو۔ اور ہم تو اسی دن طے کر دیں کہ تم نے کوئی بنیاد بنایا ہے جس دن تم ہمارے دین کے نام پر اپنا کوئی نمائندہ منتخب کر لو گے۔ صلوات

علم کی گفتگو چل رہی ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایسے عالم کا تذکرہ کیا جائے جس کو مرسل اعظمؑ نے "بافر العلوم" کی سند دی ہو اور یہ واضح کر دیا ہو کہ سارے انبیاء و مرسلین کے علوم و کمالات کو تفصیل و تشریح کے ساتھ حاصل کرنا ہے تو میرے اس فرزند کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ علم و فضل کا کیا عالم ہے۔ جہاں ساری کائنات مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہوگی۔ جہاں ارباب حکومت سر بگرمیاں ہوں گے۔ جہاں دماغ پکڑا رہے ہوں گے۔ جہاں ذہن ماؤف ہو رہے ہوں گے۔ جہاں اقتدار کی پیشانی پر سینیہ لہرا ہو گا۔ وہاں میرا فرزند سکون و اطمینان سے علمی مسائل حل کر رہا ہو گا اور اس شان سے حل کر رہا ہو گا کہ دنیا کی امامتیں شاگردی کے لئے چین ہوں گی اور اگر کچھ مل جائے گا تو اسے سرمایہ افتخار بنائیں گی۔

ہشام بن عبد الملک کا دور حکومت ہے۔ لوگوں نے یہ گزارش کی ہے کہ مکہ کے راستے میں پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے اور عراق و شام سے آنے والے حاجیوں کو سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہشام کا کرم جوش میں آچکا ہے۔ حکم دے دیا گیا ہے کہ ایک مقام پر کنواں کھودا جائے۔ اور حاجیوں کی سیرانی کا انتظام کیا جائے۔ جگہ معین ہو گئی ہے اور کھدائی کا کام شروع ہو گیا ہے۔ آخری منزل پر آنے کے بعد جب پانی نکلنے کے امکانات پیدا ہوئے تو سوتے سے پانی نکلنے کے بجائے ایسی گرم ہوا نکلنے لگی کہ سارے مزدور جھلس کر رہ گئے۔ اور کوئی ایک باہر نہ آسکا۔ لوگ منتظر رہے کہ ڈول مٹی سے بھر جائے تو نکالا جائے۔ لیکن یہاں ہے کون جو ڈول بھرے گا۔ آخر کار چند مزدور تحقیق کی غرض سے اترے اور وہ بھی ایسی گرم ہوا کی نذر ہو گئے۔ دوبارہ دوسرے افراد گئے اور ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اندر جا کر دالے فنا ہوتے جاتے ہیں۔ اور باہر دالوں کا اضطراب برپا ہوتا ہے۔ آخر یہ معہ کیا ہے اور مزدور باہر کیوں نہیں آتے۔ اگر وہ مر بھی گئے ہیں تو کنواں تو بند کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حاجیوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ مسئلہ تو بھر باقی رہ جائے گا۔ اور اگر دوسری جگہ دوسرا کنواں کھودا جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہاں ایسا نہ ہوگا اور اس طرح کی آندھی نہ آئے گی۔ اور اگر وہاں بھی یہی حشر ہوا تو اتنا سراپہ کہاں سے آئے گا کہ روز ایک کنواں کھودا جائے۔ اور اتنے مزدور کہاں سے آئیں گے کہ ہر کنوئیں میں دس بیس مزدور بھینٹ پر بٹھا دیے جائیں۔ سخت تردد ہے۔ ہشام کو خبر دی گئی ہے۔ سارا جوش کرم سرد ہو گیا ہے۔ اہل علم کو بلایا گیا ہے۔ جغرافیہ دانوں کو طلب کیا گیا ہے۔ مورخین سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ اور کوئی نہیں بتا سکا کہ آخر اس کا راز کیا ہے

اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ بالآخر حکومت نے مجبور ہو کر امامت کے آستانے پر چہیں رکھی اور امام محمد باقرؑ کو طلب کیا گیا۔ حضرت اس جگہ پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ یہ جگہ وہ ہے جہاں قوم اخفاف پر عذاب نازل ہوا تھا اور ایک "ارتع عظیم" نے ان کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ ایسی آندھی کی تہارت ہے کہ آج تک زمین جھلس رہی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر کنواں کھودا جائے۔ انشاء اللہ کوئی زحمت نہ ہوگی۔ حضرت کے حکم سے مطابق دوسرا کنواں کھودا گیا اور بہ آسانی پانی نکل آیا۔ واقعہ تو بہت مختصر ہے لیکن دو تین باتیں واضح طور پر معلوم ہو چکی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ علم و عصمت کو چھوڑ کر خلافت تقسیم کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب علی مسئلہ سامنے آتا ہے تو صاحبان علم و عصمت کے سامنے ہی تسلیم جھکا نا پڑتا ہے۔ صلوات

دوسری بات یہ ہے کہ ہشام کے دور میں علم و فکر کا برا بھلا ہوا تھا۔ دربار میں مختلف علوم کے علماء موجود تھے۔ اس نے سب سے مشورہ کیا لیکن کوئی رہنما نہ تھا تو کیا یہ کوئی تاریخ و جغرافیہ کا مسئلہ تھا۔ سائنس اور حساب کا مسئلہ تھا کہ علماء سے غیر متعلق ہوتا۔ یہ تو قرآن کے سورہ احتفان کا مسئلہ تھا۔ یہ تو کتاب اللہ کے "ارتع عظیم" کا مسئلہ تھا۔ پھر علماء کیوں نہیں بتا سکے اور امام محمد باقرؑ کی قدرت کی پویش آئی۔ یہ قدرت کا انتقام تھا۔ حبنا کتاب اللہ کا کمال تم نے کتاب اللہ کے نام پر عزت کو چھوڑ دیا تھا۔ تو اب قیامت تک کتاب اللہ ہی کے مسئلہ میں تمہیں عزت کی ڈیوڑھی پہنچدے کراؤں گا۔ اور تمہیں یہ محسوس ہوتا رہے گا کہ عزت کو چھوڑنے کا یہاں کیا انجام ہوتا ہے۔ وہاں کا حشر تو معلوم ہے۔ پیغمبر نے خود واضح کر دیا تھا کہ تسیم النار والجنة ملیٰ ہیں اب جسے جنت

دوسری بات یہ ہے کہ الہی نظام سے ہٹنے کے بعد عیسائیت کی اختیاج
یہ بعد الملک کے دور کا حادثہ نہیں ہے۔ بلکہ آج کتے اسلامی ملک ہیں جن میں
عیسائی یا درپردہ عیسائی سکھ چل رہا ہے اور مسلمان کو اس کا ہوش بھی نہیں
ہے۔ کبھی عیسائیت سے مقابلہ کیا جوتا تو اپنی فتح کا خیال بھی ہوتا۔ جب کبھی
مقابلہ کیا ہی نہیں تو فتح کی قدر قیمت کیا معلوم ہوگی۔ ہاں جو فاتح ابن فاتح
نقادہ نہ کبھی عیسائیت کے سامنے جھکا نہ بھٹکے گا اور عیسائیت کا کیا ذکر ہے
خود عیسیٰ بھی آسمان سے اتر کر آجائیں تو اسے نہیں جھکا سکتے۔ بلکہ اسی کے سامنے
سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اور وہ وقت آئے گا جب پردہ غیب سے نبی کا
آخری وارث آئے گا اور آسمان سے جناب عیسیٰ آئیں گے۔ عیسیٰ ماموم بن کر
جماعت میں کھڑے ہوں گے اور نبی کا لال امامت کے فرائض انجام دیگا۔
قدرت آواز دے گی۔ دنیا والو دیکھ لو خلافت ختم ہو چکی ہے اور امامت
آج تک امامت کو رہی ہے۔ صلوات

خاتمہ کلام میں ایک لفظ اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ کے اس واقعہ
نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اسلامی سکوں پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
کا نقش امام محمد باقرؑ کی ایجاد ہے کسی بادشاہ دنیا کی نہیں۔ اب دنیائے
اسلام میں جہاں انہیں بھی ایسا سکھ چلے گا یا ایسا نقش رہے گا اس پر امام محمد باقرؑ
کا احسان رہے گا۔ دنیا کتنی احسان فراموش ہے کہ امام کے نقش کو بغیر اسلامی
حکومت بنائی اور بغیر انہیں کے مزار اقدس پر انہدام کی سازش چلنے لگی۔ یہ ہے
اہل ہوس و اقتدار کا انداز اور میسرادل تو کہتا ہے کہ قیام محمد باقرؑ آج
بھی آواز دے رہی ہے کہ اسلام کے دعویدار و پیروی قبرستانی جاسکتی ہے میرا
نقش نہیں مٹایا جاسکتا۔ ہم اپنے لیے بیٹے ہوئے تو قبر کے مٹنے پر پریشان ہوتے ہم

اسلام کے لئے زندہ رہے ہیں تو ہم آج بھی مطمئن ہیں کہ ہمارے مٹانے والے
ہمارے نقش کو ابھارتے ہی جا رہے ہیں۔ مٹا نہیں پاتے۔ صلوات
بیان اپنی آخری منزل پر آ رہا ہے اور واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو ختم
نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے خاتمہ کلام میں صرف ایک واقعہ کی طرف اور اشارہ
کر دینا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس کو اللہ منصب دیتا ہے اس کے علم و
فضل کا کیا عالم ہوتا ہے۔

طاؤس یحیٰی دنیائے اسلام کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ایک
مرتبہ امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کرتے ہیں فرزند رسول! ذرا
یہ تو بتائیے کہ وہ کون سا دن تھا جب ایک تہائی دنیا فنا ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا
بھائی تمہیں تو سوال کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ ایک تہائی نہیں بلکہ ایک چوتھائی
اور یہ اس دن کا واقعہ ہے جب قابیل نے اہیل کو شہید کیا تھا۔ اور ایک چوتھائی
دنیا فنا ہو گئی تھی۔ اس وقت دنیا کی کل آبادی چار آدمیوں پر مشتمل تھی۔
جناب آدمؑ۔ جناب حوا۔ جناب اہیل۔ اور قابیل اور جب ایک کم ہو گیا تو گویا
ایک چوتھائی دنیا کم ہو گئی۔ صلوات

امام نے ایک مسئلہ کی طرف اور بھی اشارہ کر دیا کہ شہادت کا مرتبہ افراد
سے طے نہیں ہوتا منزلت سے طے ہوتا ہے۔ اہیل کی شہادت کو ایک فرد کی شہادت
نہ سمجھو ایک چوتھائی دنیا کا قتل سمجھو اور جیسا قتل ہوتا ہے ویسا ہی قاتل کے لئے
میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اہیل ایک چوتھائی دنیا تھے تو ان کا قاتل پڑ دنیا کا قاتل
کہا جائے گا۔ امام قلب کائنات ہوتا ہے تو اس کا قاتل کل کائنات کا قاتل کہا
جائے گا۔ لہذا اس کے مقابلے میں سر ہزار کا قتل کیا ہے۔ اگر ساری دنیائے
بخلت بھی تہ تیغ کر دی جائے تو بھی خون امام کا انتقام نہیں ہو سکتا۔

امامؑ نے واضح کر دیا کہ عشاء کے اقدام کو دیکھ کر یہ نہ سمجھنا کہ خون حسینؑ کا انتقام ختم ہو گیا۔ ابھی آخری انتقام باقی ہے اور اس میں وہ لوگ بھی شامل کئے جائیں گے جو کربلا کے واقعات سننے سے رہے ہیں اور خوش ہوتے رہے ہیں۔ اور شاید ایسوں ہی کے انتظار میں یہ انتقام رکھا ہوا ہے کہ سارے بد نفس منظر عام پر آجائیں تو ذوالفقار سعید ری اسٹے اور اپنے اصلی جوہر دکھائے۔

طاووس عرض کرتے ہیں: سرکارِ اودہ کون سی چیز ہے جس کا تھوڑا سا حلال ہے اور زیادہ حرام ہے۔ فرمایا: وہ نہر طاوت کا پانی ہے کہ جب جناب طاوت لشکر کو لے کر چلے اور لوگ پیاس سے بے قرار ہوئے۔ تو پروردگار نے ایک نہر سے ان کا امتحان لیا۔ اور جن لوگوں نے پانی پی لیا وہ جناب طاوت کی مصابیت سے خارج ہو گئے۔ اور جن لوگوں نے صرف ایک چلو پانی لیا انھیں معاف کر دیا گیا۔ گویا یہ دلیل ہے کہ اس نہر کا قلیل حلال تھا اور کثیر حرام۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کبھی کبھی پروردگار پیاس سے بھی بندو کو آزماتا ہے اور نہر سامنے رکھ کر بھی امتحان لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ طاوت کے ساتھی نہر پر ٹوٹ پڑے۔ اور "لیکن نہتی" کے سزاوار ہو گئے۔ اور کربلا والوں نے مگر کبھی نہر کی طرف نہیں دیکھا اور "پانی انتم ذرا پی کے حق دار ہو گئے۔"

طاووس عرض کرتے ہیں: فرزندِ اسلام! یہ سزاوار ہے جس میں کھانا حلال کرنے کی پابندی تھی اور کوئی پابندی نہیں تھی۔

عرض کی وہ کون سی شے ہے جو کم ہوتی ہے مگر زیادہ نہیں ہوتی۔ فرمایا: عرض انسان ہے کہ اس میں ہر روز کمی ہوا کرتی ہے کبھی اسانہ نہیں ہوتا۔

عرض کی وہ کون سی شے جس میں اضافہ ہوتا ہے کمی نہیں ہوتی۔ فرمایا:

مسندِ سکر کہ اس کا پانی بڑھتا ہی رہتا ہے گھٹنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

عرض کی وہ کون سا اڑنے والا ہے جو صرف ایک مرتبہ اڑے اور پس فرمایا وہ کوہ طور ہے جسے بنی اسرائیل کے سر پر بلند کیا گیا اور انھیں عذابِ الہی سے ڈرایا گیا اس کے بعد پھر اس پہاڑ نے جگہ سے جنبش نہیں کی۔

عرض کی وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے بات سچی کہی اور پھر بھوٹے کہے گئے۔ فرمایا: وہ منافقین ہیں جنھوں نے یہ کہا کہ پیغمبر اللہ کے رسول ہیں اور یہ صحیح تھا لیکن اللہ نے کہا کہ منافقین بھوٹے ہیں۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے تو کچھ کہا تھا وہ ان کے دل میں نہیں تھا۔ دل میں کچھ اور تھا اور زبان پر کچھ اور نہیں ہے ایک مسئلہ اور بھی معلوم ہو گیا کہ اگر زبان صحیح کہہ رہی ہے اور دل ساتھ نہیں دیتا تو جھوٹ ہے اور اگر دل صحیح کہہ رہا ہے اور زبان صحیح نہیں کہہ رہی ہے تو اسے جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ جھوٹ کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں ہے بلکہ انسان کی نیت اور اس کے ارادہ سے بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافق کو جھوٹا کہا گیا۔ لیکن تقیہ کرنے والوں کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے الفاظ ضرور غلط ہوتے ہیں لیکن ان کے ارادہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور ان کی نیت بہر حال صاف ہوتی ہے۔

مگر افسوس کہ ایسا صاحب کمال امامؑ بھی دنیا کی نگاہوں سے نہ دیکھا گیا۔ اور حکومتوں کو ہر آن فکر رہی کہ کیسے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ امام محمد باقرؑ کی پوری زندگی عجیب کرب و غم میں گزری ہے۔ آپ کے در حیات میں متعدد بادشاہ گذرے۔ ستم و تک معاویہ کی حکومت رہی۔ ستم و تک یزید بادشاہ رہا۔ یزید کے بعد معاویہ بن یزید نے حکومت

تھکرا دی تو مردان بن حکم دس ماہ بادشاہ رہا۔ اس کے بعد ۶۸۷ھ تک عبدالملک بن مردان کی حکومت رہی۔ ۶۸۷ھ سے ۶۹۶ھ تک ولید بن عبدالملک بن مردان کی بادشاہت رہی۔ ۶۹۶ھ سے ۶۹۹ھ تک سلیمان بن عبدالملک بادشاہ رہا اور ۶۹۹ھ سے ۷۰۰ھ تک مردان کا پوتا عمر بن عبدالعزیز بادشاہ رہا۔ ۷۰۰ھ سے ۷۰۵ھ تک یزید بن عبدالملک کی حکومت رہی اور ۷۰۵ھ سے ۷۱۵ھ تک ہشام بن عبدالملک کا دور دورہ رہا۔ واقعہ کہ بلا اسی عرصہ میں گزرا۔ مدینہ کی تاراجی اسی زمانہ میں ہوئی کہ کفارت گری اسی دور میں ہوئی اور تاریخ اسلام کے نہ جانے کتنے حادثات اسی ۵۰ سال کی مدت میں گذر گئے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی حکومت کی بنا کسی فرد یا خاندان کی مخالفت پر ہوتی ہے تو ہر نیا آنے والا مظالم کی رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ اور عوام کی رائے کو ہموار کرنے کے لئے مصائب میں اضافہ کر دیتا ہے۔ امام محمد باقرؑ کی زندگی بھی اسی کشمکش سے دوچار رہی۔ لیکن کیا کہنا تدابیر امامت کا کہ حکومت کے دس دور گذر گئے۔ اور سوائے عمر بن عبدالعزیز کے کسی نے ظلم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن نہ امام کے کردار میں کوئی عیب نکال سکے۔ اور نہ واقعی طور پر رائے عامہ کو ہموار کر سکے۔ دنیا امام کے علم و کمالات سے متاثر ہوتی رہی۔ اور تشنگان علوم بارگاہ امامؑ میں حاضری دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ہشام بن عبدالملک کا دور آیا اور اس نے سوچا کہ یہ اگر زندہ رہ گئے تو ہمارا رہنما مشکل ہو جائے گا۔ اس نے ۹ سال تک مسلسل ملامت کا جائزہ لینے کے بعد اور ہر محاذ زندگی پر شکست کھانے کے بعد پراثر طریقہ اختیار کیا اور امام کو نئے انداز سے زہر دینے کی سازش کی۔ ایک زین میں زہر قاتل جذب کر کے امام کی خدمت میں بیچ دیا کہ آپ اس زین پر سواری کریں یہ خاص طریقہ سے آپ کے لئے تیار کرایا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی حقیقت معلوم ہے۔ لیکن

میرے پروردگار یہی ہے کہ میں اسی ذریعہ سے دنیا سے رخصت ہوں چنانچہ آپ نے سواری فرمائی اور زہر سارے بدن میں سرایت کر گیا۔ موت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تین دن تک بستر پر کر دیں بدلتے رہے۔ امام جعفر صادقؑ کو بلا کر فرمایا بیٹا میں آج دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے اپنے پدر بزرگوار کو خواب میں دیکھا ہے وہ فرما رہے ہیں کہ فرزند عنقریب تم میرے پاس آ رہے ہو۔ میرا وقت آ گیا ہے۔ اب تم چند لوگوں کو بلاؤ تاکہ میں ان کے سامنے وصیت کر دوں اور وہ تمہیں پہچان لیں۔ لوگ آئے آپ نے وصیتیں فرمائیں۔ بیٹا تم ہی مجھے غسل دینا تمہیں کفن پہنانا۔ تمہیں نماز جنازہ ادا کرنا اور تمہیں دفن کرنا۔ میرے چاہنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور میرے احوال میں سے ایک رقم معین کر دینا کہ دس سال تک حج کے موقع پر یمنی میں میرا تم ہوتا رہے۔

ارباب عزاء! وصیت تمام ہوئی۔ امامؑ نے انتقال فرمایا۔ امام جعفر صادقؑ نے حسب وصیت سارے امور انجام دیے۔ اہتمام سے جنازہ اٹھا اور بقیع میں دفن ہوئے۔ عرزی الحجۃ ۳۵ھ کو یہ قیامت خیز حادثہ پیش آیا کہ دنیا امام محمد باقرؑ کے فیوض سے محروم ہو گئی۔ لیکن خدا کے فرزند سرانے موجود تھا۔ وصیت کی تو وصیت پر عمل ہوا۔ کیوں نہ ہو۔ جس کا فرزند سرانے موجود ہوتا ہے وہ وصیت بھی کرتا ہے اور اس کا جنازہ بھی اہتمام کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ مگر اسے یہ سجاد باپ قاتل میں زیر خنجر شمر اور بیٹا خیمہ میں بستر بیماری پر۔ باپ بیٹے کے سرانے وصیت کرنے آیا ہے۔ میرے لال جب شام سے پلٹتا کہ مدینہ جانا تو ہمارے چاہنے والوں سے ہمارا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ شیعوں! شراد قابو ہے کہ جب تمہند اپانی بیٹا تو ہماری پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب دشہید کا ذکر آ جائے تو بھد پر گرے کہنا اور اس طرح اتم کرنا جس طرح میری ماں فاطمہ زہراؑ جنت میں اتم کرتی ہیں۔ واحسیناہ واحسیناہ۔

نقطہ ایک علی کے گلے میں رہی باز صحن گئی ہے۔ بی بی! سر کے بال پریشان کرنا ہیں تو اس وقت کچھ گاجب عصر غلام کا جنگام ہوگا، سارے خیمے جل رہے ہوں گے، بنیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمے کی طرف جا رہی ہوں گی، اور داماد و داماد کے نعرے بلند ہوں گے، جب مقتل میں ہر طرف شہیدوں کے لاشے ہوں گے، شہزادوں کی گود خالی ہو چکی ہوگی، باب کا ششماہہ تیر شعبہ کھا کر کربلا کی خاک پر سو گیا ہوگا۔

بی بی! سر کے بال کھولنا ہیں تو اس وقت کھولے گا جب آپ کے حین کا گلا ہوگا اور شمر کا خیمہ ہوگا، آپ کی زینب فریاد کر رہی ہوگی اور زمین کربلا کو زلزلہ ہوگا۔ سیاہ آنکھیاں چل رہی ہوں گی اور فغانے کر بلا میں ایک آواز ہوگی اَلَا تُبْصِرُ الْخُسُفَ بِكَرْبَلَا اَلَا تَذُبُّ الْخُسُفَ بِكَرْبَلَا۔

بی بی! آپ کو بد دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا ہیں تو ابھی نہ اٹھائیے، یہ ہاتھ اس وقت اٹھائیے گا جب آپ کی زینب کے ہاتھ بندھ جائیں، جب آپ کا ام کلثوم قبہ ہی بن جائے، جب آپ کی سیکٹہ شمر کے ہمارے کھائے، جب آپ کا عابد ہمارا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، نگے میں طوق غار دار پہنے ہوں گے بہنوں کے ساتھ کوزہ شام کے بازار، تماشا ٹیوں کے ہجوم میں لئے ہائے قافلہ کے ساتھ بلوائے عام میں جائے گا۔

بی بی! فریاد کرنا ہے تو اس وقت کچھ گاجب شام کے زمانہ میں کس بجی دنیا سے سفر کر جائے اور آپ کی زینب اپنی بے کس کا ماتم کرے، نہ کوئی غسل دینے والا ہو نہ کفن پہنانے والا، نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا ہو نہ پوسہ دینے والا اور فغانے شام میں ایک آواز گونج رہی ہو، بی بی! اٹھو نہیں وطن جانے کی تماشیاں، میری جان! قافلہ جا رہا ہے۔ بی بی!۔ ماں تجھے چھوڑ کر کیسے جائیگی بی بی!

اور جیسے قبر سے آواز آرہی ہوگی۔ قافلے والو!۔ میرے چاہنے والوں سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا تمہاری مشتاق قید خانہ شام میں سو گئی اور اب بٹ کر کوزہ آئے گی!۔ مولا دانا سرل اعظم! وفات سرور عالم کا ذکر آگیا ہے تو ایک جملہ اور سن لیجئے۔ باپ کا وقت آخر تھا بیٹی سرہانے موجود تھی، بیٹی نے باپ کی آخری خدمت انجام دی تھی اس کے بعد بیٹی ہاشم کے جوانوں، بادشاہ اصحاب اور مولائے کائنات نے مل کر نہایت اہتمام و احترام سے جنازہ دفن کر دیا۔ جی چاہتا ہے فریاد کروں صدیقہ طاہرہ۔ آپ اس بے قراری سے رو رہی ہیں جبکہ آپ نے باپ کی قبر دیکھی ہے، احترام سے جنازہ اٹھتا دیکھا ہے، میں اس بیٹی کے بارے میں کیا کہوں جو وقت آخر باپ کے سرہانے نہ آ سکی اور جب شام غریباں کے سناٹے میں آئی تو غلاموں کے تازیانے کھائے اور پھر کربلا سے چلی تو جلتی رقی پر باپ کا جنازہ چھوڑ کر۔ اور پھر شام کے زمانہ میں یوں سو گئی کہ باپ کی قبہ بھی نہ دیکھ سکی۔

اِنَّ اللّٰهَ دَانَا الْیَہِ مَا جَعَلُوْنَ



امام جعفر صادق علیہ السلام

جعفر

اسم مبارک

صادق

لقب

ابو عبد اللہ

کنیت

امام محمد باقر

والد ماجد

ام فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر

والدہ ماجدہ

۱۰ ربیع الاول ۸۰ ہجری بروز جمعہ مدینہ منورہ

ولادت

فاطمہ بنت الحسین - حمیدہ مصفاة

ازواج

امام موسیٰ کاظم اسماعیل عبد اللہ ام فروہ

اولاد

اسحاق محمد عباس علی اسماء صفری

شہادت

۱۵ شوال ۱۴۰ ہجری مدینہ منورہ

۶۵ سال

عمر مبارک

جنت البقیع

قبر مبارک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء
والمرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد وآلنا أبي القاسم محمد وآلنا
الطاهرين ولعن الله الذين أخذوا منهم أجمعين أما بعد فقد قال
الله الحكيم في كتابه الكريم

بسم الله الرحمن الرحيم

وإن علينا للهدى وإن لنا للأمر ما نؤتي

ارشاد جناب اقدس الہی ہے بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر
ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے

کیا کہنا اس جو کرم کا کہ اس ہدایت کی ذمہ داری جہاں اور تادان انسان نہیں ڈالی بلکہ
عظیم کام اپنے ہی ذریعہ اور انسان کی ذمہ داری نظائر قرآنی کو وہ مالک کہتے ہیں اسے اصولوں پر عمل
کرے اور اسے عین کئے ہوئے نظام کے مطابق زندگی گزارا اسی میں فروغ و ترقی اور فلاح و آخرت بھی
مالک کا یہ کرم نہ ہوتا تو آج ایک مرد مسلم بھی اسی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرتا جس طرح
دنیا کے دوسرے افراد ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ صبح و شام قوانین بنتے ہیں اور مرض
گھٹنے کے بھلے بڑھتا ہے جا رہا ہے۔ صاحبان فکر و نظر ہیں، ار با عقل و دانش
ہیں، منتخب دور کا افراد ہیں، چاند کی سیر کرنے والے ہیں، مرتبہ پر کھنڈ ڈالنے والے
ہیں، میٹر دیا کو چیرنے والے ہیں، بطن گیتی سے خزانے نکالنے والے ہیں، لیکن
انچھ ہی زندگی کے اصول و قوانین سے بے خبر ہیں، دنیا کے بارے میں جو تجربہ کرتے
ہیں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے بارے میں جو قانون بناتے ہیں وہ ناکام ہو جاتا ہے
صبح کو بنایا ہوا قانون شام کو بدل جاتا ہے اور شام کا بنایا ہوا قانون صبح کو تبدیل

ہر جانا ہے اور یہ طے نہیں ہو جاتا کہ پہلا قانون زیادہ مناسب تھا یا دوسرا۔
یہ تو تجربہ ہی بتائے گا کہ کس میں زیادہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے
کہ بعض اوقات دوسرے قانون کا تجربہ ہی واضح کرتا ہے کہ پہلا قانون زیادہ
صحیح تھا اور انسان اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

نظام زندگی کے تفصیلات میں جانے سے پہلے ایک مولیٰ سی مثال دنیا کے
فیض کی لئے لیجئے، فیض کے پرستار صبح و شام بدلتے ہیں اور ہر تبدیلی کے بعد
یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ طریقہ عمل زیادہ مناسب اور عرصی تقاضوں کے مطابق
ہے، لیکن چند دنوں کے بعد جب اس کے عجیب و غریب نتائج سامنے آ جاتے
ہیں تو اس سے بہتر فیض ایسا دیکھ لیتے ہیں اور چند ہی دنوں کے بعد اس کا
عجب بھی ظاہر ہو جاتا ہے، تو اب یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ پہلا ہی انداز زیادہ صالح اور
مناسب تھا، آپ تجربہ کر لیں کہ انسان نے چند سال کے اندر کتنی مرتبہ انداز بدلے
ہیں اور کس کس طرح اپنے نفس کو دھوکا دیا ہے، کبھی جپت لباس اختیار کیا اور
دنیا کے معاشی حالات کی ابتدری کو دلیل بنایا اور کبھی ڈھیل ڈھالا لباس اختیار
کر کے یہ دلیل دی کہ جپت لباس میں انسان کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے،
اور دنیا کے حالات عمل چاہتے ہیں، کبھی درمیانی راستہ نکالا اور یہ دلیل دی کہ
گڈ مشین دونوں انداز کو دروں کے حامل تھے لہذا یہ طریقہ ایسا دیکھا گیا ہے
اور لہذا میں پھر معاشی حالات یاد آ گئے اور پہلے ہی انداز کی طرف پلٹ گیا۔ غرض کہ
انسانی زندگی تغیرات کا مجموعہ ہے اور اس کی بدھنیں یہ ہے کہ کسی فیصلہ کے بعد
یہ نہیں کہہ پاتا کہ یہی تغیر صحیح ہے اور اس کے پہلے کے جملہ قوانین و قواعد
غلط تھے۔

الہی نظام اور دنیاوی دستور میں یہی مسرت ہے کہ دنیاوی نظام حالات کو
دیکھ کر بدلتا ہے اور الہی نظام ایک محدود وقت کے لئے معین ہوتا ہے اس میں تجربہ
کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ دنیا اپنے فیصلہ کو تجربہ کا نام دیتی ہے
اور اسلام اپنے فیصلہ کو شریعت کا نام دیتا ہے۔ دنیا کے لئے یہ ممکن ہے کہ نئے تجربہ
کے بعد پھر پرانے تجربہ کی طرف پلٹ جائے لیکن اسلام کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ
شریعت آنے کے بعد تجربہ پھر پرانے شریعت کی طرف پلٹا دے اور اسی کو اولیٰ د
النسب ثابت کر دے۔ یہاں نظام میں اتنی جھنجکی اور اصول میں اتنی درستگی ہے
کہ پرانی شریعت کا نائنہ ہزاروں سال بھی زندہ رہے تو نئے شریعت کے
دارت کی امتداد ہی کرنے کا اس کا امام نہیں ہو سکتا، مصلحتوں۔

انسان نے دین الہی کو چھوڑ کر یہ بدھنیں اپنے ذہنی کو اپنا نظام حیات
خود میں کرے اور مسلمان کی کل خوش قسمتی یہی ہے کہ اس نے اس بارگاہ کو
اپنے ذمہ نہیں رکھا، بلکہ اپنے مالک کے حوالے کر دیا ہے۔ اسے یہ سوچنا ہی نہیں ہر کہ
ہمارے لئے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب، اس کی یہ ذمہ داری ہی نہیں ہر
کہ ہمارے حق میں کیا اولیٰ ہے اور کیا غیر اولیٰ۔ ہمارا کام نقطہ یہ ہے کہ ہم یہ
دریافت کریں کہ ہمارے لئے کیا نظام بنا ہے اور ہمیں کس قانون پر عمل کرنا ہے
یہ اور بات ہے کہ یہ خوش نصیبی کبھی انھیں مسلمانوں کا حصہ ہے جنھوں نے یہ کاروبار
بروردگار کے حوالے کیا ہے اور دین الہی میں اپنی دخل اندازی کو جائز نہیں سمجھا اور نہ
ان مسلمانوں اور کافروں میں کوئی مسرت نہیں ہے جنھوں نے دین الہی کو کبھی اپنے
خواہشات کا کھلنا بنا دیا ہے اور کمال بے شرمی سے اس اعلان پر غرور کیا ہر کہ
ہم نے حلال محمد کو حرام بنا دیا ہے اور حرام محمد کو حلال بنا دیا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں

کہ یہ حلال و حرام محمد کے منی ہی نہیں سمجھے اور ان کا ہی خیال تھا کہ اس طرح اختلاف
صفت و صفو سرور کائنات سے ہوگا ورنہ روح اسلام سے باخبر ہوتے تو انہیں یہ انداز
ہوتا کہ یہ بظاہر در دگار سے ہے اور پروردگار کا باطنی دائرہ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔

مالک کائنات کے اس کرم کا احساس اور بھی شدید تر ہو جاتا ہے جب مصنف
نہماں کی کمزوری پر نگاہ جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے قانون کا بار اس
ضیف و ناتوان مخلوق پر نہیں رکھا ورنہ جب وہ قدیم کے ترقی یافتہ مردوں نے اپنی قانون
سازی سے انسانیت کو یوں تباہ و برباد کر دیا ہے تو اگر یہ کام جذبات و خواہشات
کی محبت و عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو کائنات کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور روئے زمین
پر کسی اور ہی قسم کے افکار آباد ہوتے۔ یہ مالک کا کرم تھا کہ اس نے مردوں کی طرح عورتوں
کی ہدایت کی ذمہ داری بھی اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی ہے اور اس حسری و دور میں جب
آفرین شریعت آہی تھی تو پاسہاں شریعت بنا کر ایک ایسی خاتون کو بھیج دیا
جس کا کردار صحیح قیامت تک عورتوں کے لئے مشعل راہ بنا رہے گا اور جسے دیکھ کر
دنیا کی ساری خواتین اپنی زندگی کے احوال مرتب کرتی رہیں گی۔ اس کے کردار میں
کوئی نقص نہ ہوگا، اس کی زندگی میں کوئی کمزوری نہ ہوگی، آیت تطہینہ اس کی
طہارت کی ضمانت لے گی، آیت مباہلہ اس کی صداقت کا اعلان کرے گی، آیت بوقت
اس کی قیمت و قدرت کا اظہار کرے گی۔ مژدہ دہر اس کی سمدت کا تعین پڑھے گا
گھر میں ہے گی تو ملک پاسہاں کے لئے آئیں گے، عورتیں خدمت کے لئے
آئیں گی، رفوان درزی بن کے آئے گا، دھڑ سجدہ کرنا نظر آئے گا، جرتی جولا بولا
آئیں گے، سیکا میل بھی بیٹھنے آئیں گے۔ اور گھر سے باہر میدان مباہلہ میں نکلے
گی تو بخت سینہ سپر بن جائے گا اور امانت پشت پناہی کا فریضہ

انجام دے گی صلوات۔

مفسر کا وہ انداز کہ گویا رسول بول رہے ہیں، دنیا کا وہ انداز ہے کہ باب
سے ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، کرم کا وہ عالم کہ ماں کی روح خوش ہو جائے، ابتلا
کی وہ کیفیت کہ دین خدا شرمندہ احسان ہو جائے اور مردوں کی ہدایت کے لئے
نیر و آئیں تو عورتوں کے لئے ایک ہی خاتون قیامت تک کے لئے کافی ہو جائے۔
اور جب تنہا پڑی صفت کی ہدایت کی ذمہ داری ہو اور تیرہ مردوں کا فرض
اکیلے ادا کرے تو ہر ایک کا انداز بھی ہونا چاہیے۔ اور ہر ایک کے جلال و جلال کا
پر تو بھی ہونا چاہیے، اخلق میں رسالت کا انداز ہو، ہمت و استقلال علم عالم
صبر و شجاعت میں امامت کی شان نظر آئے، بولے تو علی معلوم ہو، چپ رہے
تو حسن کا انداز پیدا ہوا، اٹھ جائے تو حسینؑ کو وار ہو، صبر کرے تو زین العابدینؑ کا علم
نظر آئے، علم میں محمد باقرؑ کی شان ہو، صدق میں جعفر صادقؑ کا انداز ہو، قوت و شجاعت
میں موسیٰ کاظمؑ کا رنگ ہو، تسلیم و رضا میں علی رضاؑ کا انداز ہو، تقویٰ میں جیسا ہو، طہارت
میں جیسی ہو، جلال و غضب میں عسکریت پائی جاتی ہو، ارشاد و ہدایت میں مہدیؑ
کا انداز ہو۔

فاطمہ زہراؑ صلوات اللہ علیہا کی زندگی ایک ایسی ہی زندگی ہے،
آپ کی ذات گرامی بیٹی ہونے کے رشتہ سے وارث رسولؐ ہے، رفیق زندگی ہونے کے
اعتبار سے شریک امامت ہے، اور ام المومنین ہونے کے لحاظ سے ہر امام کے کمال و
جمال کی آئینہ دار ہے، جو کچھ گیارہ اماموں کے کردار سے کل ظاہر ہو رہا ہے
اس کا پر تو مضمونہ عالم کی زندگی میں آج ہی پایا جا رہا ہے اور شاید ہی راز تھا کہ
پروردگار نے بھی کساء کے نیچے زہراؑ کا تعارف کرایا تو سارے فرشتوں کا مرکز

بنادیا، اور اولاد کی منزل میں "بنوہا" جمع کا صیغہ استعمال کر دیا تاکہ زہراؑ جملہ اوصاف و کمالات کی مصدر و مرکز قرار پا جائیں۔

ایک مختصر لفظوں میں اسی معنیہ کو یونین کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالنا ہے، اور یہ دیکھنا ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ کی ذاتی شخصیت کیسا ہے اور آپ کی خدمات دین و دنیا قوم و ملت اور دینائے اسلام و ایمان میں کیا ہیں؟

زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ بخت کے پانچویں سال اس دنیا میں تشریف لائیں، تقریباً دس برس کی عمر تھی کہ حیاتِ پیغمبر اسلام ایک تازہ ترین مصیبت سے سے دوچار ہوئی، آپ کو پریشان کرنے، آپ کی راہ میں کانٹے بچانے والے آپ کے سر پر کر پڑا پھینکنے والے مشرکین نے برے کیا کہ آپ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ جب تک سامع ہے آپ کا رشتہ منقطع نہ ہو جائے گا آپ کے تسلیاتی اثرات کو روکنا ممکن نہیں ہے، آپ کا مذہب روز بروز بھلنا جا رہا ہے اور آپ کے کردار کی روشنی دلوں میں گھر کرتی جا رہی ہے۔ بائیکاٹ کا منصوبہ بنا جناب ابو طالب پورے خاندان کو لے کر ایک غار میں چلے گئے تین سال تک "مقاط" برقرار رہا۔ اور بنی ہاشم درخت کے پتے چبانے رہے، نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرد، نہ کوئی ان کے ہاتھ سامان پہنچنے والا تھا نہ ان کے حال زار پر رحم کھانے والا۔ بالآخر کفار کو خود اپنے مظالم کا احساس ہوا اور بندش توڑی گئی۔ اب باب و انش خود پہچان سکتے ہیں کہ بنی ہاشم کا صبر و استقلال کیا تھا؟ جہاں ظالم ظلم کرنے سے تھک گیا، مظلوم ظلم برداشت کرنے سے عاجز نہیں ہوا۔ اس بندش کی روشنی میں صفین کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے اور کہ ہاں کبھی ظلم، جبر و تشدد ہی سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور مظلوم صبر و استقلال ہی سے مقابلہ کرتا ہے، تاریخ نے صاف واضح کر دیا کہ کفار و مشرکین کے در و دار شام کے حکام میں

اور محمد مصطفیٰ کے وارث علی بن ابی طالب اور حسین بن علی ہیں۔

پانچ سال کی عمر تھی جب یہ محاصرہ ٹوٹا، لیکن چند دنوں کے بعد ایک تازہ مصیبت آگئی کہ اُدھر جناب ابو طالب کا انتقال ہوا اور ادھر ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کبھی میں قیدی اور تنہائی کا صدمہ کہتا ہوں کہ یہ زہراؑ کی دل جانتا ہے، لیکن خدار رکھے ابھی باپ زندہ تھا، تھوڑے عرصہ کے بعد حکم ہجرت آیا اور فاطمہؑ آٹھ برس کی عمر میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آگئیں۔ نو برس کی عمر میں مولائے کائنات سے عقد ہوا، دس برس کی عمر میں امام حسنؑ کی ولادت ہوئی، دوسرے سال امام حسینؑ پیدا ہوئے، ایک سال کے بعد زینبؑ کی ولادت ہوئی اور اس کے دو سال کے بعد جناب ام کلثومؑ پیدا ہوئیں۔ اٹھارہ سال تک ادبِ شکم اقدس میں محنت کی شہادت داتے ہوئی اور صدیقہ طاہرہؑ امت کے مظالم کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

اٹھارہ سال کی مختصر عمر اور اس میں مصائب کی یہ کثرت کو خود اپنے حال کا شریبِ پڑھا۔ محمدؐ پر اتنے مصائب ڈالے گئے کہ اگر دن پر پڑتے تو راتوں کی طرح تاریک ہو جاتے۔ لیکن کیا کہنا بخت رسولؐ کے صبر و استقلال کا کہ نہ ذاتی ادھان و کمالات میں کوئی فرق آیا نہ خدمتِ مذہب و ملت سے انحراف منہر مایا قوم سستائی رہی اور سچہ ہدایت کی دعائیں دیتی رہیں۔ دنیا گھر جلاتی رہی اور فاطمہؑ فریقِ تسلیں ادا کرتی رہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ نہ اس شان کا باپ دیکھا کر نہ اس شان کی بیٹی، نہ اس کردار کا شہرہ دیکھا ہے نہ اس عظمت کی زد و جد، نہ اس جلالت کے بچے دیکھے ہیں نہ اس رفعت و منزلت کی ماں، رشتہوں کے ساتھ فضیلتیں سپردہ کے گھر کا طواف کر رہی تھیں اور نسبتوں کے ساتھ عظمتیں فاطمہؑ کی

ڈیوڑھی پر خمیر ڈالے ہوئے ہیں۔

ذاتی فضائل کا یہ عالم تھا کہ مصلائے عبادت پر آگئیں تو دنیا اور عبادت سے منور ہو گئیں صبح کے وقت ایک نور سا طبع ہوتا، ظہر کے وقت دوسرا نور اور مغرب کے چمکنا تیسرا نور۔ دینہ نور نہ ہر سے منور ہو جاتا اور فضیلت آواز دیتی۔ نمازیں پڑھ کر خود مقرب بارگاہ بن جانا امت کا کام ہے اور نماز سے کائنات کو منور کر دینا بہت رسول کی منزل ہے مصلحت،

مسادات و مراسلات کا یہ عالم تھا کہ گھر کا کام ایک دن فتنہ انجام دیتی تھیں اور ایک دن خود بنفس نفیس یعنی خانہ نہ ہر میں ایک دن وہ بھی آتا جب کائنات کی خیر نرا دی گھر کی خدمت کرتی تھی اور نفع سکون سے بیٹھتی تھی۔ دنیا کا کوئی انسان منور ہو سکتا ہے کہ کوئی خیر نرا دی اپنی خادمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ یا نہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ انوار یا علی میں دیکھا ہے یا ہر میں۔ وہاں خیر نرا یا لباس پہنے اور خود بوسیدہ روا اور ٹھیں اور یہاں نفع آرام کرے اور خود گھر کی خدمت کرے۔ کیا ایسا ماحول بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غلام و آقا کی تفریق کی جائے؟ اور کیا ایسا مولا پا کر بھی کوئی غلام دکنیز و آقا سے جدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اور خدا گواہ ہے ہم نے بھی اسی کرم کو دیکھ کر غلامی کا دم بھرا ہے، اور ہمیں اعتماد ہے کہ ہم دنیا میں اپنی بنفسی کی بنا پر غافل ہو جائیں تو ہر جائیں لیکن وہ قیامت کے دن اپنے کرم سے غافل نہ ہوں گے، جب ان کا دامن ہاتھ میں ہے تو جنت بھی اپنی ہے اور کوثر بھی اپنا ہے، خدا بھی اپنا ہے اور رکول بھی اپنا ہے، اسلام بھی اپنا ہے، ایمان بھی اپنا ہے، کعبہ بھی اپنا ہے تو ان بھی اپنا ہے اور نصرت یہ ہے کہ ہم ان کے ہو گئے تو مکمل کائنات

اپنا ہے مصلحت،

کر دار کی بلند ہی کو دیکھا تو یہ عالم نظر آیا کہ رسول عظیم نابینا صال کے ہر ہر بیٹی کے گھر آئے ہیں۔ دروازہ پر رک کر اجازت مانگتے ہیں بیٹی نے عرض کی، بابا! یہ گھر آپ کا گھر ہے اور یہ سیدہ آپ کی خادمہ ہے، اجازت کا کیا سوال ہے؟

رسول عظیم نے پھر اجازت مانگی، سیدہ نے عرض کی، بابا! یہ آپ کا فرما ہے میں؟ یہ گھر آپ کا گھر ہے، فرمایا۔ بیٹی! مسکراتے ہوئے ایک نابینا صحابی بھی ہے۔ عرض کی، بابا! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرے پاس ایک خادمہ ہے سر جھپاتی ہوں تو ہیر کھل جاتے ہیں، ہیر دل کو ڈھکا لگتی، ہوں تو سر کھل جاتا ہے کیسے اجازت دوں؟

جی چاہتا ہے عرض کروں، ابی بی! وہ صحابی نابینا ہے، آجائے دیکھئے۔! سیدہ فرمائی گی، صحابی نابینا ہے میں تو نابینا نہیں ہوں! میں یہ پسند نہیں کرتی کہ میری نگاہ نا محرم کے چہرے پر پڑے اور اسی حقیقت کا اعلان اس وقت کیا تھا جب تکبیر اسلام نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے کیا ہے؟ اور لوگ جواب کی منزل میں لباس، تلوید، اکراشس، اسٹش کے بارے میں سوچ رہے تھے اور مولائے کائنات بیت الفرقین میں آئے تھے تو سیدہ نے عرض کی تھی یا ابا الحسن بابا سے کہہ دیجئے کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے یہ ہے کہ اس کی نگاہ نا محرم پر پڑے اور نہ نا محرم کی نگاہ اس پر پڑے۔ اور پیغمبر نے یہ جواب سن کر بیٹی کو گلے سے لگا لیا تھا۔ بے شک رسول کی بیٹی کا کردار ایسا ہی ہونا چاہئے۔ میں کہوں گا خیر نرا دی! آپ کے بلند کردار

کے قریب لیکن بی بی! آپ تو مصومہ ہیں، آپ کے یہاں یہ امکان کہاں ہے کہ آپ کی نگاہ کسی نا محرم پر پڑ جائے، آپ نابینا صحابی کو آجانے دیجئے! عجیب نہیں غیب زادی فرمائیں۔ بیشک میرا کردار ایسا ہی ہے، لیکن میں امت کے لئے ایک درس ہدایت اور نمونہ عمل فراہم کر رہی ہوں اور دنیا کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ جو اس منسزل کو دیکھ کر سوچ بھی نہ سکیں وہ تم ہو اور جو اس منسزل کو در پر فائز ہو وہ نبی کی بیٹی خاتمہ زہرا ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے کہ مجھ ترمذی کی روایت کے مطابق اس انداز سے ایک مرتبہ رسول اکرمؐ اپنی ایک زوجہ کے گھرائے تھے اور جب زوجہ نے بحال مسرت داخلہ کی اجازت دیدی تھی تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرا ساتھ میرا ایک نابینا صحابی بھی ہے، تو زوجہ نے کہا تھا، کوئی معنائق نہیں ہے وہ تو نابینا ہے۔

مجھے کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے، واقعات و دوازل آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں، اب اگر کردار کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ بیٹی مصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ بابا! وہ نابینا ہے، میں تو نابینا نہیں ہوں، اور نہ زوجہ غیبہ مصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ کوئی معنائق نہیں ہے۔ یعنی جس منسزل عصمت پر رسولؐ کی دختر فائز تھی، وہ منزل عصمت زوجہ کے تصور میں بھی نہیں تھی، اور دنیا جانتی ہے کہ عمل ہمیشہ تصور متعلق کے عین ہوتا ہے، جس کا تصور ہی ذہن میں نہیں ہے، اس پر اس عمل کیوں کر ممکن ہے؟ دختر غیبہ آزاد دے رہی ہے۔ مسلمانو! اب دیکھ کر دارالکین بن رہی کہ پہلا نوکر میں جس منسزل عصمت پر فائز ہوں نہاں

دنیا کی خواتین کا ذہن بھی نہیں پہنچ سکتا، کتنی گہری سادہ سادہ ہے زوجہ اور شہر ہر کے کردار میں۔ زوجہ کا اعلان ہے کہ جہاں میری منزل ہے وہاں تک کسی عورت کا ذہن نہیں پہنچ سکتا، شہر ہر کا اعلان ہے کہ جہاں میری منزل ہے وہاں تک کسی کا طاؤدہم و خیال پرواز نہیں کر سکتا۔ مصلوات۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ خواتین کا کیا ذکر ہے، خاتمہ اس منزل کمال پر ہیں جہاں منزل عظم فرماتے ہیں کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی زہراؑ کا کوئی پسر نہ ہوتا، نہ آدم اور نہ غیر آدم، اور جب اللہ کے مصمم انبیاء زہراؑ کا مقابلہ کر سکے تو امت کے گھنگارہ افراد کیا مقابلہ کریں گے اور جس کی زوجہ کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا اس علیؑ سے کوئی کیا مقابلہ کرے گا۔ مصلوات،

قدرت کو یہی ادائیں اور یہی ذمہ دارانہ انداز پسند آیا کہ زہراؑ کی ہر خاطر کا خیال زمین سے آسمان تک رکھا گیا۔

عید کے موقع پر بچے بچل گئے، اور ماں نے کہہ دیا کہ بچو! سو جانی تمہارے کپڑے درزی کے یہاں ہیں۔ اور بچے برا طیمان سو گئے، ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ کس نے آواز دی: بچو! کپڑے لے جاؤ۔ پرچا گیا کون۔؟ آنے والے نے جواب دیا: میں حنین کا درزی ہوں بچوں کیلئے کپڑے لیکر آیا ہوں۔

آپؐ نے پہچاننا یہ کون تھا۔؟ یہ رضوان جنت تھا جو حنین کا درزی ہنر کیا تھا، اور بچوں کے لئے جنت سے کپڑے لایا تھا۔ میں کہوں گا رضوان! تو نے اچھا کیا کہ کپڑے لے آیا، زہراؑ کی بات بھی رہ گئی اور بچوں کی عید کا سامان بھی ہو گیا، لیکن رضوان تیری عصمت خطرے میں پڑ گئی، مصوم جوڑ نہیں لٹا اور تو فرشتہ ہو کر اپنے کو درزی کہہ رہا ہے۔ اللہ نے تجھے رضوان جنت بنا لیا ہے تجھے

اپنے کو فرمان کہنا چاہئے تھا، اس طرح تیری عصمت بھی محفوظ رہتی اور نہ ہر اک کا
 دُعا بھی دہالا ہو جانا کہ رضوان جنت کپڑے لے کر آیا ہے لیکن جب تو نے
 اپنی حقیقت ظاہر نہیں کی تو ممکن ہے کہ ایں دنیا ہی سوچیں کہ کس درزی کے یہاں
 کپڑے رہے ہوں گے اور وہیں لایا ہوگا۔ رضوان آواز دے گا۔ یہ سب صحیح ہے لیکن
 میں اپنی حیثیت تم سے بہتر جانتا ہوں، تم کیا جانتے ہو کہ میں بھی اپنا حشر فطرس
 جیس کر لوں گا۔ یاد رکھو کہ میں انسان نہیں ہوں کہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاؤں میں
 فرشتہ ہوں، اپنی مسئلہ خوب پہچانتا ہوں، میں رضوان جنت ہوں بیشک
 رضوان جنت ہوں اور میری منزل بہت بلند ہے لیکن کاش تم نے یہ بھی
 سوچا ہوتا کہ رضوان جنت باشندوں کے لئے اہمیت رکھتا ہے سرداروں
 کے لئے ایک خادم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حسنین جنت کے سردار ہیں انکے
 مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے، میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا
 بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے اور تمہیں کھادیا ہے کہ رضوان جنت کھائے
 سائے آتا ہے اور رضوان ہوتا ہے اور حسنین کی بارگاہ میں جانا ہے
 تو وہ دنیا بن جاتا ہے۔

عزیزان محرم! یہ ہے جناب سیدہ کی عظمت اور یہ ہے فاطمہ زہراؑ
 کے بیان کی اہمیت کہ اگر بچوں کی تسکین کے لئے بھی کوئی فقرہ کہہ دیں تو جنت
 کھینچ کر روئے زمین پر آ جائے۔ اب کون اس زہراؑ کی عظمت کو پہچانے جسکے دہ کی
 یہ بلند ہی ہے کہ سلام کرنے کے لئے جی آتے ہیں، کپڑے دینے کے
 لئے، رضوان آتا، خدمت کرنے کے لئے جبریل آتا ہے اور سجدہ
 کرنے کے لئے ستارہ زہراؑ آتا ہے۔

معصومہ عالم کی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد رکھو کہ مولائے کائنات کے خد
 اصرار پر آپ نے ایک انار کی فرمائش کی..... اور مولائے انار لے کر چلے تو راستہ میں ایک
 غریب مریض کو دیکھا، اس نے انار کھانے کی فرمائش کی اور اپنے انار سے کھلادیا،
 اور گھر کی طرف اس عالم میں چلے کہ سر جھکا ہوا ہے، بنت رسولؐ نے مسکرا کر اصرار پر
 ایک سیدہ مالش کی تھی اور میں اسے پُورانہ کر سکا، بلکہ یہ کہ کون فرد تھا کہ سیدہ واقعہ
 کو نہیں گئی تو خوش ہو گئی، سیدہ کا مزاج خود بھی یہی ہے۔ بنت رسولؐ کا تہہ یہ عالم ہے کہ
 باپ کے گھر سے شادی میں ایک لباس ملا تھا اور جب خوب عروسی کس سائل نے اگر رسولؐ
 کر لیا تو وہ لباس بھی اٹھا کر دیدیا، بھلا سیدہ کے ناما من ہونے کا کیا سوال ہے اور
 یہاں شکوہ کی کیا گنجائش ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ میں تو بنت رسولؐ کی فرمائش کو
 پُورانہ کر سکا۔ میں تو انار نہ لاسکا۔ یہ سوچتے ہوئے دیر سیدہ کی طرف چلے، ادھر
 جب میں امین طبع انار لیکر بنسیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، اے معصومہ! سائل
 کے آنے سے پہلے یہ انار سیدہ کے گھر تک پہنچا دیتے، ابھی بیٹی نے فرمائش
 کی تھی، علیؑ نے انار سائل کے حوالے کر دیا۔ پیغمبرؐ نے انار سلمان کے حوالے کئے، سلمان
 دیر سیدہ پر لائے، معصومہ عالم نے پوچھا: سلمان! یہ انار کہاں سے لائے؟ عرض کیا۔
 آپ کے بابا نے بھیجے ہیں۔ فرمایا: بابا نے کیوں بھیجے ہیں؟ عرض کیا: جبریل امین لائے
 ہیں۔ آپ نے مولائے کائنات سے فرمائش کی تھی، انھوں نے انار لیا لیکن غریب سائل
 کے حوالے کر دیا، اللہ نے اس کے صلے میں یہ انار بھیجے ہیں کہ آپ کو انار بھی مل جائے
 اور علیؑ کی بات بھی رہ جائے۔ صلوات،

معصومہ عالم کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے، ادھر مولائے کائنات بیت الشرف
 میں داخل ہوئے، سر جھکائے ہوئے، فرمایا: بنت رسولؐ! یہ انار کی خوشبو کہاں کو

آ رہا ہے۔؟ عرض کی۔ ابا الحسن! یہ آپ ہی نے تو بھیجے ہیں۔ آپ نے ان رسائل کے حوالے کر دیئے اور پروردگار نے جنت سے انار بھیج دیئے۔ اللہ رے! خلاص علی، جو عمل کیا وہ خدا کو پسند آیا، جو اختیار کیا وہ راہ خدا میں مقبول ہوا، انگوٹھی دی تو آیت آگئی، انار دیا تو طبق جنت آگیا، روٹیاں دیں تو سورہ ہل ائی آگیا مال دیا تو انفاق و ایثار کا قصیدہ پڑھا گیا اور جان دی تو مرضی پروردگار کا سودا کر لیا مسرات۔

مصفوفہ عالم کی حیات میں ایسے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں جن آپ کی عظمت کو دربار پر روشنی پڑتی ہے لیکن تمام واقعات کا بیان کرنا مقصود نہیں، مثمر خدمات کے سلسلے میں چند فقرے عرض کر کے بیان کو آخری منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

دنیا یہ سوچتی ہے کہ ایک عورت کسی مذہب کی کیا خدمت کر سکتی ہے اور اس کے امکان ہی میں کیا ہے۔؟ پھر عورت بھی اگر سیدہ عالمہ جیسی خاتون ہو کہ گھر سے باہر قدم نکالنا ممکن نہ ہو، قوم و ملت کی خدمت کے لئے میدان عمل میں آسما پڑتا ہے، گھر میں رہ کر کوئی خدمت نہیں کی جاسکتی لیکن ارباب کرم! مصفوفہ عالمہ نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ ایک عورت اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کبھی بہت کچھ خدمت انجام دے سکتی ہے عورت کا کام میرا بازو گھومنا نہیں ہے، عورت کا کام خدمتِ خانہ ہے اس کا میدان محل گھر کی چار دیواری ہے۔ ایک عورت اپنی تربیت سے صالحہ نسل پیدا کر دے تو وہ ان لاکھوں عورتوں سے بہتر ہے جو خود میدانِ عمل میں رہتی ہیں اور بچوں کی تربیت سے یوں غافل ہو جاتی ہیں کہ

جتنا انھوں نے بنایا ہے سب اولاد نے تباہ کر دیا ہے، سیدہ عالمہ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں نے گھر کے اندر رہ کر وہ نسل کائنات کے حوالے کی ہے جس کا کوئی جواب آفت تک نہیں پہنچا ہو سکا، میرے بچے معصوم اور امام تھے تو وہ بھی جان کائنات تھے، اور غصیدہ معصوم تھے تو وہ بھی روج عالم تھے، کہا تم نے نہیں دیکھا کہ میرے معصوم بیٹے نے دین کو بھال لیا تو میری نورِ نظر زینب نے میرے فرزند کے مقصد کا تحفظ کیا، میری صالح اور صحت مند تربیت نہ ہوئی تو جو بوم مصائب میں میری بیٹی بھی ہوش کو مٹھتی لیکن یہ میری آغوش کا اثر تھا کہ مصائب بڑھنے لگے اور زینب کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میری خدمات کا جائزہ لینا ہے تو دیکھو کہ میری ماں عرب کی سب سے بڑی مالدار خاتون تھی اور میں نے زندگی بھر فاقے کئے، ہم نے امت کی پردوش کو فردی سمجھا ہے اور اپنے لئے فاقے ہی مناسب سمجھے ہیں۔

مال کے انتقال کے بعد تنہی کا صدمہ سہا لیکن مدبرِ استقلال میں فرق نہیں آیا اور باپ کی بوں خدمت کی کہ بابا نے مجھے اپنی ماں کہہ کر بچا، ناشر و کار دیا، یعنی میرے باپ کو بیٹی کی محبت ملی ہے تو مجھ سے اذان کی الفت ملی ہے تو مجھ کو میں بیک وقت آمنہ بھی ہوں اور فاطمہ بھی اس رشتے کو تم نہ سمجھو گے اسے رسولِ عظیم سمجھتے ہیں تم تو ابوطالب اور بنتِ اسد ہی کا احسان نہ کچھ سکے تو میرا احسان کیا سمجھو گے۔

بابا نے ہجرت فرمائی تو میں اسی گھر میں رہی جہیں علی آرام فرما رہے تھے، یہ بڑا کوئی معمولی ایثار نہ تھا کہ کسی کے عالم میں میں نے کوئی فرما دیا نہیں کی، گھر گھرا ہوا تلوار بن چکی تھی، نیزے چمکے رہے اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ گھر میں بیٹھی میری منزل کو یوں پہنچاؤ کہ تصورِ ظلم کیا میں مظالم کو دیکھ کر کبھی نہیں گھرائی، مسیبرا

میں سکون اس منزل پر ہے کہ جہاں بڑے بڑے انسان خیم سے ڈر کر رو دیا کرتے ہیں وہاں میں نفس مطمئن کا انہماک کرتی ہوں۔

ویدہ اکرم عقد ہوا تو زندگی بھر شہر سے کوئی فرمائش نہیں کی اور دنیا کی خواہش کو بتا دیا کہ شہر سے فرمائش کرنا عورت کی کمزوری ہے اس کا کمال نہیں ہے اور ساتھ ساتھ مردوں کو بھی سکھا دیا کہ میرے شہر کی طرح گھر کا خیال رکھو، تاکہ زوجہ کو فرمائش کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

اُحد کا میدان آیا، میرا باپ زخمی ہو گیا، سارے مسلمان ساتھ جھوڑ کر چلے گئے لیکن باپ کی خدمت کے لئے میں پہنچ گئی اور میں نے زخم کی مرہم پٹی کی، کلو سب نے پڑھا تھا لیکن کام میرا ہی گھرا آ گیا۔ میدان میں دفاع میرے شہر نے کیا اور گھر میں باپ کا علاج میں نے کیا۔

مباہلہ کے میدان میں عزت اسلام بچانے کے لئے میں ہی اپنے باپ، شوہر اور بچوں کے ساتھ گئی تھی، اسلام میں ہزاروں خواتین تھیں، خود میرے باپ کے گھر میں متعدد داڑی تھیں اور ایک سے ایک باکمال اور صاحب فضا تھیں لیکن اسلام کے وقت پر میرے علاوہ کوئی کام نہیں آیا۔ وہ میں ہی تھی جو اس شان سے نکلی تھی کہ آگے آگے نبوت، پیچھے پیچھے امت اور درمیان میں عصمت بکری، منتظر دیکھنے والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ عصمت نبوت کے نقش قدم پر چل رہی ہے اور امت عصمت بکری کے قدم پر قدم جھائے ہوئے ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر بھی میں اپنے بابا کے ہمراہ تھی، اور میں نے وہ منظر دیکھا ہے جب میرے شہر کی ولایت کا اعلان ہو رہا تھا اور مسلمان اس ولایت پر مباہلہ کر رہے تھے اور اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے میں بابا کے انتقال

کے بعد بابا حکومت میں آئی تھیں اور میں نے اعلان کیا تھا کہ کل کے بیوت کرنے والے آج کے حاکم کس طرح بن گئے؟

میں نے ایک پوری صنف کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے، بیٹی کا برتاؤ ماں باپ کے ساتھ، زوجہ کا برتاؤ شوہر کے ساتھ، ماں کا برتاؤ بچوں کے ساتھ، عزیز کا برتاؤ عزیز کے ساتھ، یہ سارے حقائق میں نے سکھ کر دیا ہیں میں گے اور اس کی مثالیں زمریم کے کوردار میں ملیں گی نہ سارہ کے کوردار میں، زحاک کی زندگی میں ملیں گی نہ صاحبہ کی زندگی میں۔ اگر جب وہ پاکستانہ زندگیاں اتنی مثالوں کو پیش کرنے سے قاصر ہیں تو امت کی غیبت معصوم عورتوں کا کیا ذکر ہے؟

لیکن چاہئے والو! اس دینے سے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا، یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ابھی میرے بابا کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ میرے جگر پر قبضہ کر لیا گیا، میرے دروازے پر آگ اور کھڑیاں جمع کر دی گئیں اور مجھ سے کہا گیا کہ غنی کو باہر نکالو، ورنہ گھر میں آگ لگا دی جائے گی، میں کہتی رہی کہ اس گھر میں رسول کے چھوٹے چھوٹے ذرا سے حق وحیث بھی ہیں، لیکن جواب ملا کہ ہم سب کو جلا دیں گے اور بالآخر مجھ پر وہ ظلم ہوا کہ میرا نقش شبہ ہو گیا، میرا پہلو شکستہ ہو گیا، میری پسلیاں ٹوٹ گئیں، میں خاک ہو گئی۔ اب جو ہوش آیا تو میں نے اپنے وارث کے گلے میں رہی دیکھی۔

آواز دی: ابوالحسن کو چھوڑ دو، ورنہ سر کے بال پریشان کر دوں گی مسجد بنیبر کی دیواریں بلند ہوں گی، کائنات میں زلزلہ آگیا، لیکن خالوں پر

دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

میرزا دوا میں دبا دیا میں گئی تو مجھے جھٹکا لگا اور ریسے گواہوں کو رو کر دیا گیا، میں نے باپ کے بعد صرف ۵۰ دن زندگی گزاری ہے لیکن یہ ۵۰ دن میرے لئے ۵۰ سال بن گئے اور میں مصیبت پر پیچھے کر دعا کرتی تھی کہ پروردگار اب مجھے دنیا سے اٹھالے نہ ہرگز زندہ رہنے کو ہی نہیں چاہتا۔

میرزا دوا! ایک لمحہ کے لئے سر جو کوئی ماں اپنے گمن بچوں کو چھوڑ کر مرنا چاہتی ہے، کوئی خاتون اٹھارہ برس کی عسہ میں موت کی تمنا کرتی ہے۔ کوئی عورت اپنے وارث کو بحکم معاصی میں روتا چھوڑ کر جانا چاہتی ہے لیکن ہائے مجھ پر وہ وقت پڑ گیا تھا کہ میری زبان پر دوائے موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پروردگار میں اس امت کے لئے بددعا نہ کر دیں گی، میں اپنی ہی موت کی دعا کر رہی ہوں یہ آخر وہ وقت بھی آیا جب میری دعا قبول ہوئی اور میں نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بچوں کو ہنلا دھلا کر مسجد کی طرف بھیج دیا اور حجرہ عبادت میں جا کر مشغول بندگی پر درگاہ ہو گئی۔ میں نے اسما کرنا کید کر دی کہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ میں نے ابوالحسن سے وصیت کر دی کہ میرے گمن بچوں کا خیال رکھیں۔ میں دنیا سے رخصت ہوئی تو سارے حقوق ادا کر کے گئی اور کوئی حق اپنے لئے کوئی نہیں گئی۔

جی چاہتا ہے عرض کر دیں، ہاں شہزادی آپ نے جملہ حقوق ادا کر دیئے لیکن بی بی! ایک لمحہ کے لئے مڑ کر دیکھیے آپ کے بچوں پر کیا گزر رہی ہے آپ تو دنیا سے رخصت ہو گئیں، ذرا حسنین کی حالت تو دیکھئے، ذرا اپنی زینب و ام کلثوم کا مڑ پنا تو دیکھئے۔

میرزا دوا! نہ ہر سب کچھ دیکھ رہی تھیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب علی نے حسب وصیت غسل و کفن دے کر جنازہ تیار کیا اور بچوں کو آواز دی: بچو! آؤ ماں کا آخری دیدار کر لو۔ اور شہزادوں نے پائنتی کھڑے ہو کر ماں کو حسرت سے سلام کیا اور آواز دی: آؤ! ناں سے ملاقات ہو تو ہمارا سلام کہئے گا اور کہئے گا ہم تمہیں ہر گئے، ہم دنیا میں غریب ہو گئے۔ تو ایک مرتبہ بند کفن ٹوٹے، نہ ہر آگے ہاتھ بڑھے، بچوں کو گلے سے لگایا، آہے میرے بچو! میں مائے موجود ہوں اور تم غربت کا نام لے رہے ہو کچھ سے یہ کیسے برداشت ہو سکے گا۔ مولائے کائنات آگے بڑھے، بچوں کو لاش سے جدا کیا، سر پر دست شفقت پھیلا۔ میں کہوں گا: میرزا دوا! جب غیوں کو لاش سر جدا کیا جاتا ہے تو اتنی ہی شفقت و محبت سے جدا کیا جاتا ہے۔ مگر ہائے سیکین! باپ کی لاش، شمر کا نازیبا، بچی کا نوحہ، زین کرلا کا زلزلہ، زینب کی فریاد، کون تھا جو بچی کو تسکین دیتا، بھائی زنجیروں میں جکڑا ہوا، ماں میں بستہ، ہر طرف دشمنوں کا ہجوم ہر چار سمت نامحرموں کا مجمع، عجب نہیں لاش حسین کو جنبش ہوئی ہوا اور آواز آئی ہو۔ میری سیکین، میری لال، صبر کر بیٹی صبر۔

میرزا دوا! میں اپنا بیان تمام کر دینا لیکن ایک جملہ ادب کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کس سے کہوں اور کیوں کہ کہوں۔ آئیے مصوٰفہ عالم سے فریاد کریں، بی بی! آپسے حسین کی زبان سے غربت کا نام نہ سنا گیا، اب ذرا عصرِ غم کو بلا میں آئیے۔ ہائے وہ عصر کا ہنگام، وہ حسین کا آخری سجدہ، وہ شمر کا خجورہ زمین کا زلزلہ، وہ آسمان سے فرخ کی بارش، وہ تیز آندھیاں، وہ آفتاب کا گھٹن اور وہ بلندی سے ایک پہر کی فریاد۔ پھر سعد میرا سنایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اور ادا ہنگام میں وہ حسین کا اشارہ۔ زینب! داپس جاؤ، ابھی بھائی زندہ ہے، حسین

اپنے سامنے نہیں خیمے کے باہر نہ دیکھ سکے گا۔
 میں کہوں گا مولا! بہن کو آجانے دیجئے، ابھی زینب کے سر پر چادر ہے۔
 بہن، سہائی سے رخصت ہوئے، مولا! تھوڑی دیر کے بعد کیا ہوگا۔ جب آپ کا سر
 تن سے جدا ہو جائے گا، خیموں میں آگ لگے گی، سیدائیاں ایک خیمہ سے
 دوسرے خیمہ کی طرف اور آخر میں جلتے خیموں سے اس شان سے باہر نکلیں گی کہ
 سر کے بال بکھرائے ہوئے، منہ پر مٹائی مارنے والی ہوئی۔ **وَالْحَيَاةُ**
وَالْحَيَاةُ

وَاللَّيْلَةُ وَالنَّجْمُ وَالْجَوْنُ
 وَيَسْتَعْمِرُ الَّذِينَ ظَنُّوا أَنَّهُمْ مَقْلِبُونَ



امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

اسم مبارک	موسیٰ
لقب	کاظم
کنیت	ابو ابراہیم
والد ماجد	امام جعفر صادقؑ
والدہ ماجدہ	جناب حمیدہ
ولادت	۲۸ صفر ۱۴۸ھ مقام ابواء (مدینہ منورہ)
ازدواج	ایک
اولاد	فرزندان و دختران
شہادت	۲۵ رجب ۱۸۳ھ (جمعہ) بغداد
عمر مبارک	۵۵ سال
قبر مبارک	سقطین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا ابي القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين ولفتحنا الله
على اعدائهم اجمعين - اما بعد فقد قال الله الحكيم في كتابه الكريم -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَرَارَ لَنَا الْاُخْرَىٰ وَالْاُولَىٰ

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے۔ "ہم تک ہدایت کی ذمہ داری

ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے"

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ خدائے صادق الودع نے
ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور عمر دنیا کا کوئی موڑ یا نہیں آیا جہاں
ایک نہ ایک ہادی اور ایک نہ ایک راہنما مقرر کیا گیا ہو۔ یہ اہل دنیا کا ساری
ذہن تھا کہ انھوں نے کسی زمانے میں خدائی راہنما کا اتباع نہ کیا۔ اوپر دو میں
اپنی طرف سے ایک نہ ایک راہنما مقرر کرتے رہے۔ نتیجہ کیا ہوا۔ یہ تاریخ کی
نگاہوں کے سامنے ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ انھیں ہادیوں اور راہنماؤں کے
کردار سے اللہ والوں کے بلند کردار پر بھی روشنی پڑتی رہی۔ اور دنیا یہ کھتی
رہی کہ ادھر کے نمائندوں کا کیا حال ہے اور ادھر کے نمائندوں کا کیا
عالم ہے۔ ادھر جہالت کا کیا رنگ ہے اور ادھر علم کی کیا وسعت ہے۔
ادھر عاجزی اور ناتوانی کے کیا اعترافات ہیں۔ اور ادھر قدرت و اختیار
کے کیا مظاہرے ہیں۔ ادھر بد عملی اور بد سلوکی کے کیا انداز ہیں اور ادھر
حسن اخلاق اور کرم کے کیا سلیقے ہیں۔ اور حقیقت حال تو اس وقت
کھلتی تھی جب سلاطین دنیا رب سلطنت سمیت بورینیشیوں کی چوکت پر بیٹھے

کے کر آیا کرتے تھے اور آواز دیتے تھے کہ اب دین کا بچانا آپ کا کام ہے۔
اب عزت اسلام آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب آبرو دے ملت آپ کے قبضہ
میں ہے۔ اور اللہ والے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ مسائل حل کر کے آواز
دیتے تھے کہ تخت و تاج سنبھال لینا آسان ہے۔ دین کا سنبھالنا مشکل ہے۔
حکومت پر قبضہ کر لینا آسان ہے۔ مندر علم پر جلوہ گر ہونا مشکل ہے یا یوں کہا
جائے کہ خلیفہ بننا آسان ہے امام بننا مشکل ہے۔ فارغ ایران بننا آسان ہے
کلّ ایمان بننا مشکل ہے۔ امیر بننا آسان ہے جناب امیر بننا مشکل
ہے۔ ————— صلوات

تاریخ اسلام کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہو گا کہ اہل دنیا نے کیسے کیسے
افراد کو تخت حکومت پر جلوہ گر کیا ہے۔ اور اسلام کی باگ ڈور کیسے کیسے
ہاتھوں میں دی ہے کہ اگر ہر دور میں چند اللہ کے مخلص بندے اور قدرت
کے سچے نمائندے نہ ہوتے تو اسلام کب کا فنا ہو چکا ہوتا۔ اور دین خدا
نام لینے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ دین الہی کے ذمہ دار مصائب میں رہے۔ پریشان
میں رہے۔ قید و بند میں رہے۔ حالات کے شکنجوں میں رہے۔ گھر میں نظر بند
رہے۔ قید خانوں کی نذر رہے۔ آوارہ وطن رہے۔ غربت زدہ رہے۔ تشدد
گرستہ رہے۔ سرو پا بربند رہے۔ لیکن دین کے مشکلات میں بہر حال کام
آتے رہے۔ اور ہر ہوش مند بادشاہ دنیا کا یہی اصول رہا کہ انھیں پریشان
رکھو لیکن زندہ رکھو۔ حتی الامکان انھیں مرنے نہ دیا جائے۔

اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر حکومتیں اللہ والوں کی مخالف تھیں تو
دونوں کے درمیان شدید اختلافات تھے تو حکومتوں نے روز اول ہی ان
کی زندگیوں کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا اور انھیں زندہ کیوں رکھا جن ادا ہو

نے ایک ایک دن میں سیکڑوں اور ہزاروں کو تہ تیغ کرایا تھا۔ جنھوں نے اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زہر دینے سے تکلف نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اللہ والوں کو زندہ ہی کیوں رہنے دیا۔ یہ زندہ رکھنا دلیل ہے کہ تعاقب بہتر تھے اور آپس میں کوئی ایسا اختلاف نہیں تھا۔ لیکن اولاً تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ موت و حیات کسی کے بس میں نہیں ہے۔ کہ جب جس کا جی چاہے کسی کا خاتمہ کر دے۔ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اس کے پہلے انسان لاکھ گوشش کرے مجرم بن سکتا ہے فنا نہیں کر سکتا۔ موت سلاطین کے اختیار میں ہوتی تو موسیٰ قصر فرعون میں زندہ نہ رہتے۔ ابراہیم نرود کے سامنے نہ ہوتے۔ شدا و اپنی جنت سے محروم نہ رہتا۔ یہ واقعات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ موت انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور جب ان انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے جو خدائی کے دعویدار تھے تو ان کے اختیار میں کیا ہوگی جو آخر تک بندے ہی بنے رہے اور خدائی کا دعویٰ نہیں کر سکے۔ خود مولائے کائنات نے بھی بیچ البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے کسی فوج اور لشکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں میدان جہاد میں اپنے ایمان اور عقیدے کے بھر دے پر لڑتا ہوں۔ میرا اعتبار نصرت پروردگار پر ہوتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اگر میرا وقت نہیں آیا تو مجھے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ اور اگر وقت آگیا تو یہ فوجیں بچا بھی نہیں سکتیں۔ جب وقت معین سلیمان جیسے بادشاہ کو بچا سکا تو کسی اور کو کیا بچا سکے گا۔

بعینہ یہی انداز امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا تھا۔ جب آپ کو ہارون نے اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ خفیہ طور سے لوگوں سے بیعت لیتے ہیں اور اپنی امامت کی تبلیغ کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مجھے

علامہ بیعت سے کون سی چیز روکتی ہے کہ میں خفیہ بیعت لوں گا۔ ہارون نے جمل کر کہا کہ آپ کو بیعت لینے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ فرمایا کہ میرا حق زائل کس نے کر دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا حق تھا ہی کب کہ زائل کرنے کا سوال پیدا ہو یا آپ نے فرمایا کہ اگر میرا حق نہیں ہے تو تیرا بھی حق نہیں ہے۔ اس نے کہا میں بادشاہ وقت ہوں۔ میرا حق کیوں نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ میں بھی بادشاہ ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تو جسوں کا بادشاہ ہے اور میں دلوں کا بادشاہ ہوں۔

یہ منشا تھا کہ ہارون کو غیظ آگیا اور کہنے لگا کہ آپ کو مجھ پر کوئی فضیلت حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا وہی فضیلت جو جسم پر روح کو حاصل ہے۔ اس نے کہا خفیہ قربت کے اعتبار سے تو ہم اور آپ برابر ہی ہیں۔ دونوں خاندان رسول کی فرد ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بھی غلط ہے۔ روز قیامت تو رسول اللہ کو یابن الہم کہہ کر سلام کرے گا اور میں اپنا باپ کہہ کر خطاب کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اولاد کا مرتبہ اور ہوتا ہے اور خاندان والوں کا مرتبہ اور۔ صلوات

ہارون یسین کر بل گیا اور سوچنے لگا کہ یہ میرے مقابلے میں اپنے کو دلوں کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ کوئی تدبیر ہونا چاہیے کہ انھیں مرعوب کر دیا جائے۔ چنانچہ حج کے موقع پر مجمع عام میں چند مسائل پوچھے اور یہ کہا کہ اگر آپ ان کا صحیح جواب نہ دیں گے تو میں آپ کو صفاد مردہ کے درمیان قتل کرادوں گا۔ حضرت یسین کر خاموش ہو گئے۔ اور ہارون کے ایک غلام نے بڑھ کر سفارش کی امیر اسلم خدایں قتل حرام ہے۔ اس جوان کو معاف کر دے حضرت یسین کر مسکراتے گئے۔ فرمایا میں سوچتا ہوں کہ غلام اور حاکم میں

کون زیادہ احمق ہے۔ وہ جو قبل از وقت موت دینا چاہتا ہے یا وہ جو آئی ہوئی موت کو سفارش سے ماننا چاہتا ہے۔ یاد رکھو اگر میری موت آگئی تو سفارش سے مل نہیں سکتی۔ اور اگر نہیں آئی ہے تو اردن کے ارادہ سے آ نہیں سکتی۔

یہ انداز بعینہ مولائے کائنات سے ملتا جلتا ہے اور دنیا کو آواز دے رہا ہے کہ آل محمد کسی بھی مسئلہ پر رہیں گے کہ دار ایک رہے گا۔ انداز ایک رہے گا اور یاد رکھو کہ جس کا عقیدہ موت کے بارے میں صحیح نہیں ہوتا، وہ مصائب ڈال کر بھی پریشان رہتا ہے اور جس کا عقیدہ صحیح ہوتا ہے وہ مصائب برداشت کر کے بھی مسکراتا رہتا ہے۔ موت کے بارے میں بدعقیدہ انسان میدان جنگ سے فراء کرتا ہے۔ اور قضا و قدر الہی پر ایمان رکھنے والا حیدر کرار ہوتا ہے۔۔۔ صلوات

سلاطین دنیا اور نمائندگان پروردگار کی بات آگئی ہے تو ایک ہلکا سا خاکہ تاریخ اسلام کا بھی پیش کر دیا جائے تاکہ دنیا اندازہ کر لے کہ اللہ والوں کو چھوڑنے کے بعد دنیا والوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں کیسے کیسے لوگوں کو امت کا ذمہ دار اور دین کا ٹھیکیدار بنایا ہے اور ان کے کردار کو دیکھنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ والوں کا کردار کیا ہوتا ہے اور نمائندگان پروردگار کس جہد منزل کے حامل ہوتے ہیں۔

تذکرہ بہت طوالتی ہے اور ساری فہرست کے پیش کرنے کا عمل نہیں ہے۔ صرف چند افراد کے حالات کی طرف تسلسل کے ساتھ اشارہ کر دینا ہے۔ تسلسل کا آغاز مرسل اعظم کی حیات کے بعد ہی سے ہو جاتا ہے لیکن میں چند افراد کو نظر انداز کر دیتا ہوں کہ ان کے حالات تمام دنیا کو معلوم ہیں اور ہر صاحب عقل و نظر کو اندازہ ہے کہ سلطنتوں کے پاس کتنا علم کتنی بصیرت اور

کتنی دینی آنکھ ہی تھی۔ ارباب سلطنت نے خود اعلان کر دیا تھا کہ اگر علی نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ ان سلطنتوں کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اولیاء خدا کے خلاف ذہنوں کو اتنا تیز کر دیا اور مزاجوں میں اتنی جرأت پیدا کر دی کہ جبرائیل المؤمنینؑ کا دور حکومت آیا تو ام المؤمنینؑ بیسی خاتون بھی میدان جنگ میں آگئیں اور معاویہ جیسا فوسلم بھی علیؑ کا مد مقابل بن گیا۔ خوارج کی جراتیں تو معلوم ہی ہیں اور آخری نتیجہ یزید کی شکل میں برآمد ہوا جس نے تین سال کی حکومت میں ایک سال فرزند رسولؐ کو شہید کیا۔ دوسرے سال حرم رسولؐ کو لوٹا اور تیسرے سال خرم الہی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور امت کو اسکا گھر دیا کہ جب اسلام الہی نمائندوں سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کا آخری انجام یزید بن معاویہ ہوتا ہے۔

ارباب بعیت سر خود اندازہ کر لیں کہ یزید کس آغاز کے انجام کا نام ہے اور جب انجام ایسا ہے تو آغاز کیسار ہا ہو گا۔ صلوات

یزید کے بعد امت اسلامیہ میں اتنا خفقور پیدا ہو گیا تھا کہ جب اس کے بیٹے معاویہ بن یزید کو حکومت دی گئی تو اس سے سات لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ خلافت روز اول سے غصبی ہے اور مجھے غصبی مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن لوگوں نے خلافت کو لے کر عیش کیا ہے وہی پروردگار کی بارگاہ میں جواب بھی ہوں گے۔ میں جواب دہی کا ذمہ دار کیوں ہوں۔ یہ ہے واقعہ کہ بلا کا آخر کہ دنیا سمجھتی تھی کہ امام حسینؑ فنا ہو گئے۔ آل محمد کا نام مٹ گیا۔ دین الہی بنی ہاشم کا کھیل تماشیا بن گیا۔ لیکن امام حسینؑ نے آواز دی کہ تو سہی سرگنا کر بھی خلافت و حکومت کو اتنا سوا نہ کر دوں کہ بیٹا بھی باپ کی جگہ لینے کو تیار نہ ہو اور گھر کا راز گھر ہی سے کھلے۔ میں نہیں جانتا کہ یزید کا بیٹا تنائیک نیت تھا اور اس نے کس غلوں سے یہ اعلان کیا تھا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ شہادت امام حسینؑ اس

قدر پر اثر تھی کہ اس نے غیرت دار بیٹے کو باپ کی جگہ لینے سے انکار کرنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت پیام اعلیٰ نے کیا خوب کہا ہے۔

صدیوں میں جو اجماع تھی وہ تقویٰ بدل دی
فسلوں سے جو بگڑی تھی وہ تقدیر بدل دی
فرزند یزید اور خلافت سے ہو بیزار
تو نے اسوی خون کی تاثیر بدل دی
عسادی بن یزید کے بعد مروان بن الحکم حاکم بنا لیکن دس بیٹے سے زیادہ زندہ
نہ رہ سکا اور بالآخر اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ بھی قدرت کا
ایک انتقام تھا کہ ہماری راہ سے ہٹ کر اپنا انجام دیکھتے رہنا اور میرا تو جی
چاہتا ہے کہ میں دنیائے اسلام کو جیلج کروں اور یہ قضا کروں کہ کسی میں
سمت ہو تو میرے اس سوال کا جواب دے کہ تاریخ حکومت میں تو ایسے
واقعات بے شمار ہیں جہاں ایک حاکم کا خون دوسرے حاکم کی گردن پر ہے
اور ایک نے دوسرے کے قتل کی سازش کی ہے۔ کبھی خاندان کے خیم و
چراغ نے رئیس خاندان کو قتل کر لیا ہے کبھی گورنر نے بادشاہ کو قتل کر لیا
ہے۔ کبھی بھائی نے بھائی کو قتل کر لیا ہے کبھی بیٹے نے باپ کے قتل کا انتظام
کیا ہے۔ کبھی کوئی اور سازش قتل کی گئی ہے۔ لیکن کیا تاریخ امت میں
بھی کوئی واقعہ ایسا ہے کہ کسی امام نے دوسرے امام کے قتل کا منصوبہ بنایا ہو
یا ایک امام نے دوسرے امام کی شہادت میں حصہ لیا ہو جب کہ ایک ایک وقت
میں متعدد امام زندہ رہے ہیں اور ہر ایک کو معلوم تھا کہ ان کے بعد امامت
ہیں ملنے والی ہے۔ دنیا کا کوئی بادشاہ ہوتا تو جلد ہی حکومت حاصل کرنے
کی فکر کرتا لیکن اس تاریخ کا بے داغ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ معصوم
کردار اور ہوتا ہے اور غیر معصوم کردار اور — دنیا کے خدیوے اور سوتے
ہیں اور پروردگار کے نمائندے اور — قتل و خون ریزیاں کرتے

ہیں۔ ہادی اور راہنا نہیں کرتے۔ اور شاید ملائکہ نے اسی تاریخ کو کچھ میں رکھ
کر آواز دی تھی کہ پروردگار انسانوں میں تو ایسے بھی پیدا ہوں گے جو قتل و خون
کریں گے۔ اور قدرت نے واضح کر دیا تھا کہ میں اپنے منصب کا حال بہتر
جانتا ہوں۔ میں یہ منصب انھیں کو دے دوں گا۔ جن کے دامن کردار پر کوئی
دھبہ نہ ہوگا۔ قتل و خون سلاطین دنیا کا شعار ہے۔ ہمارے نمائندوں کا کردار
نہیں — صلوات۔

مروان کے بعد جن سلاطین نے امت اسلامیہ پر حکومت کی ہے ان کا
مختصر نقشہ یہ ہے۔

ششم سے ششم تک عبدالملک بن مروان کی حکومت رہی۔ شخص
حکومت سے پہلے بڑا نمازی اور عبادت گزار تھا۔ لیکن جس دن یہ خبر ملی کہ خلافت
آپ کے حصہ میں آگئی ہے۔ فوراً قرآن اٹھا کر بند کیا اور آواز دی "ھذا فراق"
یعنی وینیک "آں میرے اور تیرے درمیان جدائی ہو گئی۔ اب خلافت قبضہ
میں آگئی ہے۔ اب قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ اقبال کو اسی مقام پر
مرثیہ پڑھنا پڑا ہے۔

جنوں خلافت رشتہ از قرآن سبخت

حریت راز ہر اندر کام رنجت

جب خلافت نے قرآن سے اپنا رشتہ توڑ لیا تو حریت و آزادی کے
کام و دہن میں سوائے زہر کے کچھ نہ رہ گیا — میں عرض کروں گا حضرت
علامہ! ابھی کتنے دن گزرے ہیں جب خلافت نے عترت سے کنارہ کشی کی تھی
اتنی جلدی قرآن بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن و عترت میں
کتنا اتحاد ہے کہ جس سے عترت الگ ہو جاتی ہے۔ اس سے قرآن بھی الگ ہو جاتا

ہے — صلوات

اس بادشاہ کی امانیت و فرعونیت کا یہ عالم تھا کہ حجاز کی مسجدیں بھرے مجمع میں خطبہ دیا تھا کہ یاد رکھو — "نہ میں عثمان جیسا کمزور خلیفہ ہوں نہ عمر جیسا خوشامد پسند اور نہ یزید جیسا بیوقوف۔ میرے پاس ہر بات کا علاج تلواری ہے۔ اگر تم میں سے کوئی مجھ سے تقویٰ اور پرہیزگاری کی بات کرے گا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔"

دیکھا آپ نے حکومت کا مزاج۔ مندر رسولؐ اور گفتگوئے تقویٰ پر گردن زدنی۔ یہ مزاج کہاں سے آیا۔ اور کیوں کر پر دان پڑھا۔ اس کے واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس روضۃ الصفا کی اس روایت ہی نے سارا منہ صاف کر دیا ہے۔ اب اہل دانش کا فرض ہے کہ وہ فکر کریں کہ اسلام کہاں ہے اور حکومت کہاں ہے ؟

عبدالملک کے بعد ۳۶ھ میں ولید بن عبدالملک کا دور آیا۔ یہ انتہائی جاہل آدمی تھا۔ عربی سے قطعی نادان تھا۔ بیان میں ایسی غلطیاں کرتا تھا کہ سارا مجمع ہنس پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سعید بن جبیر کو اصفہان سے بلا کر محبت اہلبیتؑ کے جرم میں قتل کرادیا اور یہ واضح کر دیا کہ حکومت کو قرآن و حدیث آئے یا نہ آئے دشمنی اہلبیتؑ ضرور آتی ہے اور حقیقت ہے کہ جسے قرآن ہی کی خبر نہیں اسے اہلبیتؑ کی کیا خبر ہوگی — صلوات

عبدالملک کے بعد ۴۶ھ سے تین سال تک سلیمان بن عبدالملک کی حکومت رہی۔ اس کا ذوق طعام و شراب شہرہ آفاق ہے۔ شکم شریف میں اتنی وسعت کہ ایک نشست میں ستر ادا چنڈ بکری کے بچے، چھ مرغیاں اور ۲۰ پاد کشمش کھا گیا اور رخمہ بھی نہ ہوا۔ موت بھی کھانے ہی سے ہوتی ہے۔ ایک

مرتبہ ایک بوری لے لے اٹھے اور ایک بوری انجیر کھا گیا۔ اور نتیجہ میں واصل تہنم ہو گیا۔ آستینوں کا شوربے میں ڈوب جانا۔ تہذیب کی علامت تھا اور یہی مال غنیمت میں اس کے لباس کی علامت بنا۔

تاریخ نے صرف حاکم شام کے بارے میں نقل کیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے بد و عادی تھی کہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔ اس واقعے اندازہ ہو کہ "اس غائبہ آفتاب است" اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہادی دین اور حاکم دنیا میں کتنا فرق ہے۔ آستینوں کو ڈبو کے کھانا حاکم دنیا کا کام ہے اور فاقے کر کے قوم کو پانی پلانا امام وقت کا کارنامہ ہے — صلوات

۹۹ھ میں سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز کو حکومت ملی۔ یہ حکومت تو چند ہی دنوں رہی۔ لیکن تاریخ بنی امیہ کا سب سے بہتر اور شریف دور یہی دور کہا جاتا ہے۔ جب اس بادشاہ نے بزرگوں کے کردار کی قدر سے اصلاح کی اور دو اہم کام انجام دیے۔ ایک کام یہ کیا کہ فدک کا علاقہ بنی ہاشم کو واپس کر دیا۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ معاویہ کے دور سے جو مولائے کائنات پر رب و شتم کا سلسلہ جاری تھا اسے بند کرادیا۔ بنی امیہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ اس زہر سے واضح ہے جس نے عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا خاتمہ کیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ جو قوم اپنے بادشاہ کو برداشت نہیں کر سکتی وہ آل محمد کو کیا برداشت کرے گی۔ لیکن ابن عبدالعزیز کے کارناموں نے یہ واضح کر دیا کہ مظلومیت بہر حال ایک دن رنگ لاتی ہے اور ظلم کو مظلومیت کے سامنے ٹھکنا پڑتا ہے۔

مجھے بادشاہ کی نیت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اباب تاریخ نے اس بادشاہ کو "ملک عادل" کی مندر دی

بات تو چھوڑیے۔ یہ تو کربلا کے بعد کا واقعہ ہے جب سارے عالم اسلام کے احتجاج کے بعد اتنا بڑا ظلم ہو سکتا ہے تو پوری دیناے اسلام کی بیعت کے بعد کیا نہیں ہو سکتا۔

شام کے بعد ۱۲۵ھ میں ولید بن یزید بن عبدالملک حاکم بنا۔ یہ صرف سو ابرس بادشاہ رہا اور اس کے بعد قتل کر دیا گیا۔ لیکن سو ابرس میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ شکاری کتوں کو ہمراہ لے کر حج بیت اللہ کے لئے گیا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب پینے کا منصوبہ بنایا جو ناکام ہو گیا۔ اور عزت کعبہ محفوظ رہ گئی۔ شراب کا یہ عالم تھا کہ حوض کے کناروں سے نمایاں کمی ظاہر ہو جائے۔

ایک مرتبہ تو یہ قیامت کردی کہ کنیز کو شراب پلا کر مہمبستی کی اور صبح کو عامہ پنہا کر مسجد میں بیچ دیا کہ مسلمانوں کو نماز جماعت پڑھا دے اور کھانا لے کر نماز پڑھ لی۔ اب اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے حاکم کو ایسے ہی عوام اور ایسے عوام کو ایسے ہی حاکم کی ضرورت ہے۔ اور جب حاکم کا یہ عالم ہے تو عوام کا کیا عالم رہا ہو گا۔ خدایا بہتر جانتا ہے۔ بے صی اس منزل پر بھی کہ قرآن سے خالی نکالا اور آیت اپنے خلاف نکل آئی تو قرآن مجید کو دیوار پر لٹکا کر اس قدر تیر مارے کہ پارہ پارہ ہو گیا۔ اور کہہ دیا کہ قیامت کے دن اپنے خدا سے کہہ دینا کہ مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اور مجھے محمدؐ کے کیل تمانے کی کوئی پرداہ نہیں ہے۔

دنیا کے نظام ہدایت کا شر دیکھ لیجئے۔ اب نہ حج کی کوئی اہمیت ہے نہ نماز کی۔ نہ قرآن کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ کعبہ کی۔ نہ خدا کی کوئی عظمت ہے نہ رسول خدا کی۔ یہ نتیجہ کس بات کا ہے اگر کل اہلیت سے دشمنی نہ کی گئی

ہوتی تو آج یہ رنگ نہ ہوتا۔ اہلیت کا کردار یہ تھا کہ سواریاں ساتھ رہیں اور پیادہ حج کو جائیں۔ پیروں سے تیز نکال دیا جائے اور نماز کے خلوص میں فرق نہ آئے۔ سرتن سے جدا ہو جائے لیکن لوگ نیزہ سے تلاوت قرآن ہو۔ حج کو عمرہ سے بدلنا پڑے لیکن حرمت کعبہ محفوظ رہ جائے۔ سکے پر خنجر رہے لیکن صدق رسول اللہؐ کا کلمہ رہے۔ رگ گردن سے خون ٹپکے لیکن زمین پر نقش الا اللہ ثبت ہو۔ — صلوات

سہاں دہ کردار اہلیت اور کہاں یہ بد کرداری حکام کیا اسلام اسی بد کرداری کا نام ہے اور کیا مالک کائنات نے ایسا ہی دین نازل کیا تھا؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو صاف کہئے کہ اسلام آل محمدؐ کے پاس ہے باقی جو کچھ ہے وہ کھیل تماشا ہے۔ دین و مذہب نہیں ہے۔ کربلا اسی سفر کے کا نام تھا جہاں امام حسینؑ کا نعرہ تھا کہ دنیا ہو و لعب ہے اور یزید کا اعلان تھا کہ اسلام کھیل تماشا ہے۔ اب دنیا کو اختیار ہے چاہے حسنیہ کے قدموں میں آجائے اور چاہے یزیدیت کے قدموں میں چلی جائے۔

ولید کے بعد اس کا فرزند یزید بن ولید حاکم ہوا اور اپنے بخل کی بنا پر تین ہی مہینے میں معزول کر دیا گیا۔ بخل کا عالم یہ تھا کہ "یزید ناقص" خطاب ہو گیا تھا۔ سارے ملک کی تنخواہیں کم کر دی گئیں۔ سب کے وظیفے بند کر دیئے تھے اور جو کچھ تھا وہ اپنا عیش تھا اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس ظلم کو کون برداشت کر سکتا تھا۔ یہ آل محمدؐ پر ظلم نہیں ہے کہ دنیا خاموشی تماشا بنی رہے۔ یہ اپنے شکم کا معاملہ ہے یہاں کون خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ یہی حالات تو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مرسل انظم کے بعد اسلام عیش و عشرت کی راہوں پر چل پڑا تھا۔ اور اسے دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔

اس دوران چند دنوں کے لئے ابراہیم بن ولید کو بھی حکومت ملی۔ لیکن حالات اس قدر خراب تھے کہ وہ خود ہی حکومت چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہ بھی ایک فرقہ ہے بادشاہ دنیا اور نمائندہ رب العالمین میں کہ دنیا کا بادشاہ منصب چھوڑ کر فرار کر سکتا ہے لیکن الہی منصب دار فرار نہیں کر سکتا۔ وہ گردن کٹا سکتا ہے لیکن میدان جہاد نہیں چھوڑ سکتا۔

ابراہیم کے بعد ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد بن مروان کی حکومت قائم ہوئی اور یہ بنی امیہ کا آخری بادشاہ قرار پایا جس کا خاتمہ سفاح عباسی نے کر دیا۔ اور اقتدار بنی امیہ سے بنی عباس کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس بادشاہ کے حکومت کے لئے یہ کافی ہے کہ تاریخ میں اس کا لقب "مروان الحمار" ہے۔ اور حمار کے معنی گدھے کے ہوتے ہیں۔

یہ ہے اقتدار دنیا کا عالم یزید شرانجوار ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ ولید فاسق ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ یزید ناقص ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ خمران حمار ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ غرض خلافت ایسی راہوں پر چل پڑی ہے جہاں علم و کردار اور عصمت و سیرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو جتنا بڑا بدکار ہو گا وہ اتنا ہی بڑا خلیفہ المسلمین ہو گا۔ اور مسلمان اتنا بے شرم ہو گا کہ تاریخ اٹھلاو میں ان تمام بدکاروں کو جگہ دے گا اور علم کلام میں یہ بحث کرے گا کہ بدکاری سے خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یعنی اب اسلام میں یہ بحث نہیں ہے کہ بدکار خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اب بحث یہ ہے کہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ نتیجہ اس بات کا ہے کہ مسلمان یہ بحث نہیں کرتے کہ رسول کو بزدان گو کہنے سے انسان مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ بحث کرتا ہے کہ واقعاً رسول بزدان بک سکتا ہے یا نہیں تو جہاں رسالت ہی کا مسئلہ صاف نہ ہو وہاں خلافت کا مسئلہ کیسے صاف ہو سکتا ہے۔ صلوات

بنی عباس نے حمایت حق آل محمد کا لغو و لگا کر اور بنی ہاشم کے بعض افراد کو ساقط کر کے بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائی کی اور بالآخر مروان الحمار کو تیغ کر کے تخت حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بنی امیہ کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اور جس طرح بنی امیہ نے بنی ہاشم کا خاتمہ کیا تھا اسی طرح بنی جن جن کر ان کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ ایسے موقع پر خیال تھا کہ آل محمد کے حقوق کی رعایت ہوگی اور ان کے نام پر حاصل ہونے والی حکومت ان کا پاس دلچاظ کرے گی۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بنی عباس کے مظالم بنی امیہ سے کچھ زیادہ ہی رہے اور اس کا راز یہ تھا کہ بنی امیہ نے کبھی بنی ہاشم کے اعزاز کا اقرار ہی نہیں کیا تھا۔ تو ان کے لئے ذلیل اور رسوا کہنا بہت آسان تھا اور بنی عباس نے اسے تو حکومت ہی بنی ہاشم کے نام پر لی تھی۔ اب اگر بنی فاطمہ منظر عام پر رہ جاتے تو بنی عباس کا پلو پھنے والا کون ہوتا۔ اس لئے ان لوگوں نے طے کر لیا کہ کسی طرح ان کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کی کوئی نمایاں فرد منظر عام پر نہ جائے۔ امامت کا بھی حسن انتظام دیکھئے کہ جب بنی عباس نے قیادت کی دعوت دی تو صفات لفظوں میں انکار کر دیا اور ساتھ دینے والوں کو بھی منع کیا۔ یس میں سے بعض حضرات نے نہیں مانا اور بالآخر تیغ ہو گئے۔ اور آخر میں یہ انتہام کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے وقت رحلت وصیت نامہ لکھا تو پانچ آدمیوں کو اپنا وصی بنایا۔ جن میں ایک منصور بھی تھا۔ منصور کو حضرت کے انتقال کی خبر ملی تو فوراً حاکم مدینہ کو لکھا کہ جعفر صادقؑ نے جس کو اپنا وصی بنایا ہو اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دے حاکم مدینہ محمد بن سلیمان نے جواب دیا کہ انھوں نے پانچ آدمیوں کو اپنا وصی بنایا ہے ان میں سے ایک آپ ہی ہیں اور ایک میں ہوں۔ ایک عبد اللہ، ایک موسیٰ بن جعفر اور ایک حمیدہ خاتون ہیں۔ منصور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکا لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ والوں کا علم و فضل کیا ہوتا ہے۔ دنیا تدبیریں کرتی

رہتی ہے لیکن کوئی بہانہ نہیں تھا اور امامت محوں میں ساری تدبیروں کو فنا کر دیتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے اس عمل نے واضح کر دیا کہ امامت کو بیات دینا سے بے خبر نہ سمجھنا۔ ہم دنیا کے سارے حالات سے باخبر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہیں روکنے والا دین نہیں ہے۔ اور ہمارے ہر اقدام پر دین کا پہرہ ہے۔ دین کا معاملہ نہ ہوتا تو ہمارے جد سے بڑا صاحب عقل و ہوش کون تھا۔ آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ غضب خدا کا کل کے چر داسے اسلام کے حاکم بن جائیں اور دوش رسولؐ کا سوار خانہ نشین ہے۔ یہ صرف دین کی حمایت کا مسئلہ تھا۔

دور دنیا دیکھ لیتی کہ ہم کہاں ہوتے اور یہ سلاطین دنیا کہاں ہوتے۔ منصور کے مظالم کی داستان بہت طویل ہے۔ ۲۲ سال کی حکومت میں قتل سادات کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ خون سادات سے گارا بنوایا۔ سادات کے بچوں کو زندہ دیواروں میں چنوا یا۔ امام جعفر صادقؑ کو قتل کرنے کی متعدد بار سازش کی۔ اور بالآخر زہر دلوادیا۔ جن لوگوں نے حکومت کی حمایت کی تھی انہیں بھی تہ تیغ کرادیا۔ اور یہ واضح کر دیا کہ سلطنت خون چاہتی ہے۔ جب تک اولاد رسولؐ کا قتل نہ ہوگا خلافت رسولؐ کا حق ادا نہ ہوگا۔

منصور کے بعد اس کا بیٹا ہدی تخت حکومت پر بیٹھا اور باپ کی بجائے آل محمدؐ پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے وزیر اعظم یعقوب بن داؤد کو ہلاک کر دیا کہ قید خانہ میں جتنے علوی سادات ہیں ان کے سردار کو فوراً تہ تیغ کر دے۔ اور یہ کینز انعام میں لے لے۔ یعقوب زیدی فرستے کا آرمی تھا اور سادات سے محبت رکھتا تھا۔ اسے سخت پریشانی ہوئی کہ بادشاہ کے حکم پر کیوں کر عمل کریں۔ بالآخر ایک سید کو قید خانہ سے گھر لے آیا۔ اور وہاں حکم حاکم سے باخبر کیا۔ سید نے کہا کہ ہم اولاد رسولؐ ہیں تو رسولؐ اللہ کو کیا منہ دکھائے گا۔

یعقوب لرز گیا کہ اللہ کینز میرے پہلو میں رہے اور اولاد رسولؐ سامنے قیدی بنی کھڑی رہے۔ اس نے موقع پا کر انہیں رہا کر دیا کہ تم شہر سے باہر کل جاؤ۔ کینز ہدی کی جاسوس تھی۔ اس نے فوراً اطلاع کر دی اور سید کو گرفتار کر لیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یعقوب کو طلب کیا گیا۔ پوچھا گیا کہ تو نے میرے حکم پر عمل کر دیا یا یعقوب نے عرض کیا سرکار عمل ہو گیا اور سید کو قتل کر دیا گیا۔ ہدی نے اشارہ کیا اور ایک غلام نے اس سید کو پیش کر دیا۔ یعقوب بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو ہدی نے کہا کہ تم نے جھوٹ کیوں کہا۔ کہا ابر مجھے اس کے مال پر رحم آگیا۔ کہا اچھا جاؤ تمہیں قتل تو نہیں کروں گا لیکن زندگی بھر قید خانہ میں رہو گے۔ ارباب عزاء! اب آپ سوچیں جب سید کو قتل نہ کرنے پر یہ سزا ملتی ہے تو خود سادات کی کیا سزا ہوگی۔

ہدی کے بعد ہادی کا ایک سال کا دور حکومت بھی یونہی گزرا۔ اس کے بعد ۳۱ سالہ عہد میں ہادی رشید بادشاہ ہوا اور ۳۳ سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس دوران جتنے مظالم ممکن تھے۔ آل محمدؐ پر ڈھائے گئے اور خصوصیت کے ساتھ امام موسیٰ کاظمؑ کو ہر طرف مصائب بنایا گیا۔

۳۱ سالہ عہد میں حضرت سے فرزند رسولؐ ہونے پر بحث کی گئی اور جب امام نے ثابت کر دیا کہ ہم فرزند رسولؐ ہیں تو شرمندہ ہو کر مدینہ بھیج دیا لیکن ذہن میں کھٹک رہ گئی اور بالآخر ۲۰ شوال ۱۵۱ھ کو آپ کو مدینہ سے قیدی بنا کر کربہ بھیج دیا گیا۔ مدنی الجہ کو بصرہ پہنچے عیسیٰ بن جعفر ماکہ بصرہ کے زندان میں لکھے گئے۔ عید کا دن آیا۔ حاکم شراب و کباب میں مصروف ہے اور فرزند رسولؐ سر جھکائے کھڑے ہیں۔

اللہ سے انقلاب زمانہ گل امام حسینؑ کے اہل حرم شام میں پیش ہوئے تھے

اور آج امام موسیٰ بن جعفرؑ بصرہ میں اسی شان سے قیدی ہیں۔ قید خانہ میں عبادت و تلاوت کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ عینی بن جعفرؑ کردار سے متاثر ہو کر نرمی برتنے لگا تو اردن نے وہاں سے بغداد بھیج دیا۔ فضل بن ربیع کی نگرانی میں رہے۔ فضل بن ابی محمد مشہور تھا لیکن اپنے حالات سے مجبور تھا۔ ایک دن ایک شخص کو بلا کر کہا کہ دیکھو زندان میں کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک سفید چادر ہے۔ کہا بھائی یہ چادر نہیں ہے یہ امام موسیٰ بن جعفرؑ سجدہ میں ہیں۔ جسم اتنا لاغر ہو گیا ہے کہ اب چادر اور جد مبارک میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ صبح سے شام تک یوہنی سجدہ میں پڑے رہتے ہیں۔ ان پر کیسے سختی کی جائے۔ اردن کو اطلاع ملی تو سندی بن شاہک کی قید میں منتقل کر دیا۔ اور آخر عمر تک وہیں ہے یہ برا ظالم اور جاہل انسان تھا۔ امامؑ پر بے حد ظلم کیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن اردن کے اشارہ پر آپ کو انگور میں زہر دے دیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے انگور کا حال معلوم ہے۔ لیکن اب میرا وقت آچکا ہے۔ یہ کہہ کر ایک دانہ کتنے کے سامنے ڈال دیا۔ وہ کھا کر فنا ہو گیا۔ فرمایا کہ اس زہر کا اثر رفتہ رفتہ ہوگا اور تین دن کے بعد میں دنیا سے رحلت ہو جاؤں گا۔ سیب بن زید کا بیان ہے کہ جب امامؑ نے کہا تھا ویسا ہی ہوا اور تین دن کے بعد حالت غیر ہو گئی۔ سندی نے فوراً علماء و فضلاء کو بلا کر کہا کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ انھیں زہر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اپنی موت سے دنیا سے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے زہر دیا جا چکا ہے۔ اور میں مغرب دنیا سے رحلت ہو جاؤں گا۔ سندی نے کہا کہ حقیقت یہی ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ اب آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کروں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا غلام موجود ہے اور میں مدینہ سے کفن لے کر آیا ہوں۔ سیب کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک

جوان آئے اور امامؑ سے پٹ کر تاویر دتے رہے۔ دونوں میں صیغہ راز میں گفتگو ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد امامؑ نے انتقال فرمایا۔ جوان نے غسل و کفن دیا۔ نماز جنازہ پڑھی اور تشریف لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون جوان تھا تو غلام نے کہا کہ یہ امامؑ کے فرزند علی رضاؑ تھے جو باعجاز تشریف لائے تھے اس لئے کہ امامؑ کے تمام امور امام ہی انجام دیتا ہے۔ اس نے بعد موت کا اعلان امامؑ کیا کیا اور سندی نے جنازہ حاملوں کے حوالے کر دیا۔ جنازہ اٹھانے والے آواز دیتے جا رہے تھے کہ جسے راضیوں کے امامؑ کا جنازہ دیکھنا ہے وہ اس جنازہ کو دیکھے۔ جسے بعد از تک جنازہ پہنچا۔ سلیمان کی نظر پڑ گئی۔ قصر سے دوڑ کر آیا۔ غضب خدا کا۔ فرزند رسولؐ کا جنازہ اور یہ تو میں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں غسل و کفن کا اہتمام کروں گا۔ یہ کہہ کر بیش قیمت کفن دیا اور اہتمام سے جنازہ اٹھوایا۔ میں کہوں گا اے غریب بغداد آپ کے جنازہ کی توہین ضرور ہوئی لیکن ایک سلیمان تو پیدا ہو گیا۔ جس نے بظاہر بہترین طریقہ سے کفن دیکر جنازہ کو دفن کر دیا۔ مگر ہائے غریب غنیوا۔ بہن موجود بیٹا موجود، بیٹی موجود لیکن جنازہ جلتی رہتی پر۔ نہ کوئی کفن دینے والا نہ کوئی دفن کرنے والا۔ اے امامؑ رضائے غریب اپنے باپ کا پرستہ بیٹے ہوا آپ دقت آخر سرانے آگئے۔ مگر وہ بیٹا کیا کرے جو باپ کے سرانے بھی نہ سکا اور باپ ہی اس کے سرانے آیا۔ میرے لال میں مرنے جا رہا ہوں۔ بیٹا میرے بعد کوفہ اور شام کے بازاروں میں جانا ہوگا۔ بیٹا میرے ہمراہ سیدائیاں بھی بربرہنہ ہوں گی۔ بیٹا تجھے صبر کرنا ہوگا۔

ارباب عزاء! ماہ رجب کی پچیسویں تاریخ تھی جب ہمارا اور آپ کا ساتواں امام ۹ سال کی مسلسل قید برداشت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت

ہو گیا۔ مگر عزا دارو! بڑا فرق ہے اس قید میں اور دنیا کے تمام قیدیوں میں۔
 کربلا کے بعد اہل حرم بھی قید میں رہے۔ عابد بیمار بھی قید میں رہے۔ لیکن
 رونے والو! سب کی مدت قید تمام ہو گئی۔ بالآخر بازوؤں سے ریاں کھل
 گئیں۔ طوق اتر گیا۔ بیڑیاں کٹ گئیں۔ مگر ہائے امام موسیٰ کاظمؑ کہ جسے بغداد پر
 جنازہ رکھا گیا اور جب تابوت سے جا رہنائی گئی تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
 بیروں میں بیڑیاں۔ جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ رسولؐ کا وارث جعفر صادقؑ
 کافر زند۔ امت کا گھبیان۔ اسلام کا ذمہ دار اور جسم نازنین زنجیروں میں۔

والمحلاہ واعلیاء واحسیناہ
 اناللہ وانا الیہ راجعون

—

امام علی رضا علیہ السلام

اسم مبارک	علی
لقب	رضا۔ ضامن
کنیت	ابو الحسن
والد ماجد	امام موسیٰ کاظمؑ
والدہ ماجدہ	نجمہ
ولادت	۱۱ ذیقعدہ ۱۵۳ھ (جمعہ) مدینہ منورہ
شہادت	۲۳ ذیقعدہ ۲۰۳ھ طوس
عمر مبارک	پچاس سال
زوجہ	بناب سبکہ
اولاد	امام محمد تقیؑ
قبر مطہر	مشہد مقدس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين
خاتمة النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين
ولعنة الله على اعدائهم اجمعين - اما بعد فقد قال الله
الحكيم في كتابه الكريم بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَارْتِنًا لِّلْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔
اس ارشاد گرامی نے صاف واضح کر دیا کہ قدرت نے ہر دور میں
ہدایت کا انتظام کیا ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر ایک نہ ایک حجت خدا کو مبعوث
کیا ہے۔ تاریخ کا کوئی ایسا دور تصور نہیں کیا جاسکتا جب اس کی طرف
سے کوئی حجت اور کوئی نمائندہ نہ رہا ہو۔ اور عالم انسانیت کا کوئی عصر
سوچا نہیں جاسکتا جب اس نے ہدایت کا کوئی معقول انتظام نہ کیا ہو۔
فرق صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر شخص اسی کو اپنا نمائندہ بناتا
ہے جس سے خود راضی ہوتا ہے اور جس کے اعمال و افعال پر اطمینان رکھتا
ہے کہ یہ ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔ اور سننے کے بعد بھی
انسان اسی وقت تک تسلیم کرتا ہے جب تک نمائندہ اپنا پسندیدہ رہتا ہے
اور جہاں سے اس کے اعمال پسندیدگی کے خلاف نہ جاتے ہیں وہیں سے مخالفت
و بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ اس کا عمل صحیح
ہے یا غلط وہ صراطِ مستقیم پر ہے یا غلط راستہ پر۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہماری

پسندیدگی کے مطابق کام کرتا ہے یا نہیں۔ مالک کائنات نے بھی کچھ ایسا
ہی نظام بنایا ہے اور اس نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ جس طرح تم اپنا نمائندہ
اسے بناتے ہو جو تمہارا پسندیدہ ہوتا ہے۔ چاہے ساری دنیا اس کی مخالف
ہو جائے۔ اسی طرح میں اپنا نمائندہ اسے بناتا ہوں جو میرا پسندیدہ ہوتا ہے
چاہے تم سب اس کے مخالف ہو جاؤ۔ مخالفت سے رائے بدلی نہیں جاسکتی
اور جب بندہ بندہ کی رائے کا پابند نہیں ہوتا تو خدا بندوں کی رائے کا کس طرح
پابند ہو جائے گا۔ یاد دسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جب تم اپنی پسندیدگی
میں میری پرواہ نہیں کرتے تو میں اپنی پسندیدگی میں تمہاری پرواہ کس طرح
کروں گا۔ صلوات

یاد رکھو۔ پسندیدگی کا بھی ایک معیار ہے۔ ہر انسان بھی ہر انسان کو
پسند نہیں کرتا۔ پسندیدگی کا مسئلہ اتنا ہی عام اور آسان ہوتا تو دنیا میں کوئی
فساد ہی نہ ہوتا۔ اور عالم انسانیت میں کوئی جھگڑا ہی نہ اٹھتا۔ یہ تو پسندیدگی
ہی کا اختلاف ہے کہ ایک حاکم بنتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ ایک حملہ
کرتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ ایک گھر میں بیٹھتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے
ایک اقدام کرتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ غرض کہ ہر منزل پر ایک عمل کرنے والا
ہوتا ہے اور ایک ناپسند کرنے والا ہوتا ہے۔ تو کیا تم اپنے سارے اقدامات
اسی لئے اچھوڑ دیتے ہو کہ شاید کوئی اسے ناپسند نہ کرے۔ اگر تم نے ایسا نظام
بنایا ہوتا تو آج دنیا میں زندہ بھی نہ ہوتے۔ نہ جانے کتنی مخلوق ہے جو تمہاری
زندگی کو ہی ناپسند کرتی ہے۔ اور کتنے افراد ہیں جو تمہارے وجود ہی کو پسند
نہیں کرتے۔ تو کیا ایسے حالات میں تم نے خود کئی کر لی ہے۔ نہ ہر کھایا ہے
مرگے ہو۔ فنا ہو گئے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے تو تم درپردہ اس بات

کے قائل ہو کہ کسی کی پسند اور ناپسند اپنے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ یاد رہے کہ اکثر تمہیں خود بھی تجربہ ہو گا کہ ناپسند کرنے والے ہی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اور تمہارا ہی اقدام غلط تھا۔ اور تم اپنے اقدام کی اصلاح بھی کر لیتے ہو۔ لیکن اس کے باوجود آغاز کار میں یہ احتمال بھی نہیں دیتے کہ شاید میری ہی پسند غلط ہو۔ اور میں ہی غلط ہوں۔ تو سوچو جب تمہارے فیصلے میں غلطی ہوتی ہے۔ تم راہ سے بے راہ ہو جاتے ہو۔ تمہاری غلطیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تب تو تم دوسروں کی پسند کی پرواہ نہیں کرتے۔ تو مجھے کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ جس کے فیصلے میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور جسے معلوم ہے کہ کائنات منقلب ہو جائے اس کا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔ تم تم کو کھا کر راستہ پر آ سکتے ہو۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ تم نے تجربہ کر لیا ہے کہ ہم نے جسے پسند کر لیا پھر اسے کبھی معزول نہیں کیا۔ تم نے روز ایک کو پسندیدہ بنایا اور روز ایک کو معزول کیا ہمارے نظام میں معزول کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہم نے جسے پسندیدہ بنایا اسے بنایا۔ پھر اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ اور بناتے بھی ہیں تو ایسا بناتے ہیں کہ تمہیں بھی عاجز آئے کہ کبھی رضا ماننا پڑتا ہے۔ کبھی مرضی ماننا پڑتا ہے۔

صلوات

ہماری پسندیدہ کسی ایک عمل سے متعلق نہیں ہوتی کہ ایک بات پر خوش ہو گئے اور پھر دوسری بات پر ناراض ہو گئے۔ صبح کو خوش رہے اور شام کو ناراض ہو گئے۔ جنگ میں خوش رہے اور صلح میں ناراض ہو گئے۔ صحت میں خوش رہے اور مرض میں ناراض ہو گئے۔ اپنا فائدہ ہوا تو خوش ہوئے اور دوسرے کا مرتبہ ظاہر ہوا تو ناراض ہو گئے ہم جب کسی سے خوش ہوتے ہیں پوری

زندگی کے اعمال کو دیکھ کر ماضی۔ حال۔ مستقبل کا جائزہ لے کر اور پھر یوں خوش ہوتے ہیں کہ وہ اچھے تو خوش بیٹھے تو خوش۔ میدان میں رہے تو خوش گھر میں رہے تو خوش۔ صلح کرے تو خوش۔ جنگ کرے تو خوش۔ دوستوں کے درمیان رہے تو خوش۔ دشمنوں کے درمیان رہے تو خوش۔ حدیث ہے کہ بیدار رہے تو خوش اور سو جائے تو مرضی ہی اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

صلوات

ہماری خوشی کا انداز ہی الگ ہے۔ ہم خوش ہو جاتے ہیں تو ایک ہند پر ساری مرضی عطا کر دیتے ہیں۔ اور خوش نہیں ہوتے تو زندگی بھر رضا کی دعا کرتے پھر بھی خوش نہیں ہوتے۔ اور زندگی کا کیا ذکر ہے۔ مرنے کے بعد بھی دعاؤں ہوتی رہیں تو بھی ہم خوش نہیں ہوتے۔ ہماری نگاہ گردا پر رہتی ہے دعاؤں پر نہیں۔

صلوات

ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود تم نے کیسی زندگی گزاری ہے اور تمہارا کردار کیا رہا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ تمہارے غلصین تمہیں کیا سمجھتے ہیں اور تمہارا لیے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہم غلصین سے مرعوب ہو جاتے تو فرعون اور فرود کے حق میں خدائی سے دست بردار ہو جاتے خدا کی خاطر اپنی جنت کو فنا کر دیتے۔ قادر دن کے خزانوں کے آسمان تک بلند کر دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا اور تم پر واضح کر دیا کہ ہم تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں تمہارے مریدوں کو نہیں۔

اور یہی تو فرق تھا اللہ والوں میں اور دنیا والوں میں کہ دنیا والے اسی پر خوش تھے دنیا ہمارے ساتھ ہے۔ عوام ہمارا اکلمہ پڑھتے ہیں۔ سکھ ہمارے نام کا پل رہا ہے۔ خطہ ہمارے نام کا پڑھا جا رہا ہے۔ تخت ہمارا ہے

تاج ہمارا ہے شکر ہمارا ہے۔ فوج ہماری ہے۔ ملک ہمارا ہے۔ علاقہ ہمارا ہے۔ اب ایک خدا ناراض بھی ہو گیا تو کیا نقصان ہے۔ اور اللہ دالے کہہ رہے تھے کہ دنیا ہماری مخالف ہو گئی ہے۔ تخت ہمارا نہیں رہا ہے۔ تاج ہمارا نہیں رہا ہے۔ ملک ہمارا نہیں رہا ہے۔ زمانہ ہمارا نہیں رہا ہے دنیا ہماری نہیں رہی ہے۔ لیکن شکر خدا کا کہ خدا ہمارا ہے۔ خدا نے بھی آواز دی میرے بندے۔ جن لوگوں نے مجھے چھوڑ کر دنیا کو لیا ہے۔ تو سہی انھیں ایسا تباہ کر دوں کہ اپنی مملکت میں بھی نشان قبر ڈھونڈے۔ ریلے اور تونے سب کچھ چھوڑ کر مجھے اپنا لیا ہے تو مجھے اتنا سر بلند کر دوں کہ ظہر کو فہ پر پھہرے تو خجف اشرف ہو جائے اور صحرائے بے آب دیکھا میں رہے تو کر بلائے معلیٰ بن جائے۔

ارباب نظر! اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ آج اہل دنیا اور سلاطین عالم قبروں کے بھی محتاج ہیں اور آپ پوری تاریخ پڑھ ڈالیں کسی کے نشان قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔ کوئی ڈھونڈے بنی امیہ کی قبریں کہا کوئی تلاش کرے بنی عباس کے سلاطین کس کھنڈر میں سو رہے ہیں۔ اور کوئی آکے دیکھے کل کے غریب الوطن آج کس شان سے آرام کر رہے ہیں۔ اور دنیا کس طرح ان کے مزار کا طواف کر رہی ہے۔ اور میں تو یہاں تک کہنا چاہتا ہوں کہ سلاطین دنیا میں کسی کی قبر کا نشان ملتا بھی ہے اس کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اللہ دالے ہی کی وجہ سے ملتا ہے۔ ہارون کی قبر کا پتہ روضہ رضفا سے ملتا ہے ورنہ ہارون کو کون پہچانتا۔ اور اس کی قبر کو کون تلاش کرتا۔ اور جب نہیں کہ رضائے غریب نے آواز دی ہو کہ یہ سلاطین دنیا کی ہوشیاری تھی کہ بڑی شخصیت کے پہلو میں رہو تاکہ نشان قبر محفوظ رہے لیکن قدرت نے بھی

اپنا انتقام لے لیا کہ جو بھی زیارت رضائے غریب کو جائے گا اس کا فریض ہو جائے گا کہ اگر مظلوم پر صلوات پڑے تو ظالم پر لعنت بھیجے کہ اگر ظالم و مظلوم ایک منزل پر جمع ہو جائیں تو محبت اور نفرت کا فریضہ بھی یک وقت ادا ہو جائے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب پروردگار عالم کی پسندیدگی کا معیار دنیا کے معیار سے الگ ہے کہ دنیا اسے پسند کرتی ہے۔ جو اس کی خواہش کا خیال رکھتا ہے اور وقت پر اس کے کام آتا ہے۔ اور رب العالمین اسے پسند کرتا ہے جو اس کی مرضی کا خیال رکھتا ہے اور وقت پر اس کے کام آتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی پروردگار کسی بندے کو پسند کرے اپنا نمائندہ بنائے گا تو اہل دنیا اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔ یہاں پہلے سے ایک نظام تیار ہے اور بیٹے ہو چکا ہے کہ نظام الہی کی پابندی نہیں کی جائے گی اور اپنے ذاتی نظام پر عمل کیا جائے گا۔ مالک کائنات نے بھی طے کر لیا کہ تم مخالفت کرتے جاؤ۔ ہم سنائندے بھیجتے جائیں گے۔ تم تاتے جاؤ ہم ہادی بناتے جائیں گے۔ تم قتل کرتے جاؤ ہم سلسلہ کو قائم رکھیں گے۔ ایک دن تو بہر حال ہماری بارگاہ میں آنا ہے اور وہی دن وہ ہو گا جب کسی حاکم، خلیفہ المسین اور سلطان و بادشاہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس دن سب کو اپنے امام کے ساتھ آنا پڑے گا۔ اور ہم سلاطین سے بھی سوال کریں گے کہ تمہارا امام کون ہے اور تم کس کی امامت میں رہے ہو۔ تخت و تاج الگ ایک مسئلہ ہے اس کا حساب تو بعد میں ہو گا۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہارا امام کون ہے؟

یہ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ ادھر مرے ادھر خلافت گئی، حکومت گئی، تخت گیا۔ تاج گیا۔ خسروانہ گیا۔ اقتدار گیا۔ جبر و

استبداد کیا۔ قہر و غلبہ کیا۔ اب نکیرین اگر نہیں پوچھتے کہ آپ کی حکومت کتنے رقبہ پر تھی۔ آپ کے مرید کتنے تھے۔ آپ کے خزانہ میں کتنا مال تھا۔ آپ کے کرد و فرما کیا عالم تھا۔ اب تو ایک ہی سوال ہے کہ آپ کا امام کون تھا؟ آپ نے کس کی امامت میں زندگی گزاری ہے اور کس کو اپنا امام تسلیم کیا ہے؟ سوال قبری نے آخرت کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہاں کس کے ساتھ جانا ہے۔ اور کہاں جانا ہے؟ اگر امام صحیح ہے تو جنت و رنہ جہنم کا راستہ تو کھلا ہوا ہی ہے۔ یہی بات امام علی بن موسیٰ الرضاؑ نے مامون رشید سے کہی تھی۔ جب اس نے پوچھا تھا کہ آپ اپنے جد امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ کو قسیم جنت دنا راتے ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو بالکل واضح ہے۔ آپ نے پیغمبر اسلامؐ کی حدیث تو سنی ہوگی کہ علیؑ کی محبت ایمان ہے اور علیؑ کی دشمنی کفر ہے! اس نے کہا ہاں سنی تو ہے فرمایا۔ پھر تو جنت و جہنم کی تقسیم ہو گئی۔ جو مومن ہو گا وہ جنت میں جائے گا اور جو کافر ہو گا وہ جہنم میں جائے گا۔

یہ کہہ کر وہاں سے آپ اٹھ کر چلے تو راوی نے کہا فرزند رسولؐ! آپ نے بہترین دلیل قائم کی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ دلیل مامون جیسے لوگوں کے لئے ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ میرے جد امرا کا پر کھڑے ہوں گے اور ہر گز رنہ والے کے بارے میں فیصلہ کریں گے "ھذا الی دھذا اللہ" اے جہنم یہ میرا ہے اور یہ تیرا ہے۔ جس کو علیؑ اپنا کہہ دیں گے وہ جنتی ہو گا اور جس کو اپنے سے الگ کر دیں گے وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ صلوات

مالک کائنات نے جنت و جہنم کا اختیار دیکر بھی واضح کر دیا کہ دنیا کے ناساندوں کے پاس تخت و تاج اور خزانہ و بیت المال ہوتے ہیں اور میرے نمائندہ کے پاس جنت و کثر تسنیم، ولسبیل، حور و علان

نعمات و لذات کا اختیار ہوتا ہے۔ سلطنت دنیا موت پر تمام ہو جاتی ہے اور امامت کے اختیارات موت سے شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سب خاموش رہتے ہیں وہاں امام بولتا ہے اور جہاں سب نفسی نفسی کرتے ہیں وہاں امام امت کی شفاعت کرتا ہے۔ صلوات

ہم نے جسے پسند کر لیا اس کے کردار کو اتنا طیب و طاہر بنا دیا کہ سلاطین دنیا بھی اس کی جو کھٹ پر سر جھکانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو نظر انداز کر دے گی کہ جن مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ کے بعد مولائے کائنات کو مشورہ میں شریک کرنے کے قابل بھی نہ سمجھا تھا۔ انہوں نے ہی بارہ سال کے بعد خلافت کا ایک مقدار تصور کر لیا۔ اور ۲۵ سال کے بعد بیعت کے لئے حاضر ہو گئے۔ اور بے قرار ہو کر کہنے لگے یا علیؑ ہاتھ بڑھائیے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ مولائے کائنات نے ہاتھ کھینچ لیا جب کل تم نے مجھے قابل بیعت نہیں سمجھا تو آج بیعت کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب قوم کا اصرار بڑھا تو فرمایا۔ یہ بیعت سر راہ بازار میں نہ ہوگی۔ بیعت کرنا ہے تو مسجد پیغمبرؐ میں آؤ۔ منبر رسولؐ کے قریب آؤ۔ جب میں منبر پر بیٹھ جاؤں تب بیعت کرنا۔ مجمع مسجد میں آیا۔ مولائے کائنات منبر پر تشریف لے گئے اور تمام سابق خلفاء کی منزل سے بند جائے پیغمبرؐ پر بیٹھے اور فرمایا کہ اب بیعت کرو۔ یہاں اس لئے بیٹھا ہوں کہ مجھے پیغمبرؐ کا جانشین سمجھو۔ سلسلہ کا جو تھا نہ سمجھو سلسلے کا جو تھا ہوتا تو جو تھے زینے پر بیٹھنا۔ پیغمبرؐ کی جگہ پر بیٹھا ہوں کہ دنیا آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ میں سلسلے کا خلیفہ نہیں ہوں۔ بلا فصل جانشین ہوں۔ صلوات

بیعت ہوئی۔ حکومت ملی۔ امت نے سر نیاز جھکایا۔ اور ۲۵ سال

کے اندر امت کو اپنا حشر معلوم ہو گیا۔ سر بازار بیعت لینے سے انکار کر کے بتا دیا کہ بیعت کے طلبکار اور ہوتے ہیں اور بیعت کے حقدار اور ہوتے ہیں۔

مجھے دنیا کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے جس کی غرض ہوگی وہ خود اگر بیعت کرے گا۔ تاریخ نے ایسا ہی نیاز کر دار نہیں دیکھا اور یہ انداز سوائے اللہ والوں کے کسی کا ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ استغناء یا مولائے کائنات کے کردار میں دیکھا تھا یا دوبارہ امام علی بن موسیٰ الرضا کے کردار میں دیکھا ہے کہ ظلم و ستم ڈھانے والا بادشاہ بالآخر حالات سے مجبور ہو کر امام علیہ السلام کو مدینہ سے طلب کرتا ہے کہ آپ کو دلی عہد ملکیت بنادے اور خود آپ سے انتہاں کرتا ہے۔

دلی عہدی کے سلسلے میں اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ مامون امام علیہ السلام کا مخلص تھا اور آپ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ ضرورت ہے کہ چند نغظیں اس پس منظر کے بارے میں بھی عرض کر دی جائیں جن حالات نے مامون کو اس اقدام دلی عہدی پر مجبور کیا تھا۔ اور اس نے امام کے سامنے یہ پیش کش کی تھی۔

یاد رکھئے بنی عباس نے اقتدار پانے کے بعد سے بنی فاطمہ پر جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی نظیر بنی امیہ کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ جو تخت حکومت پر آیا اس کا پہلا فریضہ تھا کہ سادات کو قتل کرے زندہ دیواروں میں چنوائے اور جوان کا سر براہ ہوا سے ہر طرح ذلیل کرے۔ ائمہ معصومینؑ ان حالات سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے کبھی اس اقدام کی قیادت نہیں کی جو بنی ہاشم کی طرف سے بنی عباس کے خلاف ہوا۔ سادات کرام کا یہ حال

تھا کہ جب مصائب و شدائد سے عاجز آجاتے تھے تو فوج تیار کر کے اٹھ جاتے تھے اور بالآخر قتل ہو جاتے تھے۔ اور خود ہی قتل نہ ہوتے تھے بلکہ پورے پورے خاندان کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ امام علیہ السلام نے بارہا ان اقدامات سے رد کا لیکن جوش کو ہوش کہاں۔ ادھر حکومت کے ہوا خواہوں کا بھی یہی عالم تھا کہ کچھ تو بنی فاطمہ میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بدھے سادے سادات کو بھڑکا کر میدان میں لے آتے تھے اور تہ تیغ کر دیتے تھے۔ اور کچھ حکومت سے اپنے حالات کا انتقام لینے کے لئے انہیں آلہ کار بناتے تھے۔ لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تھا اور اکثر اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ جب معصومین علیہم السلام نے سمجھایا تو اسے صد اور خاندانی عداوت پر محمول کر دیا۔ اور حاکم کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ائمہ معصومینؑ نے بھی ان کے مقابلہ میں سکوت فرمایا اور حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ہارون کا نمائندہ عیسیٰ جلودی محمد بن جعفر صادقؑ کی تلاش میں مدینہ تک پہنچ گیا۔ اور امام رضاؑ کے گھر کا محاصرہ بھی کر لیا۔ ہارون کا حکم تھا کہ جو بیدے اسے قتل کر دینا اور گھر لوٹ لینا۔

جلودی نے گھر میں گھس کر غور قوں کے زیورات لوٹنے کا ارادہ کیا فرزند رسولؐ نے بیحد سمجھایا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر آپؐ نے قسم کھائی کہ میں سارا سامان لا کر دیدوں گا تب وہ ظالم خاموش ہوا۔ اور آپؐ نے خوابتوں کے زیورات تک لا کر ظالموں کے حوالہ کر دیئے یہ حالات پیش آرہے تھے لیکن سادات کرام کو ہوش نہ آتا تھا اور انہیں حکومت سے انتقام کی دھن سوار تھی کہ اقتدار ہمارا حق ہے۔ بارہا امام علیہ السلام سے بحث بھی کی۔ جھگڑا بھی کیا۔ اور کبھی کبھی تو حکومت کے آلہ کار بن کر نہ ہر

دینے میں بھی حصہ لیا۔ لیکن یہ امام کا ظرف تھا کہ جلد حالات کو دیکھتے رہے۔ اور حکومت فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ ضرور فرما دیا کرتے تھے کہ اس اقدام کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اس میں پورے خاندان کی تباہی ہے۔ لیکن وہاں کون سننے والا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فیضیہ میں آکر زید بن موسیٰ بن جعفرؑ سے فرما دیا کہ تم نے ہوس حکومت میں لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دی ہے۔ یہ بہت برا کام کیا ہے۔ میں قطعاً تم سے راضی نہیں ہوں۔ زید نے کہا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں آپ کا بھائی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا گھناؤنا گھر ہے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جو احکام الہی کی مخالفت کرے وہ میرا رشتہ دار نہیں۔ یاد رکھو یہ تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ذریت فاطمہؑ پر آتش جہنم حرام ہے تو جو چاہو کر دو۔ ذریت فاطمہؑ سے مراد صرف امام حسینؑ اور امام حسینؑ ہیں۔ ان کے علاوہ جو جیسا کرے گا اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ کسی کو صاف نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ہمارے جد حضرت علیؑ بن الحسین نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ بید نیکی کریگا تو ثواب دہرائے گا اور وہ برائی کرے گا تو عذاب بھی دہرا ہی ملے گا۔ یہ تم نے کیا غضب کیا کہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی اور زید النار کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے سفارش کر کے حکومت کے انتظام سے آزاد بھی کر دیا۔ لیکن متوجہ نہ ہوا کہ اولاد فاطمہؑ کا یہ کردار نہیں ہے۔ وہ نہ حکومت کے طرفدار ہوتے ہیں اور نہ حکومت کے طلبکار۔ حکومت کی غرض ہوتی ہے تو ان کی جو کھٹ پر آ جاتی ہے ورنہ وہ خود کسی کی ڈیوڑھی پر نہیں جاتے۔

ان حالات نے سادات کو باقاعدہ طور پر حکومت تو نہیں دلوائی لیکن حکومت کا سونا جاگنا ضرور حسرام کر دیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے

گئے۔ ادھر ہارون رشید گھریلو ہنگامہ سے عاجز آکر اپنی حکومت کو دو حصوں پر بانٹ دیا۔ عرب کا حصہ امین کو دیدیا اور عجم کا خطہ مامون کو۔ امین کو لوگوں نے یہ سمجھایا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اس نے چاہا کہ مامون کو جہان بلا کر قتل کر دے اور مطلق العنان بادشاہ بن جائے۔ لیکن مامون نے جواب دیا کہ میرے ملک میں بغاوتیں بہت ہیں۔ میں ملک چھوڑ کر آنے کے لائق نہیں ہوں۔ امین سمجھ گیا کہ مامون نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم فوج مامون کے علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دی۔ مامون کا سردار شکر طاہر بن الحسین مقابلے کے لئے نکلا اور نہایت دلیری سے لڑ کر کامیاب ہوا۔ امین نے دوسری فوج بھیجی طاہر نے اسے بھی پسپا کر دیا اور مقابلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا بالآخر امین کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اور طاہر عراق کی سرزمین پر قبضہ کرنا چلا گیا۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ امین گرفتار ہوا اور اسے تہ تیغ کر دیا گیا۔

یہ ہے سلطنت دنیا کا انجام کہ بھائی بھائی کے قتل کا درپے ہے عزیز عزیز کے خون کا پیا سا ہے۔ فرشتوں نے کیا برا کہا تھا کہ پردرد گوار کیا انھیں کہ خلیفہ بنائے گا جو رے زمین پر فساد اور خونریزی کریں۔ پردرد گوار نے فرما دیا تھا ”اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ“ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ یعنی ایسے لوگ خلیفہ ہوں گے تو میرے نہیں ہوں گے۔ اہل دنیا کے ہوں گے۔ میرا خلیفہ صانع مصلح نیک کردار اور بلند افکار ہو گا۔

آغاز تاریخ میں ایک قابل تھا اور یہاں تو سب ہی قابل ہیں۔ بائبل کا تلاش کرنا مشکل ہے۔ قابل کے ملنے میں کوئی زحمت نہیں ہے۔ اس تاریخ لوکیت کو ذرا تاریخ امامت سے ملا کر دیکھئے تو فرق سمجھ میں آجائیگا

یہاں باپ نے دو بھائیوں کو دو علاقوں کا حاکم بنایا ہے اور قتل و خون کا سلسلہ شروع ہے اور وہاں اٹانے دونوں نواسوں کو ایک ملک کا سردار اور ایک دنیا کا امام بنایا ہے اور کہ دار میں اتنا اتحاد ہے کہ رسول کی زلفیں دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایک طرف لے جائے اور دوسرا دوسری طرف لے جائے۔ قدرت آواز دے رہی ہے۔ پہچان لو ہمارا نمائندہ کتنا پاکیزہ کردار ہوتا ہے۔ اور ہمارا نمائندہ کتنا بد نفس اور بد کردار ہوتا ہے۔

امون نے امین کو قتل تو کر دیا لیکن بغاوتوں کا ایک نیا طوفان اہل پڑا۔ سادات کرام کا انتقام ایک طرف۔ امین پرستوں کے حملے دوسری طرف اور پھر اپنے سرداران لشکر کی بغاوت الگ۔ امون بدحواس ہو گیا کہ ایسے حالات میں حکومت کیسے چلے گی۔ بالآخر عاجز آکر اپنے وزیر خاص فضل سے مشورہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فضل نے کہا کہ بہترین ترکیب یہ ہے کہ سادات میں سے کسی کو ولی عہد بنالیں۔ مخالفت کا ایک طوفان تو دب ہی جائے گا۔ اس نے مدتوں اس مسئلہ پر غور کیا۔ بنی عباس سے مشورے کئے پوری فہرست پر نظر کی۔ بنی عباس میں کوئی ولی عہدی کا اہل تو نہیں ہے۔ اور پھر جب حضرت امام رضاؑ پر نظر پڑی تو ان کے علم و کردار کا بنی عباس سے موازنہ کیا کہ کل جب اعتراضات ہوں گے تو ان کا کیا جواب دیا جائیگا اور یہ سب کچھ کے امام کے پاس پیغام بھیج دیا۔ امام مدینہ میں تشریف فرما تھے۔ قبر رسولؐ کی مجادری فرما رہے تھے۔ عبادت الہی میں زندگی گزار رہے تھے۔ ادھر ایک عظیم قافلہ پہنچ گیا اور حضرت کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ آپ مدینہ سے نکلے لیکن اس شان سے جیسے حسینؑ وطن چھوڑ رہے ہوں۔

گمرہ دزاری کا عالم۔ کھرام برپا۔ بار بار وضو رسولؐ میں جاتے ہیں۔ اور باہر نکل آتے ہیں۔ بدبزرگوار گواہ رہے گا مجبوراً جا رہا ہوں۔ میرا جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بھلا آپ کی قبر کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔

نکلے تو درد و دیار مدینہ کو بہ حسرت دیکھتے ہوئے۔ فرمایا کہ یہ میرا آخری سفر ہے۔ اب اس سفر سے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ اہل مدینہ کا کیا عالم رہا ہو گا۔ مدینہ سے رخصت ہو کر سیرت امام حسینؑ پر چل کر مکہ آئے۔ خانہ خدا کو وداع کیا۔ طواف کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ امام محمد تقیؑ کی عمر ۶ برس کی تھی۔ خانہ خدا سے لیٹ گئے۔ میں تو حرم خدا سے نہ جاؤں گا۔ فرمایا فرزند مشیت الہی پر نظر رکھو فوراً باپ کی خدمت میں آگئے۔ بابا جان اگر مرضی پروردگار یہی ہے کہ ہم غریب الوطن کی زندگی گذاریں اور حرم الہی سے دور رہیں تو میں راضی بہ رضا ہوں۔ قافلہ چلا اور راہبنی راستوں سے چلا تا کہ چاہنے والے روکنے نہ پائیں۔ مکہ سے رخصت ہو کر نیشاپور پہنچے۔ وہاں ایک شخص کے مکان میں قیام فرمایا۔ ایک بادام کا درخت لگایا جو فوراً باد آور ہو گیا اور اس سے بے شمار مہینوں نے فائدہ اٹھایا۔ ایک چشمہ شگ ہو گیا تھا۔ اسے جاری فرمایا اور وہ "چشمہ رضا" کے نام سے موسوم ہو گیا۔ وہاں سے چل کر شہر خراسان پہنچے۔ نماز ظہر کا ہنگام تھا۔ دھوکے لے پائی نہ لی سکا تو ایک چشمہ جاری فرمایا جو آج تک موجود ہے۔ اور لوگ اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ خراسان سے چل کر طوس پہنچے جہاں پتر کے ظریف بنانے کا رواج تھا۔ یہاں کے قریب جا کر دعا فرمائی اور حرم ہو گیا اور لوگوں نے مقام خرم میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ داؤد کے لئے لوہا نرم

ہوا تھا اور ہمارے لئے امامؑ نے پتھر کو نرم کر دیا ہے۔۔۔ طوس سے سناباد تشریف لائے اور مارون کی قبر کے پاس اپنی قبر کی جگہ معین فرمائی اور بالآخر دارالحکومت مرو میں نزول اجلال فرمایا۔ مامون نے عظیم الشان استقبال کیا۔ اور دو تین دن کے آرام کے بعد خلوت میں بلا کر کہا کہ آپ کو دلی عہد بنانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے گوشہ نشین رہنے دے مجھے حکومت کی کوئی غرض نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عہدہ تو آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ آپ نے قبول فرمایا اور بارگاہ الہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پروردگار گواہ بنائیں مجبوراً اس عہدہ کو قبول کر رہا ہوں۔ میرے لئے تیری ولایت سے بہتر کوئی ولایت نہیں ہے۔ اب مجھے اپنے دین پر قائم رکھنا اور اپنی شریعت کی خدمت کی توفیق عطا فرمانا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت نے بار بار دلی عہدی سے انکار کیا۔ اور جب کسی روز گذر گئے تو مامون نے پوچھا آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ میری دلی عہدی قبول نہیں فرماتے۔ آپ نے فرمایا میں اپنے آباؤ اجداد پرین سے سنا ہے کہ دلی عہدی مجھے نہ ملے گی۔ اور میں تیری زندگی ہی میں زہر و دغا سے شہید کر دیا جاؤں گا۔ مامون نے کہا کس کی مجال ہے جو میرے پوتے ہوئے آپ کو نہ ہر دے سکے۔ آپ نے فرمایا کہ مصلحت ہوتی تو میں قاتل کا نام بھی بتا دیتا لیکن اس وقت مصلحت نہیں ہے۔ یہ ہے امام کا علم اور یہ ہے امام کی بے نیازی۔ قدرت کا انتقام کتنا شدید ہوتا ہے کہ حکومت خوشامد کر رہی ہے۔ اور امانت تحت و تاج کو کھٹو کر گار رہی ہے۔ آخر مامون نے جھنجھلا کر کہا کہ آپ اپنے انکار سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں بہت زاہد و بارسا ہوں اور بادشاہ اتنا عاجز ہے کہ مجھے دلی عہد تک نہیں

بنا سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے لیکن تو بھی تو دلی عہد بنا کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دنیا سے مجبوراً کنارہ کش ہیں در نہ جیسے ہی عہدہ مل جاتا ہے فوراً دوڑ پڑتے ہیں۔ امامؑ کے اس جواب پر مامون آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اب اگر آپ نے انکار کیا تو میں آپ کو قتل کرادوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بات اس منزل تک پہنچ گئی ہے تو میں حاضر ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اس وقت ملک میں دخل نہیں دوں گا۔ اور حکم خدا و رسولؐ سے شورے دیتا رہوں گا۔ یہ ہے اتحاد کردار کہ جو انداز تاریخ میں پہلے علیؑ کا تھا وہی انداز اس علیؑ کا ہے۔ کیوں نہ ہو اس خاندان میں سب محمدؐ ہیں اور سب علیؑ ہیں۔ یہاں ادل و آخر میں کوئی فرق کروار نہیں ہے۔

دلی عہدی کا اعلان ہوا۔ یکم رمضان ۱۸۳ھ کو دربار عام آراستہ ہوا امامؑ کے دست اقدس پر بیعت ہوئی و مناکے لقب سے یاد کئے گئے۔ بنی عباس کا لباس یاہ سے سبز بنایا گیا۔ لوگوں نے نذرانے پیش کئے۔ شاعرانے قصیدے پڑھے۔ امامؑ کے نام کا سکھ چلا اور قدرت نے آواز دی۔ دنیا کے یہوشوا اب برش میں آجاؤ۔ اور میرے نمائندہ کا اقتدار دیکھو۔ یہ منظر عام پر آجائے گا تو حکومت تمھاری ہوگی۔ اور سکھ اس کے نام کا ہوگا۔

بنی عباس میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مامون نے معاذ اللہ ایک ان پڑھ آدمی کو دلی عہد بنا دیا ہے۔ مامون نے امامؑ کو دربار میں طلب کیا اور ایک خطبہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ امامؑ نے خطبہ پڑھا۔ اہل دربار ششدر رہ گئے۔ اور پھر علیؑ کے جلسوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ آئے دن نئے نئے اعتراضات اور امامؑ کے جوابات۔۔۔ یہی ایک مصلحت تھی۔ جس کی بنا پر امامؑ نے دلی عہدی قبول کی تھی کہ اس طرح حکومت کے سہارے اسلامی

علوم کے نشر و اشاعت کا موقع مل جائے گا ورنہ کہاں علی کا لال اور کہاں تخت حکومت۔ کہاں محمد کا وارث اور کہاں مامون کی ولی عہدی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ امام رضاؑ سے دریافت کئے جانے والے سوالات کو اٹھا لیا گیا تو ان کی تعداد ۸۰ ہزار تھی۔ آئے دن نئے نئے سوالات اور نئے نئے مناظرے، تمام مباحثات کے نقل کرنے کا عمل نہیں ہے۔ صرف دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔

امون کے دربار میں ایک لاد مذہب انسان وارد ہوتا ہے اور طسرح طرح کے اعتراضات کرتا ہے۔ دو بار جواب سے عاجز ہے اور بالآخر امام رضاؑ کے سامنے مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی کیا پوچھ رہا ہے اس نے کہا کہ آپ کا خدا کیسا ہے اور کہاں ہے۔

آپ نے فرمایا تو خدا کے معنی ہی نہیں سمجھتا۔ خدا مخلوق نہیں ہے۔ خالق ہے۔ کیا اور کہاں یہ مخلوق کے صفات ہیں وہ تمام کیفیات کا خالق اور تمام مکانات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسے کون سا مکان اپنے احاطہ میں لے سکتا ہے۔ اور کس جگہ کی مجال ہے کہ اس پر حاوی ہو سکے۔

اس نے کہا کہ پھر صاف کئے کہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو چیز تو اس سے باہر ہو اس کے وجود کا انفرادہ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی تو مجھ میں اور تجھ میں فرق ہے۔ تو تو اس سے باہر ہونے پر انکار کرتا ہے اور ہم اسی پر اقرار کرتے ہیں کہ تو اس کے قبضہ میں نہیں آتا ورنہ ہندہ ہو جاتا، خدا نہ رہ جاتا۔

اس نے کہا اچھا یہ بتائیے کہ وہ کب سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کب نہیں تھا کہ میں بتاؤں کب سے ہے۔ یہ سوال تو اس کے بارے میں ہوتا ہے جو کہیں نہ رہا ہو اور جس کے نہ رہنے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے

بارے میں یہ عقیدہ رکھو کہ ہمیشہ سے ہے۔ کب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے کہا خیر پہلے یہی بتائیے کہ اس کے ہونے ہی پر کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ لاکھوں دلیلیں ہیں۔ خود تیرا وجود ہی دلیل ہے کہ جب تو اپنے جسم کے طول و عرض پر قادر نہیں ہے تو یہ علامت ہے کہ یہ سب کسی اور کے اختیار میں ہے۔ پھر پوری کائنات، چاند سورج زمین، آسمان سب بیکار و بیکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور یہ بغیر خالق کے پیدا نہیں ہوئے۔

اس نے کہا اچھا اگر ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ دکھائی دینا مخلوق کی شان ہے۔ خالق کی شان نہیں ہے۔ اس کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے کہ اسے دیکھا جاسکے۔ اس میں کمی زیادتی کا بھی امکان نہیں ہے۔ وہ دیکھنے سننے میں آنکھ کان کا بھی محتاج نہیں ہے۔

اس نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ دیکھتا سنتا ہے اور آنکھ کان نہیں ہیں یہ عجیب قسم کا خدا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بیشک عجیب قسم ہے۔ اس کا قیاس مخلوقات پر نہیں ہو سکتا۔ آنکھ کان کا محتاج ہونا مخلوقات کا کام یہ خالق کی شان نہیں ہے۔

روایت کہتی ہے کہ دہریہ نے سوالات تو بیشمار کئے لیکن اتنا انصاف پسند تھا کہ جب ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو حضرت کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گیا۔

یہ تھا اللہ والوں کا کام اور اس کے بنائے ہوئے نامزدوں کا طرز عمل۔ یہاں تخت و تاج کا مسئلہ نہیں ہے یہاں دین و مذہب کے مسائل ہیں۔ تخت و تاج کو لے کے عاجز ہو جانا اہل دنیا کا کام ہے اور سب

کچھ ترک کر کے کلمہ پڑھو ایسا نامہ گان پر در دکار کا کام ہے۔

ماون یہ حالات دیکھتا رہا اور ایک طرف تو خوش ہوتا رہا کہ حریفوں کی نظر میں عزت بھی بڑھ رہی ہے اور عینار کی نگاہ میں عزت بھی بڑھ رہی ہے۔
کہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہلاک ہی ہو جاتا۔ اور بعض اوقات خود بھی عجیب و غریب سوالات کرتا تھا۔ عصمت انبیاء کے بارے میں اس کے سوالات مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ دریافت کرتا ہے کہ فرزند رسول! ایک مرد کو چار عورتوں کی اجازت دی گئی ہے تو ایک عورت کو چار مردوں کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اس طرح نسل مشکوک ہو جاتی اور کوئی شجرہ طے نہیں ہو سکتا۔ ہر پیدا ہونے والا یہ مشتبہ ہے کہ آتا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور پھر اللہ نے خلقت میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ رکھی ہے اب اگر نظام الہی کیا تو ایک پوری خلقت کنواری ہی رہ جائے گی۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ اسلام میں زنا کیوں حرام ہے؟ زنا میں نسب طے نہیں ہو سکتا اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ آنے والے کے نسب کا صحیح علم رہے تاکہ میراث وغیرہ کے مسائل مشکوک نہ ہونے پائیں۔ جہاں نسب مشکوک ہوتا ہے وہاں میراث کے مسئلہ میں جھگڑا اٹھ جاتا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن ماون ان کمالات کو برداشت بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے ہر آن خطرہ تھا کہ دنیا کا رخ علی رضا کی طرف نہ ہو جائے چنانچہ ایک دن یہ طے کر لیا کہ حضرت کو زہر دے کر ختم کر دیا جائے۔ اور ماون نے یہ منصوبہ بنالیا اور حضرت نے ہر ثمرہ کو بلا کر فرمایا کہ میرا وقت قریب آچکا ہے۔ عنقریب یہ ظالم مجھے انگوڑیوں میں زہر دے گا اور انگوڑیوں کو زہر آلود دھانگے میں پرو یا جائے گا۔ پھر ہاتھوں میں زہر مل کر انار پھوڑا

جائے گا اور مجھے پلایا جائے گا۔ میں دور دراز کے بعد دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ دیکھو ہر ثمرہ تم میرے قریب نہ آنا اور جب میرا انتقال ہو جائے تو انتظار کرنا میرا فرزند اگر غسل و کفن دے گا۔ اس کے بعد تم اندر آنا۔ ماون میرا اہتمام کرنا چاہتا لیکن کہہ دینا کہ اگر جنازہ کو ہاتھ لگایا تو عذاب الہی نازل ہو جائے گا۔ بارون کے قریب میری قبر تیار ملے گی۔ اس میں مجھے دفن کر دینا۔ اور جب ماون سرگندشت پوچھے تو میرے فرزند کی آمد اور زہر کی تیاری کا پورا واقعہ بیان کر دینا۔

وقت گذرا۔ ماون نے حضرت کو دربار میں طلب کیا۔ ہر ثمرہ نے پیغام پہنچایا۔ آپ نے فرمایا میرا وقت آگیا ہے۔ دربار میں آئے اس نے انگوڑی پیش کئے۔ آپ نے انکار فرمایا۔ اس نے کہا کہ اس سے بہتر انگوڑی لکھن نہیں ہیں آپ نے فرمایا کہ جنت میں اس سے بہتر ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ میری طرف سے مشکوک ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا وقت آچکا ہے۔ یہ کہہ کر دو ایک دانے تناول فرمائے۔ اور اٹھ کر چل دیئے۔ ماون نے پوچھا کیا ارادہ ہے فرمایا جہاں تو نے بھیجا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ بیت الشرف میں آکر کر دیں بدلتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد انتقال فرمایا۔ ہر ثمرہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک غیمہ نصب ہے اور اس میں سے غسل و کفن دینے کی آوازیں آرہی ہیں غسل و کفن تمام ہوا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں نے ماون کو اطلاع دی۔ اس نے تجھیز و تکفین کا ارادہ کیا۔ میں نے وصیت کا ذکر کیا۔ اس نے کہا اور کیا کہا ہے۔ میں نے کہا کہ انگوڑی پورا واقعہ بیان کیا ہے۔ ماون بوکھلا گیا اور کہنے لگا کہ مجھ پر رسول کی لعنت۔ علی کی لعنت۔ حسن و حسین کی لعنت۔۔۔۔۔ یہ میں نے کیا غضب کیا غیر دیکھو ہر ثمرہ کسی سے اس واقعہ کو بیان نہ کرنا۔ حکومت کی طرف سے اعلان عام کر دیا

امام محمد تقی علیہ السلام

اسم مبارک

محمد

لقب

تقی - جواد

کنیت

ابو جعفر

والد ماجد

امام علی الرضا

والدہ ماجدہ

جناب سبیکہ

ولادت

۱۰ ربیع المرجب ۱۹۵ھ (جمعہ) مدینہ منورہ

شہادت

۲۹ ذیقعدہ ۲۲۰ھ سہ شنبہ

عمر مبارک

۲۵ سال

قبر مطہر

ساظین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على اشرف الانبياء
والموسلين خاتمة النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد وآله الطيبين
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله الحكيم

في كتابه الكريم ————— بسم الله الرحمن الرحيم
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْاُولٰى

ارشاد جناب اہدیت ہے "میتک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے
اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

اس ارشاد نے ہمارے واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے ہر دور میں ہدایت
کا انتظام کیا ہے۔ اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا جس میں کوئی نہ کوئی ہدایت
کا بند و بست نہ کیا ہو۔ کبھی صامت کے ذریعہ ہدایت کی کبھی ناطق کے ذریعہ
کبھی کتاب نازل کی کبھی صحیفہ اتارا — کبھی کسی گھر کو ہدایت بنایا کبھی کسی
بشر کو — غرض کہ ہدایت کے جس قدر انتظامات ممکن تھے کوئی ایک خطام بھی
نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اور زندگی کے ہر ایک موڑ پر ایک نہ ایک ہادی دراز ہمارا
ضرور معین کیا گیا — کتابوں اور صحیفوں کے ساتھ ہمیشہ یہ لحاظ رکھا گیا کہ
ہے کہ کوئی صحیفہ ہوا میں نہیں اڑایا گیا۔ اور کوئی کتاب فضا پر نہیں نقش کی گئی
بلکہ جب کوئی صحیفہ اتارا گیا تو کسی نبی پر اور جب کوئی کتاب نازل کی گئی تو کسی
رسول پر مصلحت پر در و گار کو پروردگار جلنے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی
ہے کہ اگر صحیفہ کو ہوا میں اڑا دیا جاتا اور کتاب کو فضا پر نقش کر دیا جاتا۔
الفاظ قوم تک پہنچ جاتے لیکن معانی کا ذمہ دار کون ہوتا —————
مقصود پر در و گار صرف الفاظ ہی نہیں ہیں۔ اس کا منشا و نقطہ یہ نہیں ہے

کہ قوم الفاظ کو حفظ کرے اور ہدایت پا جائے۔ اس نے تورات کی تختیاں بھی اتاری ہیں تو کسی امتی کے ہاتھ پر نہیں بلکہ کوہ طور پر جناب موسیٰ کو ملا کر ان کے حوالے کی ہیں۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہمارا مقصود الفاظ اور نقوش نہیں ہیں۔ ہمارا مقصود معانی ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ عالم انسانیت ان الفاظ کے معانی کو پہچانے۔ اور میرا نہیں پر عمل کرے۔ الفاظ تو نقطہ مانع تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ ورنہ جب معانی کے بغیر صرف الفاظ کا استعمال اسلام نہیں ہو سکتا تو ساری کتاب کیوں کہ ہدایت بن سکتی ہے۔ قدرت کے اس انتظام نے امت اسلامیہ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور علماء اسلام کو یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ مالک نے قرآن حکیم کو قلب مرسل اعظم پر اسی لئے اتارا ہے کہ دنیا حضور کی زبان فیض ترجمان سے الفاظ قرآن نے اور حضور کے قلب اقدس سے معانی کا استفادہ کرے۔ وہ الفاظ الفاظ نہیں ہیں جو حضور کے ذہن مبارک سے نکلیں اور وہ معانی معانی نہیں ہیں جو حضور کے ذہن مبارک سے برآمد نہ ہوں۔ قرآن اپنی حقیقت میں حضور کی زبان کا بھی نمونہ ہے اور حضور کے دماغ کا بھی۔ اب اگر اس زبان میں فرق پیدا ہو جائے تو الفاظ قرآن بے اعتبار ہو جائیں۔ اور اگر اس ذہن پر بیماری کا غلبہ ہو جائے تو معانی قرآن کا اعتبار نہ رہ جائے۔ شاید انہیں معانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے حضور کے ذہن اقدس پر حلا کیا گیا تھا کہ جب تک ان کا ذہن حائل نہ کیا جائے گا اس وقت تک اپنے ذہن کا اعتبار نہ پیدا ہو سکے گا۔

ادھر قدرت نے واضح کر دیا کہ اگر تم نے رسول کے دماغ پر حملہ کیا تو اس کا کچھ نہ بگڑے گا۔ تم معانی قرآن سے محروم ہو جاؤ گے اور تمہارے پاس فقط الفاظ کا ذخیرہ رہ جائے گا۔ مہربان کتاب اللہ میں الفاظ

ہی الفاظ ہیں معانی نہیں ہیں۔

قدرت کے انتظام نے اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ مرسل اعظم نے ہر دماغ عالم سے الفاظ بھی لئے ہیں اور معانی بھی۔ اس نے قلب پیغمبر پر الفاظ معانی کے ساتھ نازل کئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ الفاظ نازل کر دیئے ہوں اور معانی کو محفوظ کر لیا ہو۔ یا معانی عنایت فرما دیئے ہوں اور الفاظ کو بچا لیا ہو۔ ایسا ہوتا تو قرآن اور حدیث میں فرق ہی نہ رہ جاتا۔ قرآن اور حدیث کا ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اشارہ خداوندی دونوں میں ہوتا ہے۔ منشاء الہی دونوں میں کارفرما ہوتا ہے۔ فرق مزید یہ ہے کہ ایک میں صرف مقصد نبی کو دیا جاتا ہے اور الفاظ کا انتخاب حالات کے اعتبار سے نبی کے حوالے ہوتا ہے اور دوسرے میں الفاظ و معانی دونوں معین ہوتے ہیں۔ اس میں کسی انتخاب و اختیار کو دخل نہیں ہوتا اور واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جہاں صرف معانی خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور الفاظ نبی کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسے حدیث کہا جاتا ہے۔ اور جہاں الفاظ اور معانی دونوں خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسے قرآن کہا جاتا ہے۔ حدیث کو الفاظ بدل کے نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا ایک نقطہ بھی نہیں بدلا جاسکتا۔ اور یہ فرق شاید اسی لئے رکھا گیا ہو کہ قرآن کا مخاطب روز ازل سے معین ہے کہ اسے حضور سرور کائنات پر نازل ہونا ہے اور حدیث کے مخاطب حالات کے اعتبار سے بدلتے رہیں گے۔ کبھی سلمانؓ والو ذریعے صاحبان علم و کردار مخاطب ہوں گے اور کبھی عرب صحرائی۔ قدرت نے یہ اختیار پیغمبر کے ہاتھ میں دیدیا ہے کہ جیسے مخاطب سامنے آئیں اسی قسم کے الفاظ استعمال کریں تاکہ وہ مدعا سمجھ سکیں اور قرآن کی مکمل تفسیر ہو سکے۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی حالات کے

اعتبار سے ایسا ہی کیا۔ اور دنیا کے ادب کا ایک اہم مسئلہ حل ہو گیا جو اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ جب قرآن بھی وحی الہی ہے اور کلام رسول بھی وحی الہی کا پابند ہے تو ایک اس قدر بند کیوں ہو گیا کہ معجزہ بن گیا اور دوسرا اس قدر کم کیوں ہو گیا کہ سب کچھ ہو کے بھی معجزہ نہ بن سکا۔ کیا خدایہ یہ چاہتا ہے کہ عمدہ کلام کو اپنی طرف منسوب کر لے اور معمولی کلام کو اپنے حبیب کی طرف منسوب کر دے۔ مآذ اللہ۔ یا کوئی معلولت اور ہے۔ لیکن جواب بالکل واضح ہے کہ دونوں ایک ہی ذات کے کلام ہیں۔ قرآن بھی وحی الہی ہے۔ اور حدیث بھی باشارہ وحی الہی ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا مخاطب رسول ہے اور ایک مخاطب عرب صحرائی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جیسا مخاطب ہو گا ویسا ہی کلام ہو گا۔ مخاطب بند مرتبہ کا ہو گا تو کلام کا مبیہار لگند ہو گا اور مخاطب اگر پست ہو گا تو کلام کا مبیہار بھی خود بخود بدل جائے گا۔ اس میں مستحکم کا لفظ نہیں ہے حالات کا فرق ہے۔

قرآن و حدیث کے اس فرق سے ایک مسئلہ اچھل ہو گیا کہ پروردگار نے اہل بیت پر میر کو قرآن ناطق کیوں بنایا۔ حدیث ناطق کیوں نہیں تیار دیا بات یہ ہے کہ قرآن تمام تر خدا کی طرف منسوب ہے۔ اس کا کبھی بندے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور حدیث کا انتساب بہر حال بندے کی طرف ہے۔ قدرت نہیں چاہتی ہے کہ اہلیت کا انتساب کسی بندے کی طرف نہ چاہے وہ رسول ہی کیوں نہ ہو کہ اس طرح امت کو انکار کا راستہ مل جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ بدلے جاسکتے ہیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ میں بھی تغیر نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس محکم کلام کا نام ہے جس کا انتساب بھی مستحکم ہے۔ الفاظ بھی مستحکم اور معانی بھی مستحکم۔ کسی طرح کے رد و بدل کا کوئی

امکان نہیں ہے۔ یہی انداز اہلیت کا ہے۔ یہاں سارا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ ان کا انتخاب بھی خدا کے حوالے۔ ان کا ظاہر بھی خدا کے حوالے ان کا باطن بھی خدا کے حوالے۔ یہ خود خدا کے حوالے اور جو ان سے دشمنی کرے وہ بھی خدا ہی کے حوالے۔

قرآن صامت کی ہی دشمنی کا انجام معلوم ہے۔ اب قرآن ناطق کی دشمنی کا انجام بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن ظاہر ہے تو اس کا دشمن اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اہلیت معنویت قرآن ہیں تو ان کا دشمن بھی باطن اسلام یعنی ایمان سے خارج ہو جائے گا۔

مجھے علماء اسلام سے بھی یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تو آپ حضرات نے طے ہی کر دیا ہے کہ اللہ نے قرآن حکیم کو قلب پیغمبر پر اس لئے نازل کیا تھا کہ الفاظ و معانی سب محفوظ رہیں۔ اور قرآن فقط الفاظ کا مجموعہ نہ بن جائے۔ یا اہل دنیا اس کے معانی خود نہ تراشتے لگیں۔ تو کیا رسول اسلام ایسا ہی غیر ذمہ دار اور غیر دیا نندار تھا کہ خدا سے چیزیں لیں دو۔ اور امت کے حوالے کی ایک۔ اور صرف قرآن بھی لیا۔ اور معانی قرآن بھی اور ادھر جب چلتے لگے تو الفاظ امت کے حوالے کر دیئے اور معانی اپنے ساتھ لئے چلے گئے۔ یہ تو بڑی بددیانتی کی بات ہے کہ جس کی امت کو ضرورت تھی اور جس سے نظام ہدایت وابستہ تھا اسے اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور جس کی بظاہر اُس قدر اہمیت نہ تھی اسے چھوڑتے گئے تاکہ آئے دن جھگڑا ہوتا رہے نئے نئے معانی پیدا ہوتے رہیں۔ اور امت بھٹکتی رہے۔ اگر مثلاً رسول یہی تھا کہ امت میں فساد ہو۔ قوم گمراہ ہو اور قرآن کے نئے نئے معانی ایجاد کئے جائیں تو قرآن بھی چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی حواست نئے نئے معانی تراش سکتی ہے وہ الفاظ بھی بنا سکتی ہے اور الفاظ کی ضرورت بھی کیا ہے

منشائے الہی تو معانی میں ہوتا ہے اور جب معانی کی ضرورت نہیں ہے تو منشائے الہی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب منشائے الہی کی ضرورت نہیں ہے اور اپنے ہی منشائے احکام الہی مقرر کرنا ہیں تو الفاظ قرآن ہی کی کیا ضرورت ہے اپنا منشائے الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ آوازیں گے خبردار! مجھ پر بددیانتی کا الزام نہ لگانا۔ خبردار میری امانت داری میں شبہ نہ کرنا۔ میں نے جو کچھ خدا سے لیا ہے سب تمہارے لئے لیا ہے۔ اور جو کچھ تمہارے لئے لیا ہے وہ سب تمہیں دیدیا ہے۔ میں نہ کلمہ لے کر جا رہا ہوں نہ کلمہ نہ قرآن لے کر جا رہا ہوں نہ اسلام۔ نہ احکام لے کر جا رہا ہوں نہ شریعت۔ نہ دین لے کر جا رہا ہوں نہ مذہب۔ میں نے جو کچھ لیا ہے وہ سب تمہیں دیدیا ہے۔ اب یہ کئی ممکن ہے کہ سارے مسائل تمہارے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور ایک ہی منسل پر بددیانتی کی جائے۔ یاد رکھو میں نے الفاظ قرآن لئے ہیں تو وہ بھی تمہارے لئے اور معانی قرآن لئے ہیں تو وہ بھی تمہارے لئے۔ اور جب سب تمہارے لئے لیا ہے تو یہ میرا حسن انتظام ہے کہ ایسی زبانیں چھوڑے جاتا ہوں جن کا فطرتی میرا فطرتی ہوگا اور ایسے دل دماغ چھوڑے جاتا ہوں جن کا علم میرا علم ہوگا۔ میں تنہا قرآن چھوڑ کر نہ جاؤں گا کہ تمہیں شکایت پیدا ہو جب جاؤں گا تو قرآن بھی چھوڑ کر جاؤں گا اور اہلیت کو بھی تاکہ قرآن سے الفاظ لئے رہیں اور اہلیت سے بچے۔ شاید اسی لہجہ اور معانی کا انداز سمجھانے کے لئے ایک طرف علیؑ کو سان اٹھنا یا گیا۔ اور دوسری طرف باب مدینۃ العلم سان اٹھنا یا گیا تاکہ لہجہ پروردگار مل جائے۔ اور باب علم بنایا گیا تاکہ معانی قرآن حاصل ہو جائیں۔ صلاب

امانت داری کی بات یہیں پر تمام نہیں ہوتی۔ رسولؐ تو اس قدر

امانت دار ہے کہ جو امانت جس طرح لی ہے اسی طرح قوم کے حوالے کی ہے اگر امانت کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے تو ہاتھوں ہاتھ پہنچا یا ہے اور اگر دل دماغ کی راہ سے لیا ہے تو دل دماغ کی راہ ہی سے پہنچا یا ہے۔ یاد رکھیں قرآن کے الفاظ زبان کی راہ سے آئے تھے۔ تو انھیں زبان کے ذریعہ پہنچا یا۔ اور قرآن کے معانی دل کی راہ سے آئے تھے اور انھیں جبریل امینؑ نے قلب پیغمبرؐ پر اتار تھا تو انھیں دل دماغ کی راہ سے پہنچا یا ہے۔ کیا سورہ جمعہ کا وہ فقرہ یاد نہیں ہے کہ اللہ نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے تاکہ ان کے درمیان آیات کی تلاوت کرے۔ ان کے نفوس کو پاک دیا کیزہ بنائے۔ اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ آیت کریمہ میں تلاوت کا ذکر الگ ہے۔ اور تعلیم کا ذکر الگ ہے اور یہ اعلان ہے کہ تلاوت کا تعلق زبان سے ہے اور علم کا تعلق دل سے۔ پیغمبرؐ نے جس طرح الہی تعلیمات کو لیا ہے اسی طرح زبان و دل سے پہنچا یا ہے اور یوں بھی انسان کی کل حقیقت زبان و دل سے وابستہ ہے۔ اگر زبان مہادق اور دل اس کے مطابق ہے تو انسان انسان ہے ورنہ منافق ہے اور انسان نہیں ہے۔ مرسل اعظمؐ نے زبان سے تلاوت کی اور ذہن و دل دماغ کے ذریعہ معانی کو دلوں میں اتار دیا۔ اور یہ کمال پیغمبرؐ تھا کہ معجز سننا کلام کے معانی امت کے ذہن میں اتار دیئے۔ اور تلاوت و تعلیم کے فرق سے یہ بھی واضح کر دیا کہ تلاوت کی منسل پاکیزگی نفس سے پہلے ہے اور تعلیم کی منسل بعد میں ہے۔ تلاوت اس کے سامنے بھی ہو سکتی ہے جس کا نفس پاکیزہ نہیں ہے لیکن تعلیم کے لئے پاکیزگی نفس ضروری ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ تلاوت کفار و مشرکین کے سامنے بھی کی گئی لیکن معانی کا اثر صرف مساجدان ایمان و کردار پر ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ حضورؐ نے جس طرح امانت لی تھی اسی طرح قوم کے حوالے

کر دی اور اب مجھے کہنا پڑا ہے کہ قرآن جبریل سے دل پر یا تھا۔ اور اہلبیت کو بنت اسد سے ہاتھوں پر یا تھا۔ اسی لئے قرآن کو دلوں کے حوالے کر دیا اور اہلبیت کو غدیر خم کے میدان میں ہاتھوں ہاتھ دیدیا۔ اب جب تک علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ ہوگی قافلہ آگے نہ بڑھے گا۔ کتنا دیانت دار تھا۔ وہ پیغمبر جس نے خدا سے جو کچھ یا اور جس طرح یا سب امت کے حوالے کر دیا۔

اور میں تو کہوں گا کہ اس شان دیانت کو کفار سمجھ کر مسلمان نہیں سمجھتے وہ ہجرت کے بعد یقین کے رہے کہ رسولؐ امانت دار ہے امانت ضائع نہیں کریگا اسی نے بیعت کو علیؑ کے پاس آکر نبیؐ کے بارے میں پوچھا۔ امانتوں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ لیکن ہماری امانتوں کو ضائع نہیں کر سکتے۔ ادھر پیغمبرؐ کو بھی اتنا خیال تھا کہ تلواروں کی چھاؤں میں علیؑ کو چھوڑ کر چلے گئے اور فرمایا یا علیؑ امانتوں کو واپس کئے بغیر نہ آنا۔ ورنہ میرا ۵۳ سال کا رونا نہ برباد ہو جائے گا۔ اور جس قوم نے ۵۳ سال تک مجھے امین کہا وہ بد دیانت کہنے لگے گی۔ اللہ اکبر۔ نبیؐ کو کتنا اعتماد تھا علیؑ کی شجاعت و امانت پر کہ بستر بھی حوالے کر دیا اور امانت بھی۔ بستر پر ٹاٹا دیا کہ ایسا صاحب ہمت و بہادر ہے کہ کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا۔ اور امانتیں حوالے کر دیں کہ ایسا دیانت دار ہے کہ خیانت نہیں کر سکتا

رسولؐ تشریف لے گئے اور تاریخ اسلام کے ”ذمہ دار حضرات“ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اب اگر علیؑ بھی معاذ اللہ امانتوں کو واپس نہ کریں یا واپسی میں کوئی کوتاہی برتیں تو نبوت کا وقار کھارہ جائے گا۔ اور نبیؐ کی عزت کس منزل پر ہوگی۔ کیا نازک موقع تھا کہ نبوت کا سارا وقار امانت کے ہاتھوں میں تھا۔ علیؑ امانت واپس کر دیں تو نبیؐ امین ہیں اور نہ واپس کریں تو کفار کی

نگاہ میں بد دیانت۔ اللہ رے اعتبار علیؑ کہ نبیؐ نے اپنا وقار علیؑ کے حوالے کر دیا۔ اور جانتے ہیں کہ یہ زندہ رہے گا تو میرے وقار میں فرق نہ آئے گا اب دنیا بتائے کہ نبیؐ کا امانت دار کون ہے۔ اور نبیؐ کے وقار کا محافظ کون ہے۔ اور پھر انصاف کرے کہ امانت دار کو دین کا امین بنایا جائے گا یا کافر کو بنایا جائے گا۔ محافظ وقار کو حافظ شریعت بنایا جائے گا یا کسی اور کو۔ میں نہیں کہتا کہ اسلام میں کس کا مرتبہ کیا تھا۔ اور کس کا مقصد کیا تھا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ رسولؐ اپنے ”دوست“ بیعت چلے گئے تھے۔ اب تو عزت و آبرو صرف علیؑ کے ہاتھ میں ہے اور علیؑ نے جان کی بازی لگا کر آبرو بچا لی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ پیغمبر صرف جان بچانا جانتا ہے عزت و آبرو دار وقار و ایمان اپنے ہی بچا یا کرتے ہیں۔ وقت پر بھائی ہی کام آتا ہے۔ غیر کام نہیں آتا۔

یہ قدرت کا انتظام ہدایت تھا کہ اس نے شریعت کے ساتھ محافلین شریعت اور قرآن کے ساتھ واقعی محافظ قرآن رکھے ہیں جو الفاظ کے ساتھ معانی اور عبارات کے ساتھ مقاصد بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ”میرا خیال یہ ہے“ یا ”میرا علم یہ کہتا ہے“ یا ”بجسب قوانین آیت کے معنی یہ نکلتے ہیں“ یا فلاں صحابی کا یہ قول ہے۔ بلکہ وہ ڈنکے کی جوت پر اعلان کرتے ہیں کہ میرا خدا یہ ہے۔ مقصد پر در و نگار یہ ہے۔ منشاء الہی یہ ہے۔ لوح محفوظ میں یہ ہے۔ جبریل یہ لائے ہیں اور سرِ اعظم نے یہ بیان کیا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کا یہ علم ہے۔ جو لوح محفوظ سے شروع ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ ہمارے واسطے میں کوئی غیر معصوم نہیں ہے۔ ہم عصمت کی چادر دلدار میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہم مریخی جاتے ہیں۔

تو ہمارے غل و گھن میں کوئی غیر معصوم اچھے نہیں لگتا اور ہم آخری منزل تک عصمت ہی کے سہارے جاتے ہیں۔

تاریخ میں یہ شار واقعات ہیں جہاں محافظان علم و شریعت نے یہ واضح کر دیا کہ جو علم ہمارے پاس ہے وہ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اور جس وقت ہم حامل شریعت ہوتے ہیں اس وقت دوسروں کے گھروں میں شریعت کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ امام محمد تقیؑ کا بچپنا ہے امام رضا علیہ السلام تشریف فرما ہیں۔ دنگ آکے کہتے ہیں کہ آپ کے بعد امام کون ہو گا؟ آپ نے فرمایا میرا فرزند محمد تقیؑ۔ لوگوں نے عرض کی کہ وہ تو ابھی بچے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ غائبہ پروردگار بچہ اور جوان نہیں ہوتا۔ اس کا علم بارگاہِ اہدیت سے آتا ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ عیسیٰ نے گوارے سے کتاب و نبوت کا اعلان کیا تھا۔ تو اگر عیسیٰ گوارے میں صاحب کتاب اور نبی ہو سکتے ہیں، تو میرا فرزند تین برس میں امام کیوں نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تمہیں شک ہو تو اسکا کر کے دیکھو کہ علم کی کون سی منزل ہے اور کمالات کا کیا عالم ہے۔ یہ امت نہیں ہے کہ بوڑھے بھی جاہل ہمارے جائیں۔ یہ عزت ہے جہاں بچہ بھی آغوشِ مادر سے لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کا دنیا کو یقین نہ آیا لیکن جب قدر متوانے پر آجاتی ہے تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ امام رضا علیہ السلام کی شہادت ہو چکی ہے۔ فلک کا نقشہ بدل چکا ہے۔ ان کے سامنے عجیب و غریب حالات ہیں۔ ایک طرف عباسی افرادِ ماضی ہیں کہ بنی فاطمہؑ کو ولی عہد کیوں دی گئی۔ دوسری طرف بنی فاطمہؑ میں بھی قیامت برپا ہے کہ ولی عہد کی دیکر بھی دھوکہ دیا۔ اور زہر دے کر شہید کر دیا۔ مامون عجیب

شش و پنج میں ہے۔ کرے تو کیا کرے۔ بنی عباس کے زخم پر ہم رکھتا ہے تو بنی ہاشم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور بنی فاطمہؑ کو راضی کرتا ہے تو بنی عباس باتو سے ٹک جاتے ہیں۔ اس نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پھر دورنگی چال چلی جائے۔ جس طرح امام رضاؑ کو ولی عہد بھی بنایا گیا اور زہر بھی دلا دیا۔ بہن کا عقد بھی کیا اور زندگی کا عقد بھی کر دیا۔ اسی طرح فرزندِ رضاؑ کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے۔ اور ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ دونوں جماعتیں خوش ہو جائیں۔ سادات کا جوش انتقام بھی ٹھنڈا ہو جائے اور بنی عباس کی بغاوت بھی سر نہ اٹھانے پائے۔ چنانچہ اس نے امام رضاؑ کی شہادت کے بعد پہلا قدم یہ اٹھایا کہ حکومت کا پرچم ہزارے پھر سیاہ کر دیا۔ اور بنی ہاشم کے رنگ پر بنی عباس کے رنگ کو غائب بنا دیا۔ ادھر معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے فرزندِ رضاؑ کے بجائے اپنے بھائی المومنین کو ولی عہد بنا دیا اور یہ عہدہ اپنے بیٹے کو بھی نہیں دیا تاکہ قوم پر دیانت داری کی دھاک بیٹھی رہے۔ بنی عباس بڑی حد تک مطمئن ہو گئے اور مامون کو یقین پیدا ہو گیا کہ اس نے بغاوتوں کا سرکچل دیا ہے۔ لیکن امین کے قتل کے بعد جو صورت حاصل پیدا ہوئی اس پر قابو پانا ذرا مشکل کام تھا اور سادات کے دل میں جو جذبہ انتقام پیدا ہوا تھا اسے سرد کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ فرزندِ رضاؑ کو بلا کر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے کہ بنی فاطمہؑ بھی مطمئن ہو جائیں اور ان کا ہنگامہ بھی ختم ہو جائے۔

چنانچہ اس نے پیغام بھیج کر امام محمد تقیؑ علیہ السلام کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا۔ آپ بغداد تشریف لے آئے تو ایک دن سر راہ کھڑے ہوئے تھے۔ ادھر سے مامون کی سواری گزری۔ تمام لوگ راستہ چھوڑ کر سٹ

گئے۔ آپ نہیں تھے۔ اس نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے ایسا زبردست جواب دیا کہ وہ بہوت ہو گیا اور فوراً سمجھ گیا کہ یہ خاندان رسالت کی کوئی فرد ہے آپ نے اپنا تعارف کرایا کہ میں فرزند علی بن موسیٰ الرضا ہوں۔ اس نے گلے سے لگا لیا۔ اور اپنے ساتھ دربار تک لے آیا۔ اب عزت و اکرام کا یہ عالم ہے کہ نہ پوچھے۔ باپ کے قتل کا الزام بھی دھوٹا ہے۔ بنی فاطمہ کو راضی بھی کرنا ہے۔ اور امام رضا علیہ السلام کی شہادت سے جو علی خسل پیدا ہوا ہے اسے پڑ بھی کرنا ہے۔ مامون جانتا ہے کہ یہ کام اولاد رسول کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بیدار عزت و احترام ہے اور بے انتہا عزت و اکرام۔ ہر وقت ساتھ ہر آن خدمت۔ دربار میں آتے ہیں تو اپنے برابر بیٹھا تا ہے۔ تشریف لاتے ہیں تو تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی عباس پر کیا گزرنا چاہئے تھی۔ وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہ بادشاہ پھر بہک گیا اس کا دماغ پھراٹ گیا۔ نہ جانے بنی فاطمہ کے پاس کون سا ہنر ہے کہ جب ان کا سامنا ہو جاتا ہے تو بادشاہ بدحواس ہو جاتا ہے اور ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ بھلا یہ سات سال کا بچہ اور یہ مامون بیہوش عالم اور علم دوست بادشاہ اور یہ تعظیم و اکرام۔ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے۔ کیا دربار کے سارے علماء مر گئے ہیں۔ کیا ملک میں کوئی صاحب کمال نہیں رہ گیا ہے کہ سب سے زیادہ احترام اس بچہ کا کیا جائے۔ ہر شخص دل ہی دل میں جل بھن رہا ہے لیکن رعب شاہی مانع ہے۔ کسی میں سانس لینے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ بنی فاطمہ نہیں ہیں کہ بادشاہوں کو سہرا ہ توک دیں۔ یہ دربار کے نمک حواریں۔ یہ نرید کے سامنے نہ بول سکے تو

مامون کے سامنے کیا بولیں گے۔ یہ تو علم دوست اور ہنرمند بھی ہے۔ وقت گذرتا رہا لیکن ایک مرتبہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ کوئی شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اور سب نے سر تھیلی پر رکھ کر مدعا بیان کر دیا۔ بادشاہ! اب ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہم نے بہت صبر کیا لیکن آپ کے اقدامات حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ذلت برداشت کر لی۔ ہم نے ایک بچہ کی عزت برداشت کر لی۔ ہم نے بنی فاطمہ کا احترام برداشت کر لیا۔ ہم نے بنی عباس کی توہین برداشت کر لی۔ لیکن ساتھ کہ حضور اپنی لڑکی ام الفضل کا عقد اس بچہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات کو ہرگز برداشت نہ کریں گے یہ آپ کی عزت کا مسئلہ ہے۔ ہماری عزت خاک میں مل جائے لیکن آپ کی عزت کی بربادی برداشت نہ کریں گے۔ بھلا دنیا کیا کہے گی کہ بنی عباس میں کوئی لڑکا نہ ملا۔ خاندان میں کوئی ایک نہ پیدا ہوا اور بنی فاطمہ کے ایک بچہ کو بیٹی دیدی گئی۔ اگر آپ کا ایسا ہی خیال تھا تو لوگوں سے مشورہ کر لیا ہوتا۔ حالات کا جائزہ لے لیا ہوتا۔ ابھی ملکی حالات قدرے ردبراہ ہوئے تھے کہ آپ نے پھر ایک قیامت کر دی۔ سوچئے ذرا یہ کس بچہ اور حضور کی شہزادی کا کیا ربط ہے۔ کیا مناسبت ہے۔ اچھا اگر یہی ارادہ کر لیا ہے اور اپنے ارادہ میں ترمیم کا بھی ارادہ نہیں ہے تو کم از کم کچھ دن معلم کے پاس بھیج کر بچہ کو پڑھوایجئے۔ کچھ سکھایجئے۔ یہ تو نہ ہو کہ بادشاہ کا داماد جاہل ہے۔ بیٹی کو یہ شرمندگی نہ اٹھانا پڑے کہ میرے باپ نے میرا عقد ایک ان پڑھ سے کر دیا ہے۔ مامون یہ سب سنتا رہا اور آخر میں فیصلہ نہ دیا کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔

میں پہچانتا ہوں یہ ابن الرضا ہے۔ یہ فرزند رسول ہے۔ یہ دہند فاطمہ ہے۔
 اس کے علم کی کوئی پناہ نہیں ہے۔ تم میں کون ہے جو اسے پڑھائے شگاہ پہلے
 اس کے علم کا تو اندازہ کرو بائیں بعد پڑھانا۔ یہ تم سب کو پڑھانے کے لئے اکیلا
 کافی ہے۔ قوم یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گئی۔ اسے یہ امیر ہدیان بک
 رہا ہے۔ آخر اسے کیا ہو گیا ہے، یہ محبت اہلبیت میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ بچہ کو
 سارے دربار سے زیادہ قابل کہتا ہے۔ اور صاحبزادے کو سب کا استاد بتاتا
 ہے۔ خیر۔ اگر اس نے رسوائی ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن
 یہ چیلنج بھی برداشت نہیں ہے کہ یہ اکیلا سب کو پڑھا سکتا ہے تو ہسی کہ ایک
 دن مقابلہ کر دیا جائے اور بادشاہ کو بھی باخبر کر دیا جائے کہ اس کا فیصلہ
 کس قدر غلط ہے۔ یہ سوچ کر لوگوں نے عرص کی۔ امیر آپ نے غور نہیں
 فرمایا ملک میں بڑے بڑے قابل لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ محمد تقیؑ پھر ابھی
 بچے ہیں۔ آپ ان کے بارے میں اتنی خوش فہمی کے شکار نہ ہوں۔ حالات
 پر غور کر لیجئے۔ مامون نے کہا میں نے سب غور کر لیا ہے۔ جانچ لیا ہے،
 امتحان کر لیا ہے۔ اب آپ حضرات میں بڑا دم ہے تو اس سے باتیں کیجئے۔
 خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے قوم کو غصہ آگیا۔ عرض
 کی حضور! پھر ایک دن طے کر دیجئے ہم اس بچے کا امتحان کر لیں گے۔ تاریخ
 طے ہو گئی۔ وقت مقرر ہو گیا۔ ملک بھر کے علماء جمع ہو گئے۔ غوام و خیراص
 کے علاوہ نو سو علماء کرام سیدوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور امام محمد تقیؑ کو بادشاہ
 کے برابر تخت پر بٹھایا گیا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مامون نے کہا تم میں کون
 ہے جو اس بچے سے بات کرے گا۔ لوگوں نے کہا قاضی القضاۃ عیسیٰ ابن ائیم سے
 بہتر کوئی نہیں ہے۔ وہی اس بچے کا امتحان لیں گے مامون نے کہا بسم اللہ

یہی نے کہا امیر اجازت ہے میں اس بچے سے کوئی سوال کر دوں۔ مامون نے
 کہا یہ آپ کی تہذیب ہے، اجازت اس سے لینا چاہیے کہ محمد سے، محمد سے
 کیا مطلب ہے۔ یہی گھبرا کر ادھر متوجہ ہوا۔ صاحبزادے اجازت ہے۔
 آپ نے فرمایا بیشک۔ اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کرے
 تو اس کا کفارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سوال ہی مہمل ہے تو جواب کیا
 دیا جائے۔ کہیں اس طرح سوال سوال کیا جاتا ہے۔ سوال کے لئے پہلے
 صحیح صورت حال کا جائزہ لے لیا جاتا ہے تب سوال کیا جاتا ہے۔ ایک ایک
 مسئلہ کے ہزار رخ ہوتے ہیں۔ خدا جانے کون سا رخ سائل کے ذہن میں ہے
 کون سا رخ جواب دینے والے کے ذہن میں ہے۔ سوال کچھ ہو جاتا ہے
 جواب کچھ ہو جاتا ہے۔ پہلے آپ سوال کی نوعیت واضح کیجئے اور یہ بتائیے
 کہ مسئلہ کی ۲۲ قسموں میں سے کون سی قسم مراد ہے۔ جب مسئلہ کی قسم طے ہو جائے
 گی تو میں جواب بھی دے سکوں گا۔ مسئلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ یہ (۱) شکار
 مقام حل میں ہو گا یا حد و حصر میں (۲)، پھر شکار سی عالم مسئلہ ہو گا یا جاہل
 (۳) آزاد ہو گا یا غلام (۴) بانٹ ہو گا یا نابالغ (۵) اپنے علی پر نام ہو گا یا مصر
 (۶) عمدہ شکار کرے گا یا سہواً (۷) پہلی مرتبہ شکار کرے گا یا مکرر (۸) شکار
 بھی چرند ہو گا یا پرند (۹) چھوٹا ہو گا یا بڑا (۱۰) وقت شکار بھی دن ہو گا یا رات۔
 (۱۱) احرام بھی حج کا احرام ہو گا یا عمرہ کا؟ یہ بائیس شکلیں ہیں جب تک مسئلہ کی
 صحیح صورت سامنے نہ آجائے۔ جواب کس طرح دیا جاسکتا ہے۔ یہ سننا تھا
 کہ عیسیٰ کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اس نے کبھی اتنی شکلیں سوچی بھی نہیں تھیں
 مامون کا اصرار بڑھا۔ یہی بتاؤ کون سی صورت مراد ہے اور کس شکل کے
 بارے میں سوال کیا ہے۔ یہی کی سانس ہی رکی ہوئی ہے کہے تو کیا کہے۔

جواب الگ نہیں بن پڑا ہے۔ بھرے دربار میں ذلت الگ ہو رہی ہے۔
آخر علامہ نے کہا فرزند رسول! اب آپ ہی بتائیے کہ ان سوالات کا جواب
کیا ہے اور ان تمام صورتوں میں کفارہ کیا دینا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو
شکار پرندہ اور بڑا ہے تو مقام حل میں ایک بکری اور عدد و جسم میں
دو بکریاں اور اگر شکار چرند اور وحشی ہے تو ایک دنبہ کا بچہ اور ہرن ہے
تو پوری بکری۔ حرم میں ہے تو یہ دونوں چیزیں دہری ہو جائیں گی۔ احرام
بھی حج کا ہے تو قربانی منی میں ہوگی۔ ورنہ مکہ معظمہ میں۔ شکاری میں عالم
د جاہل سب برابر ہوتے ہیں۔ اور سب کو کفارہ دینا پڑتا ہے۔ البتہ سہواً
شکار کیا ہے تو معاف ہے عمدہ شکار کرنے میں کفارہ ہے۔ آزاد کا کفارہ
خود اس کی ذات پر ہے۔ غلام کا کفارہ اس کے آقا پر ہے۔ طفل صغیر پر
کوئی کفارہ نہیں ہے۔ بالغ پر کفارہ واجب ہے۔ شکار کرنے کے بعد نام
ہو گیا ہے تو صرف کفارہ ہے اور اپنے گناہ پر اڑا ہوا ہے تو عذاب آخرت
بھی ہے۔

یہ سننا تھا کہ سارا دربار چونک پڑا اور مامون فرط مسرت سے اچھل پڑا
آج حکومت کی عزت رہ گئی اور فرزند رسول نے اقتدار کی آبرو بچالی۔
اس کے بعد حضرت امام بخاریؒ کی طرف توجہ ہوئی۔ اجازت ہو تو کچھ میں بھی آپ سے
پوچھوں۔ ظاہر ہے کہ جو بخاریؒ سوال کرنے سے عاجز تھا وہ جواب کیا دے گا
مجبور ہو کر کہنے لگا۔ خیر آپ سوال کیجئے۔ ممکن ہو گا تو جواب دوں گا ورنہ
آپ ہی سے پوچھ لوں گا۔ آپ نے فرمایا وہ کون سی عورت ہے جو ایک مرد
پر صبح کے وقت حرام ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت
پھر حرام ہو گئی۔ عصر کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت پھر حرام

ہو گئی۔ عشاء کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ نصب شب کے وقت پھر حرام ہو گئی
صبح ہوتے ہوتے پھر حلال ہو گئی۔

بھیٹنے لگا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ابھی جانور کا مسئلہ نہیں حل ہو پایا
تھا کہ انسان کا مسئلہ پیش آ گیا۔ شکار کا مسئلہ کیا پوچھا کہ خود ہی شکار ہو گیا۔ اب
کوئی بس نہیں ہے۔ بالآخر عاجز آ کر کہنے لگا۔ فرزند رسول! آپ ہی بیان کریں
آپ نے فرمایا یہ ایک دوسرے شخص کی کینز ہے۔ جو انسان پر حرام ہے۔ طلوع آفتاب
کے وقت اسے خرید لیا تو حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت آزاد کر دیا پھر حرام ہو گئی
عصر کے وقت عقد کر لیا پھر حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت ظہار کا صیغہ پڑھ دیا
(اور اس کو اپنی ماں جیسا کہہ دیا) پھر حرام ہو گئی۔ عشاء کے کفارہ دیدیا پھر حلال
ہو گئی۔ نصب شب کے وقت طلاق دیدی پھر حرام ہو گئی۔ صبح ہوتے ہوتے
رجوع کر لی پھر حلال ہو گئی۔ ایک ہنسی عورت ہے جو حالات کے اعتبار سے اتنی
بار حلال ہوئی اور پھر حرام ہو گئی۔ (منائب)

گویا معصوم نے واضح کر دیا کہ شے پر نظر نہ رکھو حالات پر نظر رکھو۔ حالات
ہی حلال بناتے ہیں اور حالات ہی حرام بناتے ہیں اور یہ حقائق دہی جانتے ہیں
جو شریعت کے مزاج سے باخبر ہیں اور احکام کی حقیقت تک رسائی رکھتے ہیں۔
اور میں سمجھتا ہوں کہ معصوم نے درپردہ اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا جو اکثر لوگ
کہا کرتے ہیں کہ جب وفات رسولؐ کے بعد علیؑ نے خلافت کا دعویٰ کیا اور اس
کے لئے احتجاج کیا تو جب تین دور کے بعد خلافت مل رہی تھی تو انکار کیوں کیا
کیا اب اسے اپنا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یا پہلے ہی دعویٰ صحیح نہیں کیا تھا؟ فرزند رسولؐ
نے واضح کر دیا کہ شے حالات کے اعتبار سے بدل جایا کرتی ہے۔ کل خلافت
براہ راست رسولؐ کی خلافت تھی اس لئے قبول کرنے کے لائق تھی اور

اپنے شایان شان تھی اور آج خلافت، خلافت رسول نہیں ہے۔ بلکہ خلافت خلیفہ رسول ہے۔ اس لئے جب تک یہ نسبت درمیان سے ہٹ نہ جائے قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے جب تک بنبر رسول پر عمل رسول پر نہ بیٹھ گئے تو ہم سے بیعت نہیں لی تاکہ دنیا سمجھ لے کہ میں نے رسول کی جگہ لی ہے کسی خلیفہ رسول کی جگہ نہیں لی ہے۔ صلوات

اسی طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ جب صدیقہ طاہرہؓ نے فدک کا دعویٰ کیا اور مولائے کائناتؑ نے ان کی حمایت میں بیان دیا۔ ان کی گواہی پیش کی گئی اور آپ حکومت وقت کو حق زہراؑ کا غاصب سمجھتے رہے تو جب آپ کے ہاتھ میں حکومت آئی تو آپ نے فدک کیوں نہیں لے لیا اور اسے اپنی حالت پر کیوں رہنے دیا کہ ابن عبدالعزیز کے زمانے میں سادات تک واپس کیا جائے۔ جواب بہت تفصیلی ہے اس کے ذیل میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مولائے کائناتؑ نے اپنے دور میں فدک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ وہ تھا کہاں سے واپس لیا جائے دورانات میں کس طرح تقسیم ہو چکا تھا اور واپسی کا امکان کس حد تک تھا اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ جب مظلوم اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرا کے دنیا سے جا چکی ہے تو جاگیر کو واپس لینے کا مطلب مظلوم کے ثواب اور ظالم کے عذاب کی کمی ہے۔ اور علیؑ اسے گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ زہراؑ کے ثواب میں کوئی کمی ہو۔ یا داستان مظلومیت کسی دور میں بھی غنی اور مجروح ہو جائے لیکن فی الحال ان تمام باتوں کا حل نہیں ہے۔ اس وقت حالات کے بلکہ میں اتنا عرض کرنا ہے کہ کل اور آج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کل یہ باغ فاطمہ زہراؑ کا تھا اور حکومت غاصب بھی باقی تھی۔ اور آج حکومت وقت

اسے امت کا مال بنا چکی ہے۔ اور ایک ایک کے ذہن میں یہ بات بٹھا چکی ہے کہ بنت رسول کا دعویٰ غلط تھا۔ اس جاگیر کو بینبر امت کے حوالے کر گئے ہیں۔ اور یہ فرما گئے ہیں کہ ہمارا سارا ترکہ امت کا مال ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں میراث نہیں ہوتی تو مولائے کائناتؑ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب اگر فدک پر قبضہ کیا گیا تو کل صرف درخت زہراؑ احتجاج کر رہے تھے۔ اور آج تو پوری امت احتجاج کرے گی کہ علیؑ نے ہمارے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور امت کی جاگیر کو غصب کر لیا ہے اور جو الزام کل حکومت وقت کے سر تھا وہی آج امامت کے سر آجائے گا۔ مولائے کائناتؑ نے فرمایا کہ جاگیر چھوڑنا گوارا ہے مگر الزام لینا گوارا نہیں ہے۔

الزام کی نوعیت آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ پوری مملکت اسلامیہ میں یہ ہنگامہ ہو جاتا کہ علیؑ نے حکومت پاتے ہی امت کے اموال پر قبضہ کر لیا اور جب تک دوسروں کی حکومت رہی خاموش رہے۔ یہ اپنا حق سمجھتے تھے تو اسی وقت لینا چاہئے تھا۔ آج اقتدار پانے کے بعد کیساتھ زندہ ہو گیا غرض کہ مملکت میں ایک ہنگامہ ہو جاتا۔ اور ظالموں کو ایک نیا بہانہ مل جاتا مولائے کائناتؑ اس مصیبت کو بھی برداشت کر لیا۔ اور ظالموں کو کوئی موقع حاصل نہیں کرنے دیا۔ ان مصائب کا اثر مولائے کائناتؑ کے دل پر کیا ہوا یہ علیؑ ہی کا دل جانتا ہے۔ البتہ نسل علیؑ میں یہ احساس زندہ رہا اور ایک ایک فرد کے ذہن میں یہ بات سلامت رہی چنانچہ امام محمد تقیؑ علیہ السلام کی کہنسی ہے۔ بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور مسلسل آنسو جاری ہیں۔ کسی نے کہا فرزند رسولؐ آپ کیوں رو رہے ہیں اور اس قدر کیوں گریہ فرما رہے ہیں۔ فرمایا۔ میں سوچتا ہوں کہ ظالموں نے میری جدہ ماجدہ

کے ساتھ کیا بڑا فائدہ کیا اور کس طرح انھیں اذیتیں پہنچائیں۔ خدا کی قسم مجھے بوقلم کیا تو ایک ایک ظالم کو قبر سے نکال کر اس کی لاش کو نذر آتش کرادوں گا اور خاکستر کو ہوا میں اڑا دوں گا۔ اللہ اللہ یہ مصائب اور دل بخت رسول کیامت اسی کو کہتے ہیں اور کلمہ پڑھنے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ مگر ارباب عسرا سیاست کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں رشتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ تو رسول کی بیٹی تھی اور یہاں تو ام الفضل حکومت ہی کی بیٹی تھی۔ اور امام محمد تقی حکومت ہی کے داماد تھے۔ لیکن روایت کہتی ہے کہ جب بیٹی نے باپ سے شوہر کی شکایت کی تو تلوار لے کر امام کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اور اپنی دانت میں تلوار سے جسم اقدس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ وہ تو مالک کائنات کا کرم تھا کہ امام کو بچا لیا اور نہ حکومت نے تو بیٹی کے بیوہ ہونے کے بھی کوئی پردا نہیں کی تھی اور بیٹی بھی ایسی ظالم کہ جب سے امام کے مقتدیوں کی آئی سو اسے شکایت کے کوئی کام نہیں تھا۔ روزانہ باپ سے سب سے بھائی سے شکایت۔ عزیزوں سے شکایت۔ یہاں تک کہ اماموں نے عاجز آکر امام کو مدینہ بھیج دیا۔ ام الفضل کو وہاں میدان اور وسیع مل گیا اور جب دیکھا کہ حضرت نے عقد خانی بھی فرمایا ہے اور اس کی طرف حسب درخواست توجہ نہ فرماتے تو باپ کو شکایتی خطوط لکھنا شروع کر دیے۔ جب باپ نے کوئی توجہ نہیں کی اور قہور سے عرصہ کے بعد اس کا انتقال ہو گیا تو بھائی کے پاس خطوط جانے لگے۔ آخر عاجز آکر بھائی نے امام کو مدینہ سے بغداد طلب کیا اور اب یہ لے گیا کہ امام کو ان شکایتوں کے بدلے سزا دی جائے گی۔ امامت کا قصور کیا ہے حکومت جانے۔ البتہ تاریخ کا اعتراف ہے کہ امام کی شہادت کے بعد ام الفضل نے خود یہ اعلان کیا کہ میں نے ان کے اوپر برا ظلم کیا ہے اور انہوں

نے کبھی میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ وقت گزرتا رہا اور پہلے تلاش ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن معتمد نے ام الفضل کو راضی کر لیا اور حضرت کو انگوٹھیں زہر دلا دیا۔ اور ایک روایت کی بنا پر اپنے غلام کے ذریعہ شربت بھیجا اور حضرت نے اسے پی کر فرمایا "رَضًا بِقَضَائِهِ وَتَسْلِيمًا لِأَمْرِهِ" اور زہر کا اثر سارے جسم میں دوڑ گیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ معتمد نے اپنے وزیر کے ذریعہ حضرت کی دعوت کی اور زہر آلود کھانا دیا جیسے ہی حضرت نے دودھے نوش فرمائے زہر کا اثر شروع ہو گیا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وزیر نے کہا اور نوش فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تیری مراد کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اور یہ کہہ کر بیت الشرف میں تشریف لائے۔ بہرہ بردار بدستے رہے اور بالآخر ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۳۳۵ کو دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کا ایک شریک کار تھا اسے مدینہ میں اپنے امور کا مہتمم بنا کر تشریف لائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ میں امام علی نقی کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک تختی کو سامنے رکھ کر کچھ دیکھنا شروع کیا اور قہور کی دیر کے بعد اندر تشریف لے گئے اور بیت الشرف میں کھرام برپا ہو گیا۔ میں نے عرض کی فرزند رسولؐ خیر تو ہے فرمایا میرے بابائے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد باعجاز کا طین تشریف لے گئے اور اپنے پدر بزرگوار کی چھیز دکنین فرما کر اسی مقام پر دفن فرمایا جہاں آج قبر مطہر موجود ہے۔

ارباب عزاء! مسافرت کا عالم۔ گھر دور۔ اہل وطن دور۔ بیٹا دور۔ اعزاد دور۔ زہر کا اثر۔ پیاس کی شدت۔ کون تھا جو بانی حاضر کرنا کون تھا جو دالاکر دیتا۔ لیکن بہر حال کوئی نہ کوئی پیدا ہو گیا۔ جس نے وقت آخر سہارا دے دیا۔ امام علی نقیؑ بھی باعجاز آگئے۔ غربت میں جنازہ اٹھ گیا۔

بیٹے کے ہاتھوں سے باپ کا لاشہ دفن ہو گیا۔ مگر ہائے حسین غریب وطن سے دور نگر اہل وطن قریب۔ گھر دور مگر اعز اسب خیمہ میں۔ بہن موجود بیٹی ہو و دارث موجود۔ مگر اللہ سے بکسی۔ تین دن تک جنازہ ریگ گرم کر بلا پر پڑا اور کوئی دفن دکن کرنے والا نہیں تھا۔

میں کہوں گا اسے امام علی نقی آپ کے لئے یہ صدمہ بہت سخت ہے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے باپ کو زہر دیا گیا۔ لیکن شہادت کے بعد آپ کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ مگر ہائے امام زین العابدین۔ شہادت کے بعد ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پیروں میں بیڑیاں۔ کھلیں طوق خاردار۔ کو ذہ شام کا سفر۔ ماں بہنوں کے کھلے سر منادی کی آواز تماشائیو اتنا شا دیکھو یہ اولاد رسول قید ہو کر جا رہی ہے۔ اسے وہ کو ذہا ہے وہ شام وہ باپ کا سر وہ نوک نیزہ وہ بیٹے کی غربت وہ طوق سلاسل کس سے کہیں اور کون سے۔ ایک مرتبہ جب ایک مرد غنی مل گیا تو فرمایا بھائی ہم اولاد رسول ہیں جنہیں یوں قیدی بنایا گیا ہے۔ ہم ذلیل کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی والی و دارث ہی نہیں ہے۔ کاش آج رسول اللہ ہوتے اور یہ منظر دیکھتے کہ یزید کا دربار۔ شامیوں کا مجمع۔ سیدانوں کے کھلے سر۔ یزید کے ہاتھ میں چھڑی۔ امام حسین کا سراقدس۔ یا رسول اللہ آئیے اپنی اولاد کا عالم تو دیکھئے۔ اپنی زینب کو دیکھئے۔ اپنی ام کلثوم کو دیکھئے۔

شامیان بستہ بازو زینب و کلثوم را
اے فلک ان ابتدا این انتہائے اہلبیت

انا لله وانا الیہ راجعون

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

امام علی نقی علیہ السلام

اسم مبارک	علیؑ
لقب	نقی، ہادی
کنیت	ابو الحسن ثالث
والد ماجد	امام محمد تقیؑ
والدہ ماجدہ	جناب سمانہ
ولادت	۵ رجب ۲۱۲ھ جمعہ بدینہ منورہ
شہادت	۳ رجب ۲۵۴ھ شنبہ سامرہ
عمر مبارک	۴۲ سال
قبر مطہر	سامرہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله صاحب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين
خاتم النبیین سیدنا رسولنا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین
ولعنة الله على اعدائهم اجمعين اما بعد فقد قال الله الحكيم في كتابه

الاکرام

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
إِنَّا عَلَيْنَا لِلْهُدَىٰ وَإِنَّا لَنَالِلَ الْخُرُوجِ وَالْأَوَّلِ

ایک کائنات کا ارشاد ہے کہ "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے
اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

اس ارشاد نے صاف واضح کر دیا کہ رب العالمین نے ہر دور بشریت میں
ہدایت کا مکمل انتظام کیا ہے۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ پیغمبر نازل کئے ہیں۔ انبیاء مقرر
کئے ہیں۔ اور اس سلسلہ قائم کیا ہے۔ صابجان کمالات و کمالات کو معین کیا ہے
اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا کہ زمانہ حجت خدا سے خالی رہ جائے اور بندوں کی
حجت رب العالمین پر تمام ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ بندوں نے اس کے انتظام
سے فائدہ نہیں اٹھایا اور ہر دور میں اپنا ایک الگ نظام بنائے رہے۔ کبھی
فرعونیت کی شکل میں سراٹھایا کبھی نمرودیت کی صورت میں خدائی کا دعویٰ کیا
کبھی شدا و قارون بن کے دولت و اقتدار کا مظاہرہ کیا۔ لیکن یہ گواہ نہ کیا کہ
نامزدگان پروردگار کے سامنے سر تسلیم جھکا دیں اور یہ اعتراف کر لیں کہ قدرت
کا انتظام بندوں کے انتظام سے بہتر ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہر شخص کے ذہن
میں یہ نکتہ تھا کہ اگر اپنی انتظام کو قبول کر لیا تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ وہاں صابجان
علم و کردار کی ضرورت ہے۔ وہاں عصمت و عفت کی ضرورت ہے۔ وہاں کمالات
و کمالات لازم ہیں اور یہاں جہالت و عیاری، بدکاری و شراب خواری، عیاشی

و بد کرداری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اپنی نظام میں ہمارا کیا مرتبہ ہوگا۔ یہ نظام
راج ہو گیا تو اپنے بھٹے میں تازیانوں اور کورڈوں کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ شراب
شراب پیئیں گے تو عدسہ زنا کریں گے تو عدسہ چوری کریں گے تو عدسہ قتل
نفس کریں گے تو قصاص۔ بد علی اور بد کرداری کا مظاہرہ کریں گے تو سزا
غرض کہ زندگی کے ہر موڑ پر سوائے پریشانی کے کچھ نہ ہوگا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ اپنا
نظام خود بنائیں اور اتنا مستحکم بنائیں کہ اللہ والوں کو جینے کا موقع ہی نہ ملے
نہ ان کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا نہ یہ سزا دینے پر قادر ہوں گے۔ نہ ان کے قبضے میں
ملک دنیا ہوگا نہ یہ ہمارے تخت و تاج پر قبضہ کر سکیں گے۔ ملک خدا ہوگا اور ملک
ہماری ہوگی۔ کائنات خدا کی ہوگی اور اقتدار ہمارا ہوگا۔ یہ نسخہ روز اول سے لے کر
آخر تک کیا تھا۔ اور اسی پر ایک کائنات مطلق رہی اور آج تک چل رہی ہے۔ اس نے روز
اول سمجھایا تھا کہ دیکھو اگر آزادی کی زندگی گزارنا ہے۔ اپنے اختیارات و حقوق
کو محفوظ رکھنا ہے۔ دنیا میں سکون و چین سے رہنا ہے تو بہترین راستہ یہی ہے کہ
خدا کو مانو اور خدا والوں کو نہ مانو۔ خدا تمہاری حکومت کے مقابلے میں حکومت نہ کرے
سنا۔ لیکن نامزدگان خدا نے مکراد ہو جائے گا۔ اور وہ جینے نہ دیں گے۔ بہتر یہی ہے
کہ ان کی عظمت کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور ان کی بلندی سے اسکا کرتے رہو۔ کچھ
خدا سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں نے اس کو لاکھوں سجدے کئے ہیں اور اب
بھی کر سکتا ہوں لیکن میں آدم کے ہاتھوں اپنے ہاتھ نہیں کٹا سکتا۔ میں اپنے
اختیارات کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک سجدہ کا انکار کر کے ہمیشہ ہیشہ کئے
راحت پالی۔ اب مجھ سے کوئی مطالبہ ہوگا نہ سوال و جواب۔ تم سلمان ہو کہ صبح
و شام واجب و حرام کے جھگڑے میں پڑے ہو اور تمہیں کلمہ سے فرمت
نہیں ملتی۔ میں شیطان ہوں کہ پوری راحت سے زندگی گزار رہا ہوں۔

اور بے چاہتا ہوں بہکا دیتا ہوں۔ یہ سب طفیل ہے اس ایک جرأت رندانہ کامیابی کا مظاہرہ میں نے دوزا دل کیا تھا اور آج تک اس کے مزے لے رہا ہوں۔ میں نے آدم کو سجدہ کر لیا ہوتا تو آج تک ٹانگہ کی طرح سجدہ ہی کرتا رہتا اور بندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ دیکھو بندگی چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا کہ فرعون جیسا رب اعلیٰ۔ نمرود جیسا خدا شدا جیسا مالک جنت۔ قارون جیسا سرمایہ دار ابوسفیان جیسا عیار، یزید جیسا ظالم۔ حجاج جیسا سفاک۔ متوکل جیسا بدکردار۔ سب میرے ہی غلام ہیں۔ انبیاء کی غلامی چھوڑ کر اتنے بڑے سلاطین کی شاہی ملی اور سب کو اپنے اشاروں پر بچا رہا ہوں۔ کسی کو سجدہ سے روکا۔ کسی کو بندگی سے روکا۔ کسی کو سارے روکا۔ کسی کو عبادت سے روکا۔ کسی سے شراب پلوادی۔ کسی کو زنا پر آمادہ کر دیا۔ کسی کو قاتل بنا دیا۔ کسی کو شیر بنا دیا۔ کسی کو سود میں بھنسا دیا۔ کسی کو عیاشی میں ڈال دیا۔ کسی سے ماں بہن کی عزت لوٹا دی۔ کسی سے بھائی اور باپ کا قتل کر دیا۔ غرض کہ جو چاہا وہ کیا۔ کوئی مجھے روکنے والا نہیں ہے اور جس کے روکنے کا خطرہ تھا اس نے بھی جہلت دے دی ہے۔ اب یہ ہے میرا اقتدار اور یہ ہے میرا اختیار۔ میں نے نمائندگان پروردگار کو چھوڑ کر بڑے پیش کے ہیں۔ بقیہ بھی پیش کی زندگی گزارنا ہے تو کسی نمائندہ کا ہر پروردگار کے سامنے سر نہ جھکاتا۔ اور دیکھو اگر ماننا ہو تو کتابوں کو ماننا۔ افراد کو نہ ماننا۔ کتابیں بدل سکتی ہیں۔ ان میں تحریف ہو سکتی ہے۔ ان کی غلط تادیل ہو سکتی ہے لیکن افراد پر تصرف ممکن نہیں ہے۔ ان سے ہر آن خطرہ ہی خطرہ ہے۔ دیکھو میں نے یہودیوں سے کہہ دیا کہ کتاب کو لے لو اور موسیٰ کو چھوڑ دو۔ میں نے عیسائیوں سے کہہ دیا کہ انجیل کو لے لو اور عیسیٰ کو چھوڑ دو۔ رند کے رند رہو گے ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے پائے گی۔ دیکھو یہودی اور عیسائی کتنے مزے

میں رہے۔ جیسا چاہی کتاب بنائی۔ جیسا چاہی ترمیم و تحریف کی اور آج ساری دنیا میں اہل کتاب بنے ہوئے ہیں۔ ایک تم سلمان ہو کہ تمھاری عقل میں کچھ نہیں آتا۔ کتاب کے ساتھ نبی کا کلمہ پڑھ رہے ہو اور انھیں بھی لے ہوئے ہو اچھا دیکھو اگر مصلحتاً یہ غلطی کر لی ہے تو کوئی مسرت نہیں ہے لیکن اس کا خیال رکھنا کہ جیسے ہی نبی درمیان سے اٹھنے لگیں فوراً ہوشیار ہو جاؤ اور کتاب لے کر افراد سے انکار کر دینا ورنہ قیامت تک پریشانی میں گرفتار رہو گے۔

ارباب کرم! یہ پرانا نسخہ ہے جو ہر دور میں آزمایا گیا ہے اور شیطان نے اپنے شاگردوں کو اس کے استعمال پر آمادہ کیا ہے اور عمل بھی کرایا ہے لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ اس نے کہا ابلیس! تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن تو سہی کہ تو خود ہی استرا کرے کہ میرے غلصہ بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور میرا منشا یہ بھی ہے کہ ہر دور میں غلصہ بین ہیں تاکہ میری حجت تمام رہے اس کے بعد تو سب کا فیصلہ قیامت پر رکھا گیا ہے اسی دن تیرا بھی فیصلہ ہو گا اور تیرے نمائندوں کا بھی فیصلہ ہو گا۔

عزیزان محترم! — شیطان نے اس حد تک گمراہ کیا کہ الہی نظام کے بلند کردار بندوں کے سامنے ایسے ایسے افراد کو لایا گیا جن کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہاں جناب ابراہیم اور کہاں نمرود۔ کہاں جناب موسیٰ اور کہاں فرعون۔ کہاں جناب عیسیٰ اور کہاں یہودی۔ کہاں حضور سرور کائنات اور کہاں ابوسفیان۔ کہاں مولائے کائنات اور کہاں حاکم شام۔ کہاں سرکارِ یارِ شہداء اور کہاں یزید کہاں ائمہ معصومین اور کہاں ہشام و عبدالملک و متوکل و منصور جیسے بدست شرا بی — اور اس پر ہوس یہ ہے کہ ہمیں بھی اللہ

دالوں کی طرح بلند کردار مانا جائے چنانچہ تاریخ کا واقعہ ہے کہ متوکل عباسی نے اپنے دور کے عظیم ترین ادیب ابن سکیت سے پوچھا کہ بتاؤ تمہاری نظر میں علیؑ کے فرزند حسن و حسینؑ کا مرتبہ زیادہ بلند ہے یا میرے فرزند منتصر و معتز کا؟ ابن سکیت نے گہرا کر کہا۔ امیر یہ کیا کہہ رہا ہے کہاں فرزند رسولؐ حسن و حسینؑ اور کہاں تیرے فرزند۔ کیا مقابلہ ہے ان دونوں کا۔ اور کیا رابطہ ہے ان دونوں میں۔ متوکل کو غیظ آگیا اور حضرات حسنینؑ کی شان میں گستاخی شروع کر دی۔ لیکن تاریخ نے واضح کر دیا کہ صاحبان کمال کے کمال کا پتہ نہیں کیا جاسکتا۔ گایاں دینا آسان ہے کمال کا ہکا بکا نام لکھنا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قدرت کا انتظام تھا کہ متوکل اپنے سامنے سوال کرے اور ابن سکیت اسی کے سامنے جواب دے دیں تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ ہو جائے کہ اہلبیتؑ کا مقابلہ ممکن نہیں ہے اور امت کا مرتبہ بہر حال اہلبیتؑ سے بہت تر ہوتا ہے اور مقابلہ ممکن بھی کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک طرف وہ امت ہے جو سرکارِ دو عالم کے قدموں کو سر پر رکھنے کو شرف سمجھتی ہے۔ اور ایک طرف وہ شہزادے ہیں جن کی منزل دوشِ رسولؐ اور پشتِ رسالت پر ہوا درجن کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی کہہ دیتا ہے کہ کیا کہنا کیا عمدہ سواری ہے تو سر کاڑھ لوگ کہہ فرماتے ہیں۔ خبردار یہ نہ کہو۔ یہ کہو کہ کیا اچھے سواری ہیں۔ سواری پر نگاہ رکھنا نقص ذہنیت ہے اور سواری پر نگاہ رکھنا کمال انسانیت ہے۔ صلوات

یہی ایک موقع نہیں متوکل کی پوری زندگی اسی لکڑی میں گزری ہے کہ دنیا بھر ائمہ دالوں کے برابر سمجھ لے۔ اور اللہ کے نمائندوں کو یوں تباہ و برباد کر دیا جائے کہ دنیا عاجز آکر ہماری طرف متوجہ ہو جائے۔ لیکن میں کہوں

مکہ متوکل فکر بیکار ہے۔ یہ تجربہ پہلے ہو چکا ہے اور ناکام ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل ابرہہ نے بھی یہی سوچا تھا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تو قوم مجبور ہو کر میرے گرجا کو سجدہ کرے گی۔ لیکن تاریخ نے واضح کر دیا کہ گرجا گر جاسکتا ہے عظمت کعبہ مجروح نہیں ہو سکتی۔ تو نے یہ سوچا تھا کہ قبر حسینؑ کا نشان مٹ جائے گا تو تیرے باپ دادا کے مقبروں کی عظمت بڑھ جائے گی۔ امام علیؑ نقیؑ نظر بند رہیں گے تو قوم تجھے اپنا رہنما مان لے گی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نہ تیرے باپ دادا کی قبروں کا کوئی نشان ہے اور نہ تجھے مذہبی قیادت کا شرف مل سکا ہے۔ چند روزہ حکومت ضرور رہی لیکن جس شان سے آئی تھی اسی شان سے چلی گئی۔ اور بیٹے ہی نے باپ کو تہ تیغ کر دیا۔ آلِ محمدؑ کا دامن بے داغ بھی رہا اور تجھے تیرے کردار کی سزا بھی مل گئی۔ قدرت کا یہ بھی ایک انتظام ہے کہ جب کوئی ائمہ دالوں سے ٹکراتا ہے تو آپس ہی میں تباہی کے سامان ہیا ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ دالوں کو کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پوری تاریخ اسلام پڑھ ڈالیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خلفاء و خلفاء ہی نے قتل کرایا ہے۔ سلاطین کو سلاطین ہی نے مارا ہے۔ شہنشاہوں کو شہنشاہوں ہی نے قتل کرایا ہے۔ لیکن کسی امامؑ کے دامن پر کسی امامؑ یا خلیفہ کے خون کا دھبہ نہیں ہے۔ یہ علامت ہے کہ اقتدار خون بہانے کے لئے آتا ہے اور امامت بچانے کے لئے آتی ہے۔

دنیا نے ہتھیلیاں لٹک کر ماریا۔ قدرت نے اتنی ہی عزت دی۔ تاریخ کے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے لیکن یہاں صرف چند مثالوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ متوکل کا دور ہے۔ امام علیؑ نقیؑ ۲ مدینہ میں قبر رسولؐ کے پاس علوم دین کی نشر و اشاعت فرما رہے ہیں یہ حکومت

سے مطلب نہ اقتدار سے غرض۔ اپنا دین اپنا مذہب۔ اپنا فسخ اپنا منصب اور بس۔ لیکن حکومت کے ہوا خواہوں کو سکون نہ ملا اور متوکل کے پاس شکایت کی کہ حضرت علی نقیؑ مدینہ میں حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فوج اکٹھا ہو گئی ہے سالانہ فراہم ہو گیا ہے۔ عنقریب حملہ ہونے والا ہے۔ متوکل ستر ب کے نشہ میں دیوانہ، سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کوئی راستہ سمجھ میں نہ آیا تو ایک ہی راہ سامنے آئی کہ اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح امام کو اپنے پاس بلا کر نظر بند کر دیا جائے اور یہ خطرہ ہمیشہ بھیخہ کے لئے ختم ہو جائے۔ چنانچہ ہر شہ کی قیادت میں تین سو سپاہیوں کا لشکر اس خطہ کے ساتھ روانہ کیا کہ آپ کی زیارت کا بے ملاحظہ شتیاق ہے۔ میں حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ آپ زحمت فرما کر تشریف لے آئیں۔ آپ کے احترام کے لئے فوج روانہ کر رہا ہوں۔ آپ کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ مجھے یہ شرمندگی کھائے جا رہی ہے کہ میں آپ کے حقوق کو ادا نہ کر سکا اور آپ کے آداب کا باقاعدہ لحاظ نہ رکھ سکا۔ خیر۔ اب گزارش ہے کہ فوراً تشریف لے آئیں۔ جب تک آپ تشریف نہ لائیں گے میرے ذہن کو سکون نہ ملے گا۔

ایسا خلوص آئین خط کہ انسان دور سے دیکھ کر دعو کو کھا جائے۔ لیکن کیا کہنا سنگاہ امت کا۔ پہچان گئے کیا مقصد ہے۔ ایک ہفتہ کی مہلت لی۔ سالانہ سفر تیار کیا۔ گرمی کا زمانہ تھا لیکن سارے سردی کے کپڑے لحاف، تو شک وغیرہ ساتھ لیا اور سات دن کے بعد روانہ ہوئے۔ اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ درو دیوار مدینہ کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ قبر رسولؐ سے پٹ پٹ کر رو رہے تھے۔ اور اہل وطن کو یوں الوداع کہہ رہے تھے جیسے اب پٹ پٹ کر آنا نہیں ہے۔ ادھر فوج کے آتے وقت درمیان راہ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ متوکل کی فوج

میں ایک محب اہلبیتؑ بھی تھا۔ دشمنان اہلبیتؑ اسے بات بات پر چڑھایا کرتے تھے اور وہ اپنے امکان بھر جواب دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے یہ قافلہ ایک صحرا میں ٹھہرا اور رات ہو کہ شب بسر کرنے کے بعد قافلہ آگے بڑھے گا۔ محب اہلبیتؑ کو پھر لوگوں نے چھیڑا کہ تمہارے امام حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہر زمین سے ستر ستر مردے اٹھائے جائیں گے۔ بھلا اس صحرائے تنی و دق میں کون دقن ہو گا جو اٹھایا جائے گا۔ تمہارے امام بھی کیسی بے سرپرستی کی باتیں کرتے ہیں۔ محب اہلبیتؑ نے حسب امکان جواب دیدیا تھا لیکن آج امام کا انتظام دیکھ کر ظالموں کو پھر موقع مل گیا اور کہنے لگے۔ یہ علی نقیؑ بھی تو تمہارے امام ہیں جن کو سردی اور گرمی کا بھی فرق معلوم نہیں ہے۔ یہ قیامت کی گرمی صحرا کا سفر اور سردی کا سامان لے کر نکلتے ہیں۔ جسے سرد و گرم زمانہ کا اندازہ نہیں ہے وہ امامت کا دعویٰ کرتا ہے۔ افسوس محب اہلبیتؑ یہ گفتگو سن کر شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا میں جواب تو نہیں دے سکتا ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب میرے امامؑ نے سردی کا سامان لیا ہے تو انشہ بے محل نہ ہو گا۔ اب مصلحت کیا ہے یہ مجھے نہیں معلوم ہے میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ میں امامؑ کے ہر عمل کو صحیح سمجھوں۔ اب یہ تو وقت فیصلہ کرے گا کہ امامؑ کا کلام صحیح ہوتا ہے یا غلط۔ قافلہ روانہ ہوا اور جب دوبارہ اسی صحرا میں پہونچا تو ایک تیز آندھی کے آثار دکھائی دیئے۔ آندھی کے ساتھ بارش کے آثار تھے تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ قیامت کی آندھی اور اس کے ساتھ غضب کی بارش بارش میں زبردست اونے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا موسم تبدیل ہو گیا اور لوگ سردی سے اکرٹنے لگے۔ سامان کسی کے پاس نہیں تھا۔ فرزند رسولؐ نے اپنا فاضل سامان ہر شہ کے پاس بھیج دیا اور ہر شہ نے دل ہی دل میں یہ کہا کہ میں مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ نہیں

کیا ہو گیا ہے یہ کیسا سامان کر رہے ہیں۔ لیکن اب اندازہ ہوا کہ خاندان رسالت کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ سردی بڑھی اور اتنی بڑھی کہ بچا سوں آدمی ڈھیر ہو گئے۔ صبح ہوئی تو لاشوں کا ایک انبار تھا۔ ہر شے نے گھبرا کر کہا فرزند رسول! اب کیا کیا جائے آپ نے فرمایا کہ سب کو یہیں دفن کرو دو اور آگے بڑھو۔ لاشیں دفن ہوئیں اور جب لاشیں دفن ہو گئیں تو آپ نے فرمایا ہر شے دیکھو میرے جد نے کس قدر کچا کہا تھا ایک ایک زمین سے ستر ستر دے اٹھائے جائیں گے۔ لوگ میرے دوست مذاق اڑا رہے تھے۔ اب معلوم ہو گیا کہ مردے کس طرح اٹھیں گے اور سردی کا سامان کیوں ساتھ لیا گیا ہے۔ کہاں ہے وہ شخص جو میرے دوست کا مذاق اڑا رہا تھا اور میرے جد کی گذیب کر رہا تھا؟ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی لقمہ اہل بن چکا ہے۔

یہ ہے امامت کا اقتدار کہ جو زبان سے کہہ دیا وہ ہو کر رہا۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ ترجمانِ شیت ہیں جو بغیر شیت الہی کے کلام بھی نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہی وہ ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ حکومت کی باگ ڈور نبی حال لینا آسان ہے۔ موت دیجات پر قبضہ پالینا مشکل ہے۔ یہ صرف اسی گھرانے کا شرف ہے جہاں ملک الموت بھی بلا اجازت قدم نہیں رکھتے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے بعد بھی متوکل کو عقل نہ آئی اور اس نے حضرت کے سامرہ پہنچنے کے بعد حکم دیدیا کہ آپ کو فقراء و مسکین کے مسکن پر ڈال دیا جائے اور وہیں پرارہنے دیا جائے۔ تین دن حضرت کو اسی مقام پر مقیم رکھا گیا اور متوکل نے ملاقات کا موقع نہیں دیا تاکہ حضرت کی توہین ہو جائے اور حضرت کا یہ عالم ہے کہ شکر خدا کر رہے ہیں کہ جب تک منوس بادشاہ کی شکل نہ دیکھیں اسی وقت تک بہتر ہے۔ رفتہ رفتہ شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ فرزند رسول!

کو مدینہ سے بلا کر فقراء و مسکین کے ساتھ ڈال دیا گیا ہے۔ ایک چاہنے والا صابر بن سعید بیتاب ہو کر خدمت میں حاضر ہوا۔ فرزند رسول! یہ ظلم و متوکل کا یہ برتاؤ؟ اب تو آپ پہچان گئے کہ یہ سلاطین کس قدر منافق ہیں اور کس طرح دھوکہ دیتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ جگہ؟ فرزند رسول! خاموش سنتے رہے اور آخر میں مسکرا دیئے۔ سعید آخر اس طرح گھبراتے کیوں ہو؟ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں سکون سے زندگی گزار رہا ہوں۔ فقراء کے پاس رہنے سے وہ گھبرائے جو شاہوں کے مملوں میں رہا ہو۔ ہم نے تو ہمیشہ فقیروں کے ساتھ زندگی گذاری ہے۔

لیکن فرزند رسول! یہ بڑی تکلیف دہ جگہ ہے۔ فرمایا سعید ذرا اپنے داپنے بائیں دیکھو کیا نظر آ رہا ہے۔ اب جو سعید نے دیکھا تو طرح طرح کے باغات بہترین سبزہ سدرہ بہاریں۔

عرض کی فرزند رسول! یہ کیا ہے؟ فرمایا سعید ہمارے اختیار میں سب کچھ ہے۔ لیکن ہم دنیا میں عیش کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنا عیش آخرت کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں اہل دنیا کو آرام کر لینے دو۔ ہم اسی طرح زندگی گزاریں گے۔ ہمیں اپنی فکر نہیں ہوتی صرف اپنے چاہنے والوں کی فکر ہوتی ہے۔ سعید خاموش ہو گئے۔ تین دن کے بعد حضرت کو اس سرے سے ذراقی کے گھر منتقل کر دیا گیا کہ دہاں نظر بند رہیں گے۔ اور وہ اذیت بھی پہنچائے گا لیکن حضرت نے اپنے حسن کردار سے اسے بھی رام کر لیا اور اس حد تک رام کر لیا کہ جب ایک چاہنے والا ملاقات کے لئے آیا اور ذراقی نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ تو اس نے کہا کہ آپ کی ملاقات کے لئے چلا آیا تھا۔ ذراقی نے کہا نہیں تم اپنے لائم کی زیارت کے لئے آئے ہو۔ اس نے بہانہ کرنا چاہا۔

زراقی نے کہا اب مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے انہوں نے اپنا گردید بنا لیا ہے۔ صبح
وشام کی عبادت اور ہر آن کا سجدہ شکر مجھے اپنا بندہ بے دام بنا چکا ہے۔
اللہ عجب شان بندگی ہے کہ ہر وقت عبادت و تلاوت اور سامنے قبر
کو کسی آن خوف خدا ذہن سے نہ جانے پائے۔ بھلا اس کو دار کے لوگ کہاں
پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میرا مقدر ہے کہ وہ میرے پاس ہیں۔ چاہنے والا مطمئن ہو گیا
اور زراقی کے اس بڑاؤ سے خوش ہوا۔ اور قدرت نے آواز دی دنیا دالو!
فرعون کے قصر میں موسیٰ کی پرورش دیکھی ہے تو متوکل کی حراست میں امام علی
نقیؑ کا سکون و اطمینان بھی دیکھ لو۔

وقت گزرتا رہا۔ آخر متوکل نے عاجز آکر آپ کو سعید کی حراست میں دیدیا
یہ ظالم بڑا دشمن اہلیت تھا۔ ایک چاہنے والا حضرت کی ملاقات کو گیا تو کہنے لگا
اپنے خدا سے ملنے آئے ہو۔ مل لو۔ کل تک انھیں قتل کر ڈالا جائے گا۔ زائر پریشان
ہو گیا۔ خدمت امامؑ میں عرض کرتا ہے کہ مولا آپ کے قتل کا ارادہ ہو رہا ہے۔
فرمایا بھائی پریشان نہ ہوا بھی میرا وقت نہیں آیا ہے۔ مجھے کوئی قتل نہیں
کر سکتا۔ عرض کی مولا۔ وہاں قبر بھی تیار ہو گئی ہے۔ فرمایا اہ۔ مگر مجھے قتل نہیں
کیا جاسکتا۔ زائر مطمئن ہو گیا اور امامؑ اسی طرح بارہ سال حراستوں کی زندگی
گزارتے رہے۔ یہاں تک کہ فتح بن خاقان کو متوکل کی وزارت نصیب ہوئی اور
انہوں نے موقع پا کر یہ تحریک چلائی کہ شہرے باہر مثنیٰ غیر آباد زمینیں ہیں انھیں
عوام کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے تاکہ ان کی آباد کاری کا کام انجام پاسکے اور
حکومت پر کوئی بار بھی نہ پڑے۔ اور متوکل نے اس تحریک کو قبول کر لیا۔
فتح نے موقع پا کر ایک قلعہ زمین امام علی نقیؑ کے نام فروخت کر دی اور بیعت نامہ
نوٹ لگا دیا کہ اس زمین کی قیمت وصول ہو چکی ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ متوکل

حضرت کے نام قرض زمین دینے پر راضی نہ ہو گا۔ اسے معلوم ہے کہ میں محب اہلیت
ہوں۔ اس نے تو مجبوراً وزارت کا عہدہ دے رکھا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
جب متوکل نے فہرست طلب کی اور اس میں حضرت کا نام دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا
یہ انھیں زمین کیوں دی گئی ہے۔ کیا میں اپنے ملک میں انھیں بسا کر اپنے لئے خطرہ
مولوں کا۔ لیکن جب یہ نوٹ دیکھا کہ قیمت وصول ہو چکی ہے تو خاموش ہو گیا۔
اور حالات کا انتظار کرتا رہا۔ حضرت نے مختصر سا مکان بنایا اور اپنے مکان میں
منتقل ہو گئے لیکن متوکل کو قرار کہاں؟ ایک ایسا انسان جسے غریب الوطن بنا
دیا گیا ہے اور جس کی خاطر یہ ہے کہ اسے فقیروں کے درمیان رکھا گیا ہے۔ جس کی عزت
یہ ہے کہ اسے مسلسل حراستوں اور نظربندیوں میں رکھا گیا ہے۔ جس کے دل کا یہ عالم
ہے کہ صبح و شام قبر حسینؑ کی بے حسی کی آوازیں کانوں میں آرہی ہیں۔ اور کبھی
پانی ہوا جا رہا ہے۔ اس سے کسی انقلاب کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ انقلاب تو اس وقت
نہ کیا جب بنی عباس قیادت کے طالب تھے۔ انقلاب اس وقت نہ کیا جب علوی سادات
عباسیوں سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے تو اب انتقام اور انقلاب کا کیا سوال
پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جو رکاوٹ ہی کتنا ہوتا ہے۔ حکومت کو ہر آن یہی خطرہ ہے کہ
کہیں انقلاب نہ ہو جائے۔ کہیں تخت قدموں کے نیچے سے نکل نہ جائے۔ کہیں
حالات بدل نہ جائیں کہیں زمانہ کروٹ نہ لے لے اور اسی ایک توہم پر امامؑ کو
مسلل اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ مختلف بہانوں سے "برکت السباع" میں بھیجا گیا
جہاں ایسے دندے پائے گئے تھے کہ ایک لمحہ انسان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے
اور جب کسی کو سزا دینا ہوتی تھی وہیں بھیج دیا جاتا تھا اور وہ لمحوں میں
جانوروں کا لقمہ اجل بن جاتا تھا۔ لیکن قدرت کا انتظام کہ جانوروں نے
قدموں پر سر رکھ دیئے اور گویا تعظیماً سجدہ کر کے بتا دیا کہ انسانو! تم اسکی

قدر نہیں جانتے جو ہم جانور اس کی عظمت پہچانتے ہیں۔ کاش تم ہماری ہمارا دردی سے ہوتے تو کم از کم اس کی عظمت تو پہچانتے لیکن کیا کرد۔ قرآن حکیم نے سچ کہا ہے کہ کچھ انسان جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں اور ان سے بھی زیادہ گلوہ ہیں۔ تم جانوروں سے بدتر ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمھارے بزرگ ایک جانور کے پیچھے پوری ٹرائی لڑ چکے ہیں۔

تم سے کسی خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ تم نے مراتب کو نہیں پہچانا۔ ہم نے پہچان لیا۔ اور احترام بھی کیا۔ لیکن افسوس کہ حکومت کو اب بھی ہوش نہ آیا۔ اور نئی ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ جب بھی امام دربار میں آئیں کوئی پردہ نہ اٹھائے اور انھیں ذلیل کیا جائے۔ قدرت کا انتظام دیکھئے کہ جیسے ہی آپ تشریف لے آئے ایک تیز ہوا چلی اور پردہ خود بخود اٹھ گیا۔ اسے آئے تو خود بادشاہ تقسیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ غلاموں کو حکم دیا گیا تھا کہ جیسے ہی امام آئیں انھیں قتل کر دیا جائے۔ اور غلام تقسیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جھک کر سلام کیا۔ بادشاہ سخت متحیر ہوا اور جب حضرت تشریف لے گئے تو غلاموں سے پوچھا یہ تم نے کیا کیا۔ عرض کی جو آپ نے کیا وہی ہم نے کیا۔ یہ جیسے ہی دربار میں آئے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے ہمراہ کوئی شمشیر کیف آ رہا ہے اور آواز سے رہا ہے خبر زاد قدم آئے نہ بڑھاتا نہ کوئی ایک بھی زندہ نہ بچے گا۔ کیوں نہ ہو صاب ذوالفقار کا فرزند ہے۔ اس کا لوہا آسمان والوں نے مانا ہے۔ زمین والوں کا کیا ذکر ہے۔

دربار میں تو ہین امام کی ایک نئی شکل یہ نکالی گئی کہ دو درخشاں کو عام کر دیا گیا اور حضرت کو شراب پر مدعو کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اہلبیت شراب سے ذوق نہیں رکھتے۔ اس لئے کہا اچھا قص سے شوق فرمائیے۔ آپ نے فرمایا

ہم عمرات اور منکرات سے الگ رہتے ہیں۔ اس نے کہا شعر ہی سنائیے۔ فرمایا کہیں شعر نہیں کہتا۔ اس نے کہا وہ تو آپ کو سنانا ہی پڑیں گے۔ مجبوراً آپ نے مولائے کائنات کے چند شعر سنائے۔ جن کا مضمون یہ تھا: وہ لوگ کہاں ہیں جن کے دروازوں پر ریشمی پردے بڑے رہتے تھے۔ جن کے سردوں پر تاج رہا کرتے تھے ان کے حردوں کی رونق کہاں گئی۔ ان کی آرائش و زیبائش کیا ہو گئی۔ قضا و قدر نے انھیں تخت سے کھینچ کر زمین کے اندر پہونچا دیا۔ عیش و آرام رنج و غم میں بدل گیا۔ کیرٹے ان کے جسم کو کھارہے ہیں۔ بدترین منزل میں ان کا قیام ہے اور کسی کو ملنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ یہ سننا تھا کہ متوکل بے ہوش ہو گیا۔ بیخ مار مار کر رونے لگا اور تمام جام و ساغر کو توڑ کر پھینک دیا حضرت کو باعزت طریقہ سے رخصت کر دیا (منہی الامال)۔ اور قدرت نے آواز دی۔ دیکھا ہمارا انتظام۔ ہم جسے عزت دینا چاہتے ہیں اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تو سہی کہ ہم تمھارے ہی دربار میں انقلاب نہ برپا کر دیں اور تمھارے ہی ہاتھوں تمھیں ذلیل نہ کر دیں۔

متوکل اس پر بھی ہوش میں نہ آیا اور جاسوسوں کے بیان پر اعتماد کر کے حضرت کے مکان کی تلاشی کا حکم دیدیا۔ جاسوس راتوں رات گھر میں داخل ہوئے چھت کی طرف سے آئے۔ حضرت مھلتے پڑتے۔ فوراً اٹھ کر چراغ لے کر پہونچ گئے۔ آؤ۔ آؤ میرا گھر دیکھ لو۔ میں چراغ دکھائے دیتا ہوں کہ کہیں گرنہ بڑو۔

کائنات میں اس کردار کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ آئے والے شرمندہ ہوئے حضرت نے ایک ایک گوشہ کی تلاشی دی اور سوائے سامان عبادت کے کچھ برآمد نہ ہوا۔ لوگوں نے متوکل کو خبر کی۔ اس نے دربار میں طلب کیا اور بظاہر احترام کیا لیکن بنی عباس کی روش معلوم ہے۔ وہ کبھی آل محمد کا وقار برداشت ہی نہیں

کر سکتے۔ ان کے مظالم بنی امیہ سے بدتر ہیں۔ بنی امیہ نے زندگی میں مظالم ڈھائے تھے۔ بنی عباس نے قبروں پر مظالم ڈھائے ہیں۔ نشان قبر تک مٹانے کی کوشش کی ہے۔ خدا برا کرے اس تعصب کا کہ انسان صاحبان کمال کو زندہ بھی نہ رہنے دے اور مرنے کے بعد بھی قبروں پر ظلم ڈھائے۔ مگر وہ اسے قدرت پروردگار جب کسی ظلم کا ارادہ کیا گیا قدرت نے ظلم ہی کو اظہار فضیلت کا ذریعہ بنا دیا۔ آپ سوچیں کہ اگر متوکل نے قبر حسینؑ پر ہل چلوانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ ہنر کا پانی کٹا کر لانے کی سعی نہ کی ہوتی تو کسے معلوم ہوتا کہ شہادت کے بعد حسینؑ کی جلالت کیا ہے اور کون سمجھتا کہ شہید راہ خدا کی زندگی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ دنیا تو یہی سمجھتی کہ حسینؑ معاذ اللہ اس شخصیت کا نام ہے جس کو کربلا میں یزید سے شکست ہو گئی۔ اور جو انتہائی غربت و بیکسی کے ساتھ شہید ہو گئے۔ لیکن متوکل کے مظالم نے واضح کر دیا کہ حسینؑ کربلا میں کیا بے بس ہوتے۔ سیکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی بے بس نہیں ہیں۔ حکومت کا سارا زور صرف ہو رہا ہے لیکن امت اپنے روحانی اقتدار سے حکومت کا زور روکے ہوئے ہے۔ اب تو اندازہ ہوا کہ روحانیت کا اقتدار کیا ہوتا ہے اور روحانیت مادیت کا زور کس طرح دبا دیا کرتی ہے۔ یاد رکھو حسینؑ مشیت الہی سے مجبور نہ ہوتے تو کربلا کا تختہ بھی پٹ گیا ہوتا۔ لیکن وہ مشیت کی بات تھی آج مشیت یہی ہے کہ حسینؑ اپنا زور دکھلا دیں۔ اور دنیا کو بتا دیں کہ شہید راہ خدا مرنے کے بعد بھی اس قدر زندہ ہوتا ہے تو زندگی میں کیسی زندگی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکے گا۔

سلاطین و قتلے اپنا سارا زور ختم کر دیا لیکن نہ امامت کو مرعوب کر سکے نہ امامت کے وقار میں کوئی کمی پیدا کر سکے۔ آخری حوصلہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک دن اسے بھی آزما لیا۔ جب دیکھا کہ کس طرح امام قابو میں نہیں آ رہے ہیں

تو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید انھیں ہمارے اقتدار کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر اقتدار کا اندازہ ہو جائے تو خود بخود سر جھکا دیں گے۔ چنانچہ حکم عام دیدیا گیا کہ ساری فوج ایک میدان میں اکٹھا ہو اور ایک اونچا سا ٹیلہ بنایا جائے جہاں سرکار جہاں پناہ" جا کر اپنی فوج کا جائزہ لیں گے۔ ٹیلہ تیار ہوا۔ فوج اکٹھا ہوئی۔ ۹۰ ہزار افراد صحرا میں صلح بکھرے ہوئے۔ اور بادشاہ امام علی نقیؑ کو لیسکر بندی پر جانا ہے۔ فرزند رسولؐ! چلئے آج آپ کو شہر کا منظر دکھایا جائے۔ امام نے کسی بات کا انکار نہیں کیا اور ہر انکار کو خلاف مصلحت سمجھتے رہے۔ اسلئے بھی کہ انکار سے اذیت کا نیا بہانہ مل جائے گا۔ اور اس لئے بھی کہ یہی مواقع اپنے فضائل و کمالات کے اظہار کے ہوتے ہیں۔ — بندی پر تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے فوج پر ایک نگاہ کی اور کہنے لگا کہ آپ میرا اقتدار دیکھ رہے ہیں۔ میری فوج کا کیا عام ہے۔ اور میرا لشکر کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان حالات کو دیکھنے کے بعد آپ اپنے انجام کے بارے میں نہیں سوچتے اور برابر حکومت سے مقابلہ پر آمادہ رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تیرا اقتدار دیکھ چکا اب ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا۔ اب جو اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھا کہ زمین سے آسمان تک فوج ہی فوج نظر آ رہی ہے اور ہر طرف لشکر ہی لشکر دکھائی دے رہا ہے آپ نے فرمایا وہ تیرا اقتدار تھا۔ یہ میرا اقتدار ہے۔ یہ سننا تھا کہ بادشاہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ محمودی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو حضرت نے فرمایا کہ اس قدر پریشان کیوں ہے۔ میں تو تیری فوج دیکھ کر پریشان نہیں ہوا۔ تو میری فوج دیکھ کر اس قدر پریشان کیوں ہو گیا۔ اس نے کہا فرزند رسولؐ! آپ کی فوج خدا کی پناہ اس کی کوئی انتہا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو ہم اہلبیتؑ ان طاقتوں کو حکومت کے مقابلہ میں

صرف نہیں کرتے اور ہر مصیبت کو برداشت کر لیتے ہیں۔ ہم نے دنیا کو ترک کر دیا ہے اور آخرت کو اختیار کر لیا ہے۔ ہم اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ دنیا کے دور و وہ سلاطین سے مقابلہ کریں۔ نہ ہمارے خدائے فرعون و فرود سے مقابلہ کیا ہے اور نہ ہم سلاطین وقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ (منہجی الامال)

یہ ہے اقتدارِ امامت اور یہ ہے کردارِ امامت۔ کسی اور کو یہ اقتدار مل گیا ہوتا تو ساری دنیا کو فنا کر چکا ہوتا اور روئے زمین پر کوئی ایک دشمن زندہ نہ رہتا۔ یہ آل محمد کا کردار تھا کہ اتنا عظیم اقتدار رکھنے کے بعد بھی اسے کبھی اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اور ہمیشہ خدا کی طاقت کو خدا کے لئے استعمال کرتے رہے۔ انھوں نے سنگ ریزوں کو نطق دیا تو بیچ پروردگار کے لئے جانوروں کو گویائی دی تو شہادت رسالت کے لئے جاندار کے ٹکڑے کئے تو غفلت پروردگار کے لئے اور مغرب سے سورج بھی پٹایا تو سجدۂ اہلبی کے لئے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی طاقت کو استعمال نہیں کیا۔ اپنی ذات کے لئے

طاقت کو استعمال کرتے تو سلاطین کے ہاتھوں گرفتار نہ رہتے۔ اپنے گھر میں نظر نہ رہتے۔ حراستوں کی زندگی نہ گذارتے۔ قبروں کا نشان نہ مٹایا جاتا۔ بچوں کو بھوکا پیاسا نہ رکھا جاتا۔ گھر میں رستی نہ پڑتی۔ پہلو پر دروازہ نہ گرتا۔ محسن کی شہادت نہ ہوتی۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ انہوں نے اپنی طاقت کو اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کیا اور ہمیشہ مرضی اہلبی پر راضی رہنا رہا ہے۔ قیامتیں گذر گئیں اُن تک نہیں کی۔ ہمارے پڑے بد دعا بھی نہیں کی۔ مصائب کا سلسلہ قائم رہا آہ نہیں کی۔ گلاکٹ کیا بخشش امت کے علاوہ کوئی دعا نہیں کی۔ کہاں دنیا میں ہیں گئے۔ ایسے صاحبانِ کردار۔ اور کہاں نظر آئیں گے ایسے بندگان پروردگار امام علیؑ کا تذکرہ تھا تو انھیں کے تذکرہ پر بیان کو تمام کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ درمیں وہ

سلسلہ مصائب۔ وہ ایسے مصائب۔ وہ طوفانِ خداوندی کہ بدرِ مظلوم کی زیارت پر پابندی عائد ہے۔ زائرین کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں۔ بچے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ اور شائقینِ زیارتِ قبرِ مظلوم کی زیارت کو جا رہے ہیں وہ دن بھی آیا جب متوکل کا قتل واقع ہوا اور اس کے بعد منتظر نے زیارت سے پابندی ہٹائی۔ مظلومیت رنگ لائی۔ قبرِ مظلوم آباد ہوئی۔ زائرین جانے لگے امام کے دل کو قدر سے سکون ملا۔ لیکن وہ فرزند کیا کرے۔ جو شہیت کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہے کہ آف تک نہیں کر سکتا۔ کیسے کیسے مظالم۔ آپ تصور کر سکتے ہیں۔ حکم عام ہے کہ جو زیارت کے لئے جائے۔ اس سے ایک مخصوص رقم وصول کی جائے۔ ضعیف عورتیں فاقے کرتی ہیں۔ رقم جمع کرتی ہیں اور اگر کہتی ہیں یہ حکومت کا ٹیکس حاضر ہے۔ میں اپنے مولا کی زیارت کے لئے جا رہی ہوں۔ یہاں ہوں تو سوال کیا یہ رستم کہاں سے آئی؟ ضعیف نے کہا میں نے فاقے کمر کے جمع کی ہے۔ مجھے فاقہ گوارا ہیں لیکن قبرِ حسینؑ کی زیارت نہ کروں یہ گوارا نہیں ہے۔ کیوں اربابِ عزت! جابجائے والی کو قبرِ حسینؑ کا اتنا اشتیاق ہے۔ کاش کوئی اس بہن سے پوچھتا جو بھائی کی لاش کو صحرائیں چھوڑ کر جا رہی تھی اور اتنی ہسرت نہیں تھی کہ مانجھے کی قبر بنا سکتی۔ تڑپ کر فریاد کر رہی تھی نانا! آپ کی نماز جنازہ لا لگے پڑھی ہے اور یہ آپ ہی کا حسینؑ ہے جس کا لاشہ ملتی رہتی پر پڑا ہوا ہے اور کوئی ذبح کرنے والا نہیں ہے۔ نانا یہ آپ ہی کی زینب ہے جس کے بازو دُلتا۔ ریاں بندھی ہوئی ہیں اور جس کو کوہِ دُشام لے جایا جا رہا ہے۔ اور پھر لاشِ برادر سے خطاب کر کے کہہ رہی تھیں۔ بھیا گواہ رہے گا کہ بہن مجبور ہو کر جا رہی ہے در نہ اپنا اختیار ہوتا تو ہرگز آپ کو صحرائیں چھوڑ کر نہ جاتی۔

اربابِ عزت! مصائب کا یہ سلسلہ تمام ہوا لیکن کس طرح تمام ہوا کہ

معتز باللہ نے امام علی نقی علیہ السلام کو موقع پا کر زہر دلوادیا۔ اور زہر کا یہ لال نہر جب ۵۴ھ کو اپنی جدہ ماجدہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور جب نہیں کہ جا کر عرض کیا ہو۔ جدہ ماجدہ کل آپ نے اپنے لال کو زہر دغا سے ترپتے دیکھا تھا آج پھر اپنے ایک فرزند کو زہر دغا کا شہید دیکھ لیجئے۔ جدہ ماجدہ آپ کی پوری ذریت زہر دغا سے شہید کر دی گئی اور آپ کا خاندان یونہی تباہ کر دیا گیا۔ آپ کے بچوں کو زندہ دیواروں میں چنا گیا۔ آپ کے فرزندوں کے خون سے گارا بنوایا گیا۔ آپ کے حسین کی قبر پر ہل چلوانے کی کوشش کی گئی۔ آپ کے لال کی قبر پر نہر کاٹ کر لائی گئی لیکن پانی شرابا کر ددر ٹھہر گیا۔ جس کے بچوں کو تین دن تک پانی نہ ملا ہو اس کی قبر تک میں کس طرح جاؤں گا۔

عزادارو! امام کا انتقال ہوا۔ امام حسن عسکری موجود تھے۔ باپ کی تجہیز و تکفین کا فرض انجام دیا۔ غسل دیا، کفن پہنایا۔ اپنے کاندھوں پر جنازہ اٹھایا اور اہتمام سے باپ کو دفن کر دیا۔ مگر ہائے حسینؑ مظلوم کون تھا جو یہ سارے انتظامات کرتا۔ ایک بیٹا تھا جس کے اہتقوں میں ہتھکڑیاں، پیردوں میں بیڑیاں، نگلے میں طوق خاردار۔

رونے والو! روایت میں ملتا ہے کہ باپ کا انتقال ہوا تو امام حسن عسکری نے فرط غم سے گریبان چاک کر ڈالا۔ کسی نے کہا فرزند رسول! آپ کو تو صبر کرنا چاہیے۔ فرمایا۔ یہ غم اس لائق ہے کہ اس میں گریبان کو چاک کر ڈالا جائے۔ ہاں ارباب عزاء۔ جس کا بیٹا زندہ ہوتا ہے۔ جس کی اولاد زندہ ہوتی ہے۔ اس کا غم یونہی منایا جاتا ہے۔ مگر ہائے حسینؑ غریب کسی کی آنکھ میں آنسو آجائے تو اشقیا نوک نیزہ سے اذیت دیں۔

اور کوئی رونے کا ارادہ کرے تو تازیانے مارے جائیں۔ گریبان کون چاک کرے۔ ایک سکینہ ہے تو اس کا کرتا پہلے سے پھٹا ہوا ہے۔ ایک بچی ہے تو اس کے دامن میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کا دل فریاد کر رہا ہے ارے میرے بابا۔ اب تو چچا بھی نہیں ہیں۔ میرے دامن کی آگ کون بجھائے گا کون جانے سکینہ پر کیا گذری۔ اور کون جانے کہ بچی کی فریاد کون کرے باپ پر کیا گذر گئی۔ دل کہتا ہے کہ لاش تر پی ہو گی۔ آواز آئی ہو گی۔ سکینہ اب صبر کر دیجی۔ بیٹی اب چچا کو یاد نہ کر دو۔ چچا فرات کے کنارے سو گیا۔ اب چچا واپس نہ آئیں گے میری لال۔

انا للہ وانا الیہ راجعون —



امام حسن عسکری علیہ السلام

اسم مبارک	حسن
لقب	عسکری - زکی
کنیت	ابو محمد
والد ماجد	امام علی نقیؑ
مادرہ ماجدہ	جناب سوسن
ولادت	۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ جمعہ مدینہ منورہ
شہادت	۸ ربیع الاول ۳۲۰ھ
عمر مبارک	۲۸ سال
قبر مطہر	سامرہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء الاولين
والآخرين خاتمة النبيين سيدنا ومولانا ابي القاسم محمد الما الطيبين
الطاهرين ولعنة الله على اعدائهم اجمعين لما بعد فقد قال الله الحكيم

في كتابه الكريم - بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا عَلِمْنَا لَكَ هُدًى وَإِنَّا لَنَافِلُ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے
اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالک کائنات نے اس ارشاد میں صاف واضح کر دیا ہے کہ ہم نے ہر
دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور ہر پور پر ہادی اور رہنما مقرر کئے ہیں
یہ انسانوں کی بدبختی ہے کہ انہوں نے ہمارے ہادیوں اور رہنماؤں سے فائدہ
نہیں اٹھایا اور اپنی مرضی کے مطابق رہنما تلاش کرتے رہے۔ ان کی جہالت کا تو
یہ عالم ہے کہ انہوں نے ہمارے انبیاء و مرسلین کو چھوڑ کر پتھروں کو اپنا رہنما بنایا
اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اصنام 'یہ بت ہی ہم کو خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔
اور اس سے قریب کر سکتے ہیں۔ صاحب اختیار و اقتدار انبیاء کے بارے
میں یہ عقیدہ نہ پیدا ہو سکا اور بے شعورتوں کے بارے میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا
ظاہر ہے کہ انسان جب اس جہالت اور نادانی پر اترا آئے تو انتظام ہدایت بھی
کیا کر سکتا ہے اور اسے کون راہ ہدایت پر لاسکتا ہے۔ ہمارا فرض رہنمائی کا انتظام
کرنا تھا ہم نے کر دیا۔ فائدہ اٹھانا نہ اٹھانا انسان کا کام تھا اس میں ہمارا کوئی
دخل نہیں ہے۔ ہم اس کا حساب روزِ محشر کریں گے کہ کس نے ہماری ہدایت سے
فائدہ اٹھایا اور کس نے ہمارے نظام کو نظر انداز کر دیا۔

انسان عقل و شعور سے کام لیتا تو اتنا سوچتا کہ خالق عقل و شعور کے پاس علم و کمال ہم سے زیادہ ہے۔ وہ جسے اپنا نمائندہ قرار دے گا اس کے فضائل و کمالات ساری دنیا سے زیادہ ہوں گے۔ اس کے ذریعہ جو نظام عالم ظہور میں آئے گا وہ کائنات کے سارے نظاموں سے بہتر اور برتر ہو گا وہ انسان کے باطن سے باخبر ہے۔ وہ اس کی نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل سے بھی آگاہ ہے۔ وہ نمائندہ بنائے گا تو اسی وقت بنائے گا جب امانی و حال و مستقبل سب کو ہنگامہ میں رکھ لے گا۔ ظاہر و باطن سارے کردار کو آزمائے گا۔ تبلیغ و ترویج کی ساری صلاحیتوں کا جائزہ لے گا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو اتنے اہتمام سے ساتھ رہنا بنایا جائے گا اس کی شان ہی کچھ اور ہوگی۔ اس کا عالم وہ نہ ہو گا کہ صبح کو بنایا اور شام کو معزول کر دیا اور شام کو بونا یا صبح کو معزول کر دیا۔ ارباب کرم! آپ راہِ مستقیم سے پہنچے ہوئے اسلام کا جائزہ لیں تو اس میں اور کفر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام بھی کفر کا کوئی حصہ ہے۔ کل صبح کو مت بننے تھے اور شام کو فنا کر دیئے جاتے تھے۔ آج صبح کو خلیفہ بننے ہیں اور شام کو معزول کر دیئے جاتے ہیں۔ کل انبیاء و مرسلین کو چھوڑ کر مصامت بتوں کی پرستش ہو رہی تھی اور آج قرآن باطن کو چھوڑ کر حسبات کتاب اللہ کا نعرہ لگا یا جا رہا ہے۔ صلوات لیکن قدرت نے واضح کر دیا کہ تم جب بھی اپنے نمائندوں کو ہمارے نمائندوں سے موازنہ و مقابلہ کر دو گے۔ تمہیں محسوس ہو جائے گا کہ تم نے الگ نظام بنا کر سخت غلطی کی ہے اور تمہارے مقدرمیں ٹھوکر دوں گے سو اچکھ نہیں آیا ہے۔ تم میں شعور ہوتا تو تم اتنا سوچتے کہ جسے تم بناتے ہو وہ ہر منسلک پر ٹھوکر کھا کر تمہیں پکارتا ہے کہ بھائیو! مجھ سے خطا ہو جائے تو بتا دینا میں

راستہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہ پر لگا دینا۔ میں ٹیرٹھا ہوں گا تو مجھے میدھا کر دینا۔ میں بہک جاؤں تو مجھے حراط مستقیم بتا دینا۔ اور مختصر یہ کہ میں ٹھوکر کھا جاؤں تو تم مجھے سنبھال لینا! اور جسے ہم بتاتے ہیں وہ ٹھوکر کھا کر دوسروں کو آواز نہیں دیتا ہے۔ بلکہ دنیا میں کوئی بھی ٹھوکر کھانے والا ٹھوکر کھا کر اسے آواز دیتا ہے۔ تو وہ سنبھال لیتا ہے۔ میں یاد رکھوں کہ ٹھوکر میں کھانا تھا ہمارا کام ہے اور سنبھال لینا ہمارا کام ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا تم نے درد کی ٹھوکر میں کھائیں اور حیدر کو چھوڑ دیا۔ اور ہم نے ہر در پر حیدر کو مقرر کر کے شہرِ علم کا دربنادیا۔ اور کعبہ کے قریب آیا تو دیوارِ کعبہ میں بھی دربنادیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ حیدر کون ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پروردگار عالم نے جس دور میں جسے نمائندہ بنایا۔ ساری کائنات میں اس کا جواب نہیں ملا اور فضائل و کمالات اس شان سے منظرِ عام پر آئے کہ دشمنوں کو بھی اقرار کرنا پڑا۔ وہ مصائب میں رہے۔ قید خانہ میں رہے۔ حراستوں میں رہے لیکن ان کے کردار کی شہادتیں دنیائے انسانیت کے دلوں تک پہنچتی رہیں۔ کیا دنیا اس حقیقت کو نظر انداز کر دے گی کہ سلاطینِ دنیا نے ائمہ معصومین کی زندگیوں پر پناہ پہرے بٹھائے اور حراست و زندان میں رکھ کر اذیت و مصیبت کی بے حساب تائید کی لیکن جس نے ایک مرتبہ کردارِ عمل کا جائزہ لے لیا وہ گردیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنے کافروں کو مسلمان بنا دیا۔ کتنے منافقوں کو صاحبِ ایمان بنا دیا۔ کتنے دلوں میں عقیدت کے چراغ جلا دیئے۔ کتنے ذہنوں کو محبت کی روشنی دیدی۔ کتنے جیوانوں کو انسان بنا دیا اور باادقات تو ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ دربار میں قتل کے ارادہ سے

بلا لیا گیا ہے اور جب دربار میں داخل ہوتا ہے تو حاکم سر و قد کھڑا ہو کر تعظیم کرتا ہے۔ غلاموں کو گردن زدنی کی تاکید کر دی گئی ہے لیکن جب تشریف لاتے ہیں تو غلام جھک کر تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخ میں ایک واقعہ نہیں ہے بشار واقعات ہیں۔ اس وقت دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے تاکہ دنیا کا ظلم بھی سامنے آجائے اور ظلم کی شام میں ہدایت کے چراغ کی روشنی بھی نظر آجائے۔

عبد اللہ بن خاقان ایک محبِ اہلبیت اور عقیدت مند انسان تھا۔ اس کے فرزند احمد بن عبد اللہ کو حکومت وقت نے صیغہ اذ قاف کا افسر بنا دیا تھا۔ عہدہ کا ملنا تھا کہ دنیا منتقل ہو گئی۔ اور دشمنی اہلبیت ہی سر پایہ زدگی بن کر رہ گئی۔ ایک مرتبہ احمد بن عبد اللہ کے سامنے علوی سادات کا ذکر آ گیا تو اس نے کہا کہ روئے زمین پر سادات میں امام حسن عسکریؑ سے بہتر افضل کوئی نہیں ہے۔ ان کا ظلم ان کا زہدان کا تقویٰ ان کی عظمت قابلِ صدر شک ہے علماء سے لے کر عوام تک اور فقرا سے لے کر حکام تک سب ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور ان کے کمالات کی قدر کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ایسا فرما رہے ہیں ہاں آپ تو اس کے خلاف کہنا چاہتے۔ اس نے کہا جیسا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک دن میں دیوان خانہ میں اپنے باپ کے پاس کھڑا تھا کہ خادموں نے آکر خبر دی کہ امام حسن عسکریؑ تشریف لارہے ہیں۔ یہ سنا تھا کہ میرے بابا انکی تعظیم کے لئے دوڑ بڑے اور نہایت ہی احترام سے لا کر اپنے پاس بٹھایا۔ میں نے اس سے پہلے کسی کی اس طرح تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ بابا کو کیا ہو گیا ہے اور اس طرح کیوں تعظیم کر رہے ہیں۔ لیکن کھڑا منظر دیکھتا رہا۔ وہ حضرت تشریف فرما ہوا میرے بابا گفتگو میں مسلسل یہ کہتے

رہے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اس جوان میں کون سی خاص بات ہے کہ بابا جان اس انداز سے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ تو کوئی گفتگو کا انداز نہیں ہے۔ اسی اثنا میں کسی نے خبر دی کہ خلیفہ وقت تشریف لارہے ہیں لوگ تعظیم کے لئے دوڑ پڑے لیکن بابا پر کوئی اثر نہیں ہوا مجھے اور قجب ہوا کہ آج یہ کیا ہو گیا ہے کہ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے اور ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ نہ استقبال نہ احترام۔ نہ چوبدار نہ خدام۔ کوئی توجہ نہیں ہے یہاں تک کہ سواری کا ایک حصہ مکان کے احاطہ میں داخل ہو گیا تو بابا نے امام سے فرمایا کہ اب مناسب یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ خلیفہ وقت کی سواری آرہی ہے۔ وہ حضرت نہایت خاموشی سے روانہ ہو گئے۔ بابا نے ان کی پیشانی کا بوسہ دیا اور انھیں رخصت کر کے بادشاہ کے استقبال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گذری۔ میں نے خادموں سے پوچھا کہ یہ جوان کون تھے جنہیں بابا نے اس قدر مرتبہ دیدیا ہے۔ خادموں نے کہا یہ امام حسن عسکریؑ ہیں جنھیں "ابن الرضا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے وقت کے بڑے صاحب کمالات و کمالات ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ آج اپنے بابا سے بحث کروں گا کہ آخر یہ کیا طریقہ ہے کہ خلیفہ وقت آئے تو کوئی فکر نہیں ہے اور ایک جوان آجائے تو یوں ان کی تعظیم کی جائے۔ یہ کیا انداز ہے۔ یہاں تک کہ رات آئی اور بابا جان کا غذا دیکھنے بیٹھے تو میں نے قریب آکر عرض کی۔ یہ کون بزرگ تھے جنکی تعظیم کے لئے آپ بے قرار تھے۔ اور ان سے اس لہجہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ عبد اللہ نے کہا کہ یہ شیعوں کے امام ہیں اور یاد رکھو کہ خلافت بنی عباس سے بدل جاتی تو روئے زمین پر ان سے زیادہ کوئی حق دار نہیں تھا۔ یہ بڑے صاحب کمالات و کمالات ہیں ان کے والد امام علی نقیؑ بھی بے پناہ کمالات کے مالک

تھے۔ لوگ یکتائے عصر اور یگانہ روزگار ہیں ان کی کوئی مثال و نظیر نہیں ہے۔
 احمد کہتا ہے کہ یہ منظور دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ جانے میرے باپ کو
 کیا ہو گیا ہے اور ان کے ہوش و حواس کیسے ہیں کہ وہ اس طرح کی گفتگو کر رہے ہیں۔ اور
 میں نے یہ طے کر لیا کہ اب میں خود ان بزرگ کے حالات کا جائزہ لوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ
 باپ کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ اگرچہ میرا باپ لٹوگو اور غلط بیان نہیں
 ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں نہ جانے کیوں اس قدر مبالغہ سے کام لے رہا ہے۔ یہاں
 تک کہ ایک عرصہ تک میں حالات کا جائزہ لیتا رہا اور حضرت کے عیوب کا شکر کرتا رہا۔
 لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے ان کے حالات کو قریب سے دیکھتا رہا ان کی عظمت
 بھگتوں میں اور بڑھتی رہی۔ اور اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے باپ نے جو کچھ کیا
 تھا بالکل صحیح کیا تھا۔ اور یہ بزرگ اسی عظمت و احترام کے مستحق ہیں۔
 اور اب نظر دیکھا آپ نے بات کس عداوت سے چلی اور کس محبت پر اگر
 ٹھہری۔ قدرتشہی چاہتی تھی کہ لوگ ہمارے نمائندوں کو آزمائیں۔ ان کے کردار کا
 جائزہ لیں۔ ان کی زندگی کو قریب سے دیکھیں۔ کم سے کم ان کے کمالات تو منظر عام پر
 آجائیں اور دنیا کو محسوس ہو جائے کہ اس نے ہمارے نظام کو چھوڑ کر کتنا بڑا نقصان
 اٹھایا ہے اور اپنے نظام کی بدولت کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن سلاطین وقت
 بھی اس نکتہ سے غیب باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ منظر عام پر رہے تو ہمارا
 پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔ اور ساری دنیا انہیں کی طرف مڑ جائے گی۔ اسی لئے ہر
 آن یہی ٹھہری کہ ان کو منظر عام سے الگ رکھا جائے۔ اور پھر امام حسن عسکریؑ
 کے ساتھ تو ایک نیا ظلم بھی ہوا۔ ہر امام کو عوام سے دور رکھا جاتا تھا۔ حضرت
 کو گھسے بھی الگ رکھا گیا۔ اس لئے کہ حکومت وقت کو معلوم تھا کہ
 پیغمبر کا آخری وارث انہیں کے مطلب سے پیدا ہونے والا ہے اور نظام

دنیا کا انقلاب اس کے ہاتھوں میں ہونے والا ہے۔ ظلم کا فائدہ دہی کرے گا۔ اسلام کا
 حقیقی پرچم دہی ہوا ہے گا۔ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ نئی ولی
 اللہ کا کلمہ دہی پڑھو اے گا۔ بساط اقتدار اسی کے ہاتھوں اٹھی جائے گی۔ تخت
 اسی کے سیلاب میں تھتے نہیں گئے۔ تاج اسی کے اشاروں پر ٹھوکرؤں کی گیند بنیں
 گئے۔ اس لئے ہر ایک کو فکر تھی کہ حضرت اپنے گھر میں بھی نہ رہنے پائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ
 حجت خدا وجود میں آجائے۔ اور تخت و تاج کی عمر مختصر ہو جائے۔ مصائب کا یہ نیا سلسلہ
 تھا کہ عوام میں رہیں نہ گھر میں رہیں۔ حراست اور مکمل حراست۔ زندان اور مکمل
 زندان۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ کو اطمینان نہیں ہوا تو اپنے ہی قلعے کے ایک حصے
 میں محبوس کر دیا تاکہ گھر والوں سے ملاقات نہ ہونے پائے۔ اور آخری حجت خدا
 وجود میں نہ آئے پائے۔

اللہ رے انقلاب زمانہ۔ بنی عباس کا وارث تخت حکومت پر رہے اور
 پیغمبر اسلام کا لال ایک ایسی کوٹھری میں جس میں روشنی کا گزر بھی نہ ہو۔ لیکن یہ کردار
 کی روشنی تھی جو دہاں بھی چھپائی نہ جاسکی اور بالآخر امام کو اس حراست سے نکالا
 گیا۔ اور اس حجت خدا کا وجود سامنے آ گیا جس کے تصور سے کائنات ظلم لرز رہی
 تھی۔ قدرت نے آواز دی اگر فرعون نے اپنے دور کے موسیٰ کو روک دیا ہوتا
 تو تم بھی اس دور کے موسیٰ کو روک دیتے۔ لیکن یاد رکھو فرعون عمر دیکھتا رہا
 ہے اور موسیٰ قصر فرعون میں آکر اعلان حق کر دیتے ہیں۔

ایسے حالات میں امام نے جو زندگی گزاری اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا
 آپ کے دور میں پو سلاطین بنی عباس گزرے ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے امکان
 بھر آپ کو ستانے کی کوشش کی ہے۔ ابتدائی دور میں متوکل کا زمانہ تھا اس کے
 بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ اگر یہ زندہ ہو کر اس دنیا میں آسکتا تو متوکل ہی

کی شکل میں آتا۔ دوسری شکل ممکن نہ تھی۔ متوکل ۴ سال حکومت کر کے شہر میں داخل جہنم ہوا تو اس کی جگہ پر منتظر نے حکومت سنبھالی۔ ایک سال کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو گیا تو مستعین باللہ نے حکومت ہاتھ میں لی۔ اور ۲۵۵ھ تک چار برس مسلسل حکومت کرتا رہا۔ مستعین کے بعد ۲۵۵ھ میں معتز باللہ کو حکومت ملی لیکن تین برس سے زیادہ نہ رہ سکی۔ معتز باللہ کے بعد ہندی کا دور آیا۔ لیکن ایک ہی سال میں اس کے قتل پر تمام ہو گیا۔ ہندی کے بعد معتز باللہ تخت حکومت پر آیا اور بدیع بن ۲۳ سال تک مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہا۔ ان سلاطین نے امام حسن عسکریؑ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے بنی عباس کا مزاج معلوم ہو چکا ہے۔ متوکل کی سازشیں اور اسکی شرارتیں شہر آفاق بن چکی ہیں۔ اب باقی افراد کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ سب متوکل کے جائز وارث تھے، جب تک اپنے معاملات حکومت میں مبتلا رہے۔ امام کی زندگی پر سکون رہی اور جیسے ہی سیاسی معاملات سے نجات ملی پہلا کام یہ کیا کہ امام کو اذیت دی جائے۔ اور ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ وہ تحت خدا وجود میں نہ آنے پائے جو ہر فرعون وقت کا تختہ اٹھنے والا ہے۔

تفصیلات کا محل نہیں ہے۔ اجمالی طور پر ہر بادشاہ کے مزاج کا تعارف کرادیا جائے تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اگر بابیاست نے نظام ہدایت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد کیسے کیسے افراد کو تخت حکومت پر بٹھایا ہے۔ اور تخت حکومت پر بیٹھنے والوں نے اللہ والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

متوکل کے قتل کے وقت امام حسن عسکریؑ کی عمر شریف تقریباً ۱۵-۱۶ سال کی تھی۔ آپ جوانی کی سرمدوں میں قدم رکھ چکے تھے۔ لیکن ایسے مصائب کی زندگی میں کیا جوانی اور کیا ضعیفی۔ کل ۲۸ برس کی عمر ملی لیکن اس میں بھی ضعیفی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اور شدت مصائب نے حالات بالکل تبدیل کر دیئے تھے

متوکل کے بعد منتظر تخت حکومت پر آیا لیکن اسے صرف چند ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اور اس دور میں وہ اپنے ہی حالات نہ سنبھال سکا۔ امام کی طرف کیا توجہ کرنا۔ امام کا زندگی قدرے پرسکون رہی۔ لیکن عام غربت و حراست میں سکون کا کیا ذکر ہے۔ صرف جس دن کوئی تازہ مصیبت نہ آئے اس دن کو سکون و اطمینان کا دن سمجھ لیجئے۔ ۶ برس کی عمر سے وطن چھٹ چکا ہے۔ باپ کے ساتھ مدینہ سے سامہ آچکے ہیں بلکہ لائے جا چکے ہیں۔ اور یہاں ہر روز ایک تازہ افتاد اور ہر دن ایک تازہ مصیبت امامؑ نے یہ زندگی کس طرح گزاری ہے۔ اس کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔ پہلے اس رنج کا اندازہ کر لیجئے کہ جس کے تحت یہ کردار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اور جس نے عصمت کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ کس کا زانہ ہے، سامہ کی گلیاں ہیں بے کھیل کود ہیں صرف ہیں اور امام حسن عسکریؑ کھڑے رد رہے ہیں۔ بھلول دانا کا گزر ہوا فرزند رسولؐ کو روتے دیکھا۔ دل بے قرار ہو گیا۔ عرض کرتے ہیں شہزادے کیا آپ کے پاس کھلونے نہیں ہیں تو میں ابھی لائے دیتا ہوں۔ روتے کی کیا ضرورت ہے شہزادے نے فرمایا۔ بھلول ہم اہلبیتؑ کھیلنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے، ہم عبادت و اطاعت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر قرآن مجید کی آیت سنائی کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو جنت پیدا کیا ہے اور تم پلٹ کر ہماری بارگاہ میں آؤ گے۔ بھلول میسر ہو کر رہ گئے۔ عرض کرتے ہیں فرزند رسولؐ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے چند نصیحتیں آمیز اشعار سنائے اور سنا کر اس قدر روئے کہ بیہوش ہو گئے۔ بھلول نے گہرا کر کلیجے سے دگایا۔ ہوش آیا تو عرض کی شہزادے آپ اس قدر کیوں رد رہے ہیں۔ آپ پر تو کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے آپ توجہ نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں بھلول میں نے دیکھا ہے کہ مادر گرامی جب آگ روشن کرتی ہیں تو پہلے چھوٹی لکڑیوں کو جلاتی ہیں اس کے بعد بڑی لکڑیوں کی باری آتی ہے۔

میں سوچتا ہوں بہلول کہ اگر آتش جہنم کو روشن کرنے میں چھوٹی ہی ککڑیاں کام آگئیں تو کیا ہوگا۔ یہ کہہ کر حضرت خاموش ہو گئے اور بہلول فرط مسرت سے جھومنے لگے۔ اشد یہ ہے امامت کا پھینا۔ چند برس کی عمر اور اس پر یہ عرفان الہی۔ یہ خوف پروردگار۔ دنیا میں کسے یہ انداز نصیب ہوتا ہے۔ دنیا کے بوڑھوں میں بھی یہ عرفان نہیں ہے، جو آل محمد کے بچوں میں پایا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ درگاہ رب العالمین کے تعلیم یافتہ آغوش رسالت و امامت کے پروردہ۔ ان کے پاس کمال نہ ہوگا تو کس کے پاس ہوگا۔ یہ صاحبان عرفان نہ ہوں گے تو کون ہوگا۔ قیامت کی بات ہے کہ آغوش عصمت کے پروردہ افراد سے وہ لوگ مقابلہ کریں کہ جن کی نسلیں آغوش کفر و نفاق میں پرورش پاتی ہیں۔

ارباب کرم! اس مقام پر ایک فقرہ کا عرض کر دینا ضروری ہے کہ بہلول جیسا صاحب معرفت جس کی ذہانت و قابلیت کی بنا پر ہارون رشید نے اپنا وزیر اعظم بنانا چاہتا ہوا اور انھوں نے بر بنائے استغناء و بے نیازی اے ٹھکرا دیا ہو وہ بھی یہ عالم دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ خاندانہ عصمت کا کیا انداز ہوتا ہے۔ دنیا کے جاہل و نادان کیا سمجھیں گے کہ امامت کا وقار کیا ہے۔ اور اس کے کردار کا انداز کیا ہوتا ہے۔ امام حسن عسکریؑ نے بھی واضح کر دیا کہ جب ہم معصوم ہو کر ایسا خوف خدا رکھتے ہیں اور اس طرح لڑتے ہیں تو تمہیں کیا کرنا چاہئے اور تمہارا انداز کیا ہونا چاہئے۔ یہ تمہیں خود سوچنا چاہئے اور یہ نہ کہنا کہ معصوم کو اس قدر خوف کی کیا ضرورت ہے۔ اور وہ اس قدر کیوں گریہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جے جس قدر عظمت کا احساس ہوتا ہے وہ اکا قدر خوفزدہ بھی رہتا ہے۔ اور جو عظمت کا اندازہ ہی نہیں رکھتا وہ کیا خوف پیدا کرے گا۔ بچہ سانپ کو نہیں جانتا تو اس سے کیلتا ہے۔ بزرگ انسان جانتا ہے

تو اس کے قریب بھی نہیں جاتا۔ خوف بیش معرفت سے پیدا ہوتا ہے۔ اسبے معرفت ہی نہیں ہے اسے خوف کہاں سے حاصل ہوگا یا یوں کہا جائے کہ جن لوگوں کو سانپ کا عرفان حاصل ہے وہ سانپ کے ڈر سے روتے ہیں اور جن لوگوں کو خدا کی معرفت حاصل ہے وہ خوف الہی سے گریہ کرتے ہیں۔

بہلول کا ذکر آگیا ہے تو چند کلمے اور سن لیجئے۔ یہ بڑے پایہ کے بزرگ تھے اور بہترین علم و دانش کے مالک تھے۔ ان کی حاضر جوابی اور ان کے کمال سایہ مار تھا کہ لوگ انھیں دیوانہ کہنے لگے تھے۔ اور یہ بھی اس بات پر خوش تھے کہ اس طرح دیوانگی میں جہاں پاپتے ہیں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔ حکومت کا عتاب نازل نہیں ہوتا۔ اور حق کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ تاریخ میں ان کے شمار واقعات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے تذکرہ کا محل نہیں ہے۔ صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی بھوٹی قبر میں پر شکائے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ دیوانہ کیا کر رہا ہے۔ اس سے دریافت کرنا چاہئے کہ یہ شہر کیوں نہیں جاتا اور یہاں قبرستان میں کیوں پڑے پڑے بڑھ کر دریافت کیا۔ بہلول یہاں کیوں پڑے پڑے۔ شہر کی طرف کیوں نہیں جاتے۔ بہلول نے مسکرا کر فرمایا کہ سارے شہر والے تو اسی طرف آرہے ہیں۔ میں ادھر جا کر کیا کروں گا، پھر دنیا والے تو ساتھ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ ہزار برائیاں ہزار عیب ہزار جھوٹ، ہزار غیبت اور میں جن کے درمیان بیٹھا ہوں کیسے اچھے لوگ ہیں۔ خاموش پڑے میں نے کوئی لڑائی نہ جھگڑا۔ نہ کسی کی غیبت نہ کسی کی بُرائی نہ کسی کا مال چھینتے ہیں نہ کسی پر ظلم کرتے ہیں نہ اپنے بسایہ کو تاتے ہیں۔ اور نہ آنے والے کو بھگاتے ہیں۔ ہر آنے والے کے لئے دل کشادہ رکھتے ہیں۔ حدیث ہے کہ دشمن بھی آ جاتا ہے تو نہایت خوشی سے پہلو میں جگہ دے دیتے ہیں نہ مال

نہ دولت کی فکر نہ جاہ و جلال کی ہوس نہ تخت و تاج کے لئے مر رہے ہیں۔ نہ اقتدار حکومت کے لئے جھجھیں ہیں۔ کہتے اچھے ہیں یہ لوگ اور کہتے خاموش ہیں یہ افراد۔ جن کے درمیان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ بھلا شہر میں کہیں ایسے لوگ ملتے ہیں۔ بہلول نے بے بنیادی دنیا کا بھی نقشہ کھینچ دیا۔ انسان کو اس کے آخری انجام سے بھی باخبر کر دیا۔ قبرستان کی فضیلت بھی بیان کر دی وہاں جانے کا فلسفہ بھی بتا دیا۔ اور ساتھ ساتھ ارباب حکومت و اقتدار پر کڑی تنقید بھی کر دی۔ ذرا دنیا والوں کا کردار تو دیکھو اور پھر اس کے انجام پر بھی نگاہ ڈالو تو معلوم ہو گا کہ اہل دنیا کس قدر خدا کو بھول چکے ہیں۔ اور کس طرح ان کے ذہن پر دنیا غالب آچکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جس کے نمائندے ہیں اسے یاد رکھئے ہوئے ہیں خدا کے نمائندے ہوتے تو خدا کو یاد رکھتے۔ دنیا کے نمائندے ہیں تو دنیا کو یاد رکھتے ہوئے ہیں۔

بہلول نے متعدد واقعہ کی محفل سے فیض اٹھایا ہے اور مختلف معصومین کی بارگاہ میں رہے ہیں۔ ظرف میں صلاحیت اور نفس میں قابلیت ہوتا ان بارگاہوں سے ایسا ہی کمال ملتا ہے۔ یہاں کے پروردہ ایسے ہی مہاجران فضل و شرف ہوتے ہیں اور ظرف میں صلاحیت نہ ہوتو بارگاہ رسالت سے بھی کچھ نہیں ملتا۔ اور مجھے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب اس بارگاہ کے خادموں کا یہ عالم ہے تو جن کی بارگاہ سے یہ شرف پایا ہے ان ہستیوں کا کیا عالم ہو گا۔ اتنا فرق تو ماننا ہی پڑے گا کہ بارگاہ میں حاضری دینے والے بہلول و انما ہوں گے تو بارگاہ کے مالک علم کے بزرگ اب میں ہر باب سے ہزار باب نکالتے والے ہوں گے اور رسول آواز دیں گے "اَنَامِدُیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلٰی بَابِهَا" نصرت پکاراٹھے گی۔

اَوَلَمَّا مَحَمَّدٌ وَاٰخِرُ نَا مَحْمُودٌ وَ مَحْمُودٌ اَعْمَدٌ — سلوات

امام حسن مسکری بیچنے ہی سے آپ کے ساتھ مدینہ سے طلب کر لئے گئے اور سارہ میں آپ کی زندگی صرف مصائب و آلام کا شکار رہی۔ امام علی نقی کی زندگی تک ان کے ساتھ نظربندی اور حواست کی زندگی گزارتے رہے اور ان کے بعد قید تنہائی میں زندگی بسر کی۔ حکومت کی نئی روش یہ ہے کہ حضرات اپنے بچوں سے بھی ملاقات نہ کرنے پائیں۔ تاکہ خدا کی آخری رحمت منظر عام پر نہ آنے پائے۔ ہر آنے والا بادشاہ ایک نئی ترکیب سوچتا ہے۔ اور ہر بدلنے والی حکومت امام کو قتل کر دینے کی نکتہ پیر نکالتی ہے۔ یہاں تک کہ مستعین باللہ نے ایک گھوڑا خریدیا اور وہ اتفاق سے سرکش محل گیا۔ ایسا سرکش کہ کسی کی سواری کو قبول ہی نہ کرتا تھا جس نے جڑھٹے سا ارادہ کیا اسی کو پامال کر دیا۔ اور جو قرب گیا اسی کو روند ڈالا۔ حکومت عاجز ہے۔ شہسوار پریشان ہیں۔ آخر کیا کیا جائے اتنا عمدہ گھوڑا اور اتنا سرکش۔ بالآخر ایک نئی ترکیب نکالی گئی کہ امام حسن مسکری کو طلب کیا جائے۔ اور ان سے سواری کے لئے کہا جائے۔ اگر وہ سوار ہو گئے تو گھوڑا رام ہو جائے گا اور اگر نہ ہو سکے تو اپنا دم کا حاصل ہو جائے گا۔ اور بلا کسی زحمت و بدنامی کے ختم ہو جائیں گے۔ آدمی پہنچ گیا آپ تیار ہو گئے۔ اور تیار ہو کر مستعین کے دربار میں تشریف لے آئے۔ مستعین نے کہا کہ آپ کو ایک عجیب کام کے لئے زحمت دی ہے۔ آپ نے کہا فرمائیے، کہا میں نے ایک گھوڑا خریدا ہ چاہتا ہوں کہ آپ ہی سے افتتاح ہو جائے۔ سکاری کی بھی حد ہوتی ہے اور قدرت بھی کیا رنگ دکھلاتی ہے تو سہا تیرے ہی دربار میں فضیلت کا اعلان ہو جائے۔ آپ نے فرمایا بیشک میں حاضر ہوں۔ اس نے نگام آپ کے حوالے کی آپ نگام لے کر آگے بڑھے اور لوگ موت کی خوشیاں منانے لگے۔ جیسے ہی آپ قریب پہنچے نہایت سکون سے نگام لگا دی۔ اس نے کہا فرزند رسول زمین ہی آپ ہی کس دیں۔

آپ نے وہ بھی کر دیا۔ کہا ذرا سوار بھی ہو جائیں۔ آپ نے سواری کا ارادہ کیا تو گھوڑے نے سر ہٹکا دیا۔ آپ سوار ہو گئے اور تادیر دوڑاتے رہے۔ اس کے بعد اتر کر فرمایا۔ بادشاہ کو اٹھاکام ہے یا میں جاؤں۔ بادشاہ نے کہا میں جا رہا ہوں کہ یہ گھوڑا آپ ہی کو دیدوں۔ آپ نے فرمایا میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں یہ فرما کر گھوڑے کو لیا اور نہایت ہی اطمینان سے بیت الشرف کی طرف چلے آئے۔

یہ تھا امت کا اقتدار اور وہ تھی حکومت کا روش۔ امت نے بھی آواز دی کہ تو بھی تیرے گھوڑے پر میں ہی سواری کروں اور تجھے اپنے گھوڑے پر چڑھنا نصیب نہ ہو۔ میں کہوں گا مقسم کا گھوڑا بھی شہزاد کی بنت بن گیا کہ سب کو اس کی ببار نصیب ہوئی خود مالک کو ہی نصیب نہ ہو سکا۔ امت نے اپنے اقتدار سے یہ بھی واضح کر دیا کہ جو ایک گھوڑے کی تکام نہیں سنبھال سکتا وہ پوری حکومت کی باگ ڈور کی سنبھالے گا اور اباب نظر ہم قہمی ہوں سے سنتے آتے ہیں۔ کل خیر کے بارے میں بھی یہی کہا جا رہا تھا کہ وہ توڑنے کے لئے تیار تھے لیکن گھوڑا ہی نہیں ٹھہرا اور میدان سے بھاگ آیا تو وہ کیا کرتے۔ تو میں کہوں گا کچھ نہیں کرتے صرف گھوڑے کی فراست کی داد دیتے کہ مالک کے عزائم کو کس طرح پہچانتا ہے۔ اور سوار کے اشاروں پر کس طرح چلتا ہے۔

مقسم نے ارادے ناکامیاب ہوئے۔ اس نے بعد معترض باللہ کی حکومت آئی۔ اس نے آپ کو علی بن یامش کی حراست میں دیدیا۔ وہ دشمن اہلبیت ہزدور تھا۔ لیکن حضرت کے کردار کو دیکھ کر رام ہو گیا اور اپنے اعمال کی صفائی طلب کر کے آپ کو آرام گاہ تک پہنچا دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ مجھے حکومت کے عتاب کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ایسے بندہ خدا کو اذیت نہیں دے سکتا

چند دنوں کے بعد معترض واصل جہنم ہو گیا۔ اس کی جگہ ہندی باللہ کو حکومت ملی۔ یہ بظاہر بڑا پاک باز اور متقی تھا۔ لیکن دشمن اہلبیت میں اپنے آباء و اجداد سے کم نہ تھا۔ صرف ایک سال کے قریب حکومت کی لیکن اس میں بھی ہر طرح امام کو اذیت دیتا رہا۔ اور ایک لمحہ آپ کو پھین سے بیٹھنے نہ دیا۔ کھانا پانی تک بند کر دیا۔ اور اکثر آپ میم سے نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مظلومیت رنگ لے آئی۔ اور یہ ہزار حضرت سے مانوس ہو گئے۔ اب جو داروغہ زندان صراح بن حنیف حالات کا جائزہ لینے آیا تو کیا دیکھا کہ سارے غلام آپ کے سامنے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ صراح کے آنے پر کسی میں کوئی انقلاب نہیں آیا اور صراح بہت ہو گیا۔ جب میرے سامنے ان غلاموں کا یہ عالم ہے تو میرے بعد کیا ہو گا۔ اور لوگ کس طرح ان کی اطاعت کرتے ہوں گے۔ سر اذینا ممکن نہیں ہے ورنہ کہیں اپنا ہی خاتمہ نہ ہو جائے۔ مناسب یہی ہے کہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔ اور قید سے رہا کر دیا جائے ورنہ اگر یوں ہی ان کا کردار لوگوں کے سامنے آتا رہا تو سارا سراج حب اہلبیت ہو جائے گا۔ — اب اباب کرم! آپ کو یاد ہو گا کہ مرسل اعظم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا تھا کہ کفار کا کوئی آدمی آجائے گا تو ہم واپس کر دیں گے اور ہمارا کوئی آدمی گرفتار ہو جائے گا تو ہم واپس نہ لیں گے۔ مسلمانوں کو اس بات پر بے حد جلال آیا تھا۔ اور بعض لوگوں نے تو رسالت ہی کو مشکوک بنا دیا تھا لیکن امام حسن عسکری کے کردار نے واضح کر دیا کہ غیر کے دیار میں قیدی بن کر رہنا بھی اسلام کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ اس طرح اپنا کردار پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور دشمن کے دل موڑنے جلتے ہیں۔ کیوں نہ ہو داد کی مصلحت کو ہوتے سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اور رسالت کے کردار کو امت سے بہتر کون ادا کر سکتا ہے۔ حکومت اس مصلحت کو نہ کل سمجھی تھی اور نہ آج سمجھی ہے۔ اسے

تو جوش انتقام میں قیدی بنانا آتا ہے وہ کیا جانے کہ اللہ والے قید ہو کر بھی کس طرح دین حق کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جناب دوست نے قید خانہ میں توبہ کا سبق سکھایا تھا۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے قید خانہ میں نمائندہ حکومت سے مجبور کرایا تھا۔ ثانی ذہر نے قید رہ کر شام کے دیار کو فتح کیا تھا۔ امام حسنؑ مسکریٰ نے قید کی زندگی گزار کر دشمنوں کی زندگیوں بدل دی ہیں۔ اور عباسیت کی آوازیوں میں ایمان کے چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ جس نے کردار کو دیکھ لیا وہی گرویدہ ہو گیا اور جس پر بندگی کی چھوٹ پڑ گئی اسی کا دل نور ایمان سے منور ہو گیا۔

مفتی زائد کے قتل کے بعد معتدخت حکومت بریٹھا۔ اس کے زمانے میں ملک میں انقلابات برابر سر اٹھا رہے تھے۔ اور یہ انتظام مملکت سے عاجز تھا لیکن امام حسنؑ مسکریٰ کی اذیت کی طرف برابر متوجہ تھا۔ اور یہاں تک کہ اپنے غلام خیر کو سخت تاکید کر دی کہ حضرت کو بے حد ستایا جائے اور اس نے اس قدر تائید کی کہ اس کی زوجہ تک اس کی مخالف ہو گئی۔ آخر بنی زادے کو کس قدر ستائے گا۔ اور درخت رسول اللہ کو کیا سبھ دیکھائے گا۔ خیر کو ادنیٰ رحم نہ آیا اور اپنی اذیتوں کو اور زیادہ کر دیا۔ لیکن حضرت کے مبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ بالآخر ایک دن آپ کو درندوں کے سانے ڈال دیا گیا۔ اور یہ طے کر لیا گیا کہ آج ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ لیکن درندوں نے آپ کو دیکھتے ہی سر قدموں پر رکھ دیا اور حضرت ان کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ حکومت دم بخود رہ گئی اور درندوں نے آواز دی تم انسان ہو کر انھیں نہیں پہچانتے ہو اور ہم جانور ہو کر انھیں پہچانتے ہیں۔ ہماری معرفت کا عالم یہ ہے کہ کل ان کے باپ کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ تب بھی ہم نے اطاعت کی تھی اور آج انھیں بھیجا جا رہا ہے۔ تب بھی ہم ان کی اطاعت کر رہے ہیں۔ یہی ضعف ہم نسلوں کو پہچانتے ہیں۔ اور تم شخصیت کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایسے انسانوں سے ہم باندھ

ہی بہتر ہیں۔

آخر ماجرا کر معتمد نے خود اپنی حراست میں رکھ لیا اور مکمل دو برس ایک کوٹھری میں محبوس رکھا۔ جہاں روشنی تک سا گذر نہیں تھا۔ اور امام صرف عبادت پر در و گار میں وقت گزارتے تھے۔ ضعف و ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ ۲۴ برس کی عمر میں ضعیفی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ کردار میں کوئی فرق نہیں آیا اور امامت آواز دیتی رہی کہ قید ستم سے جسم میں ضعف آ سکتا ہے۔ کردار میں ضعف نہیں آ سکتا۔ تم نے جسم کی طاقت کو اپنا سرمایہ بنایا ہے۔ ہم نے کردار کی طاقت کو اپنا طرہ امتیاز قرار دیا ہے۔

۲۵۵ھ میں معتمد نے آپ کو رہا کیا اور آپ اپنے بیت الشرف میں تشریف لائے۔ ۲۵۹ھ میں امام عسکریؑ کی ولادت ہوئی اور قدرت نے واضح کر دیا کہ غریت نے اپنی ساری تدبیریں تمام کر لیں لیکن جب موسیٰ کی ولادت کا وقت قریب آ گیا تو ہم نے تمام پہرے ہٹا دیئے۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ جسے ہم زندگی دینا چاہتے ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ تو بے روزا دل ہی واضح ہو گیا کہ حجت خدا کی زندگی پر حالات کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ تو آج دنیا اس زندگی پر کیوں تعجب کر رہی ہے۔ جو ان حالات میں دنیا میں آ سکتا ہے وہ ان حالات میں زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ معتمد کے لئے یہ حالات ناقابل برداشت تھے کہ ہم انھیں مٹا دینا چاہتے ہیں اور یہ روز بروز مزاح ظالم بننے جا رہے ہیں۔ لوگوں کی توجہ ان کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک دن اس نے طے کر لیا کہ اب آبائی حربہ کے علاوہ ان حالات سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایک ذہر آلود طعام تیار کر لیا اور اپنے خادم کے ذریعہ امام علیہ السلام تک پہنچا دیا۔ خادم نے عرض کی کہ یہ طعام سرکار نے خاص طور سے آپ کے لئے تیار کرایا ہے اور آپ ہی کے لئے بھیجا ہے۔ آپ نے

فرمایا: بہتر ہے۔ جب میرے ہی لئے تیار کرایا گیا ہے۔ تو میں ہی کھاؤں گا۔ چنانچہ آپ نے اسے تناول فرمایا۔ تناول فرمایا تھا کہ جسم اقدس پر ذہر کا اثر شرف ہو گیا۔ اور حالت بگڑنے لگی۔ حکومت کو حالات کی اطلاع ہوئی تو فوراً قدیمی مکر سے کام لیتے ہوئے تیمار داری کا انتظام کیا۔ سرکاری طبیب معین کئے تاکہ حضرت اس زہر سے جانبر نہ ہونے پائیں اور نہک خوار طبیب برابر یہ اعلان کرتے رہیں کہ انھیں زہر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے اور علاج برابر جاری ہے۔ امکان ہے کہ صحت یاب ہو جائیں گے۔

عقیدہ کا بیان ہے کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے اور میرا وقت قریب آ گیا ہے، جب میں اب مصطلکی طلب کروں تو سمجھنا کہ میری موت قریب ہے اتنے میں حضرت کی حالت دگرگوں ہوئی۔ آپ نے فوراً پانی طلب فرمایا۔ میں نے اب مصطلکی حاضر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ خالص پانی لاؤ۔ میں نے پانی حاضر کیا۔ آپ نے وضو فرمایا۔ مصلے پر آئے۔ نماز ادا کی۔ ارگاہ احدیت میں مناجات کی اس کے بعد بستر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اب وہ پانی لاؤ۔ میں نے پانی حاضر کیا۔ آپ نے پیئے کا امداد کیا۔ لیکن دست مبارک میں ایسا ریشہ پیدا ہوا کہ نہ پی سکے اور پیانا کہ کینز کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے اور معلوم ہوا کہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ حسینؑ کا یہ فرزند بھی دنیا سے تشبہ ہی گیا اور امام زمانہ کے دل پر ایک داغ یہ بھی رہ گیا۔ عجب نہیں کہ کربلا کا رخ کر کے آواز دی ہو کہ جہد مظلوم آپ کو بھی دقت آفر پانی نہیں مل سکا تھا۔ اور میرا باب بھی دنیا سے تشبہ ہی رخصت ہوا۔

ادب اب عرا! ماہ ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ تھی جب امام حسن عسکریؑ

اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ اور ہمارا اور آپ کا آخری امام یتیم ہو رہا تھا۔ یہ تاریخ عرا کی تاریخ میں بے عدا بیت کی حامل ہے۔ سال بھرجن معصومین کا غم منایا جاتا ہے وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور ان کے وارث بھی دنیا سے جا چکے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ کیا رہواں امام وہ ہے جس کا وارث خدا رکھے ابھی زندہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اور آپ مل کر اپنے اس امام زمانہ کی خدمت میں باپ کا پروردگار اور عرض کریں کہ فرزند رسول! اب تک آپ کربلا کے مصائب کو یاد کر کے روتے تھے۔ اور حسینؑ مظلوم کی خدمت میں عرض کرتے تھے ————— بد بزرگوار! اگر زمانہ نے مجھے پیچھے ڈال دیا ہے اور مقدر نے موقع نہیں دیا کہ میں کربلا میں آپ کی نفرت کرتا۔ تو جہد مظلوم اب میں صبح و شام آپ کا ماتم کروں گا۔ اور آنسو تمام ہو جائیں گے تو آنکھوں سے خون بہاؤں گا۔ لیکن آپ کے مصائب پر گم یہ بند نہ کروں گا۔ ————— مولا! آج آپ پر ایک آہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ یہی کاہدہ اور یہ حالات۔ مولا آپ کے مصائب کربلا سے ملتے جلتے ہیں۔ وہاں بھی یہی موجود تھا لیکن باپ کے سرانے نہ آسکا۔ اور یہاں بھی آپ ظاہر بظاہر باپ سے مل بھی نہ سکے۔ لیکن مولا! آپ باعجاز ہستی باپ کے سرانے رہے تو ————— اور جب باپ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے غل و گفن کے کھجنازہ تیار کر دیا اور جب ظاہر پر آپ کے چچا نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے اگر دامن کھینچ لیا۔ چچا ہنٹے یہ معصوم کی نماز جنازہ ہے اسے غیر معصوم ادا نہیں کر سکتا۔ میں بیٹا موجود ہوں۔ میرے ہونے ہوئے آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ نماز پڑھیں یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے اور باپ کی نماز جنازہ ادا کر دی۔ لیکن مولا! کوئی عابد بیار کے دل سے پوچھے۔ باپ کا لاشہ جلتی ریتی پر پڑا ہوا ہے۔ اور بیٹا قید ہو کر جا رہا ہے۔ ثانی زہر آفریا دکر رہی ہیں۔ بد بزرگوار! آپ کی

نماز ملا لکھنے پر بھی ہے اور یہ آپ کا حسین چلتی ریتی پر پڑا ہوا ہے اور آپ کی ذریت قیدی بن کر جا رہی ہے۔ ۱۲۰ اور اپنی زینب کا حال تو دیکھئے کس شان سے رسن بستہ ہو کر مقتل سے کوفہ و شام کے بازاروں کی طرف جا رہی ہے۔

ارباب عزا! امام حسن عسکریؑ کا جنازہ اٹھا اور تاریخ کہتی ہے کہ اتنی شان سے اٹھا کہ اس شان سے اب تک اولاد رسولؐ میں کسی کا جنازہ نہ اٹھا تھا۔ ساری مملکت پر اشہر۔ ایمان حکومت۔ بادشاہ وقت۔ عوام۔ خواص۔ وزراء۔ سفراء۔ علماء۔ فقہاء غرض ہر طرف اجتماع ہی اجتماع۔ ظاہری نماز جنازہ میں بھی ہزاروں کا مجمع۔ استہام۔ انتظام۔ جنازہ اٹھا اور باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔ عزا دارو! یہ آخری حسن کا جنازہ ہے جسے عالم غربت کے باوجود باپ کا پہلو نصیب ہو گیا۔ مگر اسے قافلہ سالال نہ باپ کا پہلو طائفہ ۱۲۰ کا قریب۔ روضہ رسولؐ کی طرف جنازہ چلا بھی تو تیروں کی بارش۔ مابوت میں۔ تیر۔ یہ سیدہ کے لال کا جنازہ ہے۔ عزا دارو! آپ سوچ سکیں تو سوچیں۔ قبر رسولؐ پر کتنی مرتبہ زلزلہ آیا ہوگا۔ جب حسینہ کا جنازہ اٹھا تو قبر رسولؐ میں زلزلہ آیا۔ جب سجدہ کوفہ سے جبریل کی آواز گونجی تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ جب حسن کے جنازہ پر تیرہ سے تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ جب ام سلمہ عفرہ ماثورہ کو خواب دیکھ کر پرسہ کے لئے آئیں تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ اور سب سے فطیمہ زلزلہ تو اس دن آیا ہوگا جب نواسی قید شام سے چھٹ کر وطن آئی ہوگی۔ اور ۱۲۰ کی قبر پر حاضر ہادی ہوگی۔

عزا داران حسین! آج کی تاریخ قوم میں دہرے غم کی تاریخ ہے۔ امام حسن عسکریؑ کا اتم ایک طرف اور ایام عزا کا آخری دن ایک طرف۔ عجب نہیں یہ دن ایام عزا کا آخری دن بھی اسی اعتبار سے ہو کہ معصومین کی تاریخ میں یہ آخری شہادت ہے۔ جو درجہ الالہ کو بارگاہِ امدیت میں پیش ہوئی ہے۔ اس کے بعد بارہاں وارثِ رسولؐ ابھی زندہ

ہے۔ بہر حال اس تاریخ کو اس غم کے لحاظ سے بھی ایک اہمیت حاصل ہے۔ اور آج اس قیامت فخر منظر کی بھی یاد دہانی جاتی ہے۔ جب شام سے قافلہ چھٹ کر مدینہ آ رہا تھا اور جناب ام کلثومؑ آواز دے رہی تھیں ۱۲۰ کے مدینے ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا۔ ہم لٹ کر آئے ہیں۔ ۱۲۰ کے بیٹے سے ہم گئے تھے تو ہمارے سروں پر وارثوں کے سائے تھے۔ گودیوں میں بچے تھے اور داپس آئے ہیں تو سروں پر گر و غربت ہے اور گودیوں خالی ہو چکی ہیں۔

قافلہ بیرون مدینہ منہرا۔ محمد حنفیہ ملاقات کی غرض سے چلے۔ یہاں پرچم دیکھے۔ بیہوش ہو کر گرے۔ اسے یہاں پرچم کیسے۔ میرا بیٹا کہاں ہے۔ غلاموں نے سنبھالا۔ آقا علیؑ قافلہ آیا ہے۔ حسینؑ نہیں آئے۔ سید سجادؑ قافلے کو آئے ہیں۔ محمد حنفیہ آئے بڑھے۔ سید سجادؑ نے بڑھ کر استقبال کیا۔ بچانے بھتیجے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ سید سجادؑ نے کہا چچا ذرا ہٹا لیجئے۔ محمد حنفیہ نے فرمایا بیٹا میرا بیٹا کیا مارا کیا تم نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ اور اب مجھ سے گلے بھی نہیں لٹا پاہتے۔ عرض کی۔ چچا خدا گواہ ہے۔ ایسا نہیں ہے ذرا سنبھل کر میری گردن کی حالت تو دیکھئے۔ مجھے طوقِ خار دار پہنا کر کوفہ و شام کی طرف سے جاتا گیا تھا۔ محمد حنفیہ نے جھک کر غور سے دیکھا تو بیہوش ہو گئے۔ اسے میرے لال تجھ پر یہ مصائب۔ گزر گئے بیٹا تو نے ایسی اذیتیں برداشت کیں میرے لال۔ عجب نہیں سید سجادؑ نے فرمایا ہو چچا ذرا اپنی بہنوں کا حال تو دیکھئے۔ میں ماں بہنوں کو لے کر درباروں میں گیا۔ بازاروں سے گذرا۔ چچا ہزاروں تماشائیوں میں ہم چند قیدی۔ اور آئے آگے زندان کی آواز۔ تماشائیوں کا تماشہ دیکھو۔ یہ اولاد رسولؐ قیدی بن کر جا رہی ہے۔

وقت گذرا۔ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ کس شان سے داخل ہوا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کون بتائے گا کہ نبیوں کے داپر کیا گذری۔ کون بتائے گا کہ سید علیؑ کو اکبرؑ

کیسے یاد آئے۔ شہزادی زینب نے عون و محبت کو کس طسیر یاد کیا۔ اُمّ فردہ کو قاسم کے بعد وطن کیسا لگا اور کس ماں کو کیسے چین آیا جس کا ایک بچہ خاک کو بلایا پر سو رہا ہے اور ایک بچی شام کے زندان میں آرام کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک مرتبہ ثانی زہراؑ نے عابد یار سے کہا۔ بیٹیا میں نانا کی قبر پر جا رہی ہوں۔ میں نانا کو اپنی ر د واد غم ستاؤں گی۔ پردہ کا اہتمام ہوا۔ غورتوں کا ہجوم۔ پرستہ دینے والوں کا مجمع۔ مدینہ والوں کا اثر دھام۔ نچا کی بیٹی چلی۔ قبر اطر کے قریب آئی۔ آواز دی نانا! آپ کے حسین کا پرستہ دینے آئی ہوں۔ نانا آپ کے حسین کی سانی لے کر آئی ہوں۔ نانا میں لٹ کر آگئی۔ بھیا کو کہ بلا میں چھوڑ کر آئی ہوں۔

نانا کوئی ساتھ نہیں آیا۔ ایک بیارہ بقیہ کو بچا کر لائی ہوں نانا۔ سب کو بلا کی خاک پر سو گئے۔ اور اے نانا ایک بچی تو شام کے زندان میں ہم سے جدا ہو گئی۔ ہم نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ اور اندھیرے قید خانے میں چھوڑ کر چلے آئے۔ نانا ہم پر کیا گزرتی کیسے بتائیں۔ اگر مجمع عام نہ ہوتا تو شافوں سے رہا ہٹا کر دکھاتی کہ کس طرح رسیوں سے بازوؤں کو کھینچا گیا تھا اور کس طرح کو بلا سے کوذا در کو ذسے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھائے ہیں۔

عزادار! میرا دل کہتا ہے کہ قبر پر غم کو زلزلہ آیا ہوگا اور آواز آئی ہوگی۔ بس زینب بس! بس میری لال بس۔ اب نانا کو زیادہ مصائب نہ سناؤ۔ نانا کا دل تڑپ رہا ہے۔ بیٹی میں اُس وقت بھی موجود تھا جب میرے لال کے گلے پر غم چل رہا تھا۔ میری بیٹی میں اُس وقت بھی تھا جب تیری پشت پر تازیانے

لگ رہے تھے۔ شاہش میری بیٹی دنے میری محبت کا حق ادا کر دیا۔ تو نے زہراؑ کے خیر کا اثر دکھلا دیا۔ زینب تیرے نانا پر تیرا احسان ہے کہ تو نے تازیانے کھائے مگر میرے دین کو بچا لیا۔ شاہش میری بیٹی شاہش اب اس کا اجر قیامت کے دن ملے گا جب عادل کی عدالت ہوگی۔ تیرے نانا کی فریاد ہوگی۔ زہراؑ کے بال بکھرے ہوں گے۔ اور عرش الہی کو زلزلہ ہوگا۔ تیری ماں عرض کرے گی۔ پروردگار میرا گھر اجڑ گیا۔ میرے مالک میری نسل تباہ ہو گئی۔ میرا حسین مارا گیا۔ معبود میری زینب کے بازوؤں میں ریاں باندھی گئیں۔

والحمد للہ العلیہ وحسینہ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔